انسان، اے انسان!
حسن منظر

انسان، اے انسان!

(ناول)

حسن منظر

Insaan, Ai Insaan!

(Novel)

Hasan Manzar

اشاعت: ۲۰۱۳ء

کمپوزنگ: احمد گرافکس، کراچی

طباعت: اے جی پرنٹنگ سروسز، کراچی

بی۔ ۱۵۵، بلاک ۵، گلشن اقبال، کراچی۔
info@scheherzade.com

انسان، اے انسان!

آخر تو کیا ہے؟

(ایک زندگی)

انتساب

سید بذل الرحمن

تایا، سسر اور دوست

محمد ابراہیم

بڑے ماموں اور دوست

کے نام

بڑی محبت سے

حسن منظر

(۱)

بڑی بہن کے پاس راجدھانی بھیجے جانے سے پہلے اس کے باپ نے یہ فیصلہ کیسے کرلیا تھا کہ وہ بگڑا ہوا لڑکا ہے۔ وہاں قصبے میں تھا کیا جو اُسے بگاڑتا! وہ زمانہ جب وہ کنچے اور گلی ڈنڈا کھیلتا تھا، لٹّی کا لٹو زمین پر پھینک کر نچاتا تھا یا ہتھیلی پر لے کر۔ پتنگ اڑاتا تھا۔ پھٹ جانے پر اسے جوڑنے کے لیے کھانا پکانے والی سے گندھا ہوا آٹا مانگتا تھا، اپنی پتنگ کو کٹ جانے سے بچانے کے لئے اس نے مانجھا سوتنا سیکھا تھا۔ شیشے کو پیتا تھا، ماں سے لے کر ان کے پہنے ہوئے ململ کے دوپٹے کے ٹکڑے میں، یا جو پہنے ہوں، اس کا ایک پلو پکڑ کر آٹا چھان کر اس کی لئی پکواتا تھا یا خود پکاتا تھا، وہ ہنستی رہتی تھیں ''کب تک بچہ بنا رہے گا'' وہ ڈپٹ کر کہتا ''میں بچہ نہیں ہوں: دادی اماں، نانی اماں نہیں کہتی تھیں جب میں پیدا ہوا تھا، اُس کے دانت پیٹ میں تھیں، بڑھا ہے۔'' کیا اس سب کا مطلب تھا وہ بگڑا ہوا لڑکا ہے؟ یا یہ کہ اُس چھوٹے سے قصبے کے سڑکوں پر کھیلنے والے سب لڑکے بگڑے ہوئے تھے؟

ہاں اتنا تھا دھاندلی کرنے والے اپنے سے ایک بڑے لڑکے کی پٹائی کرنے کے بعد وہ لڑکوں کا سرغنہ مانا جانے لگا تھا۔ وہ تو معصومیت کے دن تھے اس کے بھی اور ان ساتھ کھیلنے والے لڑکوں کے بھی۔ وہ لڑکا بھی بعد میں دوست بن گیا تھا۔

وہیں اس نے باپ کی فرمائش پر مولوی صاحب سے عربی رسم الخط سیکھا تھا اور تھوڑی

بہت قرأت بھی۔ مگر وہ مولوی صاحب ادبدا کر بے وقت پڑھانے آتے تھے۔ جب پتنگ اڑانے کے لیے بہترین شام ہو یا دوپہر یا میں لڑکے تالاب سے مچھلیاں پکڑنے جا رہے ہوں۔ اور روز شربت کی فرمائش کرتے تھے۔ ایک دفعہ اس نے چڑ کر ان کی سرخ داڑھی پکڑ لی تھی۔ ماں نے دروازے کی اوٹ سے مولوی صاحب سے کہا تھا "میں انہیں خود سزا دوں گی آپ ان کے والد سے شکایت مت کیجئے گا۔"

اس شام وہ پٹ باپ کے ہاتھ سے رہا تھا مگر طیش اسے مولوی صاحب پر آ رہا تھا۔ اور وہ طیش ان چیموں پر اسے تمام رہا۔ نا قابل اعتبار لوگ۔

اگلے دن اس نے شربت میں زندہ ٹیڈ پول[1] چھوڑ دیا۔

جب گلے میں اس نے حرکت کی اور مولوی صاحب کو جو منہ میں تھا اسے تھوکنا پڑا تو اوکتے ہوئے ان کا ایک ہاتھ سر پر تھا، دوسرا حلق پر۔ پھر جب انہوں نے الٹی کر کے سارا شربت نکال دیا تو تمیزہ سے بولے "دیکھو کیا تھا؟"

تمیزہ نے فرش پر غور سے دیکھ کر کہا "مینڈک کا بچہ۔ دم والا۔"

"وہ کہاں سے شربت میں آ گیا؟ پانی لاؤ کلی کروں گا۔"

تمیزہ نے معصومیت سے پوچھا "مولوی صاحب کیا مینڈک حرام ہوتا ہے؟"

بعد میں اس نے ماں سے کہا "مولوی کمینہ آدمی ہے۔ آپ آئندہ اس سے بات مت کیجئے گا۔ پردے کی اوٹ سے بھی نہیں۔"

گنی پور میں دوپہر میں گھر کے پاس پیپل کے پیڑ کے نیچے لوگ کیرم[2] کا جوا کھیلتے تھے۔ وہ اس میں بھی شریک نہیں ہوتا تھا۔ صرف کھڑا ہو کر ان کا کھیل دیکھتا تھا۔

اس کے سوا اور کون سی برائی اس میں تھی جو آئے۔

یا ہو سکتا ہے وہ بات منجھلی بہن کو معلوم ہو گئی ہو کہ اس نے ایک اپنے سے کافی بڑی عمر کی

---

۱ مینڈک کا بچہ جب اس کے دم ہوتی ہے

۲ Carom

لڑکی کو اکیلائی میں سینہ کھول کر دکھانے کو کہا تھا اور گھومتی گھماتی شکایت پر باپ سے مار کھائی تھی مگر مارتے میں انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کس بات کی مار ہے۔

پھر بھی یہ اس کے کریڈٹ میں جاتا تھا اُس پہلی لڑکی کا نام اس نے ماں باپ میں سے ایک کو بھی نہیں بتایا تھا جس نے جب وہ پانچ چھ سال کا ہوگا گرمیوں کی دوپہر میں جب سب سو رہے تھے اُسے بکسوں کی کوٹھری میں لے جا کر اپنے کندھے کی اونچائی پر رکھے ہوئے ایک بکس پر بٹھا کر کہا تھا ''ایک چیز دکھاؤں'' اور اپنا سینہ کھول کر دکھایا تھا اور اسے مبہوت ہوجاتے دیکھ کر کہا تھا ''چھو کر دیکھو''

اس نے جب ڈرتے ڈرتے انگلیاں چھوائیں تو اس نے کہا ''ہتھیلی رکھ کر چھوؤ''

وہ اس کا ایک بالکل ہی نئی دنیا سے تعارف تھا۔ ایک بالکل نئے لطف کی دنیا جس کی قیمت رازداری تھی، عمر بھر تمام چھپ کر کرنے والے کاموں کی تمہید اور اس لیے کبھی آسودہ نہ ہونے والی خواہش۔ یہ لطف اس کام میں تھا یا اس کے خفیہ ہونے میں اس سوال کا جواب وہ نہ دے پاتا۔ اس دن وہ پہلی بار اس حقیقت سے آگاہ ہوا تھا کہ گھر کے قوانین چھپ کر توڑے جاسکتے ہیں۔ تب سے وہ دو دنیائیں اپنے دماغ میں ساتھ ساتھ رکھنا سیکھ گیا تھا۔ سب پر ظاہر کرنے والی، سب سے چھپانے والی۔

وہ بات اگر تب بتادی ہوتی تو گھر کیا خاندان میں قیامت آجاتی۔ وہ پہلی لڑکی چند دنوں کے لیے اپنی ماں کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ دور سے رشتے کی بہن یا خالہ تھی۔ ماں کو بھولے پن میں بتادیتا تو پتہ نہیں اس کی کیا گت بنتی! مگر اُس نے اس کھیل کے پہلے دن کہہ دیا تھا ''کسی کو بتانا نہیں ورنہ پھر میں تمہیں پیار نہیں کروں گی۔''

وہ اس قسم کے کئی کھیل جانتی تھی جنہیں سب سے چھپا کر رات کو کھیلا جاتا تھا، جب بڑی عمر والیاں باتوں میں مصروف ہوں، بڑے بچے اپنا کھیل کھیل رہے ہوں۔ نہ معلوم اس نے کس سے یہ رازداری کا کھیل سیکھا تھا!

آٹھ نو سال کی عمر کو پہنچنے پر ایک رات اس نے ایک عورت کو ماں سے کہتے سنا

''خوبصورت تھی، کہیں کی رانی ہونا چاہیے تھا لیکن نصیبے کی ہیٹی نکلی۔''

''کیسے؟''

''آدمی ملا، شرابی جواری — کا عادی تھا۔''

''خاندان سے باہر کی شادی کا اکثر ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔'' تکمیذ کی ماں کے منھ سے نکلا۔

اس رات کی بات نے تکمیذ کو ایک نئی اصطلاح سے آگاہ کر دیا: کوٹھوں کا عادی۔ اور جلد ہی ماں سے پوچھنے پر ''کوٹھوں کا عادی کیا ہوتا ہے؟'' ان کی گھُرکی سُن کر اُسے اندازہ ہو گیا یہ بات بھی بڑوں کے سامنے منھ سے نکالی جانے والی نہیں ہے۔

گھر میں میلاد شریف عورتوں کا وہ پہلا جگھٹا ہوتا تھا جسے وہ آنکھ کھولنے کے وقت سے دیکھتا آیا تھا۔ ماں کا ارادہ جب میلاد شریف کرنے کا ہو جائے مٹھائی، گلاب کے پانی کی بوتلیں، پھولوں اور اگربتیوں کے لیے جو وہ مانگیں باپ کو دریا دلی سے دینے میں تامل نہیں ہوتا تھا۔ اس دن گلاب پاش، اگردان، کٹورے، لوٹے اور دوسرے بھرت کے ظروف صندوق سے نکلتے، چمکائے جاتے۔ قالین بچھایا جاتا، اس پر چوکی رکھی جاتی۔ چوکی پر ایک زیادہ گداز چھوٹا قالین ہوتا اور مخمل کا غلاف چڑھا ہوا گاؤ تکیہ۔ گلاب کے پھول اور گجرے شاید سیر کے حساب سے آتے۔ اس دن خاص طور سے مٹھائی مسلمان مٹھائی فروش کے یہاں سے آتی — نکتیاں یا لڈو — بتاشے کنجوس یا کم استطاعت گھرانوں میں تقسیم کیے جاتے تھے، اُن کے یہاں نہیں۔ اگر شام کا میلاد ہو تو موم بتیاں شمع دانوں میں پہلے سے تیار رکھی جاتیں۔

تکمیذ تمام کارروائی میں دل و جان سے شریک رہتا۔ خود صاحب خانہ ڈیوڑھی میں بیٹھے حمد اور نعتیں سنتے ہوئے اس سرور میں ڈوبے نظر آتے جس نے جیسے ان کے باطن کو چھو لیا ہو۔ اور ہوتے ہوتے سے درود پڑھتے جاتے۔ یہی نہیں جب سلام پڑھا جاتا وہ وہیں مردانے میں اٹھ

کر کھڑے ہو جاتے۔

زندگی کے اس دور میں تمکین نے موت سے ڈرنا سیکھ لیا تھا۔ جو صاحبہ میلاد پڑھنے آتی تھیں جب چوکی سے اٹھ کھڑی ہوتیں، ان کے دونوں طرف بیٹھی ہوئی لڑکیاں اور فرش پر بیٹھی ہوئی عورتیں بھی کھڑی ہو جاتیں۔ اُن میں ادھر ادھر کی باتیں چھڑ جاتیں، بچے دوڑ بھاگ میں لگ جاتے۔ ساری محفل خوش نظر آتی لیکن نجانے کب تمکین نے وہاں بیٹھ کر ڈرنا سیکھ لیا تھا۔ اگر یہ ڈر موت کا بیان سننے سے تھا جسے بیان کرنے میں میلاد پڑھنے والی صاحبہ کو مہارت تھی — مرنے والے یا والی کا آخری وقت، زمین کے سپرد کرنے کی تفصیلات اور وہاں جو ہوتا ہے — تو سب کو ہونا چاہیے تھا۔ لیکن باقی سب خوش نظر آتے تھے، صرف تمکین سہما ہوا سا ہوتا تھا۔
نہ معلوم کس وقت اپنے اندر تمکین نے ایک گنہگار کو سانس لیتے ہوئے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا گناہ چھپا کر کرنے کے کام کو کہتے ہیں اور اس کی بھی اپنی چھپا کر کرنے والے کاموں کی دنیا تھی۔

بعد میں وہ میلاد شریف کی تیاری میں حصّہ لیتا لیکن جب وہ صاحبہ ڈولی سے اتر کر اندر جاتیں جن کے سپرد قدرت نے بچوں کو موت سے ڈرانے کا فعل کیا تھا وہ چپکے سے گھر سے نکل جاتا اور اس وقت تک واپس نہ آتا جب بچے گھر سے مٹھائی کھاتے ہوئے باہر نکلتے نظر نہ آ جاتے۔

اُن شروع کی یادوں میں جو بڑے ہونے کی عمر تک سب سے زیادہ تسلی دینے والی ہیں

تمیز کے لیے اپنی دادی کی ذات تھی۔ دادا کو اس نے نہیں دیکھا تھا۔ دادی اس کی ہر ہر ادا پر فریفتہ تھیں۔ اُن کے نزدیک وہ ہو بہو اپنے دادا کی شکل تھا، ان ہی کی طرح ہنستا اور بولتا تھا، ان ہی کی طرح اُن کا خیال رکھتا تھا اور بڑے ہو کر اپنے دادا کی طرح غریبوں کا خیال رکھا کرے گا۔ ڈاکٹر بنے گا اور غریبوں کا علاج مفت کرے گا، جج بنے گا اور انصاف کرے گا۔ اپنے دادا کی طرح بہادر ہوگا اور جنگلوں میں ڈاکوؤں کا خاتمہ کرے گا۔

لیکن ہوا یہ کہ جب وہ آخری سانسیں لے رہی تھیں تمیز وہاں نہیں تھا، نہ جنازے کی تیاری کے وقت، نہ وہ جنازے کے ساتھ قبرستان گیا۔

جب جنازہ جا چکا تھا وہ ذرا ذرا وہاں لوٹا جہاں مسجد کے باہر بیری کی چھاؤں میں نماز جنازہ پڑھی گئی تھی لیکن گھر کے اندر نہیں گیا جہاں دادی کو نہلایا گیا تھا۔ اتنے میں لوگ قبرستان سے لوٹ آئے تھے جو گھر کے نزدیک ہی تھا اور چھت پر چڑھ کر دیکھو تو نظر آتا تھا۔ وہیں دادا کی قبر تھی۔

اسے ادھر اُدھر تجسس سے دیکھتے پا کر کسی نے پوچھا ''کیا دیکھ رہے ہو؟''

اس نے کہا: ''روح کو۔''

باپ نے اسے خفگی سے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔

'وہ بھی عجیب دور تھا'، وہ سوچتا 'جب میں نے خواہ مخواہ بھوتوں کی دیکھا دیکھی چھپکلی سے ڈرنا سیکھا تھا اور پھر گرگٹ سے ڈرنے لگا تھا۔'

''ایک دن املی کے پیڑ پر چڑھا کتارے توڑ رہا تھا۔ گرگٹ نظر آیا۔ ڈال چھوٹ گئی، گرا اور ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد پیڑ پر چڑھنا بھول گیا۔''

''املی کے پیڑ پر چڑھنا؟'' سننے والا تمسخر سے پوچھتا۔

''ہر پیڑ پر چڑھنا، وہ املی کا ہو یا امرود کا'' وہ بھی تمسخر سے جواب دیتا ''حتیٰ کہ کسی فلم میں اگر سین ہو کہ ہیرو، ہیروئن پیڑ کے گدے پر بیٹھے آم چوس رہے ہیں تو منھ دوسری طرف کر لیتا تھا

کہ اب گرے اب گرے۔"

لیکن باپ کے گھر گزارے ہوئے دنوں کی سب سے دردناک یاد جو تا عمر اس کے ذہن میں رہی یہ تھی کہ اُس دوسری بڑی عمر کی لڑکی کے، جس سے اس نے کہیں چھپ کر سینہ کھول کر دکھانے کو کہا تھا، راز اگل دینے نے اُسے بڑی بہن کے گھر پہنچا دیا تھا۔
'کاش وہ بات اس نے اماں سے کہی ہوتی! وہ بات کو پی جاتیں اور مجھے اکیلے میں دھمکی دینے پر بس کرتیں۔ She loved me۔[1]'

تسنیم، تایا کی لڑکی کو صحیح معنوں میں تمیز نے پہلی بار اس زمانے میں دیکھا تھا جب وہ دوسری جماعت میں تھا۔ اس سے پہلے کی تسنیم کو بھی وہ تصور میں دیکھ سکتا تھا جب وہ گڑیوں سے کھیلتی ہوگی۔ لیکن اس دن کی یاد اس کے ذہن میں ہلکی ہوا کی اٹھائی ہوئی لہروں کی طرح آتی تھی جب وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نئی پور دن بھر کو آئی تھی۔ سب کسی اور شہر جا رہے تھے اور تایا ابا اپنے چھوٹے بھائی سے ملنے کے لیے راستے میں چند گھنٹوں کے لیے ٹھہر گئے تھے۔

تسنیم کو ابا نے اپنے پاس بلایا اور دیر تک اس سے باتیں کرتے رہے۔ وہ کرسی پر بیٹھے تھے اور وہ ان سے لگی کھڑی تھی۔ اس وقت تمیز کے دل نے کہا تھا 'اس جیسی کوئی اور لڑکی نہیں' اور اس زمانے میں جو لفظ ہر چیز کی بڑائی جتانے کے لئے استعمال کرتا تھا ساتھ ہی کہا 'سارے جہان میں'۔
اس نے ابا کو پوچھتے سنا "کس سپارے پر ہو؟"
اس نے کہا "تیرھویں، تا ابرئ کے۔"
اور تمیز نے خوش ہوکر بغیر پوچھے اُسے بتایا: "میں یعتذرون۔ گیارہویں پر۔"

---

[1] مجھے چاہتی تھیں۔

''مجھ سے پوچھیے'' تسنیم نے مسکرا کر کہا۔

تلمیذ نے فوراً کہا ''دہرا رہا ہوں۔''

تسنیم کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

اس کا جی چاہ رہا تھا بجائے پورے وقت ابا سے باتیں کرنے کے وہ اس کے پاس آئے اور اپنی کتابیں دکھانے کو کہے۔ اسی لیے وہ اس کمرے سے نکل نہیں رہا تھا۔ وہیں اپنی کتابیں لے آیا تھا اور فرش پر بیٹھا اُن کے صفحے الٹ رہا تھا۔

بڑے ابا نے تب بھی اس سے نہیں پوچھا تھا: کیا پڑھ رہے ہو، کس کلاس میں ہو؟

رخصت ہونے سے پہلے تلمیذ کو صرف اتنا موقع ملا کہ اس سے کہہ سکا: ''اب جب آؤ گی تو میں تمھیں اپنی کہانیوں کی کتابیں دکھاؤں گا۔ اور کمرکھ کا باغ دکھانے لے چلوں گا۔ بڑے مزے کی ہوتی ہیں، بہت کھٹی۔ بالکل پاس ہے۔''

اس نے مسکرا کر صرف ''اچھا'' کہا۔

جب تلمیذ میں اتنی آزادی آ گئی تھی کہ گھر سے نکل کر اکیلا ادھر اُدھر گھومنے لگا تھا اور وقت کے ساتھ وہ دائرہ بڑھتا جا رہا تھا اُسے بھی وہ گھنے پیڑوں کا علاقہ اپنی طرف بلاتا نظر آنے لگا جدھر اکثر لڑکے اور چند ایک لڑکیاں کسی نہ کسی ٹوہ میں نکل جاتے تھے اور گھنٹوں وہیں رہتے۔ اس علاقے کو سب جنگل کہتے تھے حالانکہ بالکل مینی پور کی آبادی سے ملا ہوا تھا اور لوگوں کو جو وہاں رہتے ہوں گے اس نے آتے جاتے دیکھا تھا۔ شاید وہاں دکانیں نہیں تھیں کیونکہ عورتیں اور مرد وہاں سے گڑ، چاول، آٹا اور مٹی کا تیل خریدنے مینی پور کے بازار آتے تھے۔ وہاں جاتی ہوئی عورتوں کے سروں پر کنستر، مٹکے اور بھاری بھاری پوٹلیاں ہوتی تھیں اور ایسا ہی کچھ سامان اور جلانے کی لکڑی ان کے مرد سروں پر اٹھائے ہوتے تھے۔

وہاں جو لڑکے لڑکیاں کھیلنے جاتے تھے اکثر کچی پکی املی، کمرکھیں اور کیت لیے لوٹتے تھے۔ ایک آدھ دفعہ تو لڑکوں نے اُسے جھاڑوں کے کھٹے بیر اور کچی مونگ پھلیاں بھی کھلائیں۔ آخر ایک

دن وہ بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ بغیر ماں باپ سے پوچھے۔

وہاں جنگل کے بیچ میں ایک جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کی ہوئی جگہ تھی جہاں آمنے سامنے بنے ہوئے کوارٹروں کی دو لائنیں تھیں۔ ان لائنوں کے درمیان کی جگہ میں عورتیں چل پھر رہی تھیں، اپنے کام میں مصروف تھیں۔ ایسے کام جو اس کے گھر میں بھی کھانا پکانے والی، کپڑے دھونے والی عورتیں کرتی تھیں، یہاں وہاں بچے بھی کھیل رہے تھے، جو گھٹنیوں چل رہے تھے ننگ دھڑنگ تھے۔ جہاں سایہ تھا عورتیں چولھا پھونک رہی تھیں۔ جدھر کوارٹر ختم ہوتے تھے ان سے کچھ دور پر ریلوے لائن تھی اور یہ تمیز کی خوش قسمتی تھی کہ پہلے ہی دن اُسے وہاں سے ایک مال گاڑی گزرتی نظر آ گئی۔

تمیز نے گھر آ کر نہیں بتایا اتنی دیر کہاں رہا ہے۔ وہ جگہ اسے بہت اچھی لگی تھی، جیسے ایک بہت بڑا گھر جس میں بہت سے لوگ رہتے ہیں، اور ان کے جانور۔ اُن کا کنواں ہے اور ریلوے لائن پاس سے گزرتی ہے۔

آنے والے دنوں میں وہ ان کوارٹروں کے بارے میں سمجھ گیا ریلوے گینگ مین کے ایک ایک کمرے اور چھوٹے چھوٹے صحن کے گھر ہیں۔ ان پر سائیڈ میں انگریزی میں نمبر لکھے تھے، وہ دنیا جہاں سے ایک کُبڑی عورت اس کے یہاں بھی ایک زمانے میں برتن مانجھنے، جھاڑو دینے آتی تھی۔ اب وہ کسی پیڑ کے نیچے کھٹیا ڈالے لیٹی نظر آتی تھی۔ وہ تمیز کو نہیں پہچانتی تھی۔ وہیں وہ آدمی بھی رہتا تھا جس کے بارے میں تمیز کو یاد رہا اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔

ان کوارٹروں کے قطاروں کے بیچ کی جگہ شام کو زندگی سے پُر نظر آتی تھی۔ گرمیوں میں مرد باہر پلنگ ڈال کر اُن پر بیٹھے حقّہ یا نریل گڑگڑاتے نظر آتے تھے، کسی کے پاس اگر لکڑی کے دو تختوں کی کرسی ہوتی تھی تو وہ اس پر بیٹھا بچوں کو کھیلتے دیکھتا نظر آتا تھا۔ رات کو گرمیوں میں مرد وہیں سو جاتے تھے اور زیادہ عمر والی عورتیں بھی۔

کوارٹروں سے ملا ہوا جنگل جیسا باغ تھا جس میں تیسری کلاس میں پہنچنے کے بعد دو ایک بار تمیز اپنے ساتھیوں کے ساتھ گرگٹوں کا شکار کھیلنے گیا تھا جہاں شکار کے زمین پر گرنے کے بعد

یہ ضروری ہوتا تھا کہ اسے سٹیوں یا پتھر سے کچل دیا جائے۔ ''ورنہ'' تجربہ کار شکاری لڑکوں نے بتایا تھا ''وہ پیشاب کر کے اس میں نہاتا ہے اور ٹھیک ہو کر مارنے والے سے بدلہ لیتا ہے۔''
تمیز ان مہمات میں بس دیکھنے والے کی حیثیت سے شریک ہوا تھا۔
دوسری مرتبہ اُن کوارٹروں میں سے کچھ لڑکے نکل آئے اور لڑنے لگے: ''تم نے ہمارے گرگٹوں کو کیوں مارا!''
شکاریوں میں سے ایک نے جو ذرا سیانا تھا کہا: ''اس نے ہمارے پیغمبر کا منہ چڑھایا تھا۔''
گرگٹوں کے دفاع میں نکل آنے والوں میں سے بھی ایک سیانا تھا۔ بولا: ''ہم تمہاری مکڑیوں کو ماریں گے۔''
شکاری لڑکوں کی سمجھ میں اس کا مطلب نہیں آیا لیکن ڈر سب گئے۔ وہ معرکہ وہیں ختم ہو گیا۔

اُن کوارٹروں میں وہ آدمی کہیں سے آ کر رہا تھا جس کا کچھ حال بڑے لڑکوں کو معلوم تھا۔ وہ صبح اٹھ کر اپنی بکری باہر لا کر دوہتا تھا۔ پھر رات کی روٹی دودھ کے ساتھ کھا کر، جس میں کبھی کبھی گڑ بھی ڈال لیتا تھا، جنگل سے پتے لا کر کوٹھری میں بندھی بکری کے سامنے ڈالتا تھا، اس کے لئے پانی رکھتا تھا اور دروازے کو تالہ لگا کر کام پر چلا جاتا تھا۔
کبھی ایک ہاتھ سے گڑ کے ٹکڑے کو دانتوں سے کتلتا، دوسرے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا منہ میں رکھتا۔ یہ اس دن ہوتا تھا جب اس نے بکری سے دودھ نہ پایا ہو۔
شام کو باہر اینٹوں کے چولہے پر روٹی ڈالتا اور جو کچھ لایا ہوتا ہنڈیا میں پکاتا۔ بکری پاس ہی پلنگ کی پٹی سے بندھی ہوتی تھی اور کبھی پلنگ پر چڑھی یا سو رہی ہوتی تھی یا کھڑے کھڑے اس پر پیشاب کرتی تھی۔ کھانے کے بعد ایک بیڑی اور اس کے بعد اس کا دن ختم ہو جاتا تھا۔
سب کو معلوم تھا اس کے نہ ماں باپ ہیں، نہ بہن بھائی۔ نہ کوئی رشتے دار اس سے ملنے کبھی آیا۔

پھر ایک صبح اس نے جگنو کی دادی کے ہاتھ میں بکری کی رسی پکڑا کر کہا "میں دو ایک دن کے لیے جا رہا ہوں۔ خیال رکھنا، دودھ تمہارا۔ بچ جائے تو میری، نہیں تو کسی کا دوش نہیں۔"

جگنو کی دادی نے پوچھا "کہاں جا رہا ہے؟"

اس نے کہا "جب آؤں گا تو تجھے پتہ پڑے گا۔"

تیسرے دن جب وہ لوٹا تو اس کے ساتھ ایک جوان لڑکی تھی۔ سیدھی سپاٹ، سر پر دوپٹہ نہیں تھا۔ خوبصورت تھی، گوری اور لمبی لیکن منھ سے رال بہہ رہی تھی، جسے اس آدمی نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کپڑے سے پونچھا۔ جیسے وہ کپڑا تھا ہی اس کام کے لیے۔

جگنو کی دادی نے اس کے ہاتھ میں بکری کی رسی پکڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ لڑکی کون ہے؟"

تمام کوارٹروں کے باسی ان دونوں کے گرد جمع ہو گئے۔

"بتا کون ہے یہ؟"

"تو تو کہتا تھا تیرا دنیا میں کوئی نہیں ہے؟"

"کسی اناتھ آشرم سے لایا ہے؟"

"یتیم خانے سے؟"

بکری والے نے لجاتے ہوئے کہا "جو سمجھ لو۔ اب اسے بھی اپنی سمجھو۔"

ایک ہاتھ سے وہ بکری کی رسی تھامے تالہ کھولنے کے لیے بڑھا۔ اتنی دیر میں لڑکی ایک عورت کے پاس جا کر اس سے پوچھ رہی تھی "تم گکو خالہ ہو؟"

سارا ہجوم ورطۂ حیرت میں تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ نہا دھو کر کوارٹر میں سے نکلا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے اپنے چولھے کے لیے اینٹیں ادھر اُدھر سے چننے لگا جو بچوں نے ادھر اُدھر کر دی تھیں۔

عورتیں کام میں لگ گئیں۔ مرد پلنگوں پر بیٹھے کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھ رہے تھے۔

ایک نے کہا "اس کی بس ایک مشکل ختم ہوئی، چولھا ابھی بھی پھونکے ہے۔"

دوسرے نے کہا "اتنا بھی بہت ہے۔"

بہت جلد اس کی زندگی ڈھرے پر آ گئی۔ فرق تھا تو بس اتنا کہ پہلے صرف بکری کو بند کر کے جاتا تھا اب بیوی اور بکری دونوں کو۔ لڑکے دروازے کی جھری سے جھانک کر اندر کی دنیا دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ کبھی لڑکی نظر آتی تھی، کبھی صرف بکری۔ یا بکری اور وہ دونوں پلنگ پر پاس پاس سو رہے ہوتے تھے۔

بوڑھی عورتوں اور جوان لڑکیوں نے اُسے اس کے پتی کا نام یاد کروایا تھا۔ کبھی پوچھنے پر صحیح بتاتی، کبھی سوال کرنے والی سے پوچھتی: ''تیرے پتی کا کیا نام ہے؟''

کبھی عورتیں پوچھتیں ''تیرے بچہ کب ہوگا؟''۔ اس کا جواب اس کے پاس بھی اتنا ہی ہوتا ''تیرے بچہ کب ہوگا؟'' جب وہ یہی سوال کسی بوڑھی عورت سے کرتی تو خوب ہنسی ہوتی۔ بوڑھی عورت اُسے گالیاں دیتی جس نے سکھا پڑھا کر یہ سوال کروایا ہوتا تھا۔

تملیذ کے ذہن میں وہ کوارٹروں کی لائنیں جوں کی توں محفوظ رہیں، اُن کے پار کا جنگل جس میں جنگل جلیبی اور کمرکھ کے پیڑ تھے، اور پیلے کنیر اور ارنڈی کے۔ کنیر کی گٹھلیاں بہت سے کھیلوں میں کام آتی تھیں، بعض بڑی عمر کے لڑکے اُن سے جوا بھی کھیلتے تھے۔ وہاں کے تندرست کرگٹ، شام کے وقت کی کوارٹروں کی دنیا اور وہ آدمی، وہ لڑکی جس کا سینہ بہت واضح تھا کیونکہ کبھی دوپٹے سے ڈھکا ہوا نہیں ہوتا تھا۔ یہ نہیں کہ وہ نہیں سمجھا تھا بوڑھے آدمی نے بے چارے کی کس مشکل کے ختم ہوجانے کا ذکر کیا تھا، سب لڑکے سمجھے تھے، اور جوان عورتیں بھی جنہوں نے وہ باتیں سنی تھیں اور دانتوں سے پلو چبا کر آنکھیں نیچی کیے مسکرا رہی تھیں۔

سب ہی لڑکوں نے کہا تھا 'بری نہیں ہے۔' تملیذ نے بھی۔

ایک ریٹائرڈ فوج کا کپتان بھی اس عمر سے تملیذ کے دماغ میں رہا جب وہ انگوٹھا چوستا تھا — اکثر ماں کی گود میں بیٹھ کر جب وہ دوسری عورتوں سے باتیں کر رہی ہوتی تھیں۔ اُن کی کچھ باتیں اس کی سمجھ میں آتی تھیں کچھ نہیں۔ جو سمجھ میں نہیں آتی تھیں ان کے بارے میں وہ ماں سے سوال کر بیٹھتا تھا۔ کبھی اپنے سوال کا جواب اُسے مل جاتا، کبھی وہ آنکھیں دکھا کر چپ

کرا دیتیں۔ اکثر سوالوں پر عورتیں ہنس پڑتی تھیں۔

اُن ہی دنوں اُسے اندازہ ہوگیا تھا اپنی دونوں بڑی بہنوں سے وہ کافی چھوٹا ہے، اس کی وجہ اماں اور دوسری عورتوں کو معلوم تھی، خود اُسے نہیں۔ اس وجہ سے وہ ماں باپ دونوں کا چہیتا تھا۔

ریٹائرڈ فوج کے کپتان کا نام جو بڑے ہونے پر اس نے سنا پاگل کپتان تھا۔ اصل نام کچھ اور ہوگا۔ اُسے تلمیذ نے کبھی نہیں دیکھا تھا، ہاں اس کا مکان ضرور دیکھا تھا۔ دو تین اسٹیجز میں: جب بہت چھوٹا تھا، جب ذرا بڑا ہوا اور بالآخر اسکول کے زمانے میں۔ ساری اسٹیجز مل کر ایک ہوگئی تھیں جیسے اس نے سب کچھ دیکھا تھا۔ حقیقت میں بہت تھوڑا۔

جو اُسے یاد نہیں تھا وہ یہ تھا اپنا مینی پور والا گھر چھوڑ کر کیوں اس کے گھر والے اس گھر میں جا کر رہے تھے جو اس کے ذہن میں رہ گیا۔ شاید ماہ دو ماہ کے لیے، کیونکہ عتیق الرحمن اپنے گھر کی مرمت کرا رہے تھے جو گر رہا تھا۔ اُسے اپنا گھر پوری طرح یاد نہیں تھا۔ اس عارضی مکان کے بعد جس کرائے کے گھر میں سب جا بسے تھے وہ پہلا گھر تھا جس کے کمرے، طاق، الماریاں، صحن سب اُسے زندگی بھر یاد رہے۔

جس مینی پور سے ملے ہوئے شہر میں تلمیذ کے ابا نے وہ گھر لیا تھا تلمیذ کو بہت بڑا لگا تھا۔ مسجدوں، مندروں کا شہر، جہاں سڑکیں پکی تھیں اور ان پر تانگے بھی نظر آتے تھے۔ وہ گھر انہوں نے کرائے پر نہیں لیا ہوگا۔ شاید مفت میں ملا ہو۔ اتنی تھوڑی مدت کے لیے ان دنوں جب بڑے شہروں تک میں مکانوں اور دکانوں پر 'کرائے کے لئے خالی ہے' کے بورڈ لٹکتے نظر آتے تھے مالک مکان نے جو ان کا واقف ہوگا بے کرائے کے دے دیا ہوگا۔

وہاں پکی مین روڈ سے نکل کر ایک کچی سڑک مسجد کے سامنے سے ہوتی ہوئی ادھر مڑ جاتی تھی جدھر تلمیذ کے ابا نے گھر لیا تھا۔ فوجی ریٹائرڈ کپتان کا دومنزلہ، مسجد کے پاس سے گزرنے والی کچی سڑک کی دوسری طرف تھا۔ بعد کے دنوں میں اس کی اوپر کی منزل کی کھڑکی سے ایک شام خود تلمیذ دیکھ چکا تھا کتنے نمازی مسجد میں جمع ہوگئے ہیں۔ رمضان تھے، وہ گھروں

سے آنے والی افطاری بھی اس کھڑکی میں سے نظر آئی تھی جو اس چوڑی کاندھے جتنی اونچی دیوار پر رکھ دی گئی تھی جو مین روڈ اور مسجد کے صحن کے درمیان تھی۔ وہیں اس کے کھڑکی سے دیکھتے دیکھتے اذان شروع ہوئی اور سڑک پر بھی جو تیز تیز اپنے گھروں کو جا رہے تھے اس میں سے کوئی میٹھی چیز اٹھا کر منھ میں رکھ لیتے تھے۔ اُسے وہ سین بہت اچھا لگا تھا۔ وہ پورا علاقہ اور وہ سین جوں کا توں تمیز کے ذہن میں محفوظ رہا۔

تھوڑا بڑا ہونے پر تمیز اندازہ لگا سکتا تھا وہ دور کی دیوار جس پر افطاری رکھی تھی اتنی دور نہیں تھی کہ بندوق کی گولی وہاں تک نہ پہنچ سکے۔ اور مسجد کا صحن اور باہر نکلنے کا راستہ تو اور بھی نزدیک تھے۔

ایک جمعہ کو جب تمیز میں مختلف دنوں کی تمیز پیدا نہیں ہوئی تھی لوگ کہہ رہے تھے مسجد توحید میں نماز کے بعد تین آدمی مارے گئے۔

مارنے والے نے سب کے ساتھ نماز پڑھی تھی لیکن مسجد سے سب سے پہلے نکل آیا، اپنے گھر میں جا کر کھڑکی میں بیٹھ کر اس کے پٹ کی اوٹ سے، جنھیں مارنا تھا اُن کا انتظار کرنے لگا۔ اور جب پہلا آدمی نکلا تو اُسے شوٹ کیا، پھر دوسرے کو، تیسرا بچ گیا، لیکن گولی اس کے سیدھے کان کو پھاڑتی ہوئی چلی گئی۔

"تیسرا آدمی کون؟" تمیز نے ماں سے سوال کیا تھا۔ اُس وقت وہ ان کی گود میں انگوٹھا منھ میں لیے بیٹھا تھا۔

"وہ خود" ماں نے بغیر بات میں دلچسپی لیے کہا۔ مطمئن ہو کر تمیز دوبارہ انگوٹھا چوسنے لگا۔

تمیز کو یقین تھا رات کو اُس نے خود تین بار گولی چلنے کی آواز سنی تھی۔

آنے والے دنوں میں اس نے کئی بار سنا کپتان غصیلا آدمی تھا۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔ سپاہی بھرتی ہوا تھا، ترقی کرتا کرتا کپتان بن گیا مگر کبھی کسی سے بنی نہیں۔ "پہلی بیوی کو طلاق دی تھی، دوسری جل جل کر مر گئی۔"

"جیسے جل جل کر گوشت خراب ہو جاتا ہے اور پھینک دیا جاتا ہے۔ تو کیا فوجی نے اُسے بھی

پھینک دیا تھا؟'' اس سوال کا جواب اماں نے نہیں دیا۔ تلمیذ نے انگوٹھا مُنھ سے نکال کر پوچھا تھا، جواب نہ ملنے پر انگوٹھا پھر مُنھ میں چلا گیا۔ ابا نے صرف اتنا کہا تھا ''جب بڑے ہو جاؤ گے خود جان لو گے۔''

سال بھر بعد اسی محلے میں کوئی شادی تھی جہاں مسجد توحید میں خوں ریزی ہوئی تھی۔ تلمیذ کے گھر والے رہلوں[1] میں لدے پھندے وہاں گئے۔ شادی ایک اور گھر میں تھی لیکن انہوں نے براتیوں کو اسی گھر میں ٹھہرایا تھا جس میں پہلے تلمیذ کے گھر والے آ کر کچھ دن رہے تھے — اُسی احاطے میں جس کے مُنھ پر غصیلے فوجی کا دو منزلہ مکان تھا۔ اس دفعہ پہلی بار تلمیذ نے اس گھر کے لیے پاگل کپتان کا گھر سنا۔

وہ مکان بند پڑا تھا۔ تالے پر ایک کپڑا چڑھا کر سی دیا گیا تھا، جیسے موزہ ہو — اور اس پر لاکھ کی مہریں لگی تھیں۔ سڑک پر کھیلنے والے بچے اس مکان سے بچتے ہوئے گزرتے تھے۔ وہ مکان تلمیذ کے لیے اس دن تک پُراسرار رہا جس دن کچھ آدمیوں نے آ کر قینچی سے کاٹ کر تالے پر سے کپڑا اتارا۔ لاکھ جھڑ کر زمین پر گری۔ شادی میں آنے والے لڑکے لڑکیوں نے وہاں بھیڑ لگا دی تھی لیکن جب تالا کھول کر وہ لوگ اندر گئے تو ڈر کے مارے اُن کے ساتھ وہ بھیڑ اندر نہیں گئی۔

کچھ دیر بعد اُن میں جو پولیس کے آدمی تھے باہر نکلے اور چلے گئے۔ آس پاس کے لوگ بھی گھر میں آ جا رہے تھے۔ لیکن سب نہیں، کچھ کو باہر ہی روک دیا جاتا تھا۔ اس دن مکان کو دوبارہ تالا لگا کر گھر والے چلے گئے۔ 'وہ گھر والے ہی ہوں گے جو اتنی دیر اندر رہے۔' سب لڑکے لڑکیوں کا یہی خیال تھا۔

اگلے دن ان کے ساتھ تانگے میں دو عورتیں آئیں، برقعے میں۔ ان کے ساتھ جو اٹھارہ انیس سال کا نوجوان تھا اور جو پہلے دن بھی سپاہیوں کے ساتھ اندر گیا تھا تلمیذ کے سننے میں آیا پاگل کپتان کا بیٹا تھا۔ تلمیذ اپنے گھر کے چھجے سے اُس گھر کو دیکھتا رہا۔ اسے کھانے تک کی

---

[1] چھت اور پردوں والی بیل گاڑی

فرصت نہیں تھی۔ اس کا انگوٹھا پینا چھوٹ چکا تھا۔

گھر کے باہر کوڑا اور بے کار چیزیں جمع ہوتی جا رہی تھیں۔ ڈبے، بوتلیں، ٹوٹے ہوئے پلنگ کے پائے اور اس کا پٹ سن کا جال۔ تلے جلی ہوئی پتیلیاں، کرچھا، توا، دیچا۔ ان چیزوں کو اٹھا کر لے جانے کے لئے کوئی فقیرنی بھی آگے نہیں بڑھی۔ ایک کتا پتیلیوں کو سونگھتا رہا اور انہیں اپنے مطلب کا نہ پا کر جدھر سے آیا تھا اُدھر چلا گیا۔

ڈرتے ڈرتے تمیذ وہاں گیا۔ ایک سیلولائڈ کی موٹی گڑیا جس کا ایک پیر غائب تھا اس پتیلی کے پاس پڑی تھی جس میں کوئی سفید پاؤڈر قسم کی چیز تھی۔ پوچھنے پر کسی نے بتایا: دودھ ہے۔

لگتا تھا تمیذ کی ماں اُن عورتوں کو جانتی تھیں۔ تیسرے دن شادی میں آنے والی چند اور عورتوں کے ساتھ وہ اُن سے ملنے گئیں۔ ساتھ میں تمیذ اور اس سے بڑی نمبر ۲ بہن بھی تھے۔ بوڑھی عورت جو جوان لڑکی اور اس اٹھارہ انیس سال کے لڑکے کی نانی تھیں بتا رہی تھیں: ''کسی کے منھ سے نہیں سننا چاہتا تھا۔ اس کی اجازت نہیں تھی کہ میری بیٹی، اس کی تیسری بیوی، اپنے نیکے جائے۔ کئی دفعہ سالوں کو منع کر چکا تھا 'تمہاری بہن تمہارے گھر نہیں جائے گی۔'

''کیسے نہ جاتی، باپ مر رہا تھا، بیٹی کو دیکھنے کو سانس اٹکی ہوئی تھی۔ ہمت کر کے دونوں سالے ایک بار پھر کپتان صاحب سے کہنے گئے بہن کو بھیج دو، باپ کا آخری وقت ہے۔ وہ گھر پر نہیں تھا۔ باپ کا سن کر کہ آخری سانسیں ہیں وہ اُن کے سنگ ڈولی میں بیٹھ کر چل پڑی۔ 'جو بھی ہو، میں باپ کو دیکھے بنا ساری زندگی نہیں سو سکوں گی۔'

''یہ آیا۔ گھر کا دروازہ بند دیکھ کر بس آپے میں نہیں رہا۔ مسجد کے امام صاحب نے سمجھایا کہ تالا نہیں ہے تو کیا ہوا ہم نے کنڈی لگا دی ہے۔ تمہارے سالے ہمیں کہہ کر بہن کو لے گئے ہیں کہ گھر پہ نظر رکھنا۔ مگر اس کے سر میں تو بھیجا اللہ جانے مرکھنے بیل کا تھا یا کٹکھنے کتے کا۔ اسی وقت سسرال پہنچا۔ وہاں آدمیوں کا ٹھٹ لگا تھا کہ میت ہو گئی ہے۔

کچھ سوچ کر واپس چلا گیا۔

ہم نے لڑکی کو نہیں بھیجا کیونکہ کہہ کر گیا تھا: 'نظر آئی تو شوٹ کر دوں گا۔'

''سسرال سے گھر تک ڈولی بھر کا تو فاصلہ ہے ہی۔ مسجد پورے محلے کی ایک ہے۔ یہ دونوں جیسے پہلے پڑھتے آئے تھے اگلے جمعہ کی بھی پڑھنے گئے۔ ایک دن کا تو بیچ تھا ہی۔ کپتان تھا نمازی، روزے رکھنے والا۔ پر اس سے نہیں ڈرتا تھا جس کو سجدہ کرتا تھا۔ اوپر کی منزل سے یہ کام کرے گا سوچ کے گیا ہوگا۔ فرض پڑھ کر گھر گیا اور کھڑکی میں دو نالی بندوق لے کر بیٹھ گیا۔ ایک نکلا: ٹھیں، دوسرا نکلا: ٹھیں، دو زخمی ہوئے۔ لوگ مسجد میں دبکے بیٹھے تھے۔ پولس کو خبر ہوئی انہوں نے آ کر گھر کو گھیرے میں لے لیا۔ پڑوسیوں کی چھت پر بھی چڑھ گئے۔ کوئی گھنٹہ بھر گولیاں چلیں۔ اس کے بعد اندر سے ان کا جواب آنا بند ہوگیا۔ کھڑکی پر بھی گولیاں چلائیں اُن کا بھی جواب نہیں دیا۔

جب سپاہی پڑوس کی چھتوں سے کود کر صحن میں اترے تب بھی خاموشی رہی۔ جواب کون دیتا، اندر تو وہ کھڑکی کی دہلیز پر بیٹھا تھا، گولی کی نال جبڑے کے نیچے تھی۔ خون بہہ کر دیوار کو تر کرتا کرتا فرش تک پہنچا تھا وہ دیکھو لو۔'' تملیذ کو ہمیشہ یاد رہا دیوار پر جہاں سے جما ہوا خون دھو دیا گیا تھا نہ کوئی مکھی بیٹھی تھی نہ وہاں سے کوئی بو آ رہی تھی۔ اس نشان کو دیکھ کر اُسے خیال آیا تھا: 'کتنا بہادر آدمی تھا! اتنوں کو مار دیا اور اپنے کو مارنے سے بھی نہیں ڈرا۔'

بعد میں تملیذ نے اس آدمی کو بھی دیکھا جس کے کان کو پھاڑتی ہوئی گولی نکل گئی تھی۔ اس کی اِملی کے کونلے اور لکڑی کی نال تھی۔

راجدھانی کے اسکول کے دنوں میں جن چیزوں کے بارے میں لڑکے بحث کرتے تھے اور جو ڈبیٹ کا موضوع رہتی تھیں 'قلم زیادہ طاقت ور ہے یا تلوار'، 'مغربی تہذیب مشرقی تہذیب سے بہتر ہے' ان میں سے ایک یہ بھی تھی 'خودکشی بہادری ہے یا بزدلی؟'

تملیذ ڈبیٹر نہیں تھا لیکن اُسے اکثر خیال آتا تھا 'کپتان کے سالوں نے اس کے حکم کے خلاف کام کیا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں آکر اپنی بہن کو لے گئے۔ اگر وہ اس کا بدلہ نہ لیتا تو کیا تھا۔ بزدل؟'

(۲)

قسمت سے ملنے والا پیسہ تمیز نے زندگی میں پہلی بار اس دن دیکھا تھا جب غنی پور میں اسکول سے واپس آتے ہوئے ایک املی کے پیڑ کے نیچے کسی چیز کو چاروں طرف سے گھیرے لوگوں کا مجمع کا مجمع اسے نظر آیا تھا۔ مجمع میں سے اپنے لیے جگہ پیدا کرتا ہوا جب وہ اندر پہنچا تو وہاں اسے ایک ٹھیلا نظر آیا جس کے گرد لوگ جمع تھے۔ وہاں جو کھیل ہو رہا تھا اس میں کھلاڑی بس تین چار تھے باقی تماشائی تھے۔

ٹھیلے والا ان سے اکنی، دونی، چونی جو بھی دیں، لے کر نمبر پوچھتا تھا اور ایک چکر کو ہاتھ سے گھماتا تھا جس کے باہر کے چکر پر نمبر لکھے تھے لیکن باہر کا چکر اپنی جگہ سے ہلتا نہیں تھا۔ ٹھیلے پر چاروں طرف قسما قسم کی چیزیں سجی تھیں — جاپانی سیلولائیڈ کے کھلونے، دھوپ کے چشمے، فریم میں جڑی ہوئی ایکٹریسوں کی تصویریں، پاؤڈر کے ڈبے، سینٹ کی شیشی۔ اندر کے چکر میں کیرم بورڈ کی طرح کی ایک جیب سی تھی جس میں وہ داؤں پر لگانے والے پیسے ڈال دیتا تھا۔

ایک دفعہ اس نے چکر کے رکنے پر کہا: ''لو میاں جی آپ کی قسمت کا ہوا ہے۔'' دوسری دفعہ پیسہ لگانے والے سے کہا: ''چوک گئیں۔ اب دونی لگاؤ۔ قسمت تمہاری کھلنے والی ہے۔'' پھر ایک پیسہ لگانے والے کو ایک ایکٹریس کی تصویر تھما کر بولا: ''شانتا کماری آپ کی ہیں، سینے سے لگا کر گھر لے جاؤ۔''

لوگ ہنس رہے تھے سوائے پیسہ لگانے والوں کے۔ ان کے چہروں کی کھال تنی ہوئی تھی اور چکر کے گھمائے جانے پر لمحے بھر کو سرخ پڑتی تھی اور اس کے رکنے پر، ہر بار نہیں زیادہ تر، سفید ہو جاتی تھی۔ ایک آدمی ہر بار اکنیاں دونیاں داؤں پر لگاتا تھا اور ٹھیلے والا ہر بار وہی جملے دہراتا تھا: "کچھ نہیں" اور "پیسے لگاؤ، قسمت کھلنے والی ہے۔" مگر اس کی دفعہ میں گھومنے والے چکر کا تیر ہر بار بڑے دائرے کے اُن خانوں میں سے کسی کے سامنے جا کر ٹھیرتا تھا جن پر کٹ کا نشان بنا تھا اور ایسے خانے کمید نے فوراً ہی بھانپ لیا تعداد میں ان خانوں سے کہیں زیادہ تھے جن پر نمبر ڈالے تھے۔ لیکن ٹھیلے والے کی اس دھاندلی پر کسی کی نظر نہیں تھی — نہ کھیلنے والوں کی، نہ تماشہ دیکھنے والوں کی۔

بار بار ہارنے والا انگوچھے سے گردن اور اپنی ٹانٹ پونچھے جا رہا تھا۔ جب ایک بار اور وہ پیسہ لگانے سے جھجکا تو مجمع سے ایک نوجوان نے جیب سے چونی نکال کر تختے پر رکھی اور پکار کر بولا: "نمبر آٹھ۔"

ایک دم اتنی بڑی رقم جس میں آدمی آدھ سیر قلاقند کھا سکتا تھا یا ایک سیر بکری کا گوشت خرید سکتا تھا!

ٹھیلے والے نے بھی پکار کر کہا "آٹھ نمبر۔"

جو چیز اسے ملی وہ سنہرے کاغذ میں لپٹی ہوئی ایک مستطیل پڑیا تھی۔ اس نے پیکٹ کو ہاتھ میں لے کر کہا: "اس کا میں کیا کروں گا؟"

کسی نے کہا: "لے جاؤ، تمہاری بیوی کے کام کی ہے۔"

اس نے سرخ پڑتے ہوئے کہا: "میری شادی نہیں ہوئی ہے۔"

"تو کر لو۔ اسے پہلی رات دے دینا۔" لوگ ہنسنے لگے۔

کم عمر نوجوان نے پیکٹ جوا کھلانے والے کو واپس دے کر کہا: "میں نے چونی دی تھی، تین چانس اور دو۔ میں نے پوری چونی ایک نمبر پر نہیں لگائی تھی۔"

ٹھیلے والے نے کہا: "یہ چونی کا انعام ہے۔" لوگ بھی سمجھانے لگے: اکنی پر کھلوتا نکلتا، دونی پر

دھوپ کا چشمہ یا آئینہ، چونی پر تصویر، سینٹ یا یہ چیز جو تمہیں ملی ہے۔ ہڑتال۔

''جوا کھلوا رہے ہو اور اس میں بھی دھوکا۔ گناہ میں گناہ۔'' نوجوان نے جھلا کر کہا۔

''گناہ کاہے کا میاں جی'' ٹھیلے والے نے لجاجت سے کہا: ''میری روزی ہے۔ تمہارا جی نہ چاہے مت کھیلو۔''

تمیذ کی سمجھ میں نہیں آیا داؤں پہ چونی لگانے والے کو کیا چیز ملی تھی اور کیوں اس نے اُسے لینے سے انکار کر دیا۔ وہ سنا ہوا لفظ اُسے یاد رہا لیکن اس کی وضاحت نہ اس نے ماں سے چاہی نہ کسی اور سے۔

اگلے دن جب تمیذ ماں کی صندوقچی سے نکالی ہوئی ایک اکنّی لے کر اسکول سے واپسی پر اس املی کے پیڑ کے نیچے پہنچا جہاں کل بھیڑ لگی ہوئی تھی تو اُسے وہ جگہ خالی نظر آئی۔ اُس جگہ وہ آدمی بیٹھا سستا رہا تھا جو ہارمونیم جیسے ڈبے میں کھلوں کھلوں پھر کر آئس کریم بیچا کرتا تھا۔ اس کے محلے میں بھی آتا تھا۔ اس ڈبے میں آئس کریم کا ایک لمبا گول ڈھیما ہوتا تھا، موٹے کپڑے میں لپٹا ہوا۔ پیسہ دیئے جانے پر وہ بکس کھولتا، آئس کریم پر سے کپڑا اٹھا کر چھری سے ایک سلائس کاٹ کر ڈھاک کے پتے پر رکھ کر گاہک کو دے دیتا۔

تمیذ نے پوچھا: ''جو ٹھیلے والا یہاں کل کھلونے بیچ رہا تھا آج نہیں آیا؟''

آئس کریم والے نے کہا: ''کھلونے نہیں بیچ رہا تھا جوا کھلوا رہا تھا۔ پولیس پکڑ کر لے گئی۔''

تھوڑی دیر سوچ کر کہ وہ روزی کے لیے پکڑا گیا یا جوے کے، تمیذ نے اکنّی پکڑاتے ہوئے کہا: ''آئس کریم دو۔''

''ختم ہوگئی۔ اکنّی کیا چرا کر لائے ہو؟''

(۳)

جو گھڑیاں کبھی بھلائی جانے والی نہ تھیں ان میں وہ تھیں جو مینی پور کی زندگی سے متعلق تھیں اور وہ بھی جو راجد ھانی میں گزارے ہوئے دنوں کی تھیں۔ مینی پور کے دن بچپن کے دن تھے جو چاہے کتنے ہی دکھ اور تکلیف سے بھرے ہوں بڑے ہونے تک کے عمل میں یاد آنے پر خوبصورت بن جاتے ہیں۔ تمیز بھی لوگوں کو اپنی روداد سناتے ہوئے جس کا وہ ہمیشہ شیدا رہا، ہنس ہنس کر بتاتا کیسے شرارتوں پر ابا کے ہاتھ سے پٹتا تھا۔ تیرنا آتا نہیں تھا مرغابی کے بچے کو پکڑنے کے لئے ڈبہر[1] میں اتر گیا تھا اور دو چار غوطے کھانے پر جب نکالا گیا تو باپ نے بجائے محبت دکھانے کے کان کھینچے تھے۔ اور اپنی بے وقوفی میں ایک دن ایک جوان لڑکی سے کیا فرمائش کر بیٹھا تھا۔ باپ کی فطرت کی جلادی وہ حذف کر جاتا تھا۔

لیکن لڑکپن کے بعد کے دنوں کا حال وہ اتنی صاف گوئی سے نہیں بتا پاتا تھا۔ ان میں بہت سے واقعات ایسے تھے جن کا بیان کرتے ہوئے اس کی آواز رندھ جاتی تھی۔ مثلاً گھر سے ایک طرح سے نکالے جانے پر اس کا راستے بھر رونا۔

وہ وقت اس کے سامنے اکثر آ کھڑا ہوتا جب ایک دوپہر وہ ڈرا سہما راجدھانی میں بڑی بہن کے گھر وارد ہوا تھا۔ ساتھ میں جستے کا ایک ٹرنک تھا جسے نوکر نے سر پر اٹھا رکھا تھا۔ دوسری

[1] تالاب

چیز وہ گٹھری تھی جس میں سنگھاڑے اور شکر قندیاں تھے۔ اُسے نوکر اپنے ہاتھ میں سنبھالے ہوئے تھا، کبھی ایک میں کبھی دوسرے میں۔ ساتھ میں ناشتے دان نہیں تھا جو پہلے ہر سفر میں ساتھ جاتا تھا۔ شامی کباب اور پراٹھوں سے بھرا جس پر بچے ٹرین کے چلتے ہی ٹوٹ پڑتے تھے۔

اس نے آپا جان کو وہ لفافے میں بند خط جیب سے نکال کر دیا جو ابا نے ان کے لیے بھیجا تھا۔ خط پڑھ کر آپا جان نے نوکر کو وہ جگہ دکھائی جہاں ٹرنک رکھا جاتا تھا اور خود اس کے ہاتھ سے گٹھری لے کر باورچی خانے میں رکھنے چلی گئیں۔ ایسی سوغاتیں ان کے لیے مینی پور سے برابر آیا کرتی تھیں۔

اس وقت کے یاد آنے پر وہ دل ہی دل میں کہتا: "نہ آپا جان کو خیال آیا یہ سفر کے بعد بھوکا ہوگا نہ اُن کے باپ نے آٹھ پیسے ہفتہ جیب خرچ مقرر کرتے وقت سوچا اتنے پیسوں میں راجہ حافی جیسے بڑے شہر میں کیا خرید کر کھایا کرے گا؟ ایک پیسے میں تو اس مہنگے شہر میں مونگ کی بھنی دال بھی نہیں ملتی ہے۔ دہی پھلکی کی پلیٹ تو بڑی بات ہے۔"

اُسے پیٹ بھرنے کے لیے ان کی رخصت کرتے وقت کہی ہوئی بات یاد رہی: "وہاں ایسے رہنا کہ نہ تمہاری آپا جان کو شکایت کا موقع ملے نہ بھائی جان کو۔"

اس پہلے دن دفتر سے واپسی پر سپرنٹنڈنٹ صاحب کی نظر جب سالے پر پڑی تو انہوں نے بیک وقت اس کے سلام کا جواب بغیر کسی جوش کے دیا اور بیوی سے بولے "اچھا تو یہ آ گئے!"

"جی" انہوں نے ویسے ہی لہجے میں کہا۔

سائیکل کو گودام میں کھڑی کر کے وہ جھاڑن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر نکلے۔ تمیز وہیں کھڑا تھا

جہاں انہوں نے اسے چند منٹ پہلے چھوڑا تھا۔

''کتابیں کاپیاں ساتھ لائے ہو یا چھٹیوں کی طرح ہاتھ ہلاتے ہوئے آ گئے ہو؟''

''جی سب لایا ہوں۔ وہاں کا اسکول سرٹیفکیٹ بھی۔'' تمیذ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ وہ حیران تھا کہاں آ گیا ہے۔

آپا جان اپنے میاں کے سامنے شام کے ناشتے کا سامان رکھ رہی تھیں۔ بھانجے، بھانجیاں یہاں وہاں تھے۔ کسی کو اپنے ماموں جان میں دلچسپی نہیں تھی۔ 'ایسا تو پہلے نہیں ہوتا تھا۔'

کچھ کھانے سے پہلے بھائی جان نے اچانک دوسرا وار کیا ''یاد رکھنا یہاں پڑھنے کے لیے بھیجے گئے ہو۔ دن بھر کھیلنے کے لئے نہیں؟''

ناشتے سے فارغ ہوکر بہنوئی نے بچوں کو پڑھنے کے لیے بیٹھ جانے کا حکم دیا، عصر کی اذان آنی شروع ہوئی، انہوں نے تمیذ سے کہا ''تم بھی کتابیں نکالو اور پڑھنے بیٹھ جاؤ۔ مسجد سے آ کر دیکھوں گا تم پڑھائی میں کیسے ہو، یا وہاں ڈنڈے بجاتے رہے ہو۔''

جب وہ عشا کی نماز سے گھر لوٹے کھانا لگ گیا تھا۔ تمیذ سفر اور دوپہر اور شام کی بھوک سے اونگھ رہا تھا اور وہ خود بھی تھکے لگ رہے تھے۔

دستر خوان سے اٹھتے ہوئے انہوں نے تمیذ سے کہا ''صبح جلدی اٹھ کر تیار ہو جانا۔ کتابیں، کاپیاں، سرٹیفکیٹ ساتھ لے لینا۔ اسکول چلنا ہے۔''

تمیذ نے بمشکل سنائی دینے والی آواز میں کہا ''جی اچھا''

اس وقت سے لے کر جب وہ سونے کے لیے لیٹا اس کے دماغ میں ایک ہی خیال تھا:

'نہ یہ وہ آپا جان ہیں، نہ بھائی جان یہ کوئی اور ہی لوگ ہیں۔'

اسکول میں داخلے کے بعد، روز تو نہیں، بہنوئی نے اپنے فالتو وقت کا، جو اتوار کے دن

زیادہ ہی ہوتا تھا، یہ مصرف نکالا کہ وہ تلمیذ سے اپنی کتابیں کاپیاں لانے کو کہتے۔ کاپیوں کو چیک کرتے: ہوم ورک پر ٹیچرز کے کیا ریمارکس ہیں۔ گند وغیرہ کو وہ نظر انداز کر جاتے، جہاں غلطی نظر آ جاتی اس پر تلمیذ کو غضب ناک نظروں سے دیکھتے جو اُن کے برابر میں ماتحت کی طرح ایستادہ ہوتا۔ اسی کی طرح کانپتا ہوا۔

پھر انہوں نے انگلش گرامر کی غلطیوں پر اُسے مارنا شروع کیا جس میں وہ کسی بھی انگریز سے کم نہیں تھے۔

دوسرا حملہ ان کا ارتھمیٹک (حساب) کے محاذ پر ہوتا تھا جو تلمیذ کے پیر اکھاڑ دیتا تھا۔ لگتا تھا ان کا غصہ سالوں سے ان کے اندر دفن تھا جسے شاید بیوی کے دبدبے نے ان کے اپنے بچوں پر نہیں نکلنے دیا تھا۔ اب اُس پہاڑ سے اترنے والی پرخروش ندی کو تلمیذ بہا لے جانے کے لیے مل گیا تھا۔ آپا جان نے کبھی ایک دفعہ بھی اس کی طرف داری نہیں کی۔

وہ فرش پر پھینکی ہوئی کاپی اٹھاتا اور میز پر پھیلی ہوئی کتابیں سمیٹ کر بیٹھک سے نکل آتا۔ مگر کسی نے ایک دن بھی اس کی آنکھوں سے آنسو نکلتے ہوئے نہیں دیکھے۔ وہ جلد جان گیا تھا آنسوؤں کا نکلنا یہاں بے فیض ہوگا۔

نیئی پور سے راجہ حانی پہنچ جانا ایسا تھا جیسے کنویں کے مینڈک کو اچانک دریا میں پھینک دیا گیا ہو۔ پہلے دن وہ بڑی بہن کے گھر میں بھی سہا سہا رہا اور اسکول میں بھی۔

بہن کے گھر آ کر بہت سی آزادیاں چھن گئیں پھر بھی وہاں کے سارے چہرے پہلے سے دیکھے ہوئے تھے۔ لیکن راجہ حانی کا یہ اسکول ایک دوسری ہی دنیا تھی۔ لباس میں اور بول چال میں دونوں اسکول ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے تھے۔

نیئی پور میں اسکول میں داخلے سے پہلے بھی وہ کتنے ہی لڑکوں کو جانتا تھا جو بعد میں ہم جماعت بنے، اور وہاں کے ماسٹروں کو بھی: انہیں اس کے گھر آنے پر یا جب وہ سڑک پر نظر آ جائیں سلام کرتا آیا تھا۔ لیکن یہاں تو سب ہی نئے تھے اور بھانت بھانت کے۔

چند دن وہ کلاس میں لیے دیے رہا۔ وقفے میں سب باہر چلے جاتے وہ اکیلا وہیں بیٹھا رہتا۔ کوئی اس سے باہر چلنے کے لیے نہیں کہتا۔ انگریزی کے ٹیچر کسی ایک لڑکے سے کھڑے ہوکر سبق پڑھنے کے لیے کہتے۔ جس کی باری ہوتی وہ پڑھتا اور اگلی صف میں بیٹھا ہوا کوئی لڑکا موقع موقع سے کہتا جاتا: "mistake"، اس پر ٹیچر کسی لڑکے کا نام لے کر کہتے "Correct?"۔ اور وہ اس لفظ کو پڑھ کر دکھاتا۔ اسی طرح اردو کی کلاس میں ہوتا۔ غلط، درست؟ لیکن تمیز کے لیے وہ وقت سب سے زیادہ خوفناک بن گیا جب صحیح بتانے والے لڑکے کا تلفظ بھی غلط نکلتا۔ تب سب لڑکے کھل کر ہنستے اور تمیز کا جی چاہتا: بھاگ کھڑا ہو۔ اس اسکول سے بھی اور بڑی آپا کے گھر سے بھی۔

'اور کہاں جاؤں؟' دوسرا خیال ہوتا۔ 'نمنی پور؟'

'وہاں سے تو نکالا ہوا ہوں۔'

'اپنے باپ کے گھر سے نکالا ہوا لڑکا، جو چوتھی جماعت میں ہے کہاں جا سکتا ہے؟' اس بھیانک خیال کو لیے وہ سوتا اور اسے ہی لیے اگلے دن اسکول جاتا۔

بڑی بہن اور بھائی جان جب نمنی پور آتے تھے سراپا شفقت نظر آتے تھے۔ خالی ہاتھ بھی نہیں آتے تھے: اسے پاس بلا کر تحفہ دیتے۔ بہت سے پیار بھرے سوالات کرتے جو بچوں سے کیے جاتے ہیں، پھر بڑوں سے بات چیت میں لگ جاتے۔ لیکن راجدھانی کے اس گھر میں وہ بالکل اجنبی بن گئے تھے۔ بھانجے بھانجیاں بھی اس سے اتنے آزاد نہیں رہے تھے جتنے ان دنوں جب وہ چھٹیوں میں نمنی پور آتے تھے۔

آہستہ آہستہ اُن چہروں کے نام اُسے یاد ہوتے گئے جو اسکول میں اس کے اردگرد تھے۔ ٹیچرز کے بھی۔ کھیل کے میدان میں اتر کر لڑکے اُسے نام سے پکارنے لگے۔ کوئی پکارتا "تمیز گول کر"، اور وہ بھی انہیں نام سے پکارنے لگا۔

اگر پوچھا جاتا کس دن وہ پکی مٹی کا خول چٹخا تھا جو منکے کی طرح تمہارے دماغ بلکہ سارے جسم پر پہلے چڑھا ہوا تھا تو وہ نہ بتا پاتا۔ اُسے بس اتنا معلوم تھا وہ بھی اپنی سیٹ پر سے باری سے اردو یا انگلش سبق پڑھنے والے لڑکے کو mistake یا غلط کہہ کر ٹوک سکتا تھا اور پورے اعتماد سے بتا سکتا تھا صحیح لفظ کیا ہے۔

ہاکی میں جب کلاس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا جس کے حصے میں وہ آتا تھا وہ اُسے گول کرنے والا سمجھ کر خوشی سے لیتے۔

ان دنوں اس کی دوستی جن لڑکوں سے ہوئی اُن میں سے ایک کا نام اچھا تھا— اس کا نام حسن وارد تھا۔ دوسرے کا نام صبغت اللہ تھا۔ لڑکے اُسے صبغت کہہ کر پکارتے تھے۔ یا صبغو۔ پھر ایک لڑکا بے وجہ زیادتی پر اتر آیا اور اُسے صبغت الو کہنے لگا۔ لیکن ایک دن جب وہ اُسے صرف الو الو کہہ کر بات کر رہا تھا تو چھٹی ہونے پر صبغت اللہ نے اُسے گریبان سے پکڑ لیا۔ اس وقت تک زیادہ لڑکے باہر جا چکے تھے لیکن جو چند رہ گئے تھے وہ الو کہنے والے کے طرف دار بن گئے۔ تمیز نے اُن میں سے جو سب سے تگڑا تھا اُسے دھکا دے کر ڈیسک پر گرا دیا اور اس کے سر کو ڈیسک سے رگڑنے لگا۔ ایک اور لڑکا صبغت اللہ کا ساتھی بن گیا۔ حسن وارد پہلے ہی سے صبغت اللہ کا دوست تھا۔

یہ جنگ جاری تھی جب کسی نے کہا ہیڈ ماسٹر صاحب آ رہے ہیں۔ نیچا دکھانے والا لڑکا صبغت اللہ کی گرفت سے نکل کر اس طرح اٹھ کر باہر چل دیا جیسے اس کو کسی سے شکایت نہیں تھی۔ اس کے پیچھے وہ لڑکا بھی جس کا سر ڈیسک پر رگڑا گیا تھا۔ صبغت اللہ کا ساتھ دینے والے دوسرے لڑکے کا نام خرم دین تھا۔

آنے والے دنوں میں صبغت اللہ، حسن وارد، شروِن اور تمیذ ہر جگہ ساتھ نظر آنے لگے۔ اور جتنے دن ان کا ساتھ رہا تمیذ کو راجدھانی میں تنہائی کا احساس نہیں ہوا۔ نہ اسکول میں نہ شہر میں کہیں آنے جانے میں۔ وہ خود اسکول سے گھر جانے کے لیے لمبا راستہ لیتے تھے اور تمیذ کو بھی وہ راستے انہوں ہی نے دکھائے تھے۔ یہ کیا کہ اسکول ختم ہوا اور اچھے بچوں کی طرح ناک کی سیدھ میں چلتے ہوئے گھر پہنچ گئے۔ ان لمبے راستوں میں بہت سی دلچسپی کی چیزیں تھیں، دلچسپ مرد، عورتیں، دلچسپ جگہیں۔ پارک، سینما ہال، ناچ گھر۔ اسکول سے گھر پہنچنے میں لاکھ گھنٹہ بھر لگے مگر جو فرحت وہ سفر بخشتا تھا اس یکسانیت اور موت جیسی خاموشی کو بے حقیقت بنا دیتی تھی جو گھر پہنچنے پر اگلی صبح تک اس کا مقدر ہوگی۔

راجدھانی بالکل نئی دنیا تھی۔ وہاں سڑکیں اتنی چوڑی تھیں کہ ان کے دونوں طرف درخت تھے اور پھر بھی چلنے والوں اور سواریوں کے لیے بیچ میں بہت جگہ تھی۔ یہی نہیں بعض سڑکوں میں گھڑسواروں کے لیے علیحدہ راہداری تھی جس پر لکڑی کی چھیلن پڑی ہوتی تھی۔ وہاں ایسی گلیاں نہیں تھیں جن کے دونوں طرف کھلی نالیاں ہوتی ہیں۔ وہاں پارک تھے، سینما گھر، ریسٹورینٹ اور ایسی دکانیں جن میں شراب بکتی ہے۔ کھلے عام! نمی پور کی طرح نہیں جہاں شراب پینے والے تھے لیکن شراب کی دکانیں نہیں تھیں۔ پالکیاں اور ڈولیاں نہیں تھیں، تانگے، کاریں اور موٹر سائیکلیں تھیں اور بعض موٹر سائیکلوں میں جوڑی ہوئی ایک پہیئے کی گگی جس میں اس نے میموں کو بیٹھے دیکھا، موٹر سائیکل گورے صاحب چلا رہے ہوتے تھے۔ نمی پور میں

گورے صرف گزرتی ہوئی ٹرین کی کھڑکیوں میں نظر آتے تھے یا پلیٹ فورم پر۔ سب سے عجیب بات جو تھی وہ سفید مرد عورتوں کا دیسی لوگوں کے درمیان چلنا پھرنا تھا۔ سب سڑکوں پر نہیں، جو نئی راجدھانی کی تھیں۔ یہ کتنا تعجب خیز امر تھا کہ شہر کا ایک حصہ نئی راجدھانی کہلاتا تھا، باقی سارا شہر راجدھانی۔ براڈوے جیسی پر رونق سڑکوں پر عورتیں بغیر پردے کے بھی نظر آتی تھیں۔ کھیتوں میں کام کرنے والی اور کاچھنیں نہیں، شلوار قمیص اور ساڑیوں والی، جن کے کپڑوں سے پسینے کی بو نہیں خوشبو آتی تھی۔ وہیں اس نے زندگی میں پہلی بار سکھ دیکھے۔ عام ہندوستانی مردوں سے مختلف۔ لیکن ان کی عورتیں اگر مرد ساتھ نہ ہوں تو انہیں پہچاننا ناممکن ہوتا کہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ 'یہ سر کے بالوں کو، اپنے مردوں کی طرح، چھپانے کے لیے پگڑی کیوں نہیں باندھتی ہیں؟ اگر باندھا کریں تو کنگھا کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ بال پگڑی میں چھپ جائیں گے۔ جیسے ان کے مردوں کے، مگر اس سوال کو تمیز نے اپنے منہ سے نہیں نکلنے دیا۔ سب ہنسیں گے۔ بعد میں اس نے جاہلوں کی طرح انگریز عورتوں کو میم صاحب اور ان کے مردوں کو گورے صاحب کہنا چھوڑ دیا۔ سب انگریز بن گئے۔ انگریز مرد، انگریز عورت۔

بڑی بہن کے گھر کا ایک کمانچہ پڑھنے کے لیے وقف تھا جس میں تین لمبے اسٹول، جنہیں تختیں کہنا درست ہوگا، ایک دوسرے سے لمبائی میں جوڑ کر بچھائے گئے تھے۔ وہ ڈیسک کا کام دیتے تھے، مشترک ڈیسک کا، اور پڑھائی کے وقت ڈیسک کہلاتے تھے۔ ان کے دونوں طرف پڑھنے والے فرش پر بیٹھتے تھے۔ وہ لالٹینیں اس طرح رکھی جاتی تھیں کہ تینوں ڈیسکوں کو روشنی دے۔

جب تمیز اس گھر میں پرانا ہو چکا تھا کبھی کبھی جھک کر لالٹین کی گرم ٹوپی سے اپنے سر کے بال چھواتا اور ان کی چرائند جھیلتی۔ بھانجے بھانجیاں جو برابر میں ہوں کھل کھلا کر جسم دور

کی طرف لیجاتے۔ ماموں کا یہ عمل ان کے نزدیک بہادری کی دلیل تھا۔ ماں کے پوچھنے پر 'مجھے کیوں؟' وہ یا تو خاموش رہتے یا کہتے 'ماموں نے آج اپنے اسکول کا ایک لطیفہ سنایا تھا وہ یاد آ گیا۔'

لیکن جب کھانے کے لیے کتابیں کاپیاں سمیٹی جاتیں تو ایک لالٹین گل کر دی جاتی کیونکہ کھانے کے لئے اتنی روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ دوسری اٹھا کر ایک اونچے اسٹول پر رکھ دی جاتی جہاں سے مری مری روشنی ان اسٹولوں پر پھیل جاتی جن پر اب دستر خوان بچھا ہوتا تھا۔ لڑکیاں باورچی خانے سے لالا کر رکابیاں تشتریاں، کٹورے پیٹیوں پر رکھ دیتیں — اب وہ کھانے کی میز یا دستر خوان ہوتیں۔ ذرا فاصلے پر جو چوکی بچھی تھی اس پر آپا جان کا دستر خوان بچھتا۔ وہاں جو بھی پکا ہو اس کی بڑی پتیلی آ جاتی اور موٹے کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں۔ وہاں سے رسد پیٹیوں کو پہنچتی۔ اگر بھائی جان گھر میں ہوں تو وہ بھی چوکی پر کھاتے تھے۔
کبھی کبھی آپا جان، اگر بچوں کے ساتھ کھا رہی ہوں تو بے وجہ اپنے کسی بیٹے کو کہتیں 'سالن کم لو۔ زیادہ سالن کھانے سے برکت اٹھ جاتی ہے۔'
تمیز سر جھکائے کھانے میں مصروف رہتا۔ سالن کیسا تھا، کتنا تھا اس کی فکر کرنا اس نے جلد چھوڑ دیا۔

گھر میں شاید ہی کوئی برتن شیشے کا تھا — سوائے دو بلوری رنگ کی برنیوں کے جو کارنس پر بجی تھیں اور اندر سے خالی تھیں۔ کارنس کے بیچ میں ایک لمبی بوتل کھڑی تھی جس کے تنگ گلے میں سے نجانے کس طرح ایک گلدستہ اتار دیا گیا تھا جو شیشے کے چھوٹے سے گلدان میں چھوٹی سی میز پر رکھا تھا۔ سالوں بعد تمیز سمجھ پایا وہ خالی بوتل جونی واکر کی تھی۔ لیکن میز اور گلدان اس کی گردن میں سے کیسے گزارے گئے تھے یہ معمہ رہا۔

کمرے میں اور بھائی جان کی بیٹھک میں دو اور چیزیں شیشے کی تھیں — طغرے، ایک وہ جس میں بشر کے راز دل کہہ کر ذلیل و خوار ہونے کی تنبیہہ کی گئی تھی اور دوسرا **بَلَغَ الْعُلیٰ بِکَمَالِہٖ** والا جو نینی پور میں اس کے گھر میں بھی تھا۔

اُسے بہنوئی کی داڑھی جتنا جلاتی تھی اتنا ہی بڑی بہن کا دیگچی کا ڈھکنا کھول کر ایک ایک بیٹے کو نام لے کر پکارنا۔ پھر وہ روٹی کا نوالہ سالن کی سطح پر پھرا کر اس کے منہ میں دے دیتی تھیں۔ وہ منہ چلاتا ہوا وہاں سے بھاگ جاتا۔ پھر دوسرے بیٹے کا نمبر آتا۔ اس کے بعد تیسرے کا۔ اتنی دیر تمیز خود کو بیٹا محسوس کرتا۔ وہ ان پہلے لقموں کا مستحق نہیں تھا۔ مگر اپنی عزت جو اس کے دماغ میں تھی اس نے کبھی بڑی آپا سے یہ پوچھنے نہیں دیا اس پہلے لقمے میں کیا ہوتا ہے جو صرف آپ کے لڑکوں کے لیے ہوتا ہے؟ نہ ہی خود ان لڑکوں سے کبھی اس نے پوچھا۔

رات کو جب سب سو چکے ہوتے تھے اور وہ جاگ رہا ہوتا تھا اُسے لگتا تھا، اور ایسا کئی بار ہوا تھا، یہ پورا بڑا شہر، انگریزوں کی راجدھانی اس کی پہنچ میں ہے۔ یہاں کی سڑکیں، پارک اور شاہی عمارتیں جن کا ذکر اس نے کورس کی کتابوں میں پڑھا تھا اس کے چاروں طرف میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں اور اُن میں جگہ جگہ رشتے داروں کے گھر ہیں، جہاں سے بہت کم کوئی یہاں بڑی کے گھر میں آتا ہے۔ اُن میں سے بہت سوں کو وہ نینی پور میں دیکھ چکا تھا اور کچھ کے گھر بچپن، لڑکپن میں ماں کے ساتھ گیا تھا۔

'بڑی بہن ان رشتے داروں کے گھر بلاوا آنے پر جاتی ہیں، کبھی بچوں کے ساتھ کبھی وہ اور بہنوئی جاتے ہیں۔ میں گھر کا پہرہ دینے کے لیے اکیلا رہ جاتا ہوں۔ شاید اسی کام کے لیے مجھے یہاں رکھا گیا ہے۔

ان محلوں میں تایا ابا کا گھر بھی ہے، میرا دیکھا ہوا۔ لیکن نہ انہوں نے کبھی مجھے بلایا نہ کبھی مجھے دیکھنے آئے کہ زندہ بھی ہوں یا مر گیا۔

اور ان کے گھر میں وہ لڑکی بھی ہے — دنیا کا خوبصورت ترین چہرہ رکھنے والی لڑکی، تسنیم۔ کیا ہوا کہ میں جاگ رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے وہ بھی جاگ رہی ہو۔ راجدھانی کی ہوا میں اس کی سانسیں بھی ہیں اور میری بھی۔'

(۴)

نینی پور کی جس فضا کو چھوڑ کر تلمیذ راجدھانی گیا تھا ساlوں اُس پر اس کی حکمرانی رہی۔
راجدھانی کی ہر چیز خراب تھی، نہ لوگ اچھے تھے، نہ وہاں کا کھانا پینا۔ نینی پور میں گرمی لگ رہی ہو جاؤ جا کر تلیا میں ڈبکی لگاؤ۔ کسی کے کھیت سے توڑ کر گاجریں کھالو گنے چوس لو کچھ نہیں کہے گا۔ لوگ سیدھے تھے، گناہ نا آشنا۔

'ہاں کچھ ایسے ویسے بھی تھے جیسے وہ آدمی جس کے بارے میں سب جانتے تھے اُسے بچوں کو علیحدگی میں لے جا کر دکھانے کا شوق تھا۔' وہ سوچتا: 'اگر وہ مر گیا ہو تو کیا میں اس کی بھی بخشش کی دعا کروں گا؟'

پھر جیسے آسمان سے اس سوال کا جواب اتر آتا 'نہیں اس کی بخشش کی دعا کبھی نہیں مانگوں گا۔'
پھر دماغ نینی پور کی کوئی اور خوبی ڈھونڈ نکالتا۔

وہاں شراب کی اتنی برائی تھی کہ اس پیسے کی بھی نہیں تھی جس کا مقروض نینی پور کا ہر کسان تھا۔ سب کہتے تھے 'اس کے گھر اور کنبے پر نحوست برستی ہے کیونکہ وہ سود کھاتا تھا اور اپنے بچوں کو کھلاتا ہے۔' شروع میں وہ سمجھتا تھا 'سود بھی ان چیزوں میں سے ہے جسے نہیں کھانا چاہیے۔ پھر؟ وہ اپنے بچوں کو اُسے کیسے کھلاتا ہوگا؟'

لیکن اس سے زیادہ برائی اُس کابلی پٹھان کی تھی جس کے لیے لڑکے کہتے تھے پیاز کا

کام کرتا ہے۔

یہی بات ایک دن میں نے ابا سے کہی تھی: "اتنے لوگ پیاز بیچتے ہیں، انہیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ ہمارے اسکول کے لڑکے اجون خان کو پیاز والا پیاز والا کہہ کر کیوں چھیڑتے ہیں؟"

ابا نے پوچھا "پہلے نہیں اس نام سے چھیڑتے تھے؟"

"ہمارے اسکول میں وہ تیسری جماعت سے آیا ہے۔ پہلے وہ لوگ کہیں اور رہتے تھے، پہلے دن جب اس سے ماسٹر صاحب نے پوچھا تھا: "تمہارے باپ کیا کرتے ہیں؟" اس نے کہا تھا "پیاز کا کام کرتے ہیں۔" اس پر ماسٹر صاحب ہنسے تھے۔ پھر سب لڑکے ہنسنے لگے۔

تب تک میں ابا کا چہیتا بیٹا تھا، ان سے ڈرتا نہیں تھا۔ میں نے ان کی گردن میں بانہیں ڈال کر کہا۔ "ابا وہ کیوں اس پر ہنستے ہیں؟"

ابا نے کہا "اب دیکھنا جب اس کا باپ گھر سے نکلتا ہے اس کی بغل میں کیا ہوتا ہے؟"

"کیا ہوتا ہے؟" میں نے کہا۔

"ایک کاپی جس میں وہ لکھتا جاتا ہے کس نے اس سے کتنے روپے قرض لیے۔ کتنا اس پر ہر مہینے سود بنا اور جو سود بنا اس کو ملا کر اور کتنا سود بنا۔"

تب تک مجھے اسکول میں سود در سود نہیں پڑھایا گیا تھا اس لیے میں ان کی بات نہیں سمجھ سکا۔ ہاں دل میں سمجھا کہ یہاں بھی سود کھانے اور اسے بچوں کو کھلانے کا معاملہ ہے۔

ابا نے کہا "وہ کاپی اس کی روزی ہے۔ جسے اس کا بیٹا پیاز کہتا ہے اور اگر وہ مر جائے تو اس کا بیٹا لوگوں سے قرض وصول کرتا پھرے گا۔ اس لڑکے سے دوستی مت کرنا۔ نہ کبھی اس کے گھر کا کچھ کھانا پینا۔"

مجھے بھی وہاں شراب کی برائی اتنی تھی کہ کسی اور چیز کی نہ ہوئی۔ گھر میں، اسکول میں، دینیات کی کتابوں اور رسالوں میں۔ اتنا ذکر تو نہ قتل کا تھا نہ چوری کا۔ اور واقعی کسی لڑکے بڑوں وغیرہ کو کیا آگے چل کر وہ قتل کرے گا، ڈاکہ ڈالے گا، جوا کھیلے گا۔ شراب سب کو ڈراتی تھی۔ وہ ایک خیال خوشی سے میرے بھی دماغ میں آتا تھا اور اپنا نشان چھوڑ کر گزر جاتا تھا آخر وہ ہوتی کیا ہے؟

بڑی بہن کے گھر راجد حانی بھیجے جانے سے بڑی سزا تلمیذ کو نہیں دی جا سکتی تھی، گھر والی آزادی وہاں پہنچ کر ختم ہو گئی۔ اپنے گھر جب جی چاہا، جہاں جی چاہا، پڑ کر سو رہے۔ چلتے پھرتے جب جی چاہا منہ جھٹال لیا، ماں کی لوہے کی صندوقچی کو کھٹکھوڑا۔ پیسے نکل آئے ان کا کچھ کھا لیا۔ اسے چوری نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کپڑے تھوڑی دیر میں میلے کر لیے، کوئی بات نہیں، دوسرے موجود ہیں۔

بڑی بہن کے گھر رہتے ہوئے اس نے پیسے کی اہمیت سمجھی اور اُسے پیدا کرنا سیکھا۔ اُن کے یہاں اس کے لئے ایک اپنی چارپائی تھی، صرف اپنی چارپائی جیسے اچھوت ہو۔ کسی اور کی نہیں — جس پر پڑ کر سو رہے۔ ایک پیسہ روز کے حساب سے جیب خرچ ملتا تھا، جسے بعد میں اُسے پتہ چلا پوکٹ منی کہتے ہیں۔ بہنوئی ہر آٹھویں دن دوئی دیتے ہوئے کہتے تھے:

"یہ دوئی نہیں روپے کا ۱/۸ ہے۔ دوسروں کو اتنے بھی نہیں جڑتے جیب خرچ کو۔"

لگتا تھا وہ ۱/۸ روپیہ ان کی جیب سے آتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے ذری زبان سے کہا تھا: "بس اتنے؟" بہنوئی نے بھنّا کر کہا: "ابا جان بس اتنے بھیجتے ہیں جیب خرچ کے لئے۔"

اُس گھر میں کپڑے روز نہیں بدلے جا سکتے تھے کیونکہ بڑی آپا بتا چکی تھیں: "یہاں کوئی ملازمہ کپڑے دھونے اور استری کرنے کے لئے نہیں ہے۔ جو پہنو تین دن چلاؤ۔" ان کے گھر میں اس نے پہلی بار دھلائی کا رونا سنا — جو تلمیذ کے آ جانے سے دگنی ہو گئی تھی۔

ایک اور بات جو راجد حانی میں آ کر تلمیذ کو معلوم ہوئی یہ تھی یہاں کا سیر نینی پور کے سیر سے کم ہے اور ہر چیز تل کر ملتی ہے، نینی پور کی طرح نہیں جہاں تربوز وغیرہ دیکھ کر ملتے تھے اور پان ڈھولی کے حساب سے۔ پان سے اُسے سروکار نہیں تھا، کھانے کی چیزوں کا یہ نرخ اُسے اپنے خلاف نظر آیا۔

بے وقت بھوک لگنے کے لئے جب وہ گھر جاتا تھا ماں سے لڑ جھگڑ کر کچھ پیسے بٹور کر لاتا تھا۔ اس میں مید بقرعید پر اضافہ ہو جاتا تھا یا اگر بھولے سے کوئی رشتے دار راجدھانی آتا اور چلتے وقت بچوں کو کچھ دیتا تو تمیز کی آمدنی میں بھی کچھ اضافہ کر جاتا۔ اس کے لئے اماں کا ہاتھ بھی ابا نے تنگ کر رکھا تھا: ''پیسے دے کر اسے بگاڑو گی۔''

لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا تمیز کو لگنے لگا اس کے ساتھ پیٹ میں بھوک جمع ہوتی گئی ہے اور اگر اس نے اسے نہیں بجھایا تو وہ اسے جلا ڈالے گی۔

اسے ماں باپ پر غصہ دن رات آتا ''مجھے یہاں بھیج کر کس بات کا بدلہ لیا ہے؟ باقیوں کو گھر سے نہیں نکالا۔ کیا میں ان کی سوتیلی اولاد ہوں!''

پہلی بار اس سوال کے آنے نے اس کے وجود کی نیو ہلا کر رکھ دی۔ اور ایک بار سر اٹھا کر اس خیال نے کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔

'اور وہ تایا ابا، وہ بھی اسی شہر میں رہ رہے ہیں ایک دفعہ بھی پوچھنے کو نہیں آئے کہ جیتا ہوں یا مر گیا۔ اگر آیا کرتے اور میرا وہاں آنا جانا رہتا تو ایسا تو نہیں ہے تائی امی بغیر کھانا کھائے آنے دیتیں۔' تایا ابا کا جب جب خیال آیا وہ صورت بھی اس گھر کی ذہن میں ابھرتی تھی۔ تسنیم کی۔ جس سے خوبصورت لڑکی اس نے نہیں دیکھی تھی۔

ایک دن اسکول سے لوٹتے ہوئے اس نے یکبارگی خروان سے کہہ ڈالا: ''یار کوئی پیسہ بنانے کا طریقہ بتاؤ۔''

اس نے کہا: ''کیوں خیریت تو ہے؟ سائیکل خریدنے کا ارادہ ہے یا بڑی بہن کے یہاں پیٹ نہیں بھرتا ہے؟''

''جیسا بھی ہے۔ مجھے پیسہ بنانے کا طریقہ بتاؤ۔'' پھر اس نے ہمت کر کے کہہ ڈالا: ''ہر وقت بھوک لگی رہتی ہے۔ آٹھویں دن جو روٹی ملتی ہے پہلے دن ہی آلو پوری پر ختم ہو جاتی ہے۔''

خروان نے تعجب سے کہا: ''بس دو ہی!''

''ہاں۔ اس سے زیادہ جب میں نمنی پور میں تھا روز خرچ کرتا تھا، تیسری تک اور یہاں پانچویں میں پہنچ گیا ابھی تک۔۔۔''

خروان نے کہا: ''تو گھر سے پورا پیٹ کھا کر چلا کرو اور اس سے بھی کام نہ چلے تو ایک ڈبے میں انڈا روٹی رکھ کر لے آیا کرو۔ تم اسے ختم نہ کر پاؤ گے تو میں تمہارا ہاتھ بٹاؤں گا۔'' ایک سیکنڈ کے وقفے سے اس نے کہا: ''یہ میں کیا کہہ گیا، کہنا چاہیے تھا منھ بٹاؤں گا۔'' اور اپنی بات پر دیر تک ہنستا رہا۔

تمیذ ہنسا نہیں اور اس نے جھوٹی خفگی سے کہا ''ہنھ۔ اس گھر کے بچوں نے آج تک انڈا دیکھا ہی نہیں ہے۔ اُن کے دماغ میں شاید صرف سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہے۔''

خروان کو لگا اس نے اپنے آنسو روک کر آخری بات کہی ہے۔ اس نے ایک پتھر کو ٹھوکر مارتے ہوئے کہا ''تو آؤ چلیں پیسہ بنانے۔''

وہ اُسے ایسی جگہ لے گیا جو راجدھانی میں ہوتے ہوئے بھی کسی گڑھے پڑے تعجب کا حصہ لگی۔ ایک برگد کے پیڑ کے نیچے کچی جگہ میں لوگ جمع تھے۔ ان کے بیچ میں تمیذ کو پہچاننے میں دیر نہیں لگی وہ آدمی تھا جو جوا کھلوا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ پر اس کا سلیٹی رنگ کا بہت بڑا طوطا اپنے نکل کے اڈے پر بیٹھا تھا۔ یہاں جو کھیل ہو رہا تھا اس سے مختلف تھا جو اس نے نمنی پور میں دیکھا تھا: یہاں جیتنے والے کو کوئی چیز انعام میں گھر لے جانے کے لیے نہیں ملتی تھی۔ سیدھا سادا پیسوں کا کھیل تھا۔ اکنی لگاؤ— پہیہ گھماؤ، خالی گھر پر تیر ٹھیرا اکنی غائب نالہ۔ چونی پر ٹھیرا تین آنے جیت گئے۔ جوا کھلانے والا لوگوں کو پیسہ لگانے پر اُکسا رہا تھا اور لوگ ایک دوسرے کو۔ کوئی کوئی اپنے اکسانے والے کو کہتا: ''خود کیوں نہیں لگاتے۔''

کبھی کبھی طوطا بیساختہ کہہ بیٹھتا: ''پیسہ لگاؤ'' اور سب ہنس پڑتے۔

کچھ دیر کھیل کو خاموشی سے دیکھ کر تمیذ نے کہا: ''یہ کھیل کب ہے، ڈاکا ہے۔'' لوگوں نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔

مجمع سے باہر آ کر اس نے دیکھا پولس والے بھی آس پاس ہیں لیکن اُن سے نہ جوا کھلانے والے کو خطرہ ہے نہ کھیلنے والوں کو۔

"یہاں آ کر تو اور بھوک بڑھ گئی۔"

"تو چھولے کھا لو" خرم نے کہا۔

تمیز نے کہا: "میں ڈر رہا تھا اگر تم نے کہا ہوتا پیسہ لگاؤ یا جوا کھلانے والا کہتا پیسہ لگاؤ یا تماشہ دیکھنے کو کھڑے ہو گئے ہو تو میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا۔ میری جیب میں تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔"

راستے میں ایک جگہ رک کر خرم نے کہا: "آؤ کچھ کھائیں۔ اس حلوائی کے پیڑے بہت اچھے ہوتے ہیں۔"

تمیز نے کہا "میری بھوک اڑ گئی۔ گھر جا کر بھی اس وقت کچھ نہیں کھاؤں گا۔"

گھر پہنچنے کے بعد تمیز خوش تھا کہ غلط جگہ چلا گیا تھا لیکن بچ گیا، خدا نے بچا لیا۔ ورنہ اگر جیب میں پیسے ہوتے تو میں بھی آج کو جواری بن گیا تھا۔ مگر یہ احساس کھانے کے بعد کا تھا اور بس دو چار دن رہا۔

اصل میں بڑی آپا کے گھر صبح، چاہے اسکول جانا ہو یا چھٹی کا دن ہو ناشتے میں صرف ایک پیالی چائے اور دو بسکٹ ملتے تھے، جس پہ پیٹ کو اس وقت تک جب وقفہ ہو بھرا ہوا محسوس کرنا ہوتا تھا۔ وقفے کے ایک پیسے کی دہی بڑے کی پلیٹ، یا دو کیلوں کے لئے پیٹ کو گھر پہنچ کر کھانے کے وقت تک صبر سے کام لینا پڑتا تھا۔ بڑی آپا کے بچوں کے پیٹ ٹرینڈ تھے یعنی تربیت یافتہ یا یہ کہ وہ اپنے ساتھ کچھ لے کر جاتے تھے۔ انہیں اس نے کبھی بھوک سے بلبلاتے نہیں دیکھا۔ اُن کا اسکول گھر سے نزدیک تھا اور تمیز سے پہلے گھر پہنچ جاتے تھے۔

'وہاں' اپنے گھر صبح ناشتے میں حلوہ پراٹھا ہوتا تھا یا انڈا اور گھی کی نکیاں۔ اور کھانا کھاتے میں کون ٹوکتا تھا "سالن کم لو، زیادہ سالن چٹورے کھاتے ہیں"، اور کون کھانے کے بیچ ہی میں

یاد دلاتا تھا' اللہ کا شکر کرو'

اس دن برگد کے پیڑ کے نیچے کی قمارگاہ سے لوٹ آنے کے بعد تمیذ نے زندگی میں پہلی بار پیسے کا حساب رکھنا شروع کیا: 'ایک دن میں ایک پیسے سے زیادہ خرچ نہیں کرنا ہے۔ دھیلے کا ایک کیلا وقفے میں، اور دھیلے کے چنے اسکول سے لوٹتے ہوئے، جب بھوک اپنی انتہا پر ہوتی تھی۔ ہوکی، فٹ بول، پی ٹی بچپن سے لے کر اس وقت تک کا سب کھایا پیا برابر کرا چکے ہوتے تھے۔

لیکن دو دن بعد ہی وہ بغیر سحری کا روزہ رکھنے والے کی طرح وقفے میں دہی پھلکی کی پلیٹ پر ٹوٹ پڑا اور اسے ختم کر کے کھمل کے بیر بیچنے والے کے سامنے کھڑا تھا جو مسلم اسکول کے گیٹ کے باہر کھڑا ہوتا تھا۔ اندر کھڑے ہونے پر، اس کا تجربہ تھا، ہیڈ ماسٹر کا اردلی جاڑوں بھر ان کے لیے' پیسے آ جائیں گے' کہہ کر روز پاؤ، آدھ پاؤ بیر لے جاتا تھا۔

اگلے سال وہ ایک قبرستان میں جانے لگا تھا، وہ جگہ بھی اسے حر دن نے دکھائی تھی، قبروں کے بیچ میں کی ایک خالی جگہ۔ جہاں کی قبریں بیٹھ گئی تھیں۔ وہاں چار چھ آدمی خاموشی سے بساط بچھائے بیٹھے ہوتے تھے۔ ایک طرف کی قبر کے کتبے کی پیٹھ سے وہ ایک میلا بغیر غلاف کا تکیہ ٹکا کر ترچھا کھڑا کر دیتے تھے اور اس پر کوڑیاں پھینک کر بساط پر مہرے چلتے تھے۔ دو آدمی بیٹھے پورے وقت بیڑی پیتے رہتے تھے، تیسرے کے ہاتھ میں گڑگڑی ہوتی تھی۔ باوجود کھلی ہونے کے اتنی جگہ میں جہاں جوا ہو رہا ہوتا تھا، بیڑی کی تیز بو اور ان کے کپڑوں کی بدبو پھیلی ہوتی تھی۔

پہلے دن تمیذ کو دلچسپی سے کھیل کو دیکھتے ہوئے ایک نے پوچھا: ''آتا ہے؟''

''ہاں'' ان کے میلے کپڑے، بڑھے ہوئے ہوشوں والے بال اور میل بھرے پنجوں جیسے ناخن

دیکھ کر یہ فیصلہ کرنے میں اُسے دیر نہیں لگی: یہ لوگ آپ جناب اور جی والے لوگ نہیں ہیں۔ تم اور ہاں والے لوگ ہیں۔

''تو پھر بیٹھو۔'' سوال کرنے والے نے کہا۔

اس دن حمید وہاں سے سترہ پیسے لے کر اٹھا — چار آنے اور ایک پیسہ۔ خود اس نے ایک پیسہ بھی نہیں لگایا تھا۔ کوڑی والے نے کہا: ''کل آنا، یہ نہیں کہ ایک دن جیت کر چلتے بنے۔''

وہ سترہ پیسے یقیناً اس محسن کی اجرت تھی جو اُسے گھنٹہ بھر سہنی پڑی تھی۔

چند ہی دن میں اس کی طبیعت اس گناہ سے بھر گئی۔ پھر اس نے خود کو سمجھایا: ''اگر یہ گناہ ہے تو ابا مجھے علیحدہ سے جیب خرچ کیوں نہیں بھیجتے ہیں ہر مہینے بڑے بھائی جان کے نام منی آرڈر آتا ہے — میرا مہینے کا خرچ۔ مجھے کیوں نہیں اسی طرح ہر مہینے جیب خرچ بھیج سکتے ہیں۔ یہ گناہ ان کے سر ہے۔''

(۵)

اندر ہی اندر باپ کو برا سمجھنے اور کہنے کے بعد تلمیذ کو تھوڑا سکون ملتا تھا جیسے ایک ریلوے پلیٹ فورم کے سرخ قمیض کے قلی نے سر پر سے دو من کا بوجھ غصے سے اتار پھینکا ہو کیونکہ جس مسافر کے وہ ٹرنک اور ہولڈال تھے انہیں اس کے سر پر رکھوا کر صحیح اجرت کی جگہ کم کی بات کر رہا تھا۔ اس سکون کے بعد کبھی ایسا ہوتا تھا اُسے نیند آ جاتی تھی اور جب سو کر اٹھتا تھا جی چاہتا تھا ماں کے گھر کی طرح گھوموں پھروں، گانے گاؤں، کوئی فکر نہ رہے، زندگی کے وہ دن پھر سے لوٹ آئیں۔ مگر گانا بہن اور بہنوئی کے گھر!

جب بھوک نے ستانا بند کر دیا تھا اور جوتے سے اتنی اتنی ہونے لگی تھی کہ اُسے کسی اور خوشی کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا اس نے ایک دن ایمن سے پوچھا: ''تم نے کوئی فلم دیکھی ہے یا یونہی دوسروں سے سن سنا کر اس کی کہانی مجھے سنایا کرتے ہو۔''

ایمن نے کہا ''کوئی؟ ہزاروں، میں ماں کے پیٹ سے فلم دیکھتا ہوا اس دنیا میں آیا تھا۔''

تلمیذ نے کہا ''تو کیا تم جب پیٹ میں تھے وہ فلم دیکھنے جاتی تھیں؟''

ایمن نے کہا ''یہ بات اگر اُن کے کان میں پڑ جائے تو قیامت آ جائے گی — میرے سر پر۔ انہوں نے صرف ایک سائلینٹ فلم دیکھی تھی، میری پیدائش سے دس پندرہ سال پہلے: 'میر

پرستان — اس کی کہانی وہ مجھے کتنی ہی بار سنا چکی ہیں۔"

اس دن اسکول سے واپسی پر وہ الشتہر ٹاکیز گئے۔ گھر آ کر تمکین نے مار کھائی اور رات کو بھائیوں بہنوں سے کہا: "جانتے ہو یہ مار کس بات کی پڑی ہے۔ فلم دیکھ کر گھر دیر سے آنے کی۔ تم بھی جب پیسے جمع کر لو میرے ساتھ سینما جا سکتے ہو۔ لڑکیاں نہیں جا سکتی ہیں کیونکہ وہ اسکول نہیں جاتی ہیں۔ کس بہانے پر گھر سے نکلیں گی؟ ہاں شاید شادی کے بعد جا سکیں گی۔" اس پر وہ شور کرتیں لیکن اس کی بات جاری رہی۔

"فلم دیکھ کر دیر سے گھر آنے پر تمہیں مار پڑے گی۔ کوئی بات نہیں مار کھا لینا۔ مگر فلم دیکھنے کی چیز ہے۔ اس نعمت سے تمہارے امی ابا محروم ہیں۔"

شروع کی چند فلمیں چھپ کر دیکھنے نے اس کی فلم دیکھنے کی پیاس بڑھا دی۔ بیٹھا بیٹھا سوچا کرتا: "یہ مزہ صرف سے صرف تین گھنٹے رہتا ہے۔ اصل میں سینما ہال میں کام کرنے والے مزے میں رہتے ہیں۔ روز دو شو دیکھتے ہیں اور اتوار کے دن دوپہر کو بھی۔" کچھ دن اس کی آرزو سینما کے گیٹ کیپر بننے کی رہی۔ پھر خود ہی ختم ہو گئی۔ اس کی جگہ ایک اور خواہش نے لے لی: "اصل میں خوش تو فلموں میں کام کرنے والے ہیں جو دن رات اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ ہیروئن ساتھ رہتی ہے اور وہ دوسری لڑکی جس سے ہیرو محبت نہیں کرتا ہے ہر دم اس سے چپکی رہتی ہے اور جب فلم بن جائے تو سب سے پہلے وہ اسے دیکھتے ہیں جتنی دفعہ جی چاہے۔"

آگے چل کر ملک کا فلم کیپٹل اس کا مستقر ہو گا انہی دنوں اس نے اپنے لیے فیصلہ کر لیا تھا۔

اپنی زندگی کی شاید چوتھی یا پانچویں فلم دیکھتے ہوئے اسے برابر میں بیٹھا ہوا آدمی اپنے پر مہربان لگا۔ انٹرول میں اس نے سگریٹ کا پیکٹ کھول کر اپنے ساتھی کی طرف بڑھایا، پھر تمکین کی طرف۔ لیکن اس کے انکار پر اپنا سگریٹ سلگایا اور لیمونیڈ بیچنے والے کو اپنی طرف بلایا۔ ایک بار پھر تمکین نے سر زور سے ہلا کر اس دعوت کو رد کر دیا۔

وہ دونوں آدمی اسے ایسے نہیں نظر آئے جن کے برابر میں بیٹھا جا سکتا ہے۔
ان دونوں کی شکل گھر جا کر بھی یاد آنے پر تمیذ کو ہنسی آ گئی: ایک کی آنکھیں کھوپڑی میں بہت اندر تھیں۔ لگتا تھا ماتھا اُبل کر باہر آ گیا ہے۔ دوسرے کے سر کا تیل بہہ کر ماتھے پر آ گیا تھا۔ شکل سے لگتا تھا دونوں ڈولی کے کہار ہیں یا آٹے کی چکی پر کام کرنے والے مزدور۔ مگر راجدھانی میں ڈولیاں کہاں تھیں جو وہ کہار ہوتے! اور بجلی سے چلنے والی آٹے کی چکی بھی اس نے یہاں نہیں دیکھی تھی۔
ایسے لوگوں سے بچ کر رہنا اسے وقت نے سکھایا تھا۔

اس دن کے بعد اس نے تھرڈ کی جگہ سیکنڈ میں فلم دیکھنی شروع کر دی۔ سیکنڈ کلاس والے شکل سے پڑھے لکھے لگتے تھے۔ ان ہی دنوں ایمن اور حمروان کی دیکھا دیکھی اس نے سگریٹ پینی بھی شروع کر دی۔ لیکن خریدتا ایک ہی سگریٹ تھا کیونکہ سگریٹ کی ڈبیا اور ماچس لیے گھر میں داخل ہوتا۔ ویسے بھی جیب ایک سگریٹ برداشت کر سکتی تھی پورا پیکٹ نہیں۔ اس کفایت شعاری کے باوجود ان تین گھنٹوں کے ڈیسک پر سب کے ساتھ بیٹھ کر پڑھتے ہوئے ایک خوف سا اس پر طاری رہتا تھا: ان میں سے کسی کو سگریٹ کی بو نہ آ جائے۔

یہاں تک بھی زندگی کے واقعات پر تمیذ ہنس سکتا تھا: ہوا تھی مگر اس نے وہ گھٹن دور کر دی تھی جس کا شکار میں تنخ پور چھوڑنے کے بعد سے رہا تھا۔ تھوڑے دن میں میری اتنی کمائی نے پورے بل کی ادائیگی سے انکار کر دیا — اسکول میں وقفے کا خرچ، وہاں سے نکل کر راستے کا خرچ جس میں ٹرام اور بس بھی شامل ہو جاتی تھیں، ہفتہ دس دن میں فلم، وہاں لیمونیڈ یا کباب اور سگریٹ کی دعوت۔

اس تفصیل نے بھی خود پر ہنسنے کے طلسم کو نہیں توڑا، چھوٹا موٹا نواب تھا۔

اگلے سال وہ دن آئے جب اس نے اس گھر کا رخ کرنا شروع کیا تھا جہاں ایک چھوٹے سے کمرے میں چاندنی کے فرش پر دو تین مرد، دو ایک عورتیں حلقہ بنائے بیٹھے ہوتے تھے۔ اگر بازی جمی ہوتی تو وہ اسے بمشکل نظر اٹھا کر دیکھتے تھے اور اگر کھیل رکا ہوا ہو یا کوئی پتے پھینٹ رہا ہو تو اسے دیکھ کر کہتے "آؤ میاں ننھو، تمہارا ہی انتظار تھا۔" یا ایسا ہی کوئی جملہ جو جذبات سے خالی لیکن تکلف سے پر ہوتا تھا۔

ایش ٹرے سگریٹ کے بہت ہی چھوٹے ٹکڑوں سے بھری ہوتی — عورتوں سمیت سب کے انگوٹھے اور دو، دو انگلیاں اتنے پیلے تھے کہ کالے پڑ گئے تھے۔ ہونٹوں پر سب کے لگتا تھا لاکھا لگا ہے۔

عورتوں مردوں میں جو کسی بھی محفل میں دوری ہوتی ہے وہ تمیز وہاں نظر نہیں آتی۔ لگتا تھا مرد اس سے آگاہ نہیں ہیں ان کے برابر میں عورتیں بیٹھی ہیں اور عورتیں مردوں کی موجودگی سے۔ سب کی بس ایک ہی شناخت تھی — جواری ہیں۔ وہاں جنس معنی نہیں رکھتی تھی۔

اس گھر سے حسن دار اشن نے اسے روشناس کرایا تھا۔ اس کی ایک رشتے کی خالہ کا گھر تھا اور اس لحاظ سے اور جگہوں سے بہتر تھا کہ وہاں کھیل روز ہوتا تھا، دوسری جگہوں میں اگر چار، پانچ یا چھ ہوئے تو کھیل ہو جاتا تھا ورنہ ڈھونڈنا پڑتا تھا کھیل کہاں ہو رہا ہے — کسی گھر کی بیٹھک میں یا ہیجڑوں اور رنڈوؤں کے گھر میں، یا کسی بند دکان میں۔

ایک بار پتے لوگوں کے ہاتھ میں ہوں تو کمرے پر موت کی خاموشی چھا جاتی تھی اور خاموشی کسی کے شو کرنے پر اضطراب میں بدل جاتی۔

وہاں کسی کی پان یا چائے سے خاطر نہیں ہوتی تھی، سب اپنا پان اپنی سگریٹ لے کر آتے تھے

اور جیت کا کچھ پیسہ چلتے ہوئے صاحب یا صاحب خانہ کے لیے چھوڑا جاتا تھا۔ مگر تلمیذ کو کبھی کسی نے کچھ چھوڑ کر جانے کے لیے نہیں کہا کیونکہ، کیونکہ وہ ایمن کا دوست تھا۔

ایک پچکے ہوئے گالوں والا ادھیڑ عمر اس کی سواگت "آؤ لمڈے میاں" سے کرتا تھا۔ ایک بار جب تلمیذ ہار رہا تھا اور چھمو صاحب نے کہا "کھلواؤ پتے لمڈے میاں، کیا قیامت کا انتظار کر رہے ہو" تو وہ انہیں مارنے کو ہوا اور پتے پھینک کر چل دیا۔ لیکن خالہ پھسلا کر لے آئیں: "یہ تو کھیل ہے، دو گھڑی دل بہلانے کو۔ سب اپنے ہی ہیں، کسی کی بات کا کیوں برا مانتے ہو۔"

پتہ نہیں ایمن کی ان رشتے کی خالہ کا ایمن کی والدہ کو بھی پتہ تھا یا نہیں۔

چھمو صاحب کے بارے میں سنا گیا تھا انہوں نے جوانی میں پارے کا کشتہ کھایا تھا جو پوری طرح پھنکا ہوا نہیں تھا اور دانت جھڑ گئے، ورنہ وہ اتنے گئے گزرے نہیں تھے کہ ادھیڑ عمر کے نظر آتے۔

وہ کمرہ تکیے سے بہتر تھا جہاں ایک قبر کے سرہانے کے پتھر پر تکیہ لگا کر جوا ہوتا تھا۔ وہاں کے اُن لوگوں کے کپڑوں اور چلم کی بو ایسی تھی کہ سالوں بعد جب بھی وہ جگہ ذہن میں آئے وہ بدبو جیسے سوتے سے ناک میں جاگ جاتی تھی۔

ایمن کی رشتے کی خالہ کے گھر، یا وہ جو بھی تھیں، اگر جوئے میں پیسے اچھے بنے ہوں اور وہاں سے نکل کر کوئی اور پروگرام نہ بنا تو راستے میں اچھے کھانے کے شوق کو پورا کیا جا سکتا تھا۔ اگلے دن وہ کسی نہ کسی بھانجے کو جتاتا ضرور تھا "تم نے کبھی تیخ کے کباب کھائے ہیں؟ نہاری؟ پراٹھے؟" اور اس کے چہرے پر حیرانی دیکھ کر کہتا "ان کے لیے نئی پور جاؤ اپنے نانا کے گھر یا بڑے ہو جاؤ تو کھایا کرنا۔"

ایک دن سب سے بڑی بھانجی نے پوچھا "اور ہم؟ ماموں جان؟"

"تم جب شادی ہو جائے تب کھا سکو گی۔ مگر میرا خیال ہے نہیں۔ تمہاری شادی بھی تمہارے امی ابا اپنے جیسے خشکوں کے گھر میں کریں گے۔"

اس نے وہ بات ماں سے کہی اور انہوں نے اپنے شوہر سے۔

اس رات جب وہ اسے مارنے کو ہوئے تو وہ گھر سے بھاگ گیا اور اگلی صبح اس وقت لوٹا جب وہ دفتر جا چکے تھے۔

جب چاندنی سے فرش والے گھر پر جا کر تمیزہ کی یادداشت ٹھہرتی تو آہستہ آہستہ گہری سے گہری ہوتی ہوئی لہریں اٹھنے لگتیں جن سے وہ بچپن سے ڈرتا آیا تھا: اندھیری قبر میں اکیلا لیٹا ہوا تمیزہ۔ قبر کی تنگ دیواریں جو دونوں طرف سے بھینچتی ہیں۔ وہاں چھپے ہوئے بچھو، کنکھجورے اور نیولے۔

خیالات کی اس ہیولے کے بعد ایک زمانے میں جب نیند آنے کو ہوتی تھی اس کی چیخ نکل جاتی تھی اور اماں کہتی تھیں "سوتے میں ڈر گیا ہے۔" لیکن کام کرنے والی اور دھوبن کا خیال تھا اثر ہے۔ کسی قبر پر بے دھیانی میں پیر پڑ گیا ہوگا یا بے دھیانی میں کہیں کچے میں پیشاب کیا ہوگا۔ پھر یہ راز بھی کھلا کہ زمین کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں ہے جہاں کوئی دفن نہیں ہے۔ کہاں تک کوئی احتیاط کرے! اس نے گھر کے میلاد شریف میں تو بیٹھنا چھوڑ ہی دیا تھا وہاں اسکول کے دینیات کے پیریڈ سے بھی موقع ملتے ہی فرار ہو لیتا تھا۔

بڑی مشکل یہ تھی وہ کسی واقعہ میں لے کر یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ گنہگار ہے۔ پوچھنے والے کے کیوں اور کیسے کا جواب وہ نہ دے پاتا۔

شروع میں اس نے اسکول سے دیر میں گھر لوٹنے پر بجولی کے ہاتھ سے مار خاموشی سے کھائی تھی۔ پھر وہ خاموشی ڈھٹائی میں بدل گئی: بغیر ہلے، بغیر چلائے، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مار کھاتا۔ جب بجولی نے ہاتھوں کی جگہ لکڑی استعمال کرنا شروع کی تو اس نے اس وقت

گھر لوٹنا شروع کیا جب وہ عشاء کی نماز کے لیے مسجد گئے ہوتے تھے۔ اس سے زیادہ دیر سے لوٹنے میں گھر کے دروازے کے نہ کھلنے کا خطرہ تھا۔ اور وہ جان گیا تھا اس کے رات بھر گھر نہ لوٹنے کی خبر اگر ابا کو ملے تو یہ خود بہنوئی کے حق میں اچھی نہیں ہوگی۔ چنانچہ زیادہ دیر سے گھر آنے پر آپا جان خاموشی سے آکر دروازہ کھول کر بغیر ایک لفظ کہے جا کر سو رہتی تھیں۔

عتیق الرحمٰن کو اپنی ساری اولاد میں بڑی بیٹی کلثوم سے جتنی محبت تھی کسی اور سے نہیں تھی۔ اور اُس کی وجہ سے بڑے داماد سے۔ محض اس وجہ سے کہ دونوں اتنے دین دار تھے جتنے وہ خود نہیں تھے۔

باپ کی اپنی مذہبی زندگی کیسی تھی؟ بھولے بھٹکے ایک دو وقت کی نماز، فجر عشا، کبھی نہیں اور عصر اکثر چھوٹ جاتی تھی۔ مگر دوسرے کو گھر میں نماز پڑھتے دیکھ کر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آس پاس جو ہوں انہیں خاموش ہو جانے کا اشارہ ضرور کرتے تھے۔ عید، بقرعید کی نماز کے لیے سب لڑکوں اور چھوٹی لڑکیوں کے ساتھ بڑے اہتمام سے جاتے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر والے گراموفون پر، جب اس کی کمان ٹوٹی ہوئی نہ ہو اور نئی سوئیوں کا پیکٹ موجود ہو، حمد اور نعت کے ریکارڈ بڑی عقیدت بلکہ رقیق القلبی سے سنتے تھے۔

انہوں نے اولاد کی بھرمار ہونے کی وجہ سے حج پر جانے کی نیت ساری عمر نہیں کی اور بیوی اگر حج کا کہتیں تو ان کا جواب ہوتا ''کون سا مسلم بادشاہ اور اس کی ملکہ حج پر نکلے تھے جو ہم نکلیں۔'' مسلم بادشاہ سے ان کی مراد اپنے ملک کے مسلمان بادشاہ ہوتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی نے حج کیا تھا اس لیے کہ وہ کبھی کثیر الاولاد نہ تھے۔

بڑی بہن کے گھر کا ماحول باپ کے گھر سے کہیں زیادہ مذہبی تھا۔

بہنوئی عصر کی نماز کے لئے گھر سے نکلتے تھے اور تین نمازوں کے بعد رات کو گھر لوٹتے تھے۔

بہن نمازی تھیں اور کبھی کبھی اطراف میں وعظ دینے کے لیے بلائی جاتی تھیں۔ اس گھر میں آ کر شوہر کا مذہبی رنگ تھوڑا بہت ان پر بھی چڑھ گیا تھا۔ باپ کے گھرانے کے میلاد شریف کی محفلوں کے وہ بھی خلاف ہوگئی تھیں۔

جب بہن بہنوئی دونوں گھر پر نہ ہوں تو گھر کی دنیا ہی بدل جاتی تھی۔ تینوں بھانجوں اور دونوں بڑی بھانجیوں کی اصل آوازیں لوٹ آتی تھیں اور وہ اپنے ماموں سے دنیا جہان کی باتیں اور قصے سنتے۔ تمیز بھی اتنی دیر میں زندہ تمیز بن جاتا، مری مری آواز میں باتیں کرنے والا تمیز کہیں اور چلا جاتا۔ اس نے مینی پور میں نوٹنکی دیکھی تھی اور رام لیلا، اور اُن سے بھی بڑھ کر ایک دفعہ قناتوں اور شامیانے کے منڈوے میں سنیما 'یعنی فلم'۔ جس کا انہوں نے بس ذکر ہی اپنے اسکول کے ساتھیوں سے سنا تھا۔ انہیں افسوس ہوتا جب جب وہ مینی پور گئے وہاں نہ فلم تھی، نہ رام لیلا نہ ہی نوٹنکی۔

''اگر ہوتی بھی تو کیا تمہارے خشکے ماں باپ تمہیں دیکھنے کی اجازت دیتے!''

سب بات کو سمجھ کر سر ہلاتے۔

کبھی وہ باورچی خانے سے کوئی چیز چرا کر اپنے ماموں جان کو لا کر دیتے اور اُسے کھاتے ہوئے تمیز کہتا ''تم اپنے ماں باپ سے پٹو گے چوری کرنے پر۔''

''اور آپ؟'' پچھلی بار یہ بات سننے پر بڑی بھانجی نے کہا تھا۔

''میں کہہ دوں گا تم نے کھایا ہوگا۔ میں تو تم سب چوکیداروں کے سامنے تھا، کیسے چوری کرسکتا تھا۔''

ایسی چھوٹی سی تُنکی اگلے لمحے ہی مٹ جاتی اور تمیز اپنے کارنامے سنانے لگتا تھا: کیسے مینی پور کے لڑکے خود پیڑ پر چڑھ کر املی کھاتے تھے، خود کمرکھ، کیسے تلیا پر جا کر خود سنگھاڑے

توڑتے تھے اور بنسی سے مچھلی پکڑتے تھے جسے چکنی مٹی میں لپیٹ کر چولھے کے بھوبھل میں دبا دو تو آدھے گھنٹے ہی میں پک کر ایسی ہو جاتی ہے کہ تم نے ویسی کوئی چیز آج تک کھائی ہی نہیں ہے۔ خود اس پر نمک مرچ چھڑکو اور "

"سب کام خود" کوئی نہ کوئی کہہ اٹھتا جسے سن کر سب کو اپنی بے بسی کا احساس ہوتا۔

لیکن ماں باپ کے لوٹتے ہی سارے بڑے بچے پڑھنے اور اسکول کا کام کرنے بیٹھ جاتے۔ اماں چاہے وعظ سے لوٹیں چاہے قرآن خوانی سے ان کے ہاتھ میں وہاں بٹنے والی کوئی نہ کوئی چیز ضرور ہوتی تھی۔ بھانجے بھانجیوں کی نظر اس پر ہوتی تھی۔

بعد میں جب پٹنے سے بچنے کے لیے تلمیذ گھر سے بھاگنے لگا تھا اس نے بہن بہنوئی اور مزا پر دو حرف بھیجنے کے لئے ایک سوانگ رچنا شروع کیا۔ دیر سے واپس آنے پر جب دروازہ کھولا نہ گیا ہو اور اس نے رات باہر گزاری ہو، صبح جب بہنوئی دفتر جا چکے ہوتے اور بڑے بچے اپنے اسکول وہ چھوٹے بچوں کے سامنے جن میں سب بھانجیاں ہوتی تھیں، آئینے میں خود سے مخاطب ہوتا:

"کیوں دوست گھر سے بھاگے تھے!"

"یہاں ہے کیا جو نہ بھاگتا۔"

"پھر بھاگو گے؟"

"کیوں نہیں، کون روک سکتا ہے۔"

"فلم ایکٹر بننے کا ارادہ ہے؟"

"ہاں ایک دن بن کے دکھا دوں گا۔"

"یہاں جی نہیں لگتا؟"

"اس گھر میں کوئی گنگناتا تک نہیں ہے۔ اول تو چڑیاں آتی نہیں ہیں، جو آتی ہیں خاموشی سے روٹی کے بھورے چگ کر اڑ جاتی ہیں۔ کبھی انہیں چہچہاتے دیکھا ہے؟ کبھی

بھی بچوں کو ساتھ لاتی ہیں! پھر کیسے جی لگے۔"

"یہاں کا کھانا پسند نہیں ہے؟"

"آپا جان بوٹیاں اور گھی کا تار اپنے بیٹوں کو دیتی ہیں تمہیں صرف شوربا اور دال۔ خود جب باپ کے گھر جاتی ہیں وہاں کہتی ہیں 'اور لو تمیز تم گوشت نہیں کھا رہے ہو'، باپ سے کہتی ہیں۔ 'تمیز کو دونوں وقت گوشت چاہیے، پورا مسلمان ہے'۔ باپ کہتے ہیں 'تم ناز اٹھاتی ہو اس لیے مسلمان ہے۔ دال ترکاری کھلاؤ۔ عینک پڑی ہوئی، لالہ بن جائے گا ڈھیلی دھوتی والا'۔"

"خوش نہیں ہو یہاں؟"

"سنو بے عیب ذات آسمان پر خدا کی ہے، زمین پر آپا جان کے بیٹوں بیٹیوں کی۔ پھر خوش کیسے ہوں۔"

"جب فلموں میں کام کرنے لگو گے تو کہاں کھایا کرو گے؟"

"میکسم اور تاج محل ہوٹلوں میں اور سمندر کا کنارہ ہوگا جہاں ناریل کا پانی پینے کو ملتا ہے۔"

پھر وہ سین آتا جب چھوٹے بھانجے بھانجیاں ماں کو بتاتے "آج ماموں آئینے میں کہہ رہے تھے "

اس کی بعد کا سین وہ ہوتا تھا جب شام کو بہنوئی مسجد جانے سے پہلے یا وہاں سے آ کر بیوی سے کہتے "ذات شریف گھر میں ہیں یا فلم کی دنیا میں چلے گئے؟ میری آمدنی میں تم نے ایک بے دین کو شریک کرلیا ہے۔"

وہ زیرلب کہتا "بے دین اپنی روزی ساتھ لے کر آیا ہے" جسے بڑے بچے بھی سن لیتے تھے اور انتظار کرتے تھے کب اس بات کو ماں سے جڑنے کا موقع ملے۔

اس وقت وہ لالٹین کے سامنے کتاب کھولے بیٹھا ہوتا تھا، اپنی فتح پرتاب ناک چہرہ لیے۔

پہلی بار گھر سے بھاگنے پر تمیز نے بڑی بہن کے مُنھ سے سُنا تھا "بنا بنایا دوسرا منظور ہے۔" اور بڑے بھائی جان اکثر کہتے: "اس کے لچھن اچھے نہیں ہیں ہمارے لڑکوں کو بھی خراب کردے گا۔ تم نے اچھی مصیبت مول لے لی۔ بدچلن تھا تب ہی باپ نے اُسے پڑھانے کو تمہارے سپرد کر دیا۔ اب پڑھاؤ۔"

وہ یقیناً سالے کو گھر سے نکال چکے ہوتے اگر اُن کے سسر اس کی کفالت کے لیے ہر ماہ اتنی رقم نہ بھیجتے جو اس کے شوربے، دال، روکھی روٹی کی دو وقت کی خوراک، صبح کے ایک پیالی دودھ اور دو بسکٹوں کے ناشتے اور اسکول کی فیس سے دگنی تگنی ہوتی تھی۔

اُس دور کے باپ کے خلاف رہنے والے جذبات کو تمیز زندگی بھر اپنے دماغ سے دور نہ کر سکا۔

بڑی آپا کے گھر گزارے ہوئے دنوں سے وابستہ جو یادیں تمیز کے ذہن میں تھیں اُن میں سے ایک ایسے نوجوان کی تھی جس کا ذکر وہ نینی پور میں بھی تھوڑا بہت، بغیر سمجھے سُن چکا تھا اور دبے لفظوں میں راجدھانی پہنچ کر بھی بار ہا سُنا لیکن جسے اس نے دیکھا ایک بار بھی نہیں تھا۔ بڑی آپا کے جیٹھ کا بیٹا جس کا جرم ایک ہندو لڑکی کی محبت میں گرفتار ہونا تھا ــ منظور، جس کی تصویر تک بھی کسی گھر میں نہیں تھی۔ منظور کے ماں باپ دین دار تھے، باپ اس حد تک کہ نماز چھوڑنے والے کو جہنمی سمجھتے تھے۔ اس سے کم نہیں۔ اُن کا وہ سب سے بڑا بیٹا باغی نکلا تھا۔
مشکل یہ آ پڑی کہ وہ ہندو لڑکی اس کے ساتھ بھاگنے کو تیار تھی اور گھر والوں کو خودکشی کی دھمکی دیتا کو ہاتھ میں لے کر دے چکی تھی۔

منظور کی تصویر جب بھی ذہن میں ابھرے وہ دبی آواز میں کہتا "اگر انسانوں کو ایک دوسرے سے اتنا جدا رکھنا تھا تو کیوں نہیں ہر مذہب، قوم، رنگت والے کی صورت دوسرے ہر مذہب، قوم اور رنگت والے کی صورت سے اتنی مختلف رکھی کہ ایک، دوسرے کو انسان ہی نظر نہ آتا اور اگر پھر بھی کسی پر پیار آتا تو جیسے پالتو بلی یا کتے پر۔"

منظور دنوں گھر سے غائب رہتا تھا۔ ایک رات وہ اس وقت گھر لوٹا جب سب گہری نیند سو رہے تھے۔ دیر تک دروازے کو دھپ دھپاتا رہا۔ بیچ بیچ میں پانی مانگ رہا تھا۔ اماں بی کہہ کہہ کر۔ ماں نے اٹھ کر دروازہ کھولنے کا ارادہ کیا لیکن حافظ صاحب نے سختی سے منع کر دیا۔ یہاں تک کہ۔ پانی پانی کہتی ہوئی آواز خاموش ہوگئی۔

صبح کے قریب دروازے کے کھٹکھٹائے جانے کی آواز آنے لگی، جو تھوڑی ہی دیر میں دھڑ دھڑانے میں بدل گئی۔ اذان میں ابھی دیر تھی۔ آخر میں سونا ناممکن ہو گیا اور حافظ صاحب کو اندازہ ہوا دروازے پر شاید بھیڑ لگی ہے اور اس میں پانی مانگنے والے کی آواز نہیں ہے۔

منظور مسجد کے صحن میں پڑا تھا۔ باپ کے لادین قرار دینے کے بعد سے شاید پہلی بار مسجد میں گیا تھا۔

بعد میں کتنی ہی بار سننے میں آیا شیلا کے بھائیوں نے منظور کو یقین دلایا تھا وہ اس کی شادی شیلا سے کرنے کو تیار ہیں۔ پھر ایک دن اسے کھانے پر بلا کر زہر دے دیا۔

اس زمانے میں عزت والے لوگ تھانے، کچہری جانا اپنی بے عزتی سمجھتے تھے۔ کون کسے سزا وار ٹھیراتا۔ بات بخوبی دب گئی۔ حافظ صاحب جو مفتی بھی تھے محلے والوں کے زور دینے کے باوجود نماز جنازہ میں شریک نہیں ہوئے۔ لاکھ خودکشی نہ ہو، تھی موت اس کی سرکشی کا نتیجہ۔ شیلا کا نام اس کے بعد اس گھر میں کسی کی زبان پر نہ آیا۔

تمیز کو نہیں معلوم تھا بے چارہ منظور مرنے کے بعد اس کی زندگی میں کیا رول ادا کرنے جا رہا تھا۔

(۶)

راجدھانی میں جیسے بھی تھے، دن گزرتے جا رہے تھے جب وہ وقت آیا جب اس خیال نے تمیز کو اپنی گرفت میں لے لیا کہ 'میں اچھا انسان نہیں ہوں۔ کیا تھا، کیا بن گیا ہوں، کیا بنتا جا رہا ہوں۔ میرے ارادے میرے بس میں نہیں ہیں۔ میرے اندر جو شیطان ہے، جسے میں سب سے چھپاتا ہوں، جو چاہتا ہے مجھ سے کروالیتا ہے۔ میں گھر سے جو جسم لے کر آیا تھا وہ ابا کی حلال کی کمائی سے بنا تھا۔ لیکن جتنا وہ جسم اب ہے کیا اس کے لیے میں کہہ سکتا ہوں حلال کی کمائی سے بنا ہے؟'

'تم جواری ہو' دماغ جواب دیتا۔

وہ بحث کرتا: جوا اس نے شوقیہ کھیلنا نہیں شروع کیا تھا، سوائے اس موقعے کے جب وہ ماں کی صندوقچی سے پیسے نکال کر املی کے پیڑ کے نیچے اس کھیل کا مزہ لینے گیا تھا جو وہاں ہو رہا تھا۔ مگر وہ بچپن تھا۔'

'جھوٹ۔ تم تب بھی جانتے تھے اس کھیل کو جوا کہتے ہیں۔'

'مگر میری پیسے بنانے کی نیت نہیں تھی۔'

اُسے سر پر ایک بوجھ رکھا ہوا محسوس ہوتا اور لگتا سر کو ایک چوڑی نواڑ کی پٹی سے کس کر باندھ دیا گیا ہے۔ وہ اُن دونوں سے چھٹکارا پانے کے لئے اِدھر اُدھر کی باتیں ذہن میں لاتا۔ لیکن وہ

زیادہ دیر ساتھ نہ دیتیں۔

اسے خیال ستانے لگتا 'تم اپنے باپ کو برا سمجھتے ہو۔ اس کا گناہ کس کے سر ہے؟'

کبھی وہ ڈٹ جاتا 'جوئے کی ذمے داری اُن پر ہے۔ یہاں آ کر جو کچھ ہوا بھوک کی وجہ سے۔ اور بھوک کی ذمے داری بڑی آپا اور اُن کے شوہر پر ہے۔ اور ابا کو کیا ہوا تھا جب مجھے منی پور سے راجہ حانی بھیجا جا رہا تھا؟ انہیں خیال نہیں آیا بھوک بھی اسے ستا سکتی ہے۔ اگر یہی ان کا ارادہ تھا کہ وہ بسکٹوں اور چائے، بے مزہ بغیر بالائی کے دودھ کی ایک پیالی کے ناشتے کے بعد — اگر اسے ناشتہ کہا جا سکتا ہے — اسکول جاؤں اور دو وقت کے روکھے سوکھے کھانے پر گزارہ کروں تو بچپن سے مجھے اس کی طرح دونوں وقت باسی روٹی پر رات کی دال یا ترکاری کا سالن رکھ کر ہاتھ میں تھما دیتے' (یا یتیم خانے میں دے دیتے' دماغ ٹہوکا دیتا۔)

'مگر انہوں نے کیا کیا؟ مجھے ایک نوکر کے سپرد کیا کہ جاؤ اسے اس کی بڑی آپا کے گھر راجہ حانی میں پہنچا آؤ۔'

یہ اندرونی مقدمہ، ایک بار اس کی شنوائی ہو جائے گھنٹوں چلتا تھا۔ کبھی ایک خیال اس کی حمایت میں ابھرتا 'چاندنی کے فرش والے گھر جانا اس لحاظ سے میری زندگی کا ایک معرکہ ہے کہ میں نے ایک ایسا کھیل اختیار کر لیا ہے جو میری زیادہ تر ضرورتیں پوری کر دیتا ہے۔'

'لیکن اس کھیل میں پیسے کی شرط لگتی ہے اور اس گھر کو چاندنی کے فرش والا گھر کہنے سے اس کی اصلیت نہیں بدلی جا سکتی ہے۔ جوئے خانہ ہے۔ وہاں جو کھیل ہوتا ہے اس میں پیسہ داؤں پر لگتا ہے، اتفاق سے جو بھی جیت جائے۔ نئے لوگ چانس کہتے ہیں اور تم جانتے ہو دینیات کی کتابوں میں نشہ لانے والی چیزوں اور اتفاق کی ہار جیت والے کھیلوں کا ایک ساتھ ذکر آیا ہے۔'

'مگر جوئے کے بعد، یعنی اگر یہ جوا ہے تو میں کہیں بھی بغیر شرمائے جا سکتا ہوں۔ یہ نہیں کہ جہاں جاؤں منتظر رہوں کہ کب شربت کا گلاس آئے گا، یا سموسے اور مٹھائیاں۔ یا کون سخی ایسا ہوگا جو فلم دکھانے لے جائے۔ اپنی ضرورتیں اب خود پوری کرتا ہوں۔'

اسے یاد آتا: ساتھی کہتے ہیں جوئے میں تمیز قسمت کا دھنی ہے۔

'اس میں خرابی کیا ہے! وہ نہیں قسمت کے دھنی ہیں کہ فرسٹ کلاس میں ریل کا سفر کرتے ہیں، فرسٹ کلاس میں فلم دیکھتے ہیں! ہوٹلوں میں چائے پیتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں!'

'تعجب ہے یہ خیال کہ قرآن کی اتنی سخت تنبیہہ کے باوجود تم جواری بنتے جارہے ہو تمہیں اس وقت نہیں ستاتا ہے جب جوئے خانے کا رخ کرتے ہو اور وہ بھی ویسا جواری جو فلموں میں دکھاتے ہیں جوئے خانوں میں کام کرتا ہے۔ دائمی گنہگار۔'

'مجھے پیسے کی ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں جانتا ہوں۔'

'ریلوے پلیٹ فورم کے قلی نہیں بن سکتے؟'

'اور رہوں گا کہاں؟'

تھوڑی دیر دماغ خاموش رہتا اور جو پڑھ رہا ہو سمجھ میں آنے لگتا۔

پھر اچانک دماغ پوچھتا 'اور وہ پیسے بھی وہیں سے آئے تھے جو تم نے اس فنڈ میں دیئے تھے جو پہلی بار شراب کا ذائقہ معلوم کرنے کے لیے حسن وارد ایمن، جگ موہن اور خسرون نے جمع کیا تھا؟'

'یقیناً —اور کہاں سے آتے! ان لوگوں کو پہلے سے معلوم تھا کہاں ملتی ہے؟ کتنے کی؟ پھر چاہے اُسے وہیں کھڑے کھڑے پی لو اور خالی بوتل کو کہیں بھی پھینک جاؤ کیونکہ کچے کانچ کی تو ہوتی ہے۔ یا کمپنی باغ میں لے جاکر پیو۔ ہم نے عزت والوں کی طرح پینے کا فیصلہ کیا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا پینے کے لیے گلاسز کہاں سے آئیں گے۔'

'پکے بدمعاش تھے۔ میں نے کہا تھا'' شیشے کے گلاس کیوں نہیں۔ سنا ہے دھل جائیں تو ناپاک نہیں رہتے۔''

اس پر خسرون نے کہا تھا:'' وہ تم گھر سے لے کر آؤ گے- اور پینے کے بعد واپس لے جاؤ گے۔ حسنو! مٹی کے بھلوے اچھے ہیں اور سستے، اُن میں پئیں گے اور پھوڑ کر خالی ہاتھ گھر چلے جائیں گے۔'' بدمعاش یہ بھی جانتے تھے بھلوے کہاں ملتے ہیں۔ آخر کو راجہ حافی ہی کے رہنے والے تھے۔

اس دن پینے والے بس چار تھے: ثروت، ایمن، تلمیذ اور جگ موہن۔

وہ پہلی بار پینے کا تجربہ دوسرے بہت سے پہلی بار کیے ہوئے انوکھے کاموں کی طرح تلمیذ کے ذہن میں جوں کا توں ہمیشہ موجود رہا۔ ایک مڑتی تڑتی تنگ گلی جس کی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں ہائی پاور کے بلب روشن تھے۔

ایمن نے ایک دکاندار سے اس طرح بات کی جیسے وہ اس بازار کا پرانا گاہک ہے۔ دکاندار نے اُسے ایک کپڑے کا بیچ کی بوتل جس کا رنگ ہلکا ہرا تھا تھمائی اور ایمن نے اُسے جمع کی ہوئی پونجی۔

کمپنی باغ میں کچھ دیر ادھر ادھر ٹہلنے کے بعد جیسے وہاں سیر کے لیے آئے تھے سب ایک پتھر کی بنچ پر بیٹھ گئے۔ ادھر آس پاس نہ سیر کے لیے آنے والے تھے نہ مالی۔ جگ موہن نے کاغذ کی تھیلی سے جو اس کے ہاتھ میں تھی چار کلہڑ نکالے۔ ثروت نے ایک چھوٹی بوتل جس میں پانی تھا ایمن نے برابر ناپ سے سب کو وہ چیز دی جسے وہ فخر سے بلیک ہورس کہہ رہا تھا۔

''اپنے ملک کی بنی ہوئی وائٹ ہورس۔''

پھر اس میں برابر مقدار سے پانی ملایا گیا۔ ''سب کے حصے کا ایک ایک پیگ۔'' ایمن نے کہا۔

پھر سب نے اٹھا کر چیئرز کہا اور پہلا گھونٹ لیا — اشتیاق سے اور ڈرتے ڈرتے۔

یہ طے تھا جب کوئی آدمی اس طرف آتا نظر آئے گا کلہڑوں کو سب اپنے پیچھے چھپا لیں گے اور تھوڑا آگے ہو کر بیٹھ جائیں گے۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ گرمی کی سہ پہر شام میں داخل ہو رہی تھی اور جب تک پارک میں چہل پہل شروع ہو سب وہاں سے نکل آئے تھے۔ کمپنی باغ سے نکل کر کاغذ کی تھیلی جس میں کلہڑ تھے اور پانی کی بوتل ایک برساتی نالے میں پھینک دی گئی۔

کافی دیر اس نیت سے سب سڑکوں پر پھرتے رہے کہ بو سے سانس اور نشے سے دماغ خالی ہو جائیں۔ آخر کار جب پھر پھر کر پنڈلیاں ٹوٹنے لگیں چاروں نے فیصلہ کیا اب گھر جایا جا سکتا ہے۔

اس رات بھانجے بھانجیوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنا اور کھانا اس کے لیے دشوار ہو گیا۔ کسی نے ناک تک نہیں سکیڑی جو اس کے سر کے بال جلانے پر وہ کیا کرتے تھے لیکن پورے وقت اُسے لگتا رہا اب سارا راز فاش ہوا چاہتا ہے۔ اُس رات وہ سخت سر درد لیے سویا اور سوچتا رہا کیا اسی کے لیے لوگ پیا کرتے ہیں!

خواب دیکھے ہوں گے لیکن شاید زیادہ ڈرانے والے نہیں تھے کیونکہ صبح اٹھ کر کسی نے نہیں کہا: 'ماموں جان آپ سوتے میں بڑبڑا رہے تھے۔' نہ آپا جان نے کہا: 'رات تمھیں کیا ہوا تھا؟' جس سوال کی اُسے امید تھی۔ حقیقت یہ تھی وہ اس گھر کے ماحول سے ڈرنے لگا تھا اور اس میں ماں کے گھر سے لایا ہوا بھی ایک خوف شامل ہو گیا تھا۔

تمیز کو ساری زندگی یاد رہا اس کی ماں کہتی تھیں: ''ایک وظیفہ ایسا ہے جسے پڑھ کر اگر سونے والے پر پھونکا جائے تو جو کچھ اس نے اپنے دماغ میں چھپا رکھا ہے اُسے سوتے ہی میں اگل دیتا ہے۔''

ماں کا یہ واحد روپ تھا جس سے وہ نینی پور کے زمانے میں ڈرتا تھا کیونکہ واقعی تب بھی اس کے سینے اور سر میں بہت سے راز تھے۔ باقی اماں بس محبت ہی محبت تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ نجانے کس وجہ سے اس کی سب سے بڑی خواہش پوری نہ کر سکیں اور اس کے منھ سے سن کر جھجک کر علیحدہ ہو گئیں تھیں۔ پوری ہونے پر وہ اس کی سب سے بڑی خواہش اُسے زندگی بھر انسان بنائے رکھتی۔

راجد حانی میں بڑی بہن کے گھر میں ایک ناپسندیدہ مہمان کی طرح رہتے ہوئے اس کا یہ خوف مستقل بڑھتا ہی رہا کیونکہ اس گھرانے کی پوری فضا ہی پُراسرار تھی۔

اُن کے یہاں اگر جھاڑو دی جا رہی ہو اور کسی کے پیر کو چھو جائے تو اس پر تھوتھو کرنا جھاڑو دینے والی پر فرض ہو جاتا تھا۔

اُن کے یہاں جو بڑیاں یا منگوچیاں پکتی تھیں نینی پور کی توڑی ہوئی ہوتی تھیں۔ اماں کہتی تھیں

"اس کے دل میں شک بیٹھ گیا ہے: جب ایک دن اس کے یہاں بڑیاں توڑی جا رہی تھیں اسی دن اس کا پہلوٹی کا بچہ گزر گیا تھا۔ تب سے اس کے لیے بڑیاں منگوچیاں یہاں سے جاتی ہیں۔ اپنی ساس کو بھی نہیں توڑنے دیتی تھی۔ وہ سیدھی عورت تھیں، جلتی بھنتی تھیں۔

بڑی بہن کے گھر میں دروازے کی چوکھٹ میں بھی پلنگ بچھا کر لیٹنے کی کسی کو اجازت نہیں تھی اور یہ تماشہ تو وہ روز ہی دیکھتا تھا: وہ منھ ہی منھ میں کچھ پڑھ رہی ہیں ساتھ ہی لڑکوں کی رول کول (Roll Coll) ہو رہی ہے، اور پہلا تمہ، چٹکی میں کچھ کر ان کے منھ میں دیتی جاتی ہیں۔

آہستہ آہستہ ان پُراسرار باتوں سے وہ ڈرنے لگا تھا — جیسے بڑی بہن حقیقت میں جادوگرنی تھیں۔

ان کے یہاں جب کھانے اور پڑھائی کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹتا تو بجائے اس کے کہ دماغ کی بندشیں کھلنی شروع ہوں اور اسے نیند آتی جب کہ خوف بجائے دھیما پڑنے کے بڑھتا جاتا کہ ایک وقت ہے جو اس سے دماغ کے سارے راز سوتے میں اگلوا لے گی۔

ویسے پڑھنے سے اسکولوں پر بھی جب وہ بھانجے بھانجیوں کے ساتھ بیٹھتا تو ڈرا رہتا تھا: سانس میں ہی ہونی ہوئی ہو، آواز میں تبدیلی، چہرے کی رنگت، کوئی گھڑی جاتی ہے سب پوچھا کریں گے — کہاں گیا تھا؟ کیا کھایا پیا، کیا کیا کیا؟ یا ہو سکتا ہے خواب میں بولنے لگوں جیسے اور بچوں سے ہوتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود نیند مدد کو آ جاتی تھی۔

پھر یہ خوف کہ بڑی آپا اپنے وظیفے سے سوتے میں اس کے منھ سے اس کی زندگی کے سب راز اگلوا سکتی ہیں اگر ایسا تھا جیسے کوئی معمولی چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو تو کمپنی باغ کے اس تجربے کے بعد وہ بڑھ کر ایسا ہو گیا ہو جیسے دہشت پسندوں کے ساتھ ریل کی پٹری پر بم لگاتے شہنشاہ برطانیہ کی پولیس نے دیکھ لیا ہو۔

اگلی صبح اسکول کے لیے گھر سے نکلتے ہوئے اس نے فیصلہ کر لیا" یہ کام اب نہیں کرنا ہے۔ اگر وہ لوگ سر ہوں گے تو کہ دوں گا پیسے نہیں ہیں۔ وہ کہیں گے: پیسے نہیں ہیں تو بنا لو تو

کہہ دوں گا نہیں میں قرآن ہاتھ میں لے کر قسم کھا چکا ہوں آئندہ پینی نہیں ہے۔'
اس پر وہ لوگ مجھ سے کٹ جائیں گے، بولنا چھوڑ دیں گے۔
خیر کوئی اور بہانا کر دوں گا، اس نے پہاڑی سے گزرتے ہوئے ایک پتھر کو ٹھوکر مارتے ہوئے خود سے کہا۔

وہ عہد ساتویں کلاس کا یاد آنے پر ہمیشہ ایسا لگا جیسے آج کیا ہو — غلطی کو تسلیم کر کے اس سے دور رہنے کا مصمم ارادہ۔ اور گو وہ عہد پائیدار ثابت نہیں ہوا لیکن تملیذ کو ہر بار اس سے اس دن ہی کا سا سکون محسوس ہوا۔

آنے والے دنوں میں وہ کہتا: 'اے خدا تو جانتا ہے میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے خرابیوں سے دور رہنے کی۔ اگر میں ہر بار اپنی کوشش میں ہارا اور پہلے سے زیادہ گہرائی میں ہر بار گرا تو کیا تو میری کوشش اور ارادے کو نہیں دیکھے گا اور مجھے معاف نہیں کرے گا؟ میرا خیال ہے کوشش کی بنیاد پر بھی تیرے بندے تیرے یہاں بخشے جاتے ہوں گے۔'

اگر گھر میں نہ آپا جان ہوں نہ بڑے بھائی جان تملیذ اپنے بھانجوں بھانجیوں سے کہتا:
''گانا سنو گے؟''
اُن کے ہاں کہنے پر وہ بتاتا 'یہ گانا فلاں فلم کا ہے جو آج کل المشتہر تا کیز میں چل رہی ہے۔ اس میں جس لڑکی نے کام کیا ہے اتنی خوبصورت ہے کہ ملک کی ہر ریاست، رجواڑے کا نواب یا راجہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی ماں نے کہہ دیا ہے: لڑکی کی شادی اس سے کرے گی جو ایک لاکھ روپے پہلے دے، پھر ہر مہینے دس ہزار روپے۔'
ان باتوں کو سنتے ہوئے بھانجوں، بھانجیوں کی آنکھیں پھٹی ہوتیں۔ ایک بھانجی نے پہلی بار یہ بات سن کر کہا تھا ''شادی کے لیے اتنے روپے چاہیے ہوتے ہیں ماموں جان!''

اس سے بڑی نے کہا: ''اتنے پیسے کون دے گا ہماری اماں بی کو کہ وہ اُسے بھائی صاحب کے لیے لے آئیں!''

''تمہارا خیال ہے اگر تمہاری اماں بی اتنے پیسے اسے دیں بھی تو وہ اس گھر میں آنا پسند کرے گی!''

سب چپ ہو گئے اور تمیزہ کے چہرے کو دیکھتے رہے۔

''وہ لڑکی ہیرو کو یاد کر کے گا رہی ہے۔''

چھوٹی لڑکی کی نظریں دروازے پر تھیں کہ اماں بی اچانک نہ داخل ہوں۔

کبھی کبھی وہ گانے کے ساتھ ٹھمکا بھی لگا کر دکھاتا۔

گانے اور فلموں کے مکالمے سنتے سنتے سب کو یقین ہو گیا تھا ان کا یہ ماموں جو اکثر ان کے باپ کے ہاتھوں پٹتا ہے ایک نہ ایک دن خود فلموں میں کام کرنے لگے گا جس سے ملنے وہ اسٹوڈیوز کے شہر جایا کریں گے جہاں فلمیں بنتی ہیں۔ اور فلمیں کیا ہوتی ہیں؟ ایسے فوٹو جو چلتے پھرتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں۔ اس شہر میں تین تین چار، چار منزل والی عمارتیں ہیں، اور سمندر جس میں جہاز چلتے نظر آتے ہیں، جابجا سینما ہال اور تھیٹرز ہیں۔ فلموں میں کام کرنے والی خوبصورت عورتیں، خوب صورت مرد شام کو سمندر کے کنارے ٹہلا کرتے ہیں۔

تمیزہ نے انہیں فلمی رسالے بھی دکھائے تھے جنہیں وہ چھپا کر اپنے بستے کے بکس میں رکھتا تھا۔ آپا جان یا ان کے شوہر کو بھی اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ اُسے بکس کھول کر، اس کے اندر کیا ہے، دکھانے پر مجبور کرتے۔

بھنوئی نے اُسے جمعہ کی نماز کے لیے چلنے پر بھی مجبور کرنا چھوڑ دیا تھا۔

ایک دن تمیزہ نے عجیب حرکت کی۔ جب گھر میں نہ بھنوئی تھے نہ بڑی آپا اس نے

بھانجوں بھانجیوں کو ساتھ ناچنے کے لئے کہا: ''آؤ میں تمہیں سکھاؤں'' اور وہ بے معنی لفظ منھ سے نکالنے لگا جو اس نے فلموں میں ڈانس کے ساتھ سنے تھے۔

پھر جب وہ جلد ہی تھک کر تخت پر بیٹھ گئے تو اس نے کہا ''تم لوگ فلم میں کام کرنے کے لائق نہیں ہو، دو ٹھمکیوں میں تھک گئے۔ تم اس لائق بھی نہیں ہو کہ فلم دیکھو۔''

پھر اس نے کہا ''تمہیں منظور یاد ہے؟''

بڑے بھانجوں نے کہا ''منظور؟''

''نہیں منظور بھائی جان کہو۔ تم سے بڑے تھے۔ جانتے ہو وہ اب کہاں ہیں؟''

بچوں نے خوف زدہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ کہانی انہیں وراثت میں ملی تھی اور پشتہا پشت چلتی۔

''جنت میں۔ جہاں ہر محبت کرنے والا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد اس کی روح دوسرے میں جاتی ہے جسے مرنے والا چاہتا ہو۔ مجھ میں ہے اس کی روح۔ تم اپنی اماں بی کو میرے لیے کہتے نہیں سنتے ہو: بنا بنایا منظور ہے۔''

بچے سہم گئے۔

اس شام بہنوئی نے اُسے سوتے سے جگا کر پہلی بار کہا ''اسی وقت گھر سے نکل جاؤ۔''

''کہاں جاؤں؟''

''جنت میں'' ان کے مُنھ سے بے اختیاری میں نکلا۔ ''نہیں جہنم میں، جہاں منظور گیا۔''

بہن نے پاس آ کر انہیں سو رہنے کے لیے کہا۔ تلمیذ بھی سو گیا۔

چھٹیوں میں جب تلمیذ گھر جانے لگتا تھا تو بھانجوں بھانجیوں سے کہہ کر جاتا تھا ''اپنی ماں کے گھر جا رہا ہوں، دیکھ لینا وہاں سے موٹا اور طاقت ور ہو کر آؤں گا۔ تمہیں بھی طاقت ور بننا ہے تو چھٹیاں گزارنے نانا کے گھر جایا کر، وہاں تمہیں اصلی کھانا ملے گا۔ پراٹھے، سموچا مرغا بُھنا ہوا۔ یہاں کیا ہے سوکھی روٹیاں، ابلے چاول جنہیں تمہاری اماں خشکا کہتی ہیں۔ سدا یہاں

رہے تو میری طرح سوکھتے جاؤ گے۔"

وہ چاہتا تھا اس کے چلے جانے کے بعد ساری باتیں وہ اپنی ماں سے کہیں اور وہ رات کو اپنے شوہر سے اور دونوں خوب جلیں۔

حقیقت بھی یہی تھی جتنے دن وہ مینی پور میں رہتا تھا کھانا روز زور وشور سے پکتا تھا کہ بیٹا گھر آیا ہے۔ اس معاملے میں تلمیذ کے باپ کی مرضی نہیں چلتی تھی۔

ابا اس سے بس سرسری سی بات کر لیتے تھے۔ زیادہ وقت اس کا ماں اور بہن بھائیوں کے ساتھ گزرتا تھا۔

ایک دن فجر کی نماز کے بعد جب وہ تخت پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں اور ناشتہ ابھی بننا شروع نہیں ہوا تھا عادت کے مطابق تلمیذ ان کی گود میں سر رکھے لیٹا تھا۔ اس دن اس کا ارادہ ان سے اپنا دل کھول دینے کا تھا۔ یہ نہیں کہ مجھے بہن کے گھر سے نجات دلایئے بلکہ ایک اور بات کہنے کا جس کا ارادہ وہ بہت دن سے کر رہا تھا۔

جب ان کا تسبیح پڑھنا تھما اور وہ دعا پڑھ کر اس پر پھونک چکیں اس نے اچانک کہہ ڈالا:

"آپ کو تسنیم کیسی لگتی ہے؟"

آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اُن کی اس کے بالوں میں چلتی ہوئی انگلیاں رک گئیں۔

"تمہارے تائے ابا کی لڑکی؟"

اس نے سر ہلایا۔

"آئندہ یہ بات زبان پر مت لانا۔" انہوں نے اس کا سر گود سے اٹھا کر سخت تخت پر رکھ دیا۔ اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

بعد میں اُسے ہمیشہ خیال آیا' مجھے امید تھی وہ مسکرائیں گی کہ بیٹا اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اپنے لئے لڑکی پسند کر لی ہے لیکن ان کا رویہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا میں نے کوئی بہت بری بات کہہ دی تھی؟ یا یہ کہ وہ بھی ابا کی طرح اسی نتیجے پر پہنچی تھیں کہ میں بگڑ گیا ہوں؟'

مجھے امید تھی بات آگے بڑھے گی' اور اگر قسمت نے یاوری کی تو ہوسکتا ہے اتوار کا دن وہاں

گزارنے لگوں۔'

اس دن ماں کے اس بے ساختہ جملے نے ایک اور چیز تمیز کو دماغ کے صندوق میں رکھنے کے لئے دی تھی: تسنیم سے یا کسی بھی لڑکی سے محبت زبان پر لانے کی چیز نہیں ہے۔ خاص طور سے بزرگوں کے سامنے۔

ایک شام وہی نوکر اترا ہوا چہرہ لیے بڑی آپا کے گھر پہنچا جو پانچ سال پہلے تمیز کو وہاں چھوڑنے آیا تھا۔ اسی رات وہ بڑی بہن کے ساتھ اپنے گھر گیا۔ اگلی صبح ماں کا دفن تھا۔ اس کے چہرے پر جو لکھا تھا وہ باپ کو نظر نہیں آیا کہ وہ اُسے سینے سے لگاتے۔

اس سوگوار فضا میں باپ نے بس اتنا کرم کیا وہ سب باتیں نہیں دہرائیں جنہیں وہ بڑی بہن سے سنتے اور بہنوئی کے خطوں میں پڑھتے آئے تھے۔ لیکن ماں کے کھو بیٹھنے پر انہوں نے اس کی دلجوئی بھی نہیں کی۔ اُسے توقع تھی وہ اسے چمٹا کر کہیں گے: "تم جلدی جلدی تعلیم مکمل کر کے نینی پور لوٹ آؤ اور جو تھوڑی بہت جائیداد ہے اس کا انتظام سنبھالو۔ یہاں میں تنہا رہ گیا ہوں۔"

باپ سے اُسے کوئی شکایت اس سلوک کی نہیں ہوئی۔ ماں سے بس اتنی شکایت اسے پہلے سے تھی: وہ ان کے منھ سے بڑی بہن، بہنوئی کی برائی سننا چاہتا تھا مگر وہ نہیں کرتی تھیں۔ کہتی تھیں تو بس اتنا "راجد حانی جا کر میرا بیٹا مرجھا گیا ہے۔"

ماں کے بعد چھٹیاں اس کے لیے یکساں تھیں۔ باپ کے گھر جائے یا بہن کے گھر رہے۔ گھر جانے پر اس کے لیے کوئی چیز اس کی پسند کی نہیں بنتی تھی نہ کوئی دیکھتا تھا اس نے ٹھیک سے پیٹ بھر کھایا بھی یا نہیں۔ باپ کو اس کی بھی فکر نہیں تھی یہ شیروانی جو نجانے کتنے سال سے وہ پہنے ہے اُنگی ہوگئی ہے اور بدرنگ، بٹن تک سلامت نہیں ہیں۔ نئے کپڑے چاہیے ہوں گے۔ ان کے نزدیک شاید جتنا جسم لے کر وہ پہلی بار بڑی بہن کے گھر گیا تھا ابھی تک اتنے کا اتنا تھا۔

ایک اور دردناک بات ہوئی: پہلے جب وہ اسے نصیحتوں کے پردے میں ڈانٹ رہے ہوتے تھے ماں اس کی حمایت میں بول اٹھتی تھیں، اب وہاں ایسی کوئی ہستی نہیں رہ گئی تھی۔ لگتا تھا ماں کے رخصت ہوجانے نے نینی پور سے اس کا رشتہ منقطع کردیا ہے۔ اس سوگوار ماحول

سے جو ایک یاد خوشی کی وہ اپنے ساتھ لیے راجد حانی لوٹا تھا وہ تایا ابا کی بیٹی کی تھی۔ دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی۔ وہ وہاں ہوگی جہاں عورتوں میں رونا دھونا پڑا تھا اب اس وقت بالکل اس کے پاس کھڑی اس سے پوچھ رہی تھی ''تمھیں بہت دکھ ہوا تمکین بھائی۔''

اس کے سوا وہ وہاں سے کیا لیے لوٹا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا تو وہ کہتا 'کچھ نہیں' یا یہ کہ 'بغیر ماں کے میرے بیٹنے اور سر پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونکنے کے وہاں سے لوٹا ہوں۔ اب وہاں ہزار بار جاؤں، ہزار بار وہاں سے نکلوں کوئی آیت الکرسی پڑھ کر دم نہیں کرے گا'

راجد حانی لوٹ کر پہلی رات خود کو اپنی چار پائی کے سپرد کرنے پر اسے ایک خیال دکھ دے رہا تھا: 'نہ بڑے بھائی جان کو یہ خیال آئے گا۔ نہ آپا جان کو کہ ماں کے کھو بیٹھنے پر یہ دکھی ہوگا۔ نہ دونوں میں سے ایک بھی اس کے برابر میں پلنگ پر آ کر دو گھڑی کو بیٹھے گا اور اس کے سر پر دھیرے دھیرے ہاتھ چلاتے ہوئے کہے گا: ماں بہت یاد آ رہی ہیں؟ رو تو نہیں رہے ہو؟ اور اس خیال نے جیسے دنیا سے اس کی توقعات کو ختم کر دیا اور چند ہی لمحوں میں وہ گہری نیند میں تھا۔

دماغ کی جس دنیا میں وہ دوبارہ واپس نہیں جانا چاہتا تھا وہ شراب کے اس پہلے تجربے کے بعد کی تھی۔ لیکن ماں کے انتقال کے بعد جب وہ غمگین صورت لیے مینی پور سے لوٹا تو دوستوں نے فیصلہ کیا اُسے غم کے منانے کی ضرورت ہے اور زبردستی اس تنگ گلی میں لے گئے، اپنے خرچے پر۔ بعد میں اُسے احساس ہوا زبردستی وہاں لے جائے جانے والا خیال گناہ کی شدت کو کم کرنے کے لیے ہے اور اس سے سکون نہیں ملے گا۔ 'زبردستی نہیں اس میں میری بھی منشا تھی۔ جیسے اتنے دن سے میں اس چیز کے لیے ترس رہا تھا۔ بہتر یہ ہے دعا میں مان لوں گناہ میں نے کیا ہے اور کہوں مجھے معاف کر دے' لیکن ہوا کیا کہ اس کے بعد دوستوں میں سے کسی کو، کسی کو راضی نہیں کرنا پڑتا تھا۔ جب بھی جیب میں پیسے ہوئے ادھر کا رخ کرتے تھے۔

کمپنی باغ میں عزت دار بھی آتے تھے اور بقول ایمن کے ہم جیسے گرے پڑے بھی۔ بڑے لوگوں کے ساتھ قبائیں بھی ہوتی تھیں جن میں سے دو ایک کو تلمیذ بھی پہچاننے لگا تھا۔ وہاں ایک گوشے میں بیٹھے لڑکی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہے ہیں، جیسے کنج میں بیٹھے ہیں اور کسی کی نظر ان پر نہیں پڑے گی۔ لڑکی کبھی کبھی کہہ اٹھتی تھی: ''ہٹو تمیز سے بیٹھو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ مجھے بھی بدنام کراؤ گے۔'' اس کی ایک ایک بات پر وہ نواب طالع آزما ہوں یا لالہ منسکھ رام، نہال ہوئے جا رہے ہیں۔

کئی دفعہ ایسا ہوا حسن وارد یا خر وان نے لڑکی کو دیکھ کر ایک دوسرے سے کہا: ''پہچانے کون ہے؟'' اور اس کے کہنے سے وہ دوسرے کو بھی شکل سے جانی پہچانی لگنے لگتی۔ ''ارے یہ تو وہی ہے جو شام کو بازار میں بنی ٹھنی راہ چلنے والوں میں سے کسی کو ٹھینگا دکھاتی ہے کسی کے لیے سینے پر ہاتھ رکھتی ہے۔''

''اچھی خاصی عمر کی ہے۔ یہاں کمپنی باغ میں اٹھارہ انیس کی لگ رہی ہے۔ بازار میں کوٹھے سے نخرے دکھاتی ہوئی بیس پچیس کی اور پاس جاؤ، بالکل پاس تو پتہ چلتا ہے اپنے سے عمر میں دگنی ہے۔ تیس بتیس کی۔''

''کمپنی باغ کی ہوا کا اثر ہے۔ بڈھوں کو جوان کر دیتی ہے۔''

ہر برائی اور جرم میں جانتے بوجھتے داخل ہونے کے لیے پہلا قدم ہی سب سے مشکل ہوتا ہے اور جب آدمی وہ پہلا قدم ہمت کر کے اٹھا ہی لے تو پھر کوئی گناہ گناہ نہیں رہتا ہے، نہ کوئی جرم، جرم۔ تلمیذ اس دور پر نگاہ ڈالتے ہوئے خود کو ویسا ہی انسان پاتا تھا جو پہلا قدم اٹھا

چکا تھا اور یہ نہیں سمجھ پا رہا تھا آگے صرف اس وقت تک سکون ہے جب تک وہ اس نئی روش پر چلتا رہے۔ رکنے کی صورت میں پچھتاوے کا بھوت دل اور دماغ پر سوار ہو جاتا ہے، اور وہ بہت اذیت دینے والا بھوت ہے، یہ وہ جانتا تھا۔

رات کو لمبائی میں بچھائی ان تین شیٹوں پر بھانجوں بھانجیوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھتے ہوئے وہ کیفیت مٹ چکی ہوتی تھی جس کی کشش اُسے اس تنگ گلی میں لے جاتی تھی اور اس کی جگہ یہ دبدھا لے لیتا جو میں پڑھ رہا ہوں وہ دماغ کے اندر بھی اتر رہا ہے یا اس کی رسائی صرف آنکھوں تک ہے۔ لکھنا چاہتا تو لکھنا دشوار ہوتا۔ اُن کے نزدیک ہو کر بیٹھنے میں راز کے افشاں ہونے کا اندیشہ وہ جان گیا تھا بے اساس ہے۔

ان پچھتاوے کے دنوں میں بھی جب اکثر اُسے اپنی ذات سے نفرت محسوس ہوتی تھی ماں سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے کا سین اس کے دماغ کو سوتے میں گھیر لیتا تھا،'اب اپنا وہاں کون رکھا ہے جس کے لیے وہاں جاؤں' پھر اُسے دکھ ہوتا ہمیشہ کی طرح ماں نے اس کے اس راز کو بھی صرف اپنے تک رکھا ہوتا، شاید آگے چل کر وہ میری خواہش کو تایا ابا اور تسنیم تک پہنچا دیتیں، پھر اسے وہی آواز سنائی دیتی: ''تمھیں بہت دکھ ہوا تلمیذ بھائی۔'' اور اس کا چہرہ نظر آ جاتا۔

(۷)

بارشوں میں ہمیشہ کی طرح وہ گرمیوں کی کچھ چھٹی گھر گزار کر آیا تھا کہ بہنوئی کے نام آنے والے ایک تار سے پتہ چلا: عتیق الرحمن رحلت کر گئے۔ سبب: فالج۔

باپ اس سے کبھی نزدیک نہیں رہے تھے۔ اتنے بچوں کا باپ پہلے اور آخری بچے کے سوا باقی اولاد میں سے کم ہی کے دل میں گھر کر سکتا ہے۔ ایسے گھر میں بچے بھی اس پر کبھی غور نہیں کرتے ہیں یہ شخص اگر کل نہ رہے تو جو ہم کھاتے پیتے ہیں، پہنتے اوڑھتے ہیں وہ کہاں سے آئے گا۔ وہ بچے جو یہ سب سوچنے کے عادی ہوتے ہیں انہوں نے غریبی کا لفظ ماں باپ سے سنا ہوتا ہے اور وہ ایک ایک چیز کی فکر کیا کرتے ہیں۔ وہ چیزوں کو سنبھال کر رکھنے کے عادی ہوتے ہیں اور اس سے بھی جو ان چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے چاہیے ہوگا۔ چاہنے پہ ہر چیز اسی آن نہیں مل جاتی ہے یہ ان کی سمجھ میں پڑا ہوتا ہے۔ ان گھروں میں بڑے بچے اس کی بھی فکر کرتے ہیں چھوٹے کیوں رو رہے ہیں؟ پیٹ خالی تو نہیں ہے؟ یا کہیں درد ہے؟ اگر درد ہے تو چوران کی بوتل سے نکال کر گولی دیتے ہیں، رونے والے کو بہلاتے ہیں۔

حمید کے گھرانے میں پیسہ برستا نہیں تھا پھر بھی خرچ اللے تللے تھا۔ پانچ لڑکیاں اور پانچ لڑکے اس ٹھاٹ باٹ کے حق دار تھے جو عتیق الرحمن چھوڑ کر رخصت ہوئے تھے اور جو شاید

زیادہ نہیں تھا۔ زمین بہت تھوڑی تھی، دونوں ڈبہر (تالاب) بھی اسی زمین کا حصہ تھے۔ رہا عتیق الرحمن کا ذاتی مکان وہ اس لیے سالہا سال سے بند پڑا تھا کہ کنبے کے لیے ناکافی تھا اور اس کا کچھ حصہ ڈھے بھی چکا تھا۔ اولاد میں سے شادی صرف دو بڑی لڑکیوں کی ہوئی تھی۔ اُن کے ایک طویل عرصہ بعد تمیز نے دنیا کی شکل دیکھی تھی۔ بیچ میں آ کے جھانک کر چلے جانے والے بچوں کی صحیح تعداد نہ اس کی ماں کو یاد تھی نہ باپ کو معلوم۔ لڑکیوں میں سے ایک نے بھی اسکول کی صورت نہیں دیکھی تھی لیکن تھیں سب پڑھی لکھی یا زیر تعلیم۔ گھر سے صرف بڑا لڑکا تعلیم کے لیے نکالا گیا تھا۔ نمبر دو ذہین نہیں تھا اور باقی اپنی بہنوں کی طرح گھر پر ہی پڑھ رہے تھے۔

تمیز کے تایا کا عتیق الرحمن کے گھرانے سے بس اتنا رشتہ تھا جو اُن پیڑ پودوں میں ہوتا ہے جن کی ایک شاخ کاٹ کر دوسرے میں لگا دی جاتی ہے اور وہاں جڑ پکڑ لیتی ہے۔ وہ راجہ حانی میں رہ رہے تھے اور زندگی سے مطمئن تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی نے نئی پور نہیں چھوڑا اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا اپنے وسیع کنبے میں وہ ناخوش تھے۔

مذہبی زندگی میں سرمو جنبش کرنے پر آمادہ نہ ہونے کی بنا پر وہ دوسروں کے لیے ہمیشہ سے باعث رنج رہے تھے۔ موسیقی اپنی ہر شکل میں ان کے یہاں ممنوع تھی۔ چنانچہ عتیق الرحمن کی دوسری بیٹی کے نکاح کے وقت وہ پنڈال سے اس وقت اٹھ کھڑے ہوئے تھے جب بارات نے اپنی آمد کی اطلاع ڈھول تاشے باجے سے دی تھی۔ وہ اگر کسی کے قرضدار نہیں تھے تو کسی کو قرضہ دیتے بھی نہیں تھے۔ ہمیشہ سب سے لیے دیے رہے۔ اس لیے جب تمیز کے مستقبل کا فیصلہ ہونے جا رہا تھا عتیق الرحمن نے دس بیس خوش حال گھروں کے قصبے نئی پور سے اُسے نئے پرانے دو قلعوں، شاہی باغوں، ہندو مسلم لانوں یعنی راجہ حانی والے شہر بھیجتے وقت اس کا امکان ہی نہیں سمجھا کہ وہ ان کے بڑے بھائی کے گھر رہ کر بھی اپنی دنیا اور عاقبت سنوار سکتا ہے۔ وہ ان کی زہد و تقویٰ کی زندگی میں حارج ہوتا۔

دفن کے بعد عزیز الرحمن بس ایک دن اپنے مرحوم بھائی کے گھر رکے۔ بیوی اور بیٹی کو وہ

دفن کے بعد پہلے ہی دن واپس گھر بھیج چکے تھے۔ اگلے دن جب باقی رشتے دار جا چکے تھے۔ سوکھی ساکھی رسومات نہ پہلے دن کسی کو بھائی تھیں نہ اگلے دن نظر آتا تھا فاتحہ خوانی ہوگی، شام کو سب قبر پر فاتحہ پڑھنے جائیں گے، ماں اور باپ دونوں کی قبروں پر پھول رکھیں گے، تین دن گھر میں کھانا نہیں پکے گا، دوسرے بھیجیں گے۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے انہوں نے بھتیجوں بھتیجیوں کو اپنے سامنے دری پر بیٹھنے کو کہا اور جب سب مودب ہوکر بیٹھ گئے انہوں نے بتایا باپ کے ترکے میں سے کس کا کتنا حق ہے۔ شادی شدہ بیٹیوں کا بالکل بھی نہیں، اگر باقی وارث چاہیں انہیں اپنے ورثے میں سے کچھ دے سکتے تھے، اور مرحوم کے استعمال کی چیزوں میں سب کا حصہ تھا بشرطیکہ وہ انہیں یادگار کے طور پر رکھنا چاہتے ہوں۔ چومنے اور آنکھوں سے لگانے کے لیے نہیں، جو شرک ہوتا، باپ سے محبت کا اظہار نہیں۔ رونے کو وہ سب کو پہلے ہی دن منع کر چکے تھے۔ قرآن مجید کی رو سے کس کا کتنا حصہ بنتا ہے اس کے لیے انہوں نے آیات کا پڑھنا غیر ضروری سمجھا کیونکہ شاید ہی کسی نے قرآن لفظ بلفظ سمجھ کر پڑھا تھا۔

اس مختصر گفتگو کے بعد انہوں نے کہا ''تم لوگ طے کرلو تم میں سے کون عتیق الرحمٰن کی پس انداز کی ہوئی رقم اور ماں کے گہنوں کو اپنی تحویل میں لے کر اس کی تقسیم کرے گا۔'' سب چپ رہے۔ چھوٹے بھتیجے بھتیجیاں ان کے چہرے کو دیکھتے رہنے سے اکتا گئے تھے۔ اس میں نہ دلاسا تھا نہ شفقت۔

دونوں بڑی لڑکیوں کو مصیبت اپنی طرف آتی محسوس ہوئی۔ بڑی کو جب پتہ چلا اپنے حصے کا ترکہ وہ اپنی شادی کے موقعے پر لے چکی ہے تو اسے تایا سے اور ان سے بڑھ کر باپ سے نفرت محسوس ہوئی۔

عزیز الرحمٰن نے کہا ''کلثوم تم سب میں بڑی ہو، یہ کام تمہیں کرنا چاہیے، تمہارے شوہر آفس سپرنٹنڈینٹ ہیں، لکھا پڑھی وہ کر سکتے ہیں۔''

کلثوم نے اپنا غصہ چھپاتے ہوئے کہا: ''تائے ابا میرے پاس دماغ کہاں اور رہے یہ، اُن کے پاس اتنا وقت کہاں۔''

''زینب تم؟''

یہی رائے منجھلی کی ہوئی۔

''ٹھیک ہے تو یہ کام مجھے کرنا پڑے گا۔ اس میں زیور بیچنے کا کام بھی ہے اور حکومت سے مرحوم کی پنشن وغیرہ کی رقم وصولنے کا کام بھی۔ بڑی لڑکیاں چاہیں تو اپنی ماں کا زیور لے لیں اور اس کی رقم باقی ورثا کو دے دیں۔''

بڑی نے منجھلی سے دبے لفظوں میں کہا: ''میرے پاس کیا ہے دینے کو''

منجھلی نے کہا: ''اور میرے پاس بھی کون سا ہے۔''

''میں ماہانہ لڑکوں کی پڑھائی کا خرچہ انہیں دیتا رہوں گا۔ جو بچ رہا وہ بالغ ہونے پر یا پڑھائی ختم ہونے پر یکمشت۔ لڑکیوں کا ماہانہ خرچہ اور جو ان کی شادیوں پر خرچ ہوگا اس گھر کے کرایے سمیت تمہیں ملتا رہے گا۔''

گفتگو کے آخیر تک وہ اپنی گھڑی شیروانی کی جیب سے نکال کر کئی بار دیکھ چکے تھے۔

''چاہو تو یہ سب کام تمیزیہ کے سپرد کر دو۔ میں مکروہات زندگی سے پرے رہنا چاہتا ہوں۔''

دونوں بڑی لڑکیوں نے ساتھ ساتھ کہا ''نہیں وہ نہیں۔''

سب نے نفی میں سر ہلایا۔ بات سمجھ میں نہ آنے پر چھوٹے بچے اٹھ کر پہلے ہی چل دیئے تھے۔

''آخری سوال۔ تم سب اسی گھر میں رہنا چاہتے ہو یا وہاں میرے نزدیک کرایے پر گھر لے کر رہو گے؟''

کسی نے جواب نہیں دیا۔

حاجی عزیز الرحمن نے فرش سے اٹھتے ہوئے کہا ''فی امان اللہ۔ میری ٹرین کا وقت ہو گیا ہے۔''

تیسری اور چوتھی بھتیجی کی بات کہ ''تایا ابا کھانا تیار ہے'' انہوں نے نہیں سنی۔

(۸)

راجہ حانی پہنچنے کے تیسرے دن جب شام کو تمیز فٹ بال کھیلنے کے لیے باہر جانے کا ارادہ کر رہا تھا سب سے بڑے بھانجے نے آ کر کہا "ماموں جان آپ کو ابا بلا رہے ہیں۔"

بڑے بھائی جان یعنی سپرنٹنڈنٹ صاحب اپنی بیٹھک میں لکھنے پڑھنے کی میز پر ایک موٹی کتاب اپنے سامنے کھولے بیٹھے تھے۔ چشمہ درست کرتے ہوئے انہوں نے تمیز کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے جو وہ کہنے جا رہے ہیں اُسے اس کے دل دماغ میں سیدھا اتارنے کا عزم رکھتے ہیں۔ بولے:

"تمیز تم کس کلاس میں ہو؟"

"جی بھائی جان؟" سوال تمیز کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"میں پوچھ رہا ہوں تمہیں یہاں رہتے ہوئے پانچ سال ہو گئے، کس کلاس میں پہنچے ہو؟"

"آٹھویں پاس کر کے نویں میں آیا ہوں۔ ابھی پڑھائی شروع نہیں ہوئی ہے۔"

"میں۔ نے۔ اور۔ تمہاری۔ بڑی۔ آپا۔ نے۔ فیصلہ۔ کیا۔ ہے۔" انہوں ہر دو لفظوں کے درمیان علامت ربط (hyphen) لگاتے ہوئے کہا "اس۔ سے۔ زیادہ۔ ہم۔ تمہیں۔ نہیں۔ رکھ۔ سکتے۔ ہیں" ساتھ میں ہر لفظ کے ساتھ وہ کلمے کی انگلی سے کھٹ کھٹ کرتے جا رہے تھے۔ تمیز پر اس جملے کا وہ اثر ہوا جو باپ کی موت کی خبر دینے والے تار کا ہونا چاہیے تھا، مگر نہیں ہوا

تھا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر جیسے الفاظ ڈھونڈ رہا ہو تمید نے کہا ''پھر میں کہاں جاؤں گا!''
بہنوئی نے عینک اتار کر کتاب پر کھڑی کی اور بولے: ''اگر تم خدا کو مانتے ہوتے تو میں کہتا: خدا کی اتنی بڑی دنیا ہے، اس میں اپنی جگہ ڈھونڈ لو۔ مگر تم مذہب سے باغی ہو اس لیے کیا کہہ سکتا ہوں۔''
''میں تو خدا کو مانتا ہوں۔ اُس سے باغی نہیں ہوں'' اس نے بہنوئی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس سے بڑا حربہ اس کے پاس نہیں تھا۔
''ہوں! نماز ایک وقت کی نہیں پڑھتے ہو؟ روزہ رکھتے ہو اور دن بھر اُسے اتارتے رہتے ہو!''
اس اثنا میں بڑی بہن صحن سے بیٹھک میں کھلنے والے دروازے کا پردہ اٹھا کر وہاں آن کھڑی ہوئی تھیں اور دیکھ رہی تھیں جو ان میں اور سپرنٹنڈنٹ صاحب میں طے ہوا تھا اسے وہ کس طرح تمید کے کانوں میں اتار رہے تھے۔ ان کے خون میں وہ زہر ابھی تک دوڑ رہا تھا جو تایا ابا کے انہیں باپ کے ترکے سے محروم کرتے وقت پیدا ہوا تھا۔ پھر یہ بھی تھا ترکے کی تقسیم، مکان کا کرایہ اور تعلیم کے خرچے کا ذکر تو آیا تھا تایا ابا نے یہ نہیں کہا تھا تمید کے ان کے گھر میں رکھنے کے اخراجات کون بھرے گا؟ اور وہ خود یہ سوال اٹھانا بھول گئی تھیں۔
تمید کو آنسو امنڈتے ہوئے محسوس ہوئے اور جانتا تھا اگر مزید کچھ کہا تو گلا رندھ جائے گا۔ تھوڑی دیر اس عدالت میں کھڑے رہنے کے بعد وہ اچانک پلٹا اور دروازے میں بڑی آپا سے ٹکراتا ہوا باہر صحن میں نکل آیا۔
''اس پر مطلق اثر نہیں ہوا۔ تم کہتی تھیں رو پڑے گا۔ پیر پڑے گا اور کہے گا مجھے مت نکالیے کہاں جاؤں گا۔''
''میں نے یہ تو نہیں کہا تھا'' پھر تھوڑی سی خاموشی کے بعد انہوں نے کہا ''اس کی اکڑ سے یہی پتہ چلتا ہے گھر لوٹ جائے گا، یا گلاب باڑی۔ زینب کے گھر۔''
''دریا کا رخ نہیں کرے گا؟''
آنے والے وقت میں تمید اس نتیجے پر پہنچا: میں پہلے خدا کو مانتا تھا۔ اس دن بڑے۔۔۔

بھائی جان کے فتوے نے مجھے بتایا میں لامذہب ہوں۔ وہ نہ کہتے تو شاید خود کو دین پر سمجھتا رہتا۔ اس دن میرے ذہن میں یہ بیٹھ گیا اُن کی، اور ان کے بڑے بھائی کی طرح اٹھنا، بیٹھنا، ویسی وضع قطع رکھنا، ان کی طرح میوزک اور بہت سی چیزوں سے بیر رکھنا مذہب پر ہونا ہے، اُن سب کے بغیر دل کے اندر کا ایمان، ایمان نہیں۔ میں لامذہب تھا، سو میں نے سوچا لامذہب ہی سہی۔ وہاں بڑی بہن کے دل میں اگر ممتا تھی تو صرف اپنے بچوں کے لیے۔ اور بہنوئی ایسی سوکھی لکڑی تھے — چوبِ خشک — جس سے صرف دو کام لیے جا سکتے ہیں: چولہے میں جلانے کا، یا دوسروں کا دل جلانے کا۔

بعد میں اُسے ہمیشہ احساس رہا: اُس بڑے ماڈرن شہر کی آزادی میں میرے لیے کتنی خوشی نہیں تھی۔ جب میں وہاں نیا نیا گیا تھا چاہتا تھا کوئی بڑا آدمی وہاں جو بڑے بڑے بازار تھے مجھے لے جا کر دکھائے، تاریخی عمارتیں، پتھر کے پھاٹک، دروازے اور بتائے اس کے پیچھے فرنگیوں نے فلاں شہزادے کا سر کاٹا تھا، اس دروازے کے پٹوں کو جو اب نہیں تھے دشمن نے اپنی توپ سے اڑایا تھا، منڈوے میں زندگی کی پہلی فلم دکھانے لے جائے اور رات کو گھر لوٹنے پر کہے: "کیوں آج کا دن کیسا رہا؟"

بھلا ایسے کسی بڑے سے جب سنت کی نماز کا وقت ہوتا میں گھر میں ادھر اُدھر چھپتا پھرتا!
مگر ہوا کیا زندگی کا وہ طولانی سفر اچانک شروع ہو گیا جس میں وہ بڑا ہونے پر سمجھ سکتا تھا وہ پلٹ کر بھی ان سب کی طرف نہیں دیکھتا تھا جو ٹریفک لائٹ کی طرح ہمہ وقت اُسے صحیح راستہ دکھانے کے لیے مستعد رہتے تھے۔ ہرا: راستہ کھلا ہے۔ لال: خطرہ ہے۔ لیکن اُسے بلوری رنگ کی چاہ لگ گئی۔ The amber light۔ اس میں ایک علیحدہ ہی مزہ ہے۔ ٹریفک کنٹرول والا سنتری دانت کچکچاتا، اپنی چالان کی نوٹ بک میں کچھ لکھتا ہی رہ جائے اور سائیکل یا موٹر سائیکل سوار اُسے خاطر میں لائے بغیر چوراہے کی دوسری طرف پہنچ کر اس کی نظروں سے غائب ہو جائے۔ بہنوئی کے سامنے پیشی کے بعد وہ خطرہ مول لینے والا آدمی بن گیا۔ تب سے اس کے لیے ہر راہ کھلی تھی۔ اس نے لال لائٹ کو 'راستہ کھلا ہے' میں بدل دیا۔ اُن دنوں اُسے اگر کوئی جوا

کھیلنے پر ٹوکتا تو وہ کہتا' جو مزہ قدرت نے جوئے میں رکھا ہے کون اس لمحے کی کرب سے بھری لذت کو لفظوں میں بتا سکتا ہے جب پتے کھلنے کو ہوں، یا جب رولیٹ کی ڈسک رکنے کو ہو اس کیفیت کو کون بیان کر سکتا ہے!'

پتہ نہیں یہ الفاظ اس کے اپنے تھے یا سُنے ہوئے فلمی مکالمے۔ جیسے یہ جملہ: قانون توڑنے کا یہ معاملہ ہے کہ کوئی بغیر کسی وجہ کے کوئی چیز نہیں توڑتا ہے۔ بچہ اپنا کھلونا تک نہیں۔ کچھ نہیں تو اس کا دل اس سے بھر گیا ہوتا ہے، یا ماں نے اس کے رونے کو نہیں سنا تھا۔' میرا دل بھی مذہب سے بھر گیا۔'

تمیذ کو اچھی شطرنج آتی تھی، اچھے اچھوں سے ٹکر لے سکتا تھا۔ اور جب کھیل مد مقابل سے ہو اور پانچ سات ہی چالوں میں ہار جیت نظر آ رہی ہو وہ لمحے بھی شش و پنج سے بھرے ہوتے ہیں۔ مگر وہ شش و پنج اور کہیں دور سے جھانکتی ہوئی جیت، جوئے کے اس خاص لمحے کی کہاں برابری کر سکتے ہیں جسے اک عمر بتا کر وہ سمجھ پایا ایک لذت ہوتی ہے، تکلیف سے بھری، سمجھ میں نہ آنے والی۔ اس کھیل میں ہار جیت ایک طرح سے اپنی قسمت کی آزمائش ہوتی ہے۔

اس دن جب وہ بڑی آپا کا گھر چھوڑ کر جا رہا تھا دو چھوٹے بھانجوں بھانجیوں نے پاس آ کر بہت دھیمی آواز میں کہا "ماموں جان آپ کہاں جا رہے ہیں؟" ان کی آنکھیں نم تھیں۔ سب سے بڑی بھانجی نے پاس آ کر کہا "ماموں جان مت جائیے۔ آج کوفتے پک رہے ہیں۔" سب کو یہ دکھ تھا اُن کا یہ ماموں جو انہیں ہنساتا تھا، فلموں کی کہانیاں سناتا تھا گھر چھوڑ کر جا رہا ہے۔

تمیذ نے محبت کے ابل پڑنے کو روک کر صرف "اچھا" کہا اور بستر اور ٹرنک اٹھا کر وہاں سے چل پڑا۔

ساری زندگی وہ ان چند جملوں کو نہیں بھول سکا جو ایک رات اُس رات اُن دو میاں بیوی کے درمیان جنہیں وہ آپا جان اور بڑے بھائی جان کہتا تھا سنا تھا:

''کسے تم نے یہاں رہنے کو بلا لیا۔''

''میں نے بلا لیا!''

''نہ تہی تم نے۔ مگر وہ اس گھر میں رہنے کے لائق نہیں تھا۔ جس کے لیے اس کے باپ نے کہا تھا اس کی وجہ سے اس کی ماں کی موت ہوئی۔ بے چاری اس کے غم میں چل بسی۔ اُن سے دور کیسے نہ کرتا وہاں بگڑا جا رہا تھا۔ اپنی ماں کا قاتل ہے۔''

تمیز کو لگ رہا تھا انہیں علم ہے میں سویا نہیں ہوں اور جو باتیں ہو رہی ہیں، مجھے سنانے کے لیے ہیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا اسی لمحے اٹھ کر وہاں سے چل دے اور نینی پور بھی نہ جائے۔ مگر اس طیش میں اُسے کوئی عملی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں تھی۔ اس رات وہ راجد ھانی میں آنے کے بعد اتنا رویا تھا کہ تکیے کا غلاف بھیگ گیا تھا۔ بڑی بہن کا گھر چھوڑتے وقت وہ ایسا انسان تھا جس کا کسی پر کوئی حق نہ رہا ہو۔

نینی پور کے دنوں میں جب ماں باپ دونوں حیات تھے آپا جان کا وہاں آنا اُسے یاد تھا۔ ایک بار سے زیادہ۔ تب ان کا رویہ کچھ اور ہوتا تھا: بلا کر پاس بٹھانا، پیار کرنا، پڑھائی کا پوچھنا اور حلوہ سوہن جو وہ ہمیشہ لے کر آتی تھیں، اُسے تھمانا۔ پھر یہ دونوں کیوں شروع ہی سے ایسے ہو گئے جیسے ایک دشمن اُن کے گھر میں رہنے کو آ گیا ہو۔

پہلے ہی دن سے اس گھر کی ہر چیز اُسے اپنے خلاف لگی تھی۔ بڑی آپا، بڑے بھائی جان، بڑے بچے حتیٰ کہ جو دھوبن اور حلال خورنی آتی تھیں، سب۔

'بڑے تعجب کی بات تھی۔ نینی پور سے راجد ھانی جب اُس گھر میں پہلی بار سامان کے ساتھ آیا تھا میرا سواگت ایسے چہروں نے کیا تھا جو لگتا تھا ابھی رونے دھونے سے فارغ ہوئے ہیں۔'

پھر ایک خیال اُسے اکساتا تھا: اس نفرت کا بیج اس خط نے تو نہیں بویا تھا جس میں ابا نے اپنی بڑی بیٹی کو لکھا ہوگا: اب یہ تمہارے گھر رہے گا، یہاں رہ کر بگڑ رہا ہے۔ اسے سدھارنا تم دونوں کی ذمے داری ہے۔ تعارف کا وہ خط ضرور بس کی گانٹھ ہوگا۔'

آنے والے دنوں میں یہی خیال یہ صورت اختیار کرتا تھا:

'A bad letter of introduction it must have been!'

'میں اپنی ماں کی موت کا کارن ہوں یقیناً انہوں نے اپنے سگے، بڑے بیٹے کے لیے اپنے چہیتے داماد سے کہا ہوگا۔'

(۹)

بڑی بہن کے گھر گزارے ہوئے آخری دن اس وجہ سے بھی تمیذ کے ذہن سے نہیں اترے کہ تب ہی اس کی ملاقات تین اور ہستیوں سے ہوئی تھی۔'کس سے کہاں؟' وہ سوچتا 'یانہیں پڑتا – شاید لسی کی دکان پر، میرے پاس پیسے کم پڑ گئے تھے۔لسی پی چکا تھا، جتنے تھے لسی والے کوتھمارہا تھا۔لسی والا کہہ رہا تھا:''بھائی آپ بے وجہ معافی مانگ رہے ہو۔کیا آپ کو میں جانتا نہیں ہوں۔ یہ بھی رکھ لو، جب ہوں دے جانا۔''

ایک آدمی نے لسی والے سے اس کے پیسے لوٹانے کو کہا اور اسے وکٹوریا کا چاندی کا سکہ دیتے ہوئے کہا:''یہ میرے ساتھ ہیں'' اور جب تمیذ نے اسے حیرانی سے دیکھا تو کہا ''میرے مہمان۔''

بس یہ ابتدا تھی ان لوگوں سے ملاقات کی۔

فتی، رشن، کلو — تینوں اپنے اپنے فن کے ماہر تھے۔فتی باربر تھا، حجام۔ رشن کی سائیکلوں کی دکان تھی اور کلو جیب کترا تھا۔ بعد میں تمیذ کلو کو لائسنسڈ جیب کترا کہنے لگا تھا۔

Licenced pickpocket

فتی کا ہیر کٹنگ سیلون تھا – اس علاقے میں جہاں سڑکوں پر اور دکانوں میں انگریز بھی نظر آتے تھے۔ وہیں اس نے ایک دن ایک گورے صاحب اور ان کی میم صاحب کو دیکھا۔ میم

صاحب موٹر سائیکل سے بُخت بگی میں بیٹھی تھیں اور انہوں نے ایسا ہیٹ پہن رکھا تھا جو چھتری کا کام بھی دیتا ہوگا۔ راہ چلتے بگی کے پاس سے ہوکر نہیں گزر رہے تھے، گز دو گز کی دوری سے۔ نہ کوئی جملہ کس رہا تھا نہ کوئی بیہودہ لفظ کہتا ان کے پاس سے گزر رہا تھا جو اس وقت یقینی ہوتا اگر کوئی منہ کھولے یا برقعے میں بند دیسی عورت وہاں بیٹھی ہوتی۔ میم صاحب اطمینان سے بیٹھی دلچسپی سے ٹریفک کو دیکھ رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ انگریز، ان دنوں برطانیہ کا ہر فرد بلکہ ہر سفید رنگت والا جس کی ماں چاہے دیسی ہو، انگریز کہلاتا تھا، فتی کے سیلون سے نکلا۔ غالباً مونچھیں درست کرانے گیا ہوگا۔ فتی اس کے پیچھے پیچھے آیا تھا اور بہت خوش نظر آتا تھا۔ تمیز کو دیکھ کر اس نے اندر آنے کو کہا۔

تھوڑی دیر بعد فتی تمیز کی زندگی کا پہلا شیو کر رہا تھا۔ تمیز منع کر رہا تھا ''سب ہنسی اڑائیں گے۔''

فتی نے کہا ''ایک دن تو داڑھی منڈانی تھی ہی تو آج کیوں نہ سہی۔ ابھی سے تمہاری ٹھوڑی پر بال اچھے نہیں لگتے ہیں۔ تمیز کی جگہ مولوی تمیز الدین لگ رہے تھے۔''

تمیز نے کہا ''فتی بھائی ٹھیک ہے مگر تمہاری اس محنت کے پیسے کون دے گا۔ میرے جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔''

فتی نے کہا ''گورا اپنے ساتھ تمہارے شیو کے پیسے بھی دے گیا ہے۔''

'پھر اس نے بڑی اچھی خوشبو کی کریم لگا کر میرا چہرہ تھپتھپایا، تیل لگا کر مانگ درست کی مجھے نیند آنے لگی۔ میرے ذہن میں رہ جانے والی وہ اس کی دوسری یاد ہے۔ واقفیت چند ملاقات پہلے سے تھی۔ دل والا آدمی تھا۔ پھر اس نے دو بوتلیں لیمونیڈ کی منگائیں اور بولا'' یہ تمہارے پہلے شیو کی خوشی کی رسم ہے'' اور واقعی مجھے لگا: ماں باپ کا زمانہ ہے، نائی شیو کر کے انعام لے کر خوش خوش گیا ہے۔ بہنیں مٹھائی مانگ رہی ہیں۔ اماں نے دعا پڑھ کر میرے چہرے پر پھونکا اور لپٹا کر پیار کیا۔ چلتے وقت میں نے ایک بار پھر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا، فتی کی نظریں بچا کر۔ جہاں جہاں اُسترا چلا تھا وہاں ہریالی لگ رہی تھی۔ میں جھینپ گیا۔

شام کو سب نے لالٹین قریب لاکر میرا چہرہ دیکھا۔ بڑی آپا نے مُنھ بنایا۔ عشاء کی نماز کے بعد جب بڑے بھائی جان گھر میں داخل ہوئے اور ابھی ڈیوڑھی ہی میں تھے کہ کسی سے انہیں یہ جانکاہ خبر ملی کہ تملیذ نے داڑھی منڈوائی ہے تو انہوں نے بلند آواز میں انا للہ وانا الیہ راجعون کہا۔

کبھی میں کہیں اور بال کٹوا کر یا شیو بنوا کر فتی کے سیلون میں جاتا تو وہ کہتا ''بنوا آئے اپنی گت!''

مجھے نہیں یاد پڑتا کب میں نے اس کے لیے کچھ کیا لیکن جب تک راجدھانی میں رہا اس کا رویہ مجھ سے نہیں بدلا۔ جیسے بڑا بھائی ہو۔ کبھی بھانپ کر کہ میری جیب خالی ہے وہ ایک روپیہ بھی اس میں زبردستی ڈال دیتا تھا۔ ملے زیادہ دن ہو جائیں تو وہ بورڈنگ ہاؤس بھی آ جاتا تھا۔ دو منٹ بیٹھ کر کہتا ''شام کو وقت نکال کر آ جانا''۔

فتی کے ہیر کٹنگ سیلون ہی میں تملیذ نے پہلی بار رشن کو دیکھا۔ بتانے آیا تھا: ''فتی بھائی تمہاری سائیکل کے دونوں پہیوں کے ٹائر ٹیوب بدلے جائیں گے'' اور کچھ تفصیل ڈائمو کی خرابی کی تھی۔ تملیذ نے کسی کو اتنے سنبھال کر سائیکل رکھتے نہیں دیکھا تھا جتنا فتی کو۔ سیلون کی طرح سائیکل کا فریم تو کیا پہیوں کی ایک ایک تان چمکتی تھی۔ بنی سنوری ایسی کہ کیا بنے کی بہو ہو گی۔ اور رشن جیسا سائیکل میکینک بھی نہیں دیکھا تھا۔

میں جب زندگی سے بیزار ہوں تو اس سے کرایے پر سائیکل لیتا۔ لیتے وقت پوچھتا ''کتنی دیر؟'' اور وہ کہتا ''ایک ہفتہ، دو ہفتہ، مہینہ، سال۔ جب جی بھر جائے لے آنا۔''

اس کے یہاں چار چھ سائیکلیں ہر وقت کرایے پر دیئے جانے کے لیے تیار کھڑی نظر آتیں۔ سائیکل دیتے وقت وہ اپنے ہاتھ سے ایک کاپی میں سائیکل لے جانے والے کا نام اور لے

جانے کا ٹائم لکھتا۔ میرے لیے اس کا اتنا جاننا ہمیشہ کافی رہا کہ فتی کا دوست ہوں۔ اسکول کی نویں جماعت میں پڑھتا ہوں اور گھر سے دور ہوں۔ میں اس سڑک پر سائیکل تیزی سے دوڑاتا جو راجہ حانی کو نئی راجہ حانی سے ملاتی تھی اور جس پر انگریز مرد عورتیں دیسی لوگوں کے شانہ بشانہ چلتے نظر آتے تھے۔ پارک کی سڑکوں پر انگریز لڑکیاں، عورتیں بھی سائیکل چلاتی نظر آتی تھیں۔ آیائیں پریمز چلاتی لے جارہی ہوتی تھیں جن میں تندرست سفید بچے خوبصورت کپڑے پہنے بیٹھے یا سو رہے ہوتے تھے۔ کبھی اُن کے ساتھ بچے کی ماں بھی ہوتی تھی۔

وہ سڑک ایسی تھی کہ نہ کہیں سائیکل اچھلتی تھی، نہ تیز چلانے سے پاجامہ چین میں پھنستا تھا، نہ چین اترتی تھی۔ خیر یہ آخری دو باتیں رشن کی سائیکلوں کی تعریف کی ہیں ان سے سڑک کے اچھا ہونے نہ ہونے کا کیا تعلق! اگلے لمحے ہی ان سڑکوں پر ہوتا تھا جو شاہی عمارتوں کو جاتی تھیں۔ بالآخر تھک کر ایک فوارے کی منڈیر پر بیٹھ جاتا، فواروں کی وہاں کمی نہیں تھی۔ چاروں طرف سبز قالین بچھا نظر آتا تھا جس پر مور ادھر اُدھر پھر رہے ہوتے تھے۔ سامنے وہ بڑی سنگ مرمر کی عمارت تھی جہاں سے ایک انگریز پورے ملک پر حکومت کرتا تھا۔ اس عمارت کے سامنے ایک بڑے سنگ مرمر کے تال میں راج ہنس تیر رہے ہوتے تھے۔

وہ کوئی اور ہی دنیا تھی جہاں بیٹھے ہوئے لگتا تھا سینے کے اندر سے سستی سگرٹوں کا اپنے پیچھے چھوڑا ہوا دھواں ہوا دھو کر لے گئی ہے۔

رشن بڑے گروں کا آدمی تھا۔ کیا چیز تھی جو وہ نہیں بیچتا تھا اور بیچتا اپنی قیمت پر تھا — بازار کو دیکھ کر۔ مجھے یہ بات پہلی بار سن کر بڑا تعجب ہوا وہ اُن عورتوں کی امید تھا جو اپنی بیٹی کی شادی کی امید کھو چکی تھیں۔ لڑکی کی عمر نکلی جاتی ہو، رنگ کی صاف نہ ہو، آنکھوں میں کچھ فرق ہو: سارا کیس سمجھنے کے بعد اس کا ایک ہی جواب ہر مایوس کو ہوتا تھا — 'فکر مت کرو۔ تمہاری لڑکی کی شادی ہو جائے گی۔'

رشن کے پاس آتی ایسی لڑکیوں کی صرف مائیں تھیں، باپ ہوتے نہیں تھے، یا لاپتہ۔

جب بات لگنے کو ہو وہ لڑکی کی ماں، نانی، دادی جو بھی ہو، کو بلا کر خوش خبری سناتا اور اپنی شرائط

سامنے رکھ دیتا: "مہر اتنا ہوگا، اور معجل میں سے ہزار پیچھے سو میرے۔ بھاگ دوڑ میں اتنے تو میرے لگے ہوں گے۔"

لڑکی والی کہتی "ضرور لگے ہوں گے۔"

"موجل سے جتنے جی چاہے دے دینا، نہ بھی دے سکو تو ـــ "

لڑکی والی کہتی: "اور اگر معجل پہلی رات نہ دیئے تو؟"

رشن یقین دلاتا "وہ میری ذمے داری ہے۔ لیکن اگر میرا حصہ مارا تو نکاح تڑوا دوں گا۔" وہ ہنستے ہوئے کہتا۔

سارا معاملہ اس ذرا سی جگہ میں طے ہوتا تھا جو شاید عمارت کی پشت پر چڑھنے والے زینے کی نچلی چار چھ سیڑھیوں کے نیچے نکل آئی تھی، جو اُسے دکان کے ساتھ ملی تھی، جسے اس نے ایک پردا ٹانگ کر اپنے دوپہر کو سونے کی جگہ بنا لیا تھا۔

کلو کو ہمیشہ سے فتی اور رشن کا ایک ہی مشورہ تھا— یہ پیشہ چھوڑ دے۔ اور وہ کہتا۔

"چلو تم تو اسے پیشہ کہتے ہو۔ اگر دنیا بھی اسے پیشہ مان لے تو اس میں برائی ہی کیا ہے! جیسے اور سب پیشے ہیں۔ تجر بوجے کا، ڈھنیے کا، گوالے کا۔ بس آزادی آلے: اس پیشے کو بھی اس کا حق مل جائے گا۔ رشن بھائی جیب کاٹنا ہنر ہے۔ ہر ایک کو نہیں آتا ہے۔ بڑے سازندوں کی طرح اس کا بھی ریاض کرنا پڑتا ہے۔ پھر پتلی، نرم انگلیوں کا کام ہے، ان کا نہیں جو گھاس چھیلیں، رندہ چلائیں۔"

پہلی دفعہ تمیز نے کلو سے مان سرور سینما میں ٹکٹ لیا تھا۔ تمیز کلو کو نہیں پہچانتا تھا، کلو نے اُسے پہچان لیا: "ارے تم فتی بھائی کے دوست! لائن میں کیوں لگے تھے۔ مجھ سے پوچھ لیتے۔ میں بتا دیتا آدھے ٹکٹ کھڑکی کھلنے سے پہلے ہی بیچے جا چکے ہیں۔ باقی آدھی کے لیے لائن لگی ہے۔ تمہارا نمبر نہیں آتا۔" پھر اس نے نیفے میں اڑسا ہوا ایک ٹکٹ نکال کر دیا۔ تمیز نے پیسے پوچھے۔ اس نے کہا "سوا چار آنے۔" تمیز نے کہا "بس؟" اس نے کہا "بس۔ دو ہفتے بعد

آتے تو یہی فلم مفت میں دکھا دیتا۔''

یاد آنے پر تلمیذ کہتا: ''بہت عرصہ اس سے میرا تعلق رہا۔ کبھی ماں سرور سینما میں نظر آتا، کبھی الشتبر نا کیز میں۔ فتی کے سیلون میں کم لیکن رشن کی دکان پر تقریباً روز جاتا تھا۔''

سننے والا کہتا ''تمہارا بھی کن کن کان میلیوں کباڑیوں سے تعلق رہا ہے۔''

''وہ کان میلیے، کباڑیے، جیب کترے بھڑوے بہت سے شریفوں سے بہتر روح رکھتے تھے۔'' تمیذ اندر کی دنیا میں ڈوبتے ہوئے کہتا۔

''اُس سے آخری ملاقات مجھے پریشان کرنے والی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ جیب کترا ہے، نئی فلم لگنے پر بلیک مارکیٹ سے ٹکٹ بیچنے والا بن جاتا ہے، صورت اور کپڑوں سے ان گھڑ لگتا ہے میں اسے ملتے ہوئے شرمندگی محسوس نہیں کرتا تھا۔ میرے لیے وہ سراپا اخلاق تھا۔ ایک دفعہ دیسی وسکی بھی دے چکا تھا کہ'' لو آج اسے چڑھا کر پڑھنا سیدھا دماغ کو جائے گا۔ مجھے مدرسے کے دنوں میں ملتی تو آج کو میں بھی پڑھا لکھا ہوتا۔''

ان دنوں میری عادت روز فلم دیکھنے کی نہ بھی ہو تو روز سینما ہالوں کے چکر لگانے کی ضرور تھی۔ باہر کھڑے ہو کر وہ بورڈ پڑھنا جو اس وقت چلنے والی فلم کا ہوتا تھا، اور اُن دو پہیوں پر چلائی جانے والی مشاش شکل کی گاڑیوں پر لگے ہوئے پوسٹرز کو دیکھا اور پڑھا، پھر اندر جا کر اُن فوٹو گرافس کو دیر تک دیکھتا رہتا تھا جو شیشے کی الماریوں میں سجے ہوتے تھے اور جن کے بارے میں بعد میں کسی نے بتایا وہ اسٹلز ہوتی ہیں۔

''ایک دن اس ہول میں کھڑا تھا جہاں فرسٹ کلاس کا راستہ کھلتا تھا، جہاں اسٹلز لگی تھیں اور فرسٹ کلاس کے ٹکٹ کی کھڑکی تھی جو اس وقت بند تھی۔ اچانک جیسے غیب سے وہاں کلو داخل ہوا۔ میں اُسے دیکھ کر ڈر گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ میری طرف بڑھا: ''نکالو پیسے'' میں نے کہا: ''کاہے کے'' اور پیچھے ہٹنے لگا۔

''اس دن کے جب تمہیں ٹکٹ اپنی جیب سے دیا تھا۔''

مجھے واقعی ڈر لگ رہا تھا اور لگ رہا تھا اب یہ اپنی جیب سے یا تو کھٹاک سے کھلنے والا چاقو

نکالے گا یا وہ قینچی جس سے جیب کاٹتا ہے اور وہ تیز نوک والی ہوگی۔ میں بچتے بچتے ایک طرف کی دیوار سے جا لگا تھا اور چیخ مارنے والا تھا کہ سیٹھ جگدیش نارائن جن کا مان سرور سینما تھا جیسے اس دیوار سے وارد ہوئے جو سینما ہال میں داخل ہونے کے گیٹ کی دوسری طرف تھا۔ انہوں نے آتے ہی کلّو کے دو چار تھپڑ مارے اور گدی سے پکڑ کر فرش پر دھکا دیا۔ کلّو ان کے پیر پکڑنے چاہ رہا تھا اور وہ اُسے ٹھوکریں مار رہے تھے۔ پھر انہوں نے مجھ سے چلے جانے کے لیے کہا۔

''میں مہینوں اس طرف نہیں گیا۔ اور جب قتی کی دکان پر گیا تو پتہ چلا کلّو جیل میں ہے۔ اُس جرم میں ماخوذ ہوا تھا جو میں جانتا تھا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا ــ حکومت کے خلاف سازش کے الزام میں۔

قتی نے کہا ''بس پکڑا تھا جو بھی الزام لگاتے۔ تم کہاں رہے اتنے دن؟''

میں نے کہا ''تنگی پور چلا گیا تھا۔'' اور اس نے مان لیا۔

(١٠)

حسن وارد جس کی جیب میں مہینے کے شروع میں کچھ زیادہ ہی پیسے ہوتے تھے اپنے بارے میں دوستوں کو بتا چکا تھا مہینے میں ایک یا دو بار اس بازار کا چکر لگا آتا ہے جہاں عورتیں سرِشام بنی ٹھنی کوٹھوں پر بیٹھی نظر آتی ہیں۔ بازار اس سڑک پر تھا جو ٹبی راجہ جانی سے بادشاہی مسجد کو جاتی تھی۔

حسن وارد نے اپنا تخلص ایمن تو رکھا تھا لیکن یہ جاننا مشکل تھا وہ اس کا استعمال کہاں اور کب کرتا ہے کیونکہ غزل تو کیا اس نے شاید ہی کبھی کوئی نظم اُن حسیناؤں کے حُسن کی تعریف میں کہی ہو جن کا وہاں جا کر وہ دو گھڑی کو مہمان ہوتا تھا۔ اس کا ارادہ ایک دن فلم ورلڈ کے کیپٹل سٹی میں نظر آنے کا تھا جہاں اس کی قدر ہوگی کیونکہ اس کے خمیر میں موسیقی تھی۔ وہاں وہ پلے بیک بھی دیا کرے گا، پی۔ کے۔ ملک (P.K. Mullik) کی طرح پردے پر ایکٹر سنگر ہوگا اور بالآخر ایک دن میوزک ڈائریکٹر۔

"پتہ نہیں کہاں سے اس کے خون میں میوزک آئی ہے باپ دادا کتھے اور سپاری کے بیوپاری ہیں۔" صبغت اللہ کئی بار اس کے بارے میں کہہ چکا تھا۔ "اور یہ میوزک ڈائریکٹر بننے چلا ہے۔"

ایک شام جب دسویں کے امتحان سر پر تھے تمکینہ نے حسن وارد سے کہا "یار ایمن مجھے

بھی اس کوچے کی سیر کراؤ جہاں کی بسنے والیاں سننے میں آیا ہے تمہارے ساتھ ایک دن فلم کی دنیا میں جانے کا خواب دیکھ رہی ہیں۔"

حسن وارد نے کہا "تمہاری فرمائش بے موقع ہے، مہینے کا تیسرا ہفتہ ہے۔ نہ تمہاری جیب میں پیسے ہیں نہ میری۔"

تمیذ نے تھوڑے منت بھرے لہجے میں کہا "تو کیا اس بازار سے گزرنے کے بھی پیسے ہوتے ہیں؟"

"یہ بات ہے" حسن وارد نے کہا "تو چلو۔"

وہاں راہ چلتے ہوئے تمیذ کو کئی بار خیال آیا: 'یہاں اگر کوئی دیکھ لو تو! بڑے بھائی جان یا بڑے ابا؟' اور آگے ہی لمحے: 'تو کیا؟ کون سا وہ اب مجھے پارسا سمجھتے ہیں، بو صرف یہاں دیکھ کر وہ زنی سمجھے لگیں گے اور خاندان والوں میں بات کو پھیلا دیں گے!'

حسن وارد کی نظریں کوٹھوں پر تھیں۔ دور سے سب ایک ہی عمر کی نظر آتی تھیں۔ سب کے لباس شاہانہ تھے اور سب کا میک اپ ایک جیسا تھا۔ گلابی گال، سرخ ہونٹ، رنگ سے اجاگر کیے ہوئے پپوٹوں میں سے جھانکتے ہوئے دیدے اور ان کے اوپر ابروؤں کی کمانیں۔

کئی ایک کو حسن وارد نے سلام کا اشارہ کیا لیکن جواب کسی نے نہیں دیا۔

"تمہیں کوئی پہچان نہیں رہی ہے استاد ایمن" تمیذ نے کہا۔

"اس بازار کا یہی چلن ہے، سلام کا جواب لینا ہے تو اوپر آؤ۔"

وہ وہاں اس طرح چل رہا تھا جیسے کسی شادی کے گھر میں آ گیا ہو اور ہر واقف کو سر کی جنبش اور ہاتھ سے پہچان کا کام لے رہا ہے۔

تمیذ نے اسی کی طرح کندھے پیچھے اور سینہ باہر نکالتے ہوئے کہا "ایمن تمہیں ڈر نہیں لگتا تمہارا کوئی بزرگ یا واقف اگر تمہیں دیکھ لے تو۔"

ایمن نے کہا "میں سلام میں پہل کروں گا اور کہوں گا کیسے آنا ہوا؟ میں تو یہاں بنے تمبولی کا پان کھانے آیا ہوں، کہیے تو آپ کو بھی پیش کروں؟"

اس شام کی کتھا بس اتنی ہی ہے۔ لیکن وہ شام دور نہیں تھی جب دونوں دسویں کا امتحان پاس کر کے کولج میں داخلہ لے چکے تھے اور اتفاق سے دونوں کی جیبوں میں اڑانے کے لیے کافی رقم تھی۔ تملیذ کے لیے وہ مہینے کا شروع تھا جب تایے ابا سے مہینے کا خرچہ لے کر آتا تھا اور ایمن نئی کتابوں کے لیے باپ کی غیر حاضری میں ماں اور بھائیوں سے اضافی رقم لے چکا تھا۔

جس پہلے کوٹھے پر تملیذ ایمن کے ساتھ گیا تھا آنے والے دنوں میں اسے وہاں کی بس چند باتیں ہی یاد رہ گئی تھیں۔

وہاں جا کر وہ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ دروازے کی کنڈی کسی نے آہستہ سے بجائی۔

لڑکی نے کہا: ''لے آئے؟'' اور جا کر اندر کی کنڈی کھول کر ہاتھ آگے بڑھایا۔

مگر جو آدمی اس کے لیے کچھ لایا تھا اس نے پوٹلی تھمانے پر ہی بس نہیں کی، سر لڑکی کے اٹھے ہوئے ہاتھ کے نیچے سے اندر گھسایا، چونچ رو ادھیڑ عمر کا آدمی تھا، اور پھر خود اندر گھس آیا۔ چند ثانیوں کے لیے جو تملیذ پر سخت گزرے، اس نے اسے غور سے دیکھا اور بغیر کسی تاثر کا سر کی جنبش یا منھ سے اظہار کیے واپس ہولیا۔

تملیذ اپنے اس معائنے پر کمرے کی واحد کرسی پر خوف زدہ بیٹھا تھا کہ لڑکی نے پلنگ پر اس رومال کو دستر خوان کی طرح پھیلا دیا جو ادھیڑ عمر کا آدمی تھما گیا تھا۔ اس میں بھاڑ کے بھنے ہوئے چنے تھے۔ لڑکی نے کہا: ''گرم ہیں۔ آؤ پہلے یہ کھالیں، نہیں تو ٹھنڈے ہو جائیں گے۔ مجھے گرم چنے بہت پسند ہیں— سیخ کباب سے زیادہ۔ میری نانی کہتی تھیں زکام میں گرم بھاڑ کے چنے کھانے چاہییں۔''

''تمھیں زکام ہے؟'' تملیذ نے پوچھا۔ اب اس میں تھوڑی بہت جرأت لوٹ آئی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کھانے لگی۔

بس اس کی یہ تواضع اُسے یاد رہ گئی تھی اور چاہئیں کی جگہ چاہییں کہنا۔ نہ شکل یاد رہی نہ جسم۔ شاید

بہت معمولی شکل صورت کی تھی، اس کے کپڑے بھی معمولی تھے۔ ایمن نے اُسے وہاں چھوڑتے ہوئے کہا تھا: ''سمجھو دیسی ہے، باہر کی وسکی یا بیئر نہیں۔''
اور تمیز نے جاپانی ہوے کی طرح ہاں میں سر ہلایا تھا۔

اس رات بورڈنگ ہاؤس میں جو خواب اس نے دیکھا ویسے کا ویسا ہی اس کے ذہن میں محفوظ نہیں تھا — نہ اُس کا آغاز اُسے یاد تھا، نہ تفصیل۔
'ابا ہیں اور میں۔ صحن میں کھرے پلنگ بچھے ہیں۔ شاید میری عمر وہ ہے جس میں راجہ حانی بھیجا گیا تھا۔ ابا تنگ موری کے پاجامے پر انگرکھا پہنے ہیں جو وہ نہیں پہنتے تھے۔ اور اس کے اوپر پولس یونی فورم کی خاکی قمیص جس کے بٹن بند نہیں ہیں۔ وردی کے کندھوں پر پولس کے نشان ہیں، سر پر خاکی صافہ ہے اور اس کے ایک طرف جھبا۔ واہ کیا کوسٹیوم ہے! مجھے نہیں معلوم تھا فلم اور تھیٹر کی طرح خواب میں بھی کردار کوسٹیوم میں آتے ہیں۔ جب وہ میری طرف بڑھتے ہیں تو چوڑی بیلٹ کھل کر نیچے گرتی ہے۔ لیکن اس کی پرواہ کیے بغیر انہوں نے مجھے مارنے کے لیے اپنا ڈنڈا گھمایا — ایک لمبی چھڑی جیسی بینڈ کنڈکٹ کرنے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔'
صبح اٹھ کر وہ دیر تک سوچتا رہا: 'گھر میں اور کون کون تھا؟ اماں؟ بہنیں؟ بھائی؟ اچھا ہوتا انہیں بھی دیکھ لیتا۔ ان میں سے کسی نے خواب میں آنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی! ابا کا چہرہ پورا نظر آتا تو پتہ چلتا اس پر قہر کے آثار تھے یا کیا؟ ہوسکتا ہے ناخوش ہوں کہ ان کی محنت کی کمائی میں کہاں پر خرچ کر رہا ہوں۔ پہلے جب جب پی دیسی شراب پی آج ان کی کمائی کے پیسے وایک قبہ پر چڑھا آیا۔'
اس کے چہرے پر نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراہٹ آ گئی — 'چڑھا آیا جیسے کسی مندر میں گیا تھا۔ جاتا ہی تھا تو اس دن جاتا جس دن جیت کے پیسے جیب میں ہوتے۔'
بعد میں اُسے ہمیشہ خوابوں پر غصہ آیا۔ ان میں یہ کیا خاصیت ہوتی ہے کبھی کسی ترتیب

سے نہیں آتے ہیں۔ کیوں نہیں ویسے ہوتے ہیں جیسے ناولوں اور فلموں میں دکھائے جاتے ہیں۔ زندگی کے پورے پورے سین۔ اکثر مع گانوں اور ڈانس کے۔ یہ تو ایسے لگتے ہیں جیسے بی کلاس سینما ہالوں میں چلنے والی پرانی گھسی ہوئی فلمیں۔ جو چلتے میں ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہیں اور جوڑنے والے اناڑی پن سے بغیر آگا پیچھا دیکھے ان ٹکڑوں کو جوڑ دیتے ہیں۔ پبلک ہنستی بھی رہتی ہے اور چلاتی بھی رہتی ہے مگر کہانی سمجھنے میں کسی کو دقت نہیں ہوتی ہے کیونکہ سب کی ہزار دفعہ کی دیکھی ہوئی فلم ہوتی ہے۔

(۱۱)

باپ کو خواب میں دیکھنا تمیزہ کو بڑا بھاری پڑا۔ سارے دن طبیعت بجھی بجھی سی رہی۔ لیکن خواب میں یہ دیکھا تھا اس کا پتہ جب وہ بیدار ہوتے ہی بھول چکا تھا۔ باقی خواب؟ وہ خوابوں کے ماضی میں جا چکا تھا۔ جس طرح انسان کے جاگتے ہوئے دن ماضی بنتے جاتے ہیں، سوتے ہوئے دنوں کا بھی اپنا اندوختہ ہوتا ہے اور اس تک خواب دیکھنے والے کی پہنچ کم ہی ہوتی ہے۔ شام تک جو تمیزہ کے پاس رہ گیا تھا بس اتنا تھا کہ مزاج سے بھاری ہے اور کسی کام میں جی نہیں لگ رہا ہے۔

شام کو وہ یوسف عسکری کے ساتھ اس کے دوست رامیشوری دیال کے گھر میں تھا۔ یوسف عسکری مولانا کو کبھی کبھی دوست یار نواب عسکری سُنی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ جس اسکول میں وہ پڑھاتا تھا وہاں کی شام کی کلاسوں میں ایک سرخ داڑھی والے استاد اسے نواب کے ساتھ اپنا پوتا بھی کہتے تھے کیونکہ یوسف کے باوا بھی ان کے شاگرد رہے تھے۔ تمیزہ سے اس کی دوستی کا آغاز نوکری کے پہلے سال میں ہوا تھا۔

ایک دن تمیزہ نے پوچھ بیٹھا: ''یہ تمہارے۔۔۔ وہ تخلص کیوں ہیں ایک مولانا، دوسرا نواب؟''
یوسف نے کہا: ''دادا نواب تھے۔ صرف مولانا تخلص ہے۔ وہ بھی بے ضرورت کیونکہ میں غزل

کہنے سے کتراتا ہوں، یا وہ مجھ سے کتراتی ہے۔ اور نظم میں تخلص برتنے کی ضرورت نہیں۔'' کچھ وقفے سے اس نے کہا ''پہلے تخلص الوان رکھا تھا۔ لیکن وہ مصرعے سے باہر نکل پڑتا تھا اس لیے ال اس میں سے خارج کر دیا، موان بغیر ضرورت کے باقی ہے۔''

اس کا گھر وہاں تھا جہاں پرانے وقتوں کی حویلیاں تھیں، پتھروں اور لکھوری اینٹوں کی بنی ہوئی۔ راجیشوری دیال کے باپ رائے صاحب تھے۔ یوں باپ باپ کا یارانہ تھا جس نے آگے چل کر راجیشوری دیال سے یوسف عسکری کے دوستانے کو جنم دیا۔

راجیشوری گھر پر نہیں تھا۔ تھوڑی دیر مردانے میں بیٹھنے کے بعد یوسف کو اندر بلایا گیا۔ بلانے والی نے چک کی دوسری طرف سے کہا: ''اندر آ کر سلام کیجئے۔ ماتا جی کو آپ کی صورت بھول گئی ہے۔''

یوسف شرمندہ ہو کر اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ اس نے سلام بھجوایا تھا۔

تھوڑی سی دیر بعد مردانے میں ایک لڑکی کسی کام سے آئی۔ وہ اپنی دھن میں اتنی مگن تھی کہ اسے تمیذ نظر تک نہ آیا۔

کمرے میں ایک طرف قالین پر ستار رکھا تھا۔

ایک نوکر آ کر تمیذ کے برابر کی میز پر شربت کا گلاس اور مٹھائی کی پلیٹ رکھ گیا۔ دیر تک تمیذ کی نظریں اندر جانے والے دروازے پر رہیں۔

جب یوسف لوٹا تو اسے احساس ہوا تمیذ کی دنیا بدل چکی ہے۔ راستے میں اس نے پوچھا: ''چہکتے ہوئے گئے تھے۔ گم صم کیوں ہو؟ اس لیے کہ مجھے اندر بلایا گیا تمھیں نہیں؟''

تمیذ چپ رہا۔

''سوچ رہے ہو وہاں میری خاطر مدارات ہوئی ہوگی۔ تو سنو صرف سیدھا کان کھینچا گیا۔'' پھر کچھ وقفے کے بعد بولا ''صرف اماں بی کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بلایا تھا۔ اُن سے ملنے اتوار کو آئیں گی۔''

تمیذ ایک دم بول اٹھا: ''اُن کے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا؟''

یوسف نے اُسے غور سے دیکھا اور بولا "معاملہ کیا ہے او! وہاں کچھ گنوایا؟"
"نہیں پایا۔"
"کیا؟"
"نروان۔"

یوسف دیر تک ہنستا رہا: "جو لڑکی مردانے میں داخل ہو رہی تھی جب میں اندر جا رہا تھا کسم تھی، راجیشوری کی بہن۔ ہوش میں رہنا۔ ہوش میں رہنا۔ پھسلواں زمین ہے، گرے تو نکو گے نہیں۔"

اس خاموش یک طرفہ ملاقات کے بعد رات کا تاسف جتنا بھی تھا مٹ گیا۔ وہ یہ خیال لیے سویا: 'اگر وہاں آنا جانا اُس وقت سے ہوتا جب لڑکیاں لڑکوں کے دل میں گھر کرنا شروع کرتی ہیں تو کیوں کھنڈروں، جلووں میں کچی شراب پیتا اور کیوں وہ سیڑھی چڑھتا جس کے بعد ابا سے خواب میں ملاقات ہوئی۔'

آنے والے دنوں میں یہی بات اس کے دماغ میں ہمیشہ اس طرح آئی: اگر نوجوانی کے اوائل میں کسی کو کسی سے دل میں جڑ پکڑ لینے والی محبت ہو جائے تو یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔ اگر ایسا ہو تو کتنی ہی منہ زور بدمعاشیاں اس کے تابع رہیں اور کوئی ادھر اُدھر منھ نہ مارتا پھرے۔ ہا! یہ میرے نصیب میں نہیں تھا۔'

دوسری بار وہاں جانے پر تمکین نے راجیشوری سے ستار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: "کون بجاتا ہے؟"
"پتاجی بجاتے تھے۔"
"پھر؟"

"اُن کا شوق پورا ہو گیا۔ اب کسم کوئی سکھانے والا ڈھونڈ رہی ہے۔"
ساتھ میں تمکین اپنے دماغ میں کہہ رہا تھا: 'کاش مجھے آتا ہوتا تو پڑھائی اور دنیا کا ہر کام چھوڑ کر ایک یہی کام کرتا۔'

دو اور ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک بار بغیر یوسف کے کسم کے گھر گیا جو وقت راجیشوری کے

گھر پر نہ ہونے کا تھا۔ نوکر نے دیوان خانے میں بٹھا دیا۔ تھوڑی دیر میں کسم وہاں آئی۔

''یوسف یہاں آئے ہیں؟''

کسم ہنس پڑی: ''وہ اس وقت نہیں آتے ہیں'' اور بیٹھنے کو کہا۔

''کیا آپ یوسف بھیا کا کوئی سندیش لے کر آئے ہیں؟''

تلمیذ نے سرخ ہوتے ہوئے چہرے سے کہا ''نہیں بس آ گیا۔''

کسم کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

تھوڑی دیر بعد تلمیذ نے کہا ''چلنا چاہیے'' اور اٹھ کھڑا ہوا۔

کُسم بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

اُس دن کی راجیشوری کے گھر کی حاضری کی خبر ملنے پر یوسف نے کہا: ''کیا کُسم سے عشق لڑانے کا ارادہ ہے؟''

''ارادہ ہے نہیں، کر رہا ہوں۔''

یوسف نے کہا ''تو بس اللہ کا نام لے کر کیے جاؤ۔ مگر ارادے سے آگے مت بڑھنا۔''

آنے والے دنوں میں، جب طالب علمی کا دور ختم نہیں ہوا تھا، اسے ایک شدید نقصان کا احساس ستایا کرتا تھا: تسنیم کو کھو دینے کا۔ 'کیا تایا ابا سے کسی سے نہیں کہلوا سکتا تھا کہ آپ کا بیٹا ہوں۔ چاہیں تو اس سے زیادہ بنا کر میری زندگی بنا دیجئے۔

مگر تب مجھ میں بس ایک یتیم لڑکے کی جرأت تھی۔'

پھر اسے خیال آتا تھا: 'اگر کسم سے بات آگے بڑھی ہوتی تو ہوسکتا تھا میں واقعی دوسرا منظور ہوتا۔ اور بڑی آپا کی پیشینگوئی سچ ثابت ہوتی۔ ایک دن کسی مسجد یا مندر کے صحن میں لوگوں کو پڑا ہوا ملتا۔'

(۱۲)

تمیز کی ایک عجیب عادت سے نہ اس کے گھر والے واقف تھے نہ دوست، اپنے آپ سے گھنٹوں گھنٹوں باتیں کرتا۔ نینی پور کے دنوں میں جب باپ گھر پر نہ ہوں وہ اونچی آواز میں گایا کرتا تھا جس پر نہ ماں ٹوکتی تھیں نہ دادی، نہ ہی جب وہ ٹونگی اور رام لیلا کے مکالمے دہرا رہا ہوتا تھا۔ لیکن اگر وہاں وہ خود سے باتیں کیا کرتا تو بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی — گھر ہی اتنا چھوٹا تھا۔ سب سے پہلے تو کام کرنے والیوں کو فکر لگ جاتی کہ چھوٹے صاحب پر جو آسیب ہے اس سے وہ باتیں کرتے ہیں۔ اور ان کی یہ فکر ماں اور دادی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ وہاں وہ تنہائی میں بیٹھا خود سے سوال جواب کر رہا ہوتا تھا لیکن اتنی اونچی آواز میں جیسے مسجد میں سب اور نہیں چاہتا برابر والا اُسے سنے۔

بڑی بہن کے گھر میں یہ عادت جوں کی توں تو نینی پور سے نہیں چلی آئی تھی، اس نے جب بہن بہنوئی گھر میں نہ ہوں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر سوال جواب کی صورت لے لی تھی جس کے بھانجے بھانجیاں خاموش تماشائی ہوتے تھے اور وہ اسے ایک کھیل سمجھتے تھے جو وہ انہیں ہنسانے کے لیے کرتا تھا۔ باقی باتیں وہ بغیر ہونٹ ہلائے رات کو سوتے وقت کرتا تھا۔

بورڈنگ ہاؤس میں یہ کام زیادہ اہتمام طلب کرتا تھا۔ جب کمرے کے پارٹنر نہ ہوں، احساس ہو دوسرے اپنے کمروں میں پڑھائی میں مصروف ہیں، یا کومن روم میں ہیں یا جو زیادہ

پڑھنے والے ہیں وہ لائبریری میں جا کر مطالعہ کر رہے ہیں، اس وقت وہ دروازہ بند کرتا، کھڑکی بھی اور جس سے بات کرنی ہو اُسے مخاطب کر کے آواز کے اوپر نیچے کے چڑھاؤ اتار اور جذبات کی آمیزش سے گفتگو شروع کر دیتا اور جس سے گفتگو چھڑ جاتی کئی کئی دن چلتی تھی۔ کسی کے اچانک دروازہ کھول کر اندر آ جانے پر وہ گفتگو ایسی بن جاتی جیسے تاریخ یا جغرافیہ کے باب دہرا رہا ہو۔

کولج کے دنوں میں یہ عادت جاری رہی گو اس کا موقع کم ملتا تھا۔ جب روم میٹ نہ ہو وہ دروازہ بند کرتا اور گفتگو شروع کر دیتا جو بالعموم حسرت سے بھری ہوئی تھی:

''کہو تسنیم کیسی ہو؟ اگر ایک بار ملاقات ہو جائے، ایسی کہ وہاں کوئی اور نہ ہو، تو بتاؤں ہمیشہ سے تم میرے لیے کیا ہو۔ میں نے خاندان کی، اور جتنے گھرانوں سے ہمارے گھرانے کا میل جول تھا، تقریباً سب ہی لڑکیوں کو تمہیں دیکھنے سے پہلے دیکھا تھا، ایک دو بار نہیں، بارہا، اتنا کہ مجھے اُن کے چہرے کے تل، آنکھوں اور بالوں کی رنگت تک یاد ہو گئی تھی۔ لیکن اگر تم اپنے، اس چچازاد ــ سگے چچازاد ــ بھائی کی بات کا یقین کرو جس کے بارے میں تم نے ایک لفظ خوبی کا نہیں سنا ہوگا اور برائی کے ہزار لفظ تو میری اس بات کو جھوٹ مت سمجھنا۔ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد پہلی بار تمہیں دیکھنے پر خود سے کہا تھا 'اس سے خوبصورت لڑکی میں نے نہیں دیکھی۔'

اس وقت میں دوسری کلاس میں تھا ــ بچہ، اور تمہیں معلوم ہے بچے اپنی پسند ناپسند کے اظہار کے لیے جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔ اگر کہیں پُرتکلف دعوت ہو اور ماں باپ بے وجہ دسترخوان کی ہر چیز کی تعریف کر رہے ہیں بچہ جو چیز پسند نہ آئے اس کے لیے صاف کہے گا ''بری ہے'' یا ''گندی''۔ ماں باپ لاکھ آنکھیں دکھاتے رہیں۔ میں بس ایسا ہی بچہ تھا۔ تم چاہو تو کہہ لو بچپن سے سندرتا کا پجاری تھا۔ اور اس میں دوش میرا نہیں ہے، مجھے اور میری آنکھوں کو بنانے والے کا۔

''اور یہی میں اس وقت تم سے کہہ رہا ہوں۔ تم نے اپنی چچی، میری ماں کو دیکھا ہے۔ اتنی

خوبصورت شکل تم نے بھی بچپن سے لے کر اب تک نہیں دیکھی ہوگی — ویسی رنگت، اُن کی سی گردن، ویسی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، سیاہ لمبے بال اور اُن کے سے خوبصورت ہاتھ پاؤں۔ ایسی ہستیاں فرشتوں سے نہیں بنوائی جاتی ہیں: فرشتوں کو بنانے والا انہیں اپنے ہاتھ سے بناتا ہے۔
اس پر بھی میں تمہاری تعریف کر رہا ہوں تو سوچو تمہیں یاد کر کے میرے دل کی کیا کیفیت ہے۔
''جب میں تمہارے گھر آتا ہوں، بڑے ابا سے مہینے کا خرچہ اور اسکول کی فیس لینے، اگر تم وہاں نظر آجاتی ہو جہاں بیٹھے وہ مجھے حساب کتاب سمجھا رہے ہوتے ہیں، یا جیتے جی جنت میں پہنچ جانے کے لئے صحن میں چلتی پھرتی یا اس کے پرے دالان میں تو اس دن کو سمجھتا ہوں زندہ رہنے کی قیمت وصول ہوگئی۔ ورنہ یہ دنیا جینے کے لائق ہے! اور جس دن جاؤں اور وہ دروازہ بند ہو جو صحن میں کھلتا ہے، یا لگے تم گھر میں ہو ہی نہیں تو وہاں سے ایسے لوٹتا ہوں جیسے بنیے کے پاس گیا، اپنا کچھ گروی رکھا اور رقم لے کر لوٹ آیا۔
معاف کرنا غلط مثال دے گیا۔ وہاں تو میں فیس اور خرچہ لینے جاتا ہوں، کچھ گروی رکھنا کیا! سوری اگر تم سمجھو میں تمہارے ابا کو بنیا کہہ رہا ہوں — وہ تو زندگی میں ہی جنتی ہیں۔ میرے جیسے جیتے جی، دوزخی نہیں۔ مجھے ہمیشہ لگا ہے تمہارے دل میں بھی میرے لیے جگہ ہے۔ اگر بڑے ابا اٹھ کر اندر کسی کام سے جاتے ہیں تو ان کے واپس آنے پر ہمیشہ لگتا ہے اب کہیں گے: کھانا کھا کر جانا۔
اور میری کم عقلی دیکھو سوچتا ہوں دستر خوان پر تم بھی بیٹھی ہوگی۔ کھانے کے بیچ میں آہستہ سے کہو گی: ''آپ نے یہ نہیں لیا۔'' یا کٹورے میں پانی انڈیل کر دوگی۔
مگر میں اپنی خاموش چاہ کا حال کس سے بیان کروں! اماں بی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان سے میں نے بس اپنے دل کا حال ادھورا ہی کہا تھا کہ انہوں نے گھرک دیا۔
تمہیں ایک بات بتاؤں جو شاید تمہیں معلوم نہ ہو کیونکہ تمہارا کوئی بھائی نہیں ہے: بڑے ہونے پر لڑکے جو راز کی بات اپنی ماں سے کہہ سکتے ہیں، باپ سے نہیں۔
انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا دونوں گھروں کے بیچ کوئی چھپی ہوئی تناتنی ہے؟ تایا والے اپنی

لڑکی کا رتبہ اس سے کچھ زیادہ رکھتے ہیں کہ وہ اپنے چچا کے گھر بیاہ کر آئے!

''راجد ھانی آنے کے بعد سے بڑی آپا کا گھر چھوڑنے تک بے انتہا خواہش کے باوجود مجھے تمہارے گھر آنے کے لیے کیا بہانا ہوتا، کیا تایا کے گھر جانے کے لیے کوئی بہانا ضروری ہے؟ مگر ہمارا گھر عجیب گھرانا ہے: ایسا، جہاں کوئی پھول نہ کھلا ہو اور سب خوشبو سونگھ لیں اور جہاں کھلا ہو ناک بند کر لیں۔

''خیر، شاید تم جانتی ہوگی میں نے ہر ماہ بڑے ابا کے پاس اس وقت سے جانا شروع کیا ہے جب ابا کے انتقال کے بعد بڑی آپا اور ان کے جنت کے ٹھیکیدار شوہر نے مجھے گھر سے دھتا بتا دیا تھا۔ لیکن کب ابا مجھ سے اور میں اُن سے اتنا آزاد تھا کہ ایک دن ایک پرچہ ان کے ہاتھ میں تھما کر بھاگ جاتا جس پر لکھا ہوتا: ابا آپ بڑے ابا سے کہیے وہ تسنیم کی بات کہیں نہ کریں۔

لیکن مجھ میں اتنی جرأت انہوں نے پیدا ہونے ہی نہیں دی تھی۔ اگر کسی طرح اپنے دل کی بات ان تک پہنچا پاتا تو مجھے بلا کر کہتے: تو تمہاری روش بدلی نہیں۔

محبت اور روش۔ وہ مجھے جس روش پہ دیکھنا چاہتے تھے وہ یہ تھی کہ میرے دل میں شادی سے پہلے کسی لڑکی نے گھر کیا ہی نہ ہو۔ بلکہ شادی میں ملنے والی لڑکی کے لیے بھی یہ گناہ میرے دل سے سرزد نہ ہو۔

''یہ بات میرے دوستوں کو معلوم ہے۔ ایک دن جب ہم اپنے پہلے عشق کا بیان کر رہے تھے، وہ بڑھا چڑھا کر تو میں صرف اتنا کہہ سکا: اس سے خوبصورت لڑکی شاید پورے خاندان میں نہیں ہے۔ لیکن جو میں کہنا چاہ رہا تھا یہ تھا: اس سے خوبصورت لڑکی شاید خدا نے نہیں بنائی۔

''جب میرے نصیب جاگے اور ہر مہینے بڑے ابا کے پاس جانا شروع کیا اور وہاں سے واپسی پر دوستوں نے پوچھا: کہو بات ہوئی؟'' اور میں نہ میں سر ہلا دیتا ہوں تو وہ مصر ہوتے ہیں: ہمیں موقع تو دو ہم تمہارا پیغام پہنچائے دیتے ہیں اور بڑے میاں سے منوا کر دم لیں گے کہ ہمارے دوست سے بہتر داماد انہیں نہیں ملے گا چاہے پورے ملک میں سوئمبر کرا کے دیکھ

لیں۔ میں کہتا ہوں، رحم کرو۔ جتنا ہے اس سے بھی جاؤں گا۔ فیس اور بورڈنگ ہاؤس کا خرچ منی آرڈر سے بھیجا جانے لگے گا۔ کہو سچ کہتا ہوں؟

"میری بات کا یقین کرو تسنیم۔ تمہارے ابا اور ہماری بڑی امی سے بڑھ کر خشکے دین دار میں نے زندگی میں نہیں دیکھے۔ محبت نام کی چیز دونوں کے پاس سے ہو کر نہیں گزری ہے۔ کبھی یہ نہیں پوچھا کسی چیز کی ضرورت ہے؟ ہوٹل کے کھانے سے اکتا گئے ہو گے۔ کبھی، جب جی چاہے یہاں آ کر اپنی بڑی امی سے فرمائش کر سکتے ہو آج شامی کباب کو جی چاہ رہا ہے، آج حلوہ پوری کو۔ آج میں جانتا ہوں تم نے میری بات کا برا نہیں مانا ہوگا بلکہ سن کر ہنس رہی ہوگی کہ کیا کہہ رہا ہوں۔

"شاید پہلی تائی امی دوسرے ہی مزاج کی ہوں گی۔ تم نے انہیں نہیں دیکھا، لیکن اگر اس وقت تک وہ زندہ رہتیں تو تم کہاں سے آتیں۔ آسمان میں سدا فرشتوں کا دل بہلایا کرتیں۔ سنا ہے ان کے انتقال کے بعد سے تایا ابا کی دماغی حالت بدل گئی ورنہ وہ اتنے زاہد خشک نہیں تھے۔

"بڑی آپا کے بچے تمہارا ذکر آنے پر آپس میں صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا کہہ کر ہنسا کرتے تھے۔ کافی عرصہ اس گھر میں گزر جانے کے بعد مجھے پتہ چلا تم سے پہلے مرحومہ تائی امی کی ایک بچی ہوئی تھی، اس کا نام سلیمہ تھا۔ وہ نہیں بچی۔ پھر جب تم آئیں فرشتوں کو جنت میں روتا چھوڑ کر، تو تائے ابا نے تمہارا نام رکھا تسنیم۔ اور بچوں نے دونوں ناموں کو ملا کر وہ کر دیا جو میں نے ابھی بتایا تھا۔

"نہ آپا بی اور بڑے بھائی جان نے بڑے ابا کو وجہ بتائی کہ مجھے کیوں گھر سے نکال رہے ہیں نہ بڑے ابا نے مجھ سے پوچھا وہاں سے کیوں چلے آئے۔ بڑے بھائی جان اور تایا ابا میرا خیال ہے دونوں ہی ولی ہیں۔ میں تو اتنا ہی سمجھ سکا، دونوں نے میلوں دور بیٹھے ایک دوسرے کے دل کی بات بغیر ہونٹ ہلائے سن لی۔ مذہبی ٹیلی پیتھی۔

"پتہ نہیں تمہیں تائے ابا کس پنج کلان کے سر باندھیں گے اور تم اس رشتے سے خوش بھی ہوگی یا نہیں؟ پنج کلان کے معنی جانتی ہو؟ پنج کلان وہ گھوڑا ہوتا ہے جس کے جسم میں پانچ خوبیاں گنی

جاسکتی ہیں، اور پنچ کلان وہ انسان جس کے جسم پہ پانچ نشان عبادت کے ہوں — ماتھے پر، گھٹنوں پر اور کہنیوں پر۔ اگر میری بدقسمتی ہے ایسا ہی شوہر ملے تو اس کے جسم پر گن لینا۔ وہ تمہاری قدر کیا جانے گا۔ مورتی چاہتی ہے جو اس کے پجاری ہونے کا دعویٰ کرتا ہو اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بھی صبح شام کھڑا ہو، اس کے پیروں پر سر رکھے۔ تم میری ہوتیں تو تمہیں اپنی قیمت کا اندازہ ہوتا۔ روز سویرے پہلے تمہارے پیروں پر پھول رکھتا، پھر کھڑا ہو کے پیار کر لیتا۔

''اور اگر میں جس دن سے نینی پور چھوڑ کر راجدھانی میں بھیجا گیا ہوتا اور جانتا کہ تم میرے لیے ہو تو کیا زندگی کی پتوار مجھے ایک سمت میں نہیں رکھتی، ادھر ادھر بھٹکنے دیتی؟ میرا سارا وقت خود کو تمہارے لائق بنانے میں گزرتا۔''

(۱۳)

اُس لمبی تنگ گلے اور چپٹے ہوئے پیٹ کی گدلے کانچ کی کُپی میں اور ان خوبصورت بوتلوں میں اُسے کوئی رشتہ نظر نہیں آتا تھا جو بعد میں اس کی زندگی میں آئیں سوائے اس کے کہ دونوں ہی کچھ دیر کے لیے زندگی کی حقیقتوں کو بدل سکتی تھیں۔

('لیکن وہ جیسی بھی ہوں تھیں غیر ضروری۔')

قیمتی بوتلیں بعد میں زندگی میں آنے والی نئی قسم کی عورتوں کی طرح تھیں جن کی رشتے دار وہ بنی سنوری عورتیں نہیں ہوتی تھیں جو سرِ شام سر کھولے کوٹھے کے نیچے گزرنے والے مردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی تھیں: 'کیا اوپر نہیں آؤ گے؟' کبھی کسی کے لیے مسکراتی تھیں کبھی تیوری پر بل ڈال کر دوسری طرف دیکھنے لگتی تھیں جیسے پچھلی دفعہ وہ چوٹ دے گیا ہو۔'

'جب نیت اچھی ہوتی تو اس تیسری قوت کے سامنے تمیز خود کو قطعاً بے بس محسوس کرتا۔ وہاں سے نکل کر ہر بار اس کا دماغ خود سے سوال کر بیٹھتا تھا: 'تم آدمی ہو یا پن کیا ہوا بجار۔ آج بھی اس معرکے میں ہارے۔'

'وہ دن اچھے تھے جب اس شہر میں آیا تھا۔ اور کتنے ہی سال اچھے رہے جب اسکول سے واپسی پر دوسرے لڑکوں کے ساتھ راہ میں پڑے ہوئے روڑوں کو کک کرتا ہوا چلتا تھا۔ سرخ پتھر کی پہاڑیوں سے گزرتے ہوئے یہ بھی ایک کھیل ہوتا تھا۔ پتھر اٹھا اٹھا کر نیچے کھوؤں

میں پھینکنا جن میں بارش کا پانی سدا جمع رہتا تھا، پتھر پھینکے جانے پر مچھر غصّے سے بھنبھنا کر اٹھتے تھے کہ کیسے دن کی نیند سے کسی نے اٹھا دیا۔ اور وہ بھی کیا بُرا تھا جب چھٹی کے دن ایک پیسے پر کرائے کی سائیکل لے کر گھنٹہ بھر اُسے دوڑائے پھرتا تھا۔

'اُس خرابی کا ذمے دار جُوا تھا۔ نہ وہ پیسے جیب میں ہوتے نہ تنگ گلی جاتا نہ بھاڑ کے بُھنے چنے کھاتا، اور اُن کے بغیر بھوک سے لڑا کرتا۔'

چند دن تک وہ پچھلی ندامت اور گناہ سے پیدا ہونے والی تکلیف کو بھولا رہتا۔ جُوا اپنے پیچھے نہ اتنی ندامت چھوڑتا تھا، نہ کوئی گہرا احساسِ گناہ کہ اُسے چھوڑنے کی وہ دعا مانگتا۔

ہائی اسکول اور کولج کے پہلے چند پیریڈ خیریت سے گزرتے تھے پھر خرابی اپنی طرف بلاتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، ایک طرح سے اس کی مرضی کے خلاف، روز نہیں ہفتہ پندرہ دن میں۔ اس وقت ندامت اور گناہ کا احساس اگر پچھلی دفعہ کے بعد ذہن میں کچھ بھی بچ رہا ہو اور پیسے جیب میں ہوں اس خرابی کی قوت کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے تھے۔ کوٹھے اپنی طرف بلاتے ہوئے محسوس ہوتے تھے: سستے قسم کے گھر، پرانی بلڈنگوں میں جن کے پلاسٹر باہر سے جھڑ رہے تھے اور اُن پر لگتا تھا سالوں سے نہ چونے کا ہاتھ پھیرا گیا ہے نہ دروازوں اور چوکھٹوں پر رنگ کا۔ ہاں کمرے میں اندر چھت گیریاں ہوتی تھیں، دیواروں پر فریم میں لگی ہوئی تصویریں ۔ بعض پچھلی اور نئی کام کرنے والیوں کی (''وہ کام کرنے والیوں کے سوا کیا تھیں!'') یا اگر کمرہ وسیع ہو اور اُس کی دیواریں چوڑی تو سازندوں اور گانے والیوں کی۔ اور فلم ایکٹریسوں ایکٹروں کی۔

اُن گھروں سے نکلنے کے بعد اُسے دینیات کی کتابوں میں پڑھتے ہوئے اور ویسے ہی سُنے ہوئے جملے بچھو کی طرح ڈنک مارتے محسوس ہوتے۔

اُسے بارہا خیال آیا: 'کیا یہاں سب آنے والوں کو پچھلے پڑھتے ہوئے دینیات کے سبق بعد میں ستاتے ہیں؟'

جوئے سے توبہ اور توبہ کے ٹوٹنے سے پہلے جو کش مکش پیدا ہوتی تھی اور بعد میں دل اور

دماغ کو جلا دینے والی ندامت — بہن کا گھر چھوڑ کر بورڈنگ ہاؤس میں جا کر رہنے پر بھی جاری رہیں۔ بلکہ اُن میں اضافہ ہو گیا۔

بورڈنگ ہاؤس کے زمانے میں وہ اپنا علاج دینیات کی کتابوں سے کرنا چاہتا تھا جن کا تسکین اثر پہلی دفعہ پڑھنے پر بہت ہوتا جیسے کسی شفیق بزرگ سے بات ہوئی ہو، مگر دو تین بار پڑھنے کے بعد ختم ہو جاتا۔

ایک دن اس نے اُن مولوی صاحب سے پوچھا جو بڑے درجوں کو دینیات پڑھاتے تھے: ''ترغیبات سے بچنے کی کوئی دعا بتایئے؟''

دھوپ نکلی ہوئی تھی اور وہ اساتذہ کے کمرے کے باہر دھوپ میں بیٹھے تھے۔ ان کے پیریڈ کم ہوتے تھے۔ کمرے میں بھی کوئی نہیں تھا۔ انہوں نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اپنے لیے کرسی اٹھا لاؤ۔''

تمیز چاہتا تھا اُن کے منہ سے ایسی کوئی چیز نکلے جو اس اندرونی کشمکش کو مٹا دے جو پانچ چھ سال کی عمر سے اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔ اسی نے اس کے دماغ میں قبر کے عذاب کا خوف پیدا کیا تھا۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والی اپنی طرف کھینچتی ہوئی بے اندازہ قوت ختم ہو جائے جو زبردستی وہاں لے جاتی ہے جہاں پہنچ کر چابی دے کر چلائے جانے والے گراموفون ریکارڈ کی طرح محبت سے بھرے الفاظ منہ سے نکلنے لگتے ہیں، جھوٹے الفاظ جنہیں کسی نے نہیں کہا تھا وہاں یہ لفظ منہ پر آتا، وقتی طور پر، حقیقت سے خالی، جیسے شاید تمام کوٹھے والیوں کے پاس جانے والوں کے منہ سے وقت آنے پر نکلنے لگتے ہوں گے۔ قطعاً بے معنی، جس طرح جانوروں کا ہانپنا، اور جو چند منٹ بعد منہ سے نکلنے بند ہو جاتے ہیں، ریکارڈ ختم ہو جاتا ہے اور اگر ساؤنڈ بوکس کو اس پر سے فوراً نہ اٹھا لیا جائے تو اس میں لگی ہوئی سوئی ریکارڈ کے بیچ میں لگی ہوئی کاغذ کی ٹکلی کو دائروں میں کھرچنے لگتی ہے۔ اور اس کے بعد بھولا ہوا سبق یاد آنے لگتا ہے:

''تو نے کیا وعدہ کیا تھا؟'' اس کے بعد پسینے بھرا جسم لے کر اور لٹکے ہوئے چہرے کے ساتھ پسپائی۔

لیکن جب وہ ہمہ توجہ ہو کر بیٹھ گیا اور اس کے منھ سے دوبارہ بس اتنی ہی بات نکلی: ''ترغیبات سے بچنے کے لیے کوئی دعا بتائیے۔''

مولوی صاحب کے ماتھے پر گہرے تفکر کے بل پڑ گئے۔ آنکھیں تمیز کی آنکھوں میں گڑ گئی تھیں۔ بولے: ''کیسی ترغیبات؟''

تمیز نے کہا ''برے خیالات اور برے کام۔ ان سے بچنے کے لیے کوئی دعا۔ وظیفہ نہیں۔ ایسی دعا جو آدمی چلتے پھرتے پڑھ سکے، دل ہی دل میں۔ جو ان خیالات کو مار دے۔''

''آدمی کے؟ کس آدمی کے؟''

بات آدمی کی تھی۔ تمیز آدمی نے جم کر کہا: ''میرے۔''

''کیا خیالات ہوتے ہیں؟ اور کون سے برے کام؟ عورتوں کے بارے میں؟''

تمیز سمجھ گیا ان کے پاس جواب نہیں ہے۔ اور سنا کیا چاہتے ہیں۔ پلک جھپکتے میں وہ دوسرا ہی آدمی تھا: کیسے ایسے خیالات پیدا ہوتے ہیں، ان سے کون سی طلب جڑی ہوتی ہے۔ موضوعِ گفتگو کا ہر پہلو وہ تفصیل سے بتاتا رہا، کن کن کے بارے میں، جن سے واقفیت بس تصویر دیکھنے کی حد تک ہوتی ہے جن سے آدمی اس سے زیادہ چاہتا ہے، شیطانی کام۔ پھر خیالات اور طلب شدت اختیار کرتے جاتے ہیں... اس نے آواز دھیمی کر لی۔

مولوی صاحب نے آنکھیں کھول کر پوچھا ''پھر؟'' لگتا تھا مولوی صاحب اپنی پسندیدہ مغنیہ کا جو نغمہ سن رہے تھے اچانک بیچ میں رک گیا۔

تمیز نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا ''ظہر کی نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔ مجھے ''

کچھ دور جا کر وہ ہنس رہا تھا: 'مل گئی تو دعا انہیں بھی لکھ بھیجوں گا۔' جو احساسِ گناہ اُسے مولوی صاحب تک لے گیا تھا مٹ گیا تھا اب وہ اس لڑکے کی طرح تھا جس نے شبِ برأت کے دنوں میں استاد کی کرسی کے چاروں پایوں کے نیچے پٹ بیجنے رکھے ہوں اور ان کے آنے کا منتظر ہو کہ آ کر کرسی کھینچ کر بیٹھیں گے اور نیچے سے آنے والی چٹ پٹ کی آواز پر پھدک کر کھڑے ہو جائیں گے۔

سیرام پور (مشن) کالج کے دنوں میں تمیز کو کتنی ہی بار خیال آیا 'لاؤ اپنے ٹیچرز میں سے کسی سے پوچھوں آپ کے یہاں جوا، شراب اور جنس کے شکار ہو جانے والے کو کتنا برا سمجھا جاتا ہے؟ وہ قابلِ معافی ہوتا ہے یا نہیں؟ اور ساتھ ہی میں مجھے بتانا پڑے گا وہ آدمی جو یہ کام پلان کر کے کرتا ہے نہیں، اُسے جو اُن اکسانے والی خواہشوں کا شکار اپنی مرضی کے خلاف بار بار ہوتا رہتا ہے کیسے وہ اپنے کو ایسی ترغیبوں سے بچا سکتا ہے؟'

اُسے معلوم تھا یہ لوگ پروٹیسٹنٹ ہیں، کیتھولک نہیں کہ کہیں اس سب کے لیے اعتراف کی کھڑکی کھلی ہے۔ پھر بھی اسے کوئی چیز ڈرا رہی تھی: 'نماز بخشوانے جاؤ گے؟ ہوشیار رہنا الٹے روزے گلے نہ پڑ جائیں۔ ایک دن اُن ہی تینوں کی معیت میں ہوگے جن کے پورٹریٹ ہول میں لگے ہیں۔ The Serampur Trio[1]'

مگر اُسے معلوم تھا یہ لوگ کھلے دل والے ہیں۔ ہمدردی سے بات سنتے ہیں، تب ہی اس دیس کے نیچی ذات والوں کے دل جیت چکے ہیں۔

اس وقت وہ الیگزینڈر ڈف[2]، پروٹیسٹنٹ مشنری، اعلیٰ تعلیم کے پیش رو کے پورٹریٹ کے سامنے کھڑا تھا کہ دماغ میں ایک خیال کا گزر ہوا: 'تمہارا دینی علم صفر ہے۔ بس عربی خوش خط لکھنے تک محدود یا چند یاد کی ہوئی آیتوں اور ان کے رٹے ہوئے معنوں تک، اور وہ بھی بھولتے جا رہے ہو۔ اس رات قبرستان کے پاس سے گزرتے ہوئے آیت الکرسی پڑھ رہے تھے اور لگ رہا تھا غلطیاں کر رہے ہو۔ ممکن ہے یہ لوگ عیسائی بنا لیں۔ یسوع کی بھیڑ، اور گایا کرو گے رب خداوند بادشاہ ہے۔ اور ایسا ہوا بیٹا تو جو تھوڑی بہت امید تایا ابا کے تمہیں داماد بنا لینے کی ہے بھی وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ ہوسکتا ہے وہ تم سے ملنے ہی سے انکار کر دیں۔'

اس نے الیگزینڈر ڈف کے پورٹریٹ کو دیکھتے ہوئے سیٹی بجائی اور وہاں سے نکل آیا۔

---

۱ William Carey 2 Joshua Marshman and William Ward

۲ Alexander Duff

(۱۴)

تلمیذ کے لیے بڑے ابا سے آخری بار ملاقات کے لیے جانے کا دن بے وجہ بڑی امید، اور اس لیے ناآسودگی کا دن تھا۔ وہ انہیں بتانے گیا تھا 'میرا ارادہ راجد ھانی کے مشن کالج کو چھوڑ کر آگے اسلامک یونیورسٹی جا کر پڑھنے کا ہے۔ وہاں ہوسٹل میں جگہ مل گئی ہے، اسلامک یونیورسٹی ٹاؤن چھوٹا شہر ہے، یہاں رہ کر پڑھنے کی نسبت وہاں خرچہ کم ہوگا۔ وہاں ہوسٹل فیس میں بھی کنسیشن مل رہا ہے۔ بی۔اے۔ کرلوں گا۔'

مگر تایے ابا کو اس سب تفصیل میں دلچسپی کب تھی!

اندر سے بڑی امی کے بولنے کی آواز آ رہی تھی، شاید حلال خورنی کو ڈانٹ رہی تھیں: ''تو نے صحن میں پانی بہا کر اس طرح اُسے جھاڑو سے سینچا ہے کہ چھینٹیں جا جم پر پڑی ہیں۔ سب ناپاک کر دیا۔''

ایک لڑکی دبی زبان میں کچھ کہہ رہی تھی۔ پتہ نہیں حلال خورنی کی حمایت میں یا ڈانٹنے والی کو سمجھانے کے لیے۔ بھڑے ہوئے دروازے سے اس سے زیادہ سنا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن اس کی آواز اچھی سے اچھی گانے والی کی آواز سے زیادہ میٹھی تھی۔

'تم گاتی ضرور ہوگی۔ جب بڑے ابا گھر میں نہ ہوں۔ اتنی خوبصورت ہستی اگر نہ گائے تو مجھے ادھوری لگتی ہے۔ اور تم میں قدرت نے کچھ ادھورا چھوڑا ہوگا!'

چاندنی بچھے ہوئے فرش سے اٹھتے ہوئے اس نے سر تایا ابا کے سامنے جھکا دیا، اس امید میں کہ وہ اس پر ہاتھ پھیریں گے اور دعا دیں گے۔ مگر جو کچھ ہو رہا تھا وہیں ان کے بیٹھے بیٹھے ہوا:

''ناچ گانے سے دور رہنا۔ ہر جگہ اللہ کی ذات موجود ہے اور جہاں انسان اس کی موجودگی کو نہ محسوس کر سکے گناہ کی جگہ ہے۔ اور وہ گنہگاروں کی جگہ ہے جہاں آدمی اللہ کے خیال کو ذہن میں آنے سے روکتا ہے۔

''جتنا تم بتا رہے ہو اس سے زیادہ بھیجنا ممکن نہیں ہوگا۔ بورڈنگ ہاؤس کا کھانا۔

(تمھید نے دبی زبان سے کہا ''ہوسٹل کا'')

بسم اللہ کر کے کھاؤ گے تو اچھا لگے گا۔ ہمیشہ یاد رکھنا تمہارے باپ زندہ نہیں ہیں۔ مرحوم نے نہ کوئی بڑی جائیداد چھوڑی ہے نہ کوئی بڑا اثاثہ۔ پردادا کے وقت کی چھوٹی زمینداری تھی۔ میں اپنے حصے کی زمین بھی تمہارے باپ کو دے چکا تھا کیونکہ وہ کثیر العیال تھے اور میرا خرچہ تمام عمر محدود رہا۔

(''اور کنبہ بھی'' تمھید نے زیر لب کہا)

''... ذہن سنگسازوں کے ہیں اور ان میں مچھلی کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ یہ یاد رکھا تو ہاتھ اپنے آپ گلے سے بندھا رہے گا۔''

پھر انہوں نے سوتے وقت پڑھنے کی دعا، صبح آنکھ کھلنے پر پڑھنے کی دعا بتائی۔

تمھید نے ہمت کر کے کہا ''جانے سے پہلے بڑی امی کو آداب کرنا چاہتا ہوں۔''

''ان کے سر میں درد ہے۔'' انہوں نے رکھائی سے کہا۔

ہوسٹل لوٹنے سے پہلے وہ کئی گھنٹے ادھر اُدھر پھرتا رہا— بلا کسی مقصد کے۔ کبھی سوچتا ابھی پھر تائے ابا کے گھر جاؤں اور ان سے کہوں کیسے آپ مجھے گھر کے اندر جانے سے روک سکتے ہیں۔ کوئی غیر ہوں! میں جانے سے پہلے تائی امی کو دیکھنا چاہتا ہوں اور تسنیم کو'

وہ خفگی سے کہیں گے 'صرف تسنیم کو۔ تائی امی کا صرف بہانا ہے۔'
میں کہوں گا اس میں حرج کیا ہے؟ مجھ میں دماغی جسمانی کون سا عیب ہے؟ میں آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ابھی فوری نہیں۔ تعلیم کے مکمل ہونے کے بعد۔ تب تک وہ آپ کے پاس میری امانت ہے۔ ماں باپ نہیں رہے اس لیے مجھے خود یہ بات آپ سے کہنی پڑ رہی ہے۔'
لیکن اٹھنے والے خیالات بکھر کر دوسرے خیالوں میں مل جاتے۔ پھر دماغ کہتا: 'وہ اندر آنے ہی نہیں دیں گے؛ ابھی تو مل کر گئے ہو۔'
جب وہ ہوسٹل پہنچا میس بند ہو چکا تھا اور زندگی کی حقیقت سمت کراتی رہ گئی تھی کہ شام تک بھوکا رہنا پڑے گا- باہر کھانے کے لیے جیب میں پیسے نہیں تھے - یا یوسف اور ایمن میں سے کسی کے گھر چلا جائے۔
اگر کوئی تمکینہ سے پوچھتا: نینی پور میں گزارے ہوئے دنوں میں سے کون سا سب سے اچھا تھا، کون سب سے زیادہ ابھی تک ستاتا ہے؟ تو وہ کہتا: 'ایک دن جب ایک لڑکی میرے باپ سے لگی کھڑی تھی اور بتا رہی تھی کون سی کتابیں پڑھتی ہے، کون سی کہانی اسے بہت پسند ہے اور میں دنیا کی اس سب سے خوب صورت لڑکی کو جو میری ماں سے بھی زیادہ خوبصورت تھی فرش پر بیٹھا دیکھ رہا تھا اس امید میں کہ وہ میری کتابوں میں دلچسپی لے گی اور میں اسے کمر کا باغ دکھانے لے جاؤں گا۔
'اور دوسرا موقع وہ تھا جب راجدھانی میں کسی رشتے دار کی شادی تھی اور سارے رشتے دار جمع ہوئے تھے۔ میرے امی، ابا، بہنیں، بھائی سب آئے تھے۔ بڑے ابا کے گھر سے اُن سب تمہیدی تقریبوں میں کوئی شریک نہیں ہوا جن میں گانا بجانا تھا، ڈومنیاں آئی تھیں، مہندی ہوئی — سب خرافات تھیں۔ بڑے ابا کے ڈر سے ہمارے گھر سے بھی ان میں شرکت کے لیے کوئی نہیں آیا تھا۔'
نکاح والے دن وہ لوگ آئے۔ بڑے ابا لڑکی کی طرف سے وکیل تھے۔ میں جب ان کے

ساتھ اندر گیا تو وہ بھی نظر آئی۔ دلہن کے اردگرد جو چہرے تھے اُن میں سے ایک۔ میں نے بڑے ابا کو کہتے سنا: ''اونچی آواز سے کہو۔'' لیکن تسنیم کی آنکھوں میں کھو کر مجھے دلہن کی ''جی ہاں'' سنائی نہیں دی۔

وہاں سے باہر نکالے جاتے وقت میں نے آنکھوں آنکھوں میں پوچھا: ٹھیک ہو؟ اور اس نے ٹھوڑی کی جنبش سے ہاں کہا:

اور جس دن کی ملاقات کے یاد آ جانے پر تمکینہ مغموم ہو جاتا تھا وہ بھی اس کے ذہن سے نہیں مٹی: اس وقت میں چھٹی کلاس میں تھا۔ اور جب اگلی چھٹیوں میں گھر گیا تو اماں بی سے وہ بات کہی تھی: آپ کو تسنیم کیسی لگتی ہے؟ میرا خیال تھا وہ کہیں گی: کیوں تمہیں پسند ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو میں شرما کر اپنا منھ ان کے پیٹ میں دھنسا دیتا۔ مگر تو بہ۔ وہ کون سی باہر کی تھیں! وہ بھی اسی خاندان کی تھیں جس نے بڑے بھائی جان اور اُن کے ان سے زیادہ خشک بڑے بھائی صوفی، قاری، حافظ، حاجی، مفسر اور نہ جانے کیا کیا کچھ کو پیدا کیا تھا۔

تسنیم سے آخری ملاقات ہی بس ملاقات کہے جانے کے لائق تھی۔ اس کا اماں بی کے انتقال میں اپنی ماں کے ساتھ نینی پور آنا۔ میں رو تو نہیں رہا تھا لیکن جس طرح دالان کے کھمبے سے چپکا کھڑا تھا کوئی بھی دیکھ کر کہہ سکتا تھا اس ہجوم میں کسی کے ساتھ اپنا غم بانٹ نہیں پا رہا ہوں۔ نہ کوئی، جیسا کہ ہوتا ہے، میرے سر کو اپنا سینے سے ملا کر تسکین دے رہا ہے۔ تب سیدھے کندھے کے پاس سے وہ آواز سنائی دی جو کتنے ہی دن جب بھی اکیلا ہوتا تھا سنائی دیتی تھی اور میری مونس بن جاتی تھی:

''تمہیں بہت دکھ ہوا تمکینہ بھائی؟''

خود بخود میرا چہرہ اس آواز کی طرف مڑ گیا ''اور تمہیں بھی؟''

تم نے سر کی جنبش کے ساتھ کہا ''ہاں۔ کتنی خوبصورت تھیں۔''

اور تب ہی کسی نے تم سے کہا ''بیٹا تمو کے ڈاکٹر صاحب بلائے رہے ہیں۔''

بعد کے دنوں میں جو خیالات اس کے ساتھی بنے ماں کی یاد سے بڑھ کر تسنیم کے تھے:

'اگر تم نے اس زمانے میں جب ہم نے پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھا تھا مجھے اپنا لیا ہوتا۔'
اُسے اپنی بات پر پھیکی سی ہنسی آ جاتی: 'بچپن میں؟ خیر تب نہ سہی اس کے بعد کے زمانے میں جب میں تمہارے گھر مہینے کا خرچہ لینے آتا تھا، تو کیا میں وہ سارے دکھ جھیلتا جو میں نے جھیلے! ایک پِٹن کیا ہوا بیچارہ جس کا کوئی گھر نہیں ہوتا ہے جو ادھر اُدھر پھلوں سبزیوں میں منھ ڈالتا پھرتا ہے اور ڈنڈے کھاتا ہے۔ تم اگر ہر بار خود پر بس ایک نظر پڑ جانے دیتیں تو آج کو میری زندگی کچھ اور ہی ہوتی۔
'راجدھانی چھوڑنے کے بعد وہ امید ہی مٹ گئی کہ تم کبھی نظر آؤ گی۔ لیکن رہا میں ہمیشہ اس سرخوشی میں کہ تم مجھے بھولی نہیں ہوگی۔ کیا غلط فہمی ہے! نینی پور اور راجدھانی کے زمانے میں اگر مجھے یقین ہوتا تم میری ہو تو میں تمام زندگی کی تکلیفیں اٹھا کر بھی خود کو تمہارا رکھتا — تمہارے لائق۔'

یہ سب جیسے فریم میں لگی ہوئی تصویریں تھیں جن پر مٹی بیٹھ گئی تھی، جمی نہیں تھی۔ پھونک مارنے سے اڑتی جاتی تھی۔

(۱۵)

ایک عرصہ سے تمیز اپنے بارے میں اس حقیقت سے آگاہ تھا کوئی دن اس کی بے دلی کا ہوتا ہے اور کوئی تاسف کا۔ اسلامک یونیورسٹی ٹاؤن میں آنے کے بعد بھی یہ سلسلہ یونہی چل رہا تھا۔ کبھی بے دلی دنوں چلتی تھی، کبھی تاسف اور کبھی کبھی دونوں میں سے ایک، ایک بار آنے کے بعد ہفتے سے پہلے جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔

'اگر تایا ابا مجھے اپنے گھر میں رکھ لیتے یا کہتے چھٹی کا دن یہاں گزارہ کرو تو میری زندگی کچھ اور ہی ہوتی۔ تھوڑی سی محبت انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے!'

'تسنیم کو میں پسند تھا اس کی گواہی میرا دل دیتا ہے۔'

'اور تبسم؟ اگر وہ دل رکھ لیتی اور صرف اتنا کہہ دیتی: پھر آیئے گا، یا، اب کب آیئے گا؟ تو وہ شاید میرا دوسرا جنم ہوتا۔'

'مندر مسجد دونوں میں جھاڑو دینے والا۔'

'یا ہو سکتا ہے دوسرا منظور۔' جیسے دماغ کے دوسرے حصے نے چپکے سے کہا۔

'لیکن اس کا چاہت میں مار دیا جانا اس تاسف، بے دلی کے چکر میں گھرے رہنے سے بہتر ہوتا۔'

جب دماغ اس طرح کام کرنے لگتا تو لگتا جیسے اندر سکون ہی سکون ہے۔ زندگی شدید سردی اور

ٹھمری کا راگ سنا رہی تھی — بہار سنانے لگی۔

ٹرین سے راجدھانی سے اسلامک یونیورسٹی ٹاؤن جانا ہمیشہ اس کے ذہن میں جوں کا توں موجود رہا۔ ندیوں، تالابوں اور سرسبز کھیتوں کے بیچ سے گزرنے والا راستہ، ایک تیرتھ استھان پر ٹرین بڑے پل پر سے گزری۔ صبح ہلکے اندھیرے میں وہ ٹرین میں بیٹھا تھا۔ دن چڑھتا گیا اور کھیتوں کو جانے والے کسان نظر آنے لگے، اور ان کی عورتیں، بیل اور ہل۔

سالوں بعد بھی وہ راستہ ہمیشہ اس کے ذہن میں اس طرح ابھرا جیسے گھنے جنگل میں سے گزرنے والا ایک کچا راستہ تھا جو سالہا سال کی بارشوں سے ایسی گھاس سے ڈھک گیا تھا جس میں اگر ہاتھی بھی کھڑا ہو تو نظر نہ آئے۔ اور جب سوکھا پڑنے پر وہ گھاس پیلی پڑ کر بیٹھ رہی تو اس کے نیچے وہ راستہ صاف نظر آ رہا تھا۔

اُسے نئے شہر جانے کی خوشی بھی تھی اور راجدھانی چھوڑنے کا دکھ بھی۔ وہیں رہتا رہتا، 'وہاں کی دنیا دیکھی بھالی تھی۔ نینی پور چھوڑ کر جب راجدھانی بھیجا گیا تھا کتنے دن افسردہ رہا تھا۔ پھر، وہاں رہتا رہتا تو مہینے کے مہینے تایا ابا کے گھر جایا کرتا۔ ان کی نظروں میں رہتا، خود کو سدھار سکتا تھا، کبھی کبھی تسنیم کی جھلک مل جاتی یا آواز سنائی دے جاتی۔ ہوسکتا ہے تایا ابا کا رویہ مجھ سے بدل جاتا۔

'مگر اس کے لیے تمہیں اپنے کو بدلنا پڑتا۔ اس مسجد میں وہ تمہیں پانچوں وقت نماز پڑھتے دیکھتے جو ان کے گھر کے سامنے ہے۔ اور تراویح میں بھی — پورے رمضان۔ ایسا ہوتا تم وہاں بیٹھے قرآن پڑھ رہے ہو۔ وہ آتے اور تمہاری نظروں سے ان کی نظریں ملتیں۔ تم سلام کرتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرتے اور وہ تمہیں کندھے پر زور دے کر بٹھا دیتے کہ پڑھتے رہو۔'

'یعنی انہیں دھوکا دیتا اور خود کو بھی!'

'وہ راستہ میرے لیے آسان تھا جو سب دوستوں نے لیا تھا، جن کے بغیر میں خود کو تنہا اور بے پشت محسوس کرتا تھا۔'

اس دن ٹرین میں بیٹھے بیٹھے وہ سوچ رہا تھا 'مجھے پہلی تعلیم بگڑنے کی شرف زادی نے دی تھی یا میرے اردگرد کی دنیا نے؟ اماں نے؟ نینی پور میں وہ ہمیشہ یہ تعلیم دیتی آئی تھیں: بیٹے کے جسم کو ہمیشہ دوسروں سے چھپاؤ۔ یہ وہ جب کہتی تھیں جب نہلانے کے بعد میرا جسم پونچھ رہی ہوتی تھیں۔ اس وقت ایک جھینپی سے مسکراہٹ اُن کے چہرے پر آجاتی تھی۔ سب ہی عورتوں کو میں نے اپنے لڑکوں کے ساتھ یہ سلوک کرتے دیکھا تھا۔ اماں ہی نے تعلیم دی تھی جسم کے کس کس حصے کو ہاتھ نہیں لگانا ہے۔ اور ان کے ہٹتے ہی، سب لڑکے اپنی ماؤں کے ہٹتے ہی اس حکم کو توڑتے تھے۔ اور وہ خیال بہت مدہم سا اس کے ذہن میں ہمیشہ رہا: وہ اُسے گود میں لیے کھڑی ہیں اور وہ جو چاہتا ہے کررہا ہے۔ پھر ایک دن، یا کئی بار؟ انہوں نے اس کے ہاتھ کو اپنے جسم سے جھٹک دیا۔ ہلکی سی غصے کی آنکھیں دکھاتے ہوئے۔ کب؟ کہاں؟ یہ بالکل یاد نہیں رہا تھا۔ ایک چیز جسے وہ اپنی سمجھتا تھا اُس سے چھین لی گئی تھی — پہلی چیز جو وہ کھو بیٹھا تھا۔ ایسے کتنے ہی سین مل کر ایک بن گئے تھے اور وہ ایک خیال اُسے ستاتا رہا۔

اور وہ کتنی ہی بار کا دیکھا ہوا سین بھی برہنہ لڑکوں کو ڈرانے کا: ''جلدی چھپاؤ۔ بلی آجائے گی۔'' بیت الخلا اور غسل خانے میں نہ بولنے کی ہدایت ورنہ فرشتے آکر ننگا دیکھ لیتے ہیں۔ دوسروں کے کھلے ہوئے جسم کو نہ دیکھنے کی ہدایت۔ کیا بھرمار تھی ہدایات کی! مگر ہوا کیا، شرف زادی نے ایک دن پیار سے اُن سب کو توڑ دیا:

اُن ممانعتوں کو توڑ سکتے ہو جب تمہیں کوئی دیکھ نہ رہا ہو۔

'اس نے خود سوچ سمجھ کر اسی احتیاط کے ساتھ ان رکاوٹوں کو توڑا ہوگا۔'

'اور جب ٹرین میں ہیجان بڑھ گیا تو میں دیر تک سر کھڑکی سے باہر نکالے رہا کہ ٹھنڈی ہوا سے یہ طوفان تھم جائے گا جس نے آج کسی پابندی کا بھرم نہیں رہنے دیا ہے۔ نہ پابندی عائد کرنے والوں کا۔

خیر ٹھنڈی ہوا سے تو طوفان نہیں تھما، وہ کام آنکھ میں کوئلہ پڑ جانے نے کیا۔ میں نے سر اندر کرلیا، آنکھ کو مٹھی میں پھونک پھونک کر آرام پہنچانے لگا۔ جیسے اماں کرتی تھیں — آنکھ سے

پانی بہہ رہا تھا۔

برابر میں بیٹھے ہوئے بڑی عمر کے مسافر نے کہا: ''اپنی آنکھ مجھے دکھاؤ۔''

اس نے رومال کی نوک سے کوئلہ نکالا اور بولا: ''پھونکنے سے تو تکلیف بڑھ جائے گی۔ سینکتے جب

تیں جب چوٹ لگی ہو۔''

اُس کے بعد میں اس سے بات کرنے لگا۔ اور اپنے کو بھول گیا۔ یہاں تک کہ اسلامک

یونیورسٹی ٹاؤن کے پلیٹ فورم پر پہنچ کر ٹرین ٹھہر گئی۔

'آج میں کہہ سکتا ہوں ممانعت اور قانون توڑے جاسکتے ہیں اگر ان کو عائد کرنے

والے موجود نہ ہوں۔ ان کی غیر موجودگی میں – اور وہ کبھی نہ جان پائیں کہ ان کا قانون توڑا گیا

ہے۔ مگر تب کیا میں ٹھنڈے دماغ سے ان باتوں کے بارے میں سوچ سکتا تھا!'

اُس دن ٹرین میں جب آنکھ سے کوئلہ نکلوانے کے بعد ہیجان ٹل گیا تھا تو اس میں ایک

عجیب حسرت پیدا ہوئی تھی: 'کاش ابا نے کبھی مار لگائی ہوتی ار ہر کی سنٹی سے اور بجائے بڑے

بہنوئی کے سپرد کرنے کے خود میری تعلیم اور تربیت میں دلچسپی لینے لگتے! انہوں نے کیا کیا، پہلے

اپنی ذمے داری ماں اور پڑھانے والوں پر ڈالی، پھر اپنی لاڈلی بڑی بیٹی اور بڑے داماد پر۔'

'But' (لیکن) اور تھوڑی دیر اس لفظ میں پھنسے رہنے کے بعد اس کے دماغ نے کہا He was

a nice man۔ سیدھے آدمی تھے جو ان کی سمجھ میں آیا وہ انہوں نے کیا۔'

اسلامک یونیورسٹی ٹاؤن کے پلیٹ فارم پر اپنے لوہے کے ٹرنک اور ہولڈول کے ساتھ

اتر کر تلمیذ الرحمٰن نے چاروں طرف نظر دوڑائی: روح میں اتر جانے والی شانتی نے پیڑ پودوں،

اسٹیشن کی مختصر سی عمارت، دور نظر آنے والے مٹی کے قلعے، اور اسٹیشن کی چھت پر، وہ بھی آدھ

میل سے کم دوری پر نہیں، پیڑوں میں چھپے ہوئے شہر پر اپنے پر پھیلا رکھے تھے۔

پلیٹ فارم، بالکل نمی پور کی طرح سرخ بجری سے ڈھکا تھا اور اس کے دونوں سروں پر شہر کا نام بتانے والے پتھروں کے بلوک ایستادہ تھے جن پر چڑھ کر بجری پہ چھلانگ لگانے کا مزہ اگر کوئی دیکھنے والا نہ ہوتا تو اس وقت بھی لیا جا سکتا تھا۔

'دریا کس طرف ہے؟' سنا اور اٹلس میں تو دیکھا تھا کہ اسلامک یونیورسٹی ٹاؤن کو ایک بوڑھے نے اس سبز ویرانے میں دریا کے کنارے بسایا تھا تاکہ پڑھنے والوں کے دماغ جتنا عرصہ یہاں رہیں پرسکون گزریں، انہیں پڑھائی کے سوا اور کوئی کام نہ ہو۔ وہ بوڑھا یقیناً میر امپور والے الیگزینڈر رؤف کا کزن تھا۔ اس کی زندگی کا مشن بھی اعلیٰ تعلیم پھیلانا تھا اور رؤف ہی کی طرح مسلمانوں میں نامقبول تھا۔

جن مسافروں کو، زیادہ کو نہیں، یہاں اترنا تھا اتر کر اپنی راہ پکڑ چکے تھے۔ تمیز ارادہ کر رہا تھا بہتر یہی ہوگا کہ یا تو بکس سر پر رکھ کر اور ہولڈول بغل میں لے کر پیدل یونیورسٹی کی طرف چل پڑوں یا انتظار کروں اور جب مخالف سمت سے ٹرین آئے ٹکٹ لے کر اس میں سوار ہو جاؤں۔ اسی وقت ایک تانگا اسٹیشن کے پیچھے رکا، تمیز نے سر اٹھا کر اُدھر دیکھا۔ یوسف مواج تانگے والے کو ٹھیرے رہنے کے لیے کہتا ہوا عمارت میں سے گزر کر تمیز کی طرف دوڑا۔ اس کے پیچھے پیچھے جو آدمی آ رہا تھا شاید کیا یقیناً ہوسٹل کا نوکر تھا۔

اس کا علم چند دن ہی میں تمیز کو ہو گیا کہ اُس بوڑھے نے یہ جگہ تعلیم کے لیے ڈھونڈی ضرور تھی لیکن اس کا بہشت جیسا اردگرد طلبا کے دماغ پر چڑھ کر جادو کا کام کرے گا اس کا علم اُسے نہیں ہو سکا تھا۔ تمیز کو نئی جگہ راجد حانی سے زیادہ پسند آئی۔

وہ تمام سوچیں جو تمیز کا پیچھا راجد حانی بلکہ نمی پور کے دنوں سے کر رہی تھیں اور اس کے دماغ پر اسلامک یونیورسٹی ٹاؤن پہنچنے تک چیلوں کی طرح منڈلاتی ہوئی آئی تھیں آہستہ

آہستہ نئے ساتھیوں کے درمیان ازخود کم ہوتی چلی گئیں۔ وہاں لڑکے اپنے ایڈولیسینس[۱] (adolescence) کے دنوں کو پیچھے چھوڑ کر آئے تھے اور کھل کر اُن خیالات اور کارناموں کا ذکر کرتے تھے جو شجر ممنوعہ سے کبھی جڑے تھے، جن کا توڑنا نوجوانی پر فرض ہو جاتا ہے۔ وہ پوشیدہ زندگی اب اُن کے لیے اتنی پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ کچھ اپنے تجربات اس بے باکی سے سناتے تھے کہ صاف پتہ پڑ جاتا تھا ڈون کی لے رہے ہیں۔ یا پانچوں سواروں میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔

پھر بھی جو صاحب اسلامی فکر (Islamic Thought) پڑھاتے تھے تلمیذ اُن سے کلاس کے بعد، کبھی کبھی، گھما پھرا کر پوچھ لیتا تھا: ''انسان کے دماغ میں جو غلط خیالات آتے ہیں اُن سے بچنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ میرے ایک دوست نے مُنگیر سے لکھا ہے اپنے پروفیسر سے پوچھ کر لکھو۔ مثلاً جو معمولی سی بات پر اُسے بارود کی طرح بھک سے اڑا کر رکھ دیتے ہیں، بدلہ لینے کے خیالات، حتیٰ کہ قتل کر ڈالنے کے۔ اُن باتوں اور عمل کے جو صرف شوہر اور بیوی کے درمیان ہونی چاہئیں، شادی نہ ہوئی ہو اور دوسروں کی بیویوں اور غیر عورتوں کے لیے ایسے خیالات کا آنا۔''

یہ صاحب جتنے بڑے عالم تھے اتنے ہی بڑے جھینپو تھے۔ تلمیذ نے دیکھا تھا اُن سوالات کے کلاس میں اٹھنے پر جو ایمان میں شک کی دراڑ ڈالتے ہوں گھبرا جاتے تھے۔ چھیڑ خانی کے طور پر طلبا۔ اودھا کر اُن سے وہی سوال کرتے تھے جن کو سن کر اُن کا خاصا گورا چہرہ گلابی پڑ جاتا تھا، انگلیاں سامنے رکھی ہوئی کتاب یا نوٹ بک کے صفحے الٹنے پلٹنے لگتی تھیں۔ لگتا تھا بغیر پوری ذہنی تیاری کے انہوں نے 'اسلامی فکر' پڑھانے کی ذمے داری لے لی ہے جس میں فقہ بھی شامل تھا اور جو قدم قدم پر انہیں بچپن کی معصومیت سے ٹکراتی ہوئی محسوس ہوتی ہوگی۔ پھر بھی اُن کا ردِعمل طیش کا نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن جب واصف صاحب کلاس سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے اور

---

[۱] کشور اوستھا، لڑکپن اور نوجوانی کے بیچ کا دور

ضمیر تلمیذ کو ستا رہا تھا اس نے پاس پہنچ کر ساتھ چلتے ہوئے کہا: ''اس دوست نے جو ممبئی پور سے مجھے خط لکھا کرتا ہے پوچھا ہے: جس سے خطائیں ہو چکی ہوں، بڑے سے بڑے گناہ۔''

واصف صاحب نے گھبرا کر پوچھا: ''کسی کو قتل کیا ہے؟''

''نہیں صاحب وہ تو خون دیکھ تک نہیں سکتا ہے۔''

''کفر میں چلا گیا ہے؟''

''نہیں۔نہیں۔''

''دوسرے گناہ؟''

''جی ہاں۔''

انہوں نے سانس کو درست کرتے ہوئے کہا: ''تمہیں لکھوائے دیتا ہوں۔ اپنے دوست کو لکھ دینا: مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے: اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ [۱] کو ہر وقت ذہن میں رکھے اور اس پر عمل کرے۔ بہت آسان طریقہ ہے مایوسی سے بچنے کا۔''

تلمیذ نے کہا ''عربی اُسے نہیں آتی ہے، مجھ سے بھی کم۔''

انہوں نے کہا: ''معنی کے ساتھ لکھ دینا، قرآن کی آیت ہے: یعنی وہ کام کرو جو نیکی میں گنے جاتے ہیں، پارسائی کے کام، وہ بدیوں کو ختم کر دیتے ہیں۔''

اس کے بعد وہ ناقابل معافی گناہوں کا ذکر لے آئے جن میں تلمیذ کو دلچسپی نہیں تھی، لیکن وہ باتیں تلمیذ کو بری بھی نہیں لگیں۔ ایک کم عمر آدمی ایک اپنے سے زیادہ علم اور تجربہ رکھنے والے سے جذبات کے طلاطم کے بارے میں بات کر رہا تھا، بغیر گناہ، ثواب،، دوزخ جنت کو درمیان میں لائے۔

اس کے بعد تلمیذ نے دو تین اور سوال کئے: زیادہ بڑا گناہ قتل ہے یا شرک؟ آدمی خود کو نوجوانی اور جوانی کے مغلوب کرنے والے، سیلاب جیسے خیالات کے درمیان کس طرح پاکیزہ رکھ سکتا ہے؟ آدمی مصلحتاً بھی شرک یا کفر اختیار کر سکتا ہے؟ یہ سوالات اس نے بے وجہ پوچھے

۱ ھود ۱۱: ۱۱۴

تھے۔

واصف صاحب سے رخصت ہوتے وقت تمیز کو کچھ کچھ احساس ہو رہا تھا اس کے ذہن پر سے بڑا بوجھ ہٹ گیا ہے۔ بدی ایسی چیز نہیں ہے جس کی وجہ سے آدمی اپنی جان لے لے یا دوسرے کی۔ وہ عبادت کرے گا، لوگوں کے ساتھ نیکی کرے گا اور یہ تمام اچھائیاں اس کی روح پر جمی ہوئی بدچلنی کی مٹی کو دھو دیں گی۔

'ہر ایک کو؟'

'ہر ایک کو۔' اُسے اپنی نیت کی استواری میں شک ہوا۔

(۱۶)

کمرے میں رمی ہو رہی تھی۔ اُن کے درمیان بیٹھتے ہی اس سرخ چہرے والے آدمی نے جو یوسف عسکری کا دوست تھا، سگریٹ کا کھلا پیکٹ تمیز کی طرف بڑھایا۔ اس نے سر جھکا کر شکریہ کہا اور سگریٹ لے لی۔ وہ اُن سب سے عمر میں بڑا تھا۔ کبھی کبھی آرمی ہیڈ کوارٹرز کے شہر چھاؤنی گڑھ سے خاص طور سے یوسف سے ملنے آتا تھا۔ شادی نہیں ہوئی تھی، پیتا پلاتا تھا اور اپنے شہر کی اُن طوائفوں کو بھی جانتا تھا جو ترقی کر کے فلم کیپیٹل سٹی جا چکی تھیں۔

دوپہر کا کھانا وہیں کمرے میں ہوا۔ اس کے بعد وہ دیر تک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا، جیسے کسی سوچ میں ہو۔

ٹھنڈا وقت ہو جانے پر سب اُسے ریلوے اسٹیشن چھوڑنے گئے۔ آخری بات جو اس نے یوسف عسکری سے نہیں سب کے لیے تھی: ''نواب صاحب بندھنے جا رہا ہوں۔ لڑکی میں نے دیکھی نہیں اور ہاں کر چکا ہوں۔ زندگی جو دیکھنی ہے دیکھ لو۔ ابھی آٹھ دن ہیں، انگریزوں کی سب سے بڑی چھاؤنی کا شہر دیکھ لو جہاں سے وہ کہتے ہیں بغاوت اٹھی تھی۔ چھاؤنی گڑھ کا چکر لگالو۔ مُجرے پر لے جاؤں گا۔ بولو منظور؟''

یوسف عسکری مسکرا کر نے کہا: ''نہیں، شادی کے دن آؤں گا اور تمہارا سہرا پڑھوں گا۔''

واپسی پر پورے راستے اعجاز کی باتیں ہوتی رہیں، اور کمرے میں آ کر بھی:

اچھا پینے والا آدمی ہے، اچھی پیتا ہے۔ ہماری تمہاری طرح کلبز سے دیسی پینے سے افتتاح نہیں کی تھی۔ سستے کونٹھوں پر نہیں جاتا ہے۔ وہاں بھی اپنا اسٹینڈرڈ قائم کیے ہوئے ہے۔ بڑی زمینداری ہے۔ باپ وہیں زمینوں پر رہتے ہیں۔ گنے کی کاشت ہے، سرخ گنے کی۔ اعجاز کو بھی چھاؤنی گڑھ چھوڑ کر وہیں رہنا پڑے گا۔

ماں اور دادی بھلا بہو کو چھاؤنی گڑھ میں رہنے دیں گی! اصل میں اس کا سارا پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا: فلم کیپٹل سٹی جاتا۔ اٹھارہ سال کی عمر سے جس کے پاس جانا شروع کیا تھا، اس پر بند تھی اور فلم کیپٹل سٹی جا کر اُسے نہیں بھولی تھی — نندنا۔ (حمیدہ) وہ اُسے بلا رہی تھی "آؤ، ایک دن ڈائریکٹر بن جاؤ گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ چھاؤنی گڑھ میں کیا رکھا ہے!"

"لیکن اعجاز کو نہیں معلوم تھا جو پتے اس کے ہاتھ میں ہیں، بے قیمت ہیں۔ بڑے پتے اس کے باپ کے ہاتھ میں ہیں۔"

"اور وہ ہیرے کو پتھر سے توڑنے چلا ہے۔" صبغت اللہ نے بات پوری کی۔

یوسف عسکری نے کہا "واقعی اعجاز فلم کیپٹل سٹی کے لیے بنا ہے۔ زندگی کے کئی کھیل ایک ساتھ کھیل سکتا ہے، کھلا ہوا آدمی ہے، ہماری تمہاری طرح کھونٹے سے بندھا ہوا نہیں۔ ہمیشہ کوچۂ حسن میں مقبول رہا ہے۔ اب باپ اس سے ہل چلوائے گا۔"

"اور بس ایک کھیتی ہوگی۔" صبغت اللہ نے کہا۔ ("اُسی کو بوتا اور کاٹتا رہے گا")

حمر ون نے کہا: "گرا ہوا آدمی نہیں ہے، اور بڑی بات یہ ہے مذہب وذہب میں یقین نہیں رکھتا ہے۔ پچھلی دفعہ جب آیا تھا اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا کسی یوریشین لڑکی سے شادی کا ارادہ ہے۔"

صبغت اللہ نے سگریٹ کے سرے کو سڑک پر پھینک کر جوتے سے مسلتے ہوئے کہا: "ہاں این ایڈورڈ (Anne Edward) سے۔ مگر وہ چرچ میرج چاہتی تھی اور اعجاز مذہب کے سرے سے خلاف ہے۔ آج مجھے تعجب ہو رہا تھا وہ اپنے ماں باپ کی پسند کی لڑکی سے شادی کرنے پر راضی کیسے ہوگیا۔ اور لڑکی کو اگر باپ یا بھائیوں نے دیکھا ہوتا تب بھی بات تھی۔ عورت کا حسن

مرد دیکھ سکتا ہے، دوسری عورت کو نظر نہیں آتا۔ یا آتا ہے تو ایک دم الٹ: ماتھے چاند ٹھنڈی تارہ۔ اور یہاں تو لگتا ہے لڑکی کو صرف ماں، دادی، خالاؤں نے دیکھا ہے۔''

تلمیذ نے کہا: ''بات لگانے والی نے اگر اس کے لیے ٹھنڈی تارہ کہا ہوگا تو وہ نانی دادی کو چندے آفتاب چندے مہتاب نظر آئی ہوگی۔ لگتا ہے اعجاز بیوی کے پاس۔''

''astronomy (علم نجوم) پڑھنے جائے گا۔'' صبغت اللہ نے بات پوری کردی۔

کچھ وقفے کے بعد خرون نے کہا: ''جب سے آیا تھا خاموش تھا، جیب سے وہسکی کی کوارٹ بوتل بھی نہیں نکالی جس کے بغیر پہلے یہاں کبھی نہیں آیا۔ ہوتی تو بوتل نکال کر کہتا: ''چائے چلے گی؟''

صبغت اللہ نے کہا: ''یقین نہیں آتا ہجوم میں سر جھکا کے بیٹھ کر قاضی صاحب کے سوال پر تین بار کیسے ہاں کرے گا اور سب کے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھادے گا۔''

حسن وارد ایمن نے کہا: ''انسان کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔''

صبغت اللہ نے کہا: ''بگڑتے کہو۔ بگڑتے دیر نہیں لگتی۔''

اعجاز کے چھاؤنی گزر جانے کے دوسرے دن تلمیذ الرحمٰن نے ناشتے کے دوران وہ بات اچانک کہہ ڈالی جس کے لیے وہ نجانے کب سے خود کو تیار کر رہا تھا۔

یہاں آئے ایک سال ہو چکا تھا اور ایک احساس اُسے کب سے ستا رہا تھا: 'میں اپنے ان دوستوں سے ذہن اور شعور کے ارتقا میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ یہ لوگ حرام حلال، گناہ ثواب، جائز ناجائز کو کب کا پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور میں جھولنا بنا ہوا ہوں۔ ساتھ چلتے ہوئے کبھی میں اگر گناہ، ناجائز جیسی بات کر بیٹھوں تو خاموشی سے ایمن مجھے اپنی کلمے کی انگلی پکڑا دیتا ہے اور کچھ دور ساتھ چلتے رہنے کے بعد مجھے احساس ہوتا ہے یہ میں کیا تھامے ہوں تو خفیف ہو کر ہاتھ چھڑا

لیتا ہوں اور سب ہنستے ہیں۔'

''میں نے خدا کو ماننا چھوڑ دیا ہے۔'' اس نے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے کہا۔

کسی کو ایسا نہیں لگا جیسے چائے لانے والے نے پیالیوں کی ٹرے فرش پر گرا دی اور چائے کے چھینٹے اس پہ پڑے ہوں۔

صبغت اللہ نے کہا: ''وہ ہم کب سے جانتے ہیں، تمہیں اپنے بارے میں اب پتہ چلا ہے۔''

''چلو اڑنے والے قالین، چھل پیریوں اور زن ساحرہ کے جنگل سے نکل آئے۔'' یوسف عسکری نے کہا۔

کسی نے بات کو کریدا نہیں کہ یہ انکشاف تم پر کب ہوا۔ اُن کی طرح وہ بھی نہ نماز پڑھتا تھا نہ روزہ رکھتا تھا۔

''جزے تو پی لیتے ہیں۔'' یوسف عسکری کا کہنا تھا ''شکر خدا کنیم[1] ۔''

''جو دمشق کے صوفیوں کی عادت تھی۔'' سننے والوں میں سے کوئی کہہ بیٹھتا۔

پھر یوسف بات کو مکمل کرتا: ''اگر بیابیم[2] بخوریم وگر نیابیم صبر کنیم۔ صوفیانِ بلخ میں سے نہیں ہیں کہ گر بیابیم[3] ایثار کنیم — دوسروں کو پلا دی۔''

'اُس دن دوستوں کی کمپنی میں جو بات میں نے دل کڑا کر کے کہی تھی اُسے مُنھ سے نکالتے ہوئے ڈر رہا تھا: اب مجھے اس کی سزا ملنے والی ہے، لقوہ ہوگا اور زبان گنگ، یا اچانک موت دبوچ لے گی، ابھی اسی جگہ۔ مگر ان لوگوں نے میری بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔

'ذکر جاپانیوں کے جنگ کے جنوب مشرقی تھیٹر میں بڑھتے چلے آنے کا تھا۔ اور میرے اعلان کے بعد بھی جاری رہا۔ جورج ٹاؤن، ملاکا، سنگاپور، امپھال، کلکتہ کی بات ہو رہی تھی۔ پھر بنگال

---

۱ خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔

۲ اگر مل جائے تو پی لیتے ہیں، نہ ملے تو صبر کرتے ہیں۔

۳ اگر ملے تو ایثار کر کے دوسرے کو پلا دیتے ہیں۔

کے قحط کی بات ہونے لگی اور وہاں سے سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج کی طرف چل پڑی۔ چرچل نے کل کیا کہا تھا، آج کیا کہہ رہا تھا۔ ویول، جنرل آخنلیک (Auchinleck) سب اس اسٹیج کے بڑے ایکٹر تھے۔

''ڈھاکا اور چٹاگانگ میں فاقوں سے مرنے والوں کی لاشیں سڑکوں پر پڑی ہیں اور مدراس کے گورنر نے جو چاول بنگال جانا چاہیے تھا جنوب مشرق کے تھیٹر میں فوج کے لیے بھیج دیا ہے!''

بات سنجیدہ ہوگئی تھی۔ اکرم نے سنجیدگی کو توڑنے کے لیے کہا: ''آج کل اگر کوئی کلکتے جائے اور ہوٹل میں چاول کی جگہ روٹی کا اورڈر دے تو ویٹر اور مینیجر کا چہرہ کھل اٹھتا ہے اور اگر کوئی چاول کی فرمائش کرے تو لگتا ہے ویٹر کیا ہوٹل کے مینیجر کی ماں مر گئی۔''

خرم ان نے ہنستے ہوئے کہا: ''کچھ دن اور ٹھہر جاؤ۔ یہی تماشہ یہیں ہوگا: کوئی ہوٹل میں روٹی کے لیے کہے گا تو ہوٹل کا پورا عملہ شہید ہوجائے گا اور چاول کا نام سن کر جی اٹھے گا۔''

''ہم جو یہاں بیٹھے ہیں ہمیں کیا معلوم دنیا پر کیا گزر رہی ہے؟ خود ہمارے بہت سے شہروں کے لوگ ایک وقت جو کی روٹی کھا رہے ہیں۔''

''ابھی تک مٹی کا تیل راشن سے ملتا ہے۔ ایک بوتل ایک ہفتے کے لیے۔''

''برما چھن گیا نا۔''

''انگریز خود تو ڈوب ہی رہے ہیں، اپنے ساتھ اپنی تمام کولونیوں کے لوگوں کو بھی ڈبو رہے ہیں۔ ورنہ ہمارا اس جنگ سے کیا تعلق ہے! کون سی ہم نے ان کے شہنشاہ کو گالی دی ہے۔''

''اور کون سی ہم میں سے کسی نے جاپانی عورت بھگائی ہے!'' خرم ان نے کہا۔

میں نے محسوس ہی نہیں کیا کب میں ان کی باتوں میں شریک ہوا۔

رات کو جب سونے کی لیے لیٹا تو تعجب ہوا میں اتنی بڑی بات کہہ گیا اور جیسا تھا ویسا ہوں — نہ فالج، نہ لقوہ اور یقیناً پاگل نہیں ہوا۔

اس کے بعد سے میں نے اپنے سوالوں کے لیے عالموں سے پوچھنا چھوڑ دیا تھا کس فعل کے بدلے میں کتنی سزا ہے اور اس سے کیسے بچا جاسکتا ہے؟ اور میں نے اپنے مسائل حل

کرنے کے لیے لائبریری سے کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لانا بھی بند کر دیں۔
آخرت کیا ہے؟ قبر میں وہی کچھ ہوگا جو میلاد پڑھنے کے لیے آنے والی مولون کہتی تھیں؟ دین کے خلاف باتوں کا دماغ میں آنا — سب کو اپنے سے دور کر چکا تھا اور خوش تھا۔ مختصراً: اب میں شراب بغیر ڈرے، جب بھی ملے، اپنے ساتھیوں کے ساتھ پی سکتا تھا۔ جوا ضرورت پوری کرنے اور وقت گزارنے کے لیے کھیل سکتا تھا۔'
دماغ نے کہا: وہ ویسے بھی بڑا گناہ نہیں ہے۔ یہاں لوگ چھپ کر تکیوں اور ایسی جگہوں میں کھیلتے ہیں، یورپ امریکا میں خوش وضعی اور وقار کے ساتھ کلبوں میں۔'
'اسلامک یونیورسٹی ٹاؤن میں وہ راجد حانی والا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ آنے والے وقت میں اس کو بچے کے گناہ کے خوف کی جگہ لگنے والی بیماریوں کے خوف نے لے لی۔ اور یہ خوف اس وقت ذہن میں پختہ ہو گیا جب ثمر ون نے راجد حانی سے واپسی پر کہا: ''تمہیں گلبدن یاد ہے؟''
میں نے کہا ''ہاں۔ ٹھیک تو ہے؟''
اس نے اداس لہجے میں کہا ''پتہ نہیں یہ لوگ جب دنیا میں وقت پورا ہو جائے کس کو بیماری ہوتی ہیں۔''
''کیسے؟''
اس نے میرے سوال کو نظر انداز کر کے کہا ''جس نے اُسے بیماری دی ہوگی وہ تو خدا کو پیارا ہوا ہوگا۔''

'ثمر ون کی بات پوری ہو چکی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں نے دیکھا وہ سونے کے لیے لیٹ چکا ہے، تھکا ہوا تھا۔ زیادہ باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میری نیند گلبدن کی موت نے اڑا دی تھی۔ پتہ نہیں کون تھی، اس بازار میں کہاں سے آئی ہوگی یا لائی گئی تھی؟ وہ میری نسل کی چیز نہیں تھی، یوسف عسکری مواتج اور راجیشوری کے بزرگوں کے دور کی ہستی تھی۔ بڑے محلے کی۔ شاید پچوان پینے والی جس کی ایک نوچی پان بنانے پر مامور تھی۔ گلوریاں بنا کر تھالی پہلے

گلبدن کے سامنے پیش کرتی تھی اور ان کے اشارے پر محفل میں وارد ہونے والوں کے۔ جب وہ گلوریاں اٹھا لیتے ایک بار پھر تھالی گلبدن کے سامنے جاتی، وہ چاندی کا خول اتار کر منھ میں گلوری رکھتیں، پھر افتتاح پان کھلانے والی کے ناچ سے ہوتی۔ بدتمیزی کا ان کی محفل میں گزر نہیں تھا۔ کوئی پیسے والا اکھڑ آ جاتا اور زبان بند نہ کرتا تو گلبدن کے اشارے پر اُسے نوکر پنوازی سے لا کر پان ہاتھ میں تھماتا — گلبدن کے کوٹھے کے چار پانوں کا ایک پان اور کہہ بھی دیتا تھا: "کھالو۔"

اُن کے یہاں کے مجرے میں رسائی راجاؤں، نوابوں کے صاحبزادگان کے لیے انگریزی حکومت کے قائم کئے کسی کالج میں داخلے سے کم نہیں تھی — ایک طرح سے کم سے کم گورمنٹ کلاس وان اوفیسر کا بیٹا۔

ہم نے اُن کے بارے میں بس کہانیاں سُنی تھیں۔ راجدھانی میں گزارے ہوئے دنوں میں ایک دن میں ایک پنوازی سے پوچھ بیٹھا تھا: "ان میں گلبدن کا کوٹھا کون سا ہے؟"
اس نے جلبلا کر کہا "گلبدن صاحبہ کا؟ جا کر اپنے باپ سے پوچھو۔" اور بغیر بیڑہ دیئے آگے بڑھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے بال، داڑھی، مونچھیں، بھویں، پلکیں سب خضاب سے منور تھیں۔

پھر اکثر سننے میں آیا گلبدن علاج کے لیے پرانی راجدھانی گئی ہیں۔
اور آج یہ خبر کہ پتہ نہیں مر کر کے پیاری ہوئیں۔ کون جانے یہ وہ تھیں جن کے لیے ہمارے ایک دور کے رشتے دار حاجی واصل خاں کے صاحبزادے واجد خاں پہلی رات اپنی بیوی کے پاس نہیں گئے تھے۔ وہ ساری رات اس انتظار میں بیٹھی رہی اب دولہا آ کر اس کا گھونگھٹ اٹھائے گا۔

حاجی واصل خاں افغانستان سے راجدھانی آئے تھے، یہیں شادیاں کیں اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ پھلوں کا کاروبار تھا، راجدھانی سے لے کر سب بڑی بندرگاہوں تک پھیلا ہوا۔ واجد خاں کو اتنے بڑے دولتمند سوداگر کا فرزند ہوتے ہوئے، جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، نہ پھلوں

میں دلچسپی تھی نہ پھلوں کے کاروبار میں۔ اس کا کہنا تھا: میری صحت کے راز ہیں کھیل اور پھلوں کا رس۔ اور ہورس ریس اور تاش سے بڑھ کر کون سا کھیل ہے، اور برانڈی اور شیمپین سے بڑھ کر کون سا پھلوں کا رس!

باپ کو پتہ بھی نہیں چلا بیٹا کب بڑا ہوا، کب اس نے پینا شروع کی اور کب اس کی کوٹھوں پر آمدورفت شروع ہوئی۔ ماں کے اصرار پر کہ واجد خاں کی شادی ہونی چاہیے کوٹھے والیوں نے اسے پیسے کے لیے پھانس رکھا ہے ورنہ وہ عورتوں سے آنکھ ملا کر تو بات نہیں کر سکتا ہے، حاجی واصل خاں بیٹے کی شادی کرنے پر رضامند ہو گئے اور وہ بھی وہاں جہاں ان کی تیسری بیوی چاہتی تھی۔

ماں کی طرف سے پہلے پیغام واجد خاں کو گیا، ایک بار نہیں بار بار، اور وہ نہ کرتا گیا یہاں تک کہ اسے ماں کا سامنا کرنا پڑا۔ لڑکی افغانستان سے یہاں آنے والوں میں سے کسی کی نہیں تھی، راجدھانی ہی میں اس کی پشتیں بستی آئی تھیں"۔ خوبصورت اتنی کہ واجد تم سمجھو کہ آگے انہیں سوچنا پڑا'' میں اس کے سامنے کچھ بھی نہیں ہوں۔ مدرسے اسکول کی شکل نہیں دیکھی لیکن اردو فارسی کی کتنی ہی کتابیں پڑھ چکی ہے۔ بڑی بات یہ کہ معصوم ہے، نمازی ہے۔ اس کے آنے سے ہمارے گھر میں برکت آ جائے گی۔''

اور ہوا کیا؟ مہر افروز ساری رات گھونگھٹ نکالے ویسے بیٹھی رہی جیسے ساتھ والیاں بٹھا کر گئی تھیں اور کوئی نہیں آیا۔ آئیں تو صبح کو اس کی خالہ زاد، پھوپھی زاد بہنیں اور انہوں نے بھانپ لیا ہوا کیا ہے۔

دلہن کو حاجی واصل خاں نے اپنی حویلی کا پورا ایک حصہ دیا تھا، کمرہ، دالان، صحن، غسلخانہ۔ صحن میں سے دو زینے اترتے تھے ایک گھر کے اندر کا دوسرا باہر سڑک پر یا مردانے میں جانے کا۔

ساری رسومات ہوئیں۔ نئی دلہن سسرال میں بھی رہی اور ماں باپ کے گھر بھی رواج کے مطابق آنا جاتا رہا۔ بس اُسے چپ لگ گئی تھی۔ حلال خورنی نے پہلا ہی موقع پانے پر دلہن کو یہ اڑتی اڑتی خبر سنائی تھی: دلہن جاگیں سیج پہ، مجرا دیکھیں دولہا۔

ساس نے مہر افروز کو سمجھایا "نادان ہے، پھنس گیا ہے، تم فکر مت کرو۔ آخر کو تمہارے پاس آئے گا۔ کہاں کہاں کس کس درگاہ میں اس کے لیے دعائیں نہیں ہورہی ہیں کہ اس کا دل اس کسبن سے پھر جائے۔"

لیکن دلہن نے ایک لفظ منھ سے نہیں نکالا۔ نہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہے۔

پھر ایک دن کو جیسا تمکید نے سنا تھا، وہ خوشبوؤں کے پانی سے نہائی، بالوں کو خوشبو کی دھونی دی، سنگھار کیا، چھپر کھٹ پر تازہ منگوائے ہوئے پھول بکھیرے۔

دوپہر کو کھانا لانے والی تھالی دالان کے فرش پر رکھ کر نیچے بھاگی "دلہن دروازہ نہیں کھول رہی ہیں اندر سے جلنے کی بو آرہی ہے۔"

دروازہ توڑا گیا، چھپر کھٹ کو آگ لگی ہوئی تھی، کمرے کے دروازے کھڑکیاں سب بند تھے۔ کارنس پر دولہا کی تصویر تھی اور اس کے اوپر دیوار پر سرخ رنگ سے بہت خوشخط لکھا ہوا تھا:

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

چھپر کھٹ کے سرہانے کی دیوار پر لکھا تھا:

گل کے ثبات پہ تو بہار اپنی صبا دکھلا گئے حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

اس کے نیچے لکھا تھا: بدنصیب نکہت آرا مہر افروز۔

'لوگ کہتے ہیں واصل خان کا پیسہ ٹھیک نہیں تھا۔ پہلے بیاض کا کام کرتے تھے جب پیسہ ہوگیا تو تاجر بن بیٹھے۔

'میں آدھی رات تک جاگا۔ وہ گلبدن نہیں تھی، کوئی اس کی بہن ہوگی۔ کیا فرق پڑتا ہے۔

سننے میں یہی آیا بعد میں واجد خاں نے کسی کرسچین عورت سے شادی کرلی تھی، کسی گوری کرسچین عورت سے نہیں، اُس سے بھی نہیں جس کے لیے وہ شادی کی پہلی رات، ور اس کے بعد کی تمام راتیں بیوی کے پاس نہیں گیا تھا۔'

تمکید کہتا تھا: "میں نے اُسے زندگی میں صرف ایک بار دیکھا تھا۔ ایک جگہ رمی ہورہی

تھی وہ بھی تھا۔ اس کے سیدھے ہاتھ پر برانڈی تو نہیں وہسکی کی بوتل تھی۔ سب کی اپنی اپنی بوتلیں تھیں، اپنے اپنے سگریٹ کے پیکٹ۔ لگتا تھا سب ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔

صاحب خانہ نے مجھے بتایا: 'یہ واجد خاں، حاجی واصل خاں مرحوم کے بیٹے ہیں۔' شاید انہیں اس کا علم تھا کہ اس میں اور مجھ میں کہیں دور سے رشتے داری تھی۔ پھر واجد خاں کے کندھے پر ایک طرف سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: 'ان سے ملو مرحوم ڈاکٹر عزیز الرحمن کے بھتیجے۔'

اس نے ایک پیگ انڈیلتے ہوئے میرے سلام کا جواب دیا، بڑی احتیاط سے اس میں سوڈا ملایا، اور کھیل میں مصروف ہو گیا۔

''واقعی کھیل اور پھلوں کے رس سے نہ سہی، جو کے ست اور جوئے نے ان کی جان بنا رکھی تھی: سرخ چہرہ، موٹی گردن، بڑا پیٹ۔ حالانکہ جب میں نے اُسے دیکھا وہ پچاس بلکہ پچپن سے اوپر کا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے وہ خط بھی نہیں پڑھا ہوگا جو مرنے والی کی بھنچی ہوئی مٹھی میں سے غسل کے وقت نکالا گیا تھا اور نہیں معلوم کس کے نام تھا: مجھے معلوم ہے میرا رب مجھے بخش دے گا کیونکہ میں ظالم نہیں ہوں اور خود پر بھی اس وقت ظلم نہیں کر رہی ہوں: بس اتنا اُس سے کہہ رہی ہوں:

ہر چند کہ رنگ و بوئے زیباست مرا   چوں لالہ رخ و چو سرو بالاست مرا
معلوم نشد کہ درطرب خانۂ خلق   نقاش من از بہرچہ آراست مرا

بدنصیب نکہت آرا مہر افروز

لیکن یہ بات تکمید کے راجد ھانی چھوڑنے کے کافی بعد کی ہے۔

بی۔اے کی آخری گرمی کی چھٹیاں شروع ہونے والی تھیں کہ تکمید کو اپنے تایا ابا کا خط ملا:

میری صحت تیزی سے گر رہی ہے۔ اپنے گھر کے معاملات سے

سبکدوش ہو چکا ہوں۔ تمہارے باپ مرحوم عتیق الرحمن نے جاتے جاتے علائق دنیا میں پھنسا دیا اور الحمد اللہ اس معاملے میں جتنی میری ذمے داری تھی وہ پوری کر چکا ہوں۔ میں سب کو جدی جدی ہر ماہ رقوم بھیجتا رہا ہوں۔ حساب کا رجسٹر موجود ہے۔ کبھی نہ منی آرڈر خرچ حساب میں شامل کیا نہ اسی طرح کا کوئی اور خرچہ۔

تالاب اور زمیں تمہارے چھوٹے بہن بھائیوں کی کفالت کر رہے ہیں۔

تمہارے حصے کی رقم ختم پہ ہے۔

۱۹۳۸ء میں عتیق الرحمن کا انتقال ہوا۔ اب ۱۹۴۴ء ہے۔ آگے پڑھنا چاہو تو اس کے لیے کوئی نوکری کرنی ہوگی، اور اپنی شادی کے خرچے کے لیے بھی۔

دعا گو

عزیز الرحمن

خط میں افراد خانہ میں سے کسی کا ذکر نہیں تھا۔ تسنیم کا بھی نہیں، گھر کے معاملات سے سبکدوش ہونے والے جملے کو تمکینہ نے کئی بار پڑھا، چوما اور خط کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے وہاں ڈال دیئے جہاں کمرے کا کوڑا جمع ہو جاتا تھا اور خاکروب اگلی صبح آ ئے نوکری میں اٹھا کر لے جاتا تھا۔

مینی پور سے آنے والے ایک خط میں وہاں رہ جانے والی بہنوں میں سے سب سے بڑی نے لکھا تھا، شاید تمکینہ کے خط کے جواب میں: تائے ابا نے تسنیم کو اسکول نہیں بھیجا، گھر پر مولون پڑھانے آتی ہے، بڑی امی اردو پڑھاتی ہیں اور تائے ابا خود حساب اور انگریزی۔

(۱۷)

ایمن، حسن وارد اپنے اندر چھپے ہوئے موسیقار کے حکم پر فلم کیپٹل سٹی جا چکا تھا۔ بی۔اے کا امتحان بھی اس نے ادھورا ہی سا دیا تھا۔ تملینہ کو پاس ہونے کی امید کم کیا بالکل نہیں تھی۔ انہی دنوں اُسے ایمن کا خط ملا: یہاں آجاؤ۔ مجھے ابھی صرف ایکسٹرا کا رول ملا ہے، لیکن پروڈیوسر میرا گانا سُن چکا ہے۔ اس کی اگلی فلم میں ہیرو کے گانے میری آواز میں ہوں گے۔ ایکسٹرا کا رول کر کے ہی بڑے سے بڑے ڈائریکٹر، میوزک ڈائریکٹر اور ہیرو تمام فلم سینٹرز میں، اسکرین کی اوپر کی منزل تک پہنچے ہیں۔ بہت سوں کو تو بس ایک جھلک کراؤڈ سین میں دکھانے کا موقع ملا تھا - اور اس میں انہیں عار نہیں ہوا۔ اس لیے ایکسٹرا کے رول کو قبول کر کے میں شرمندگی محسوس نہیں کرتا ہوں۔ رزلٹ کو مارو گولی اور فلم کیپٹل سٹی پہنچو۔ مجھے یقین ہے تمہیں شروع ہی میں سائیڈ ہیرو کا رول مل جائے گا۔ میرے ہوتے ہوئے تم یہاں نہ فٹ پاتھ پر سوؤ گے، نہ فاقہ کرو گے۔ لکھو کب یہاں پہنچ رہے ہو۔

تو اسلامک یونیورسٹی ٹاؤن کو ٹرنک اور ہولڈول سنبھال کر خدا حافظ کہنے کے ساتھ ہی وہ ساری کشمکش ختم ہو گئی جو چودہ سال سے تملینہ کے دماغ میں چل رہی تھی: ایک ایسی آزادی کا تصور جو اس نے پہلے کبھی نہیں محسوس کی تھی - نینی پور میں بھی نہیں۔ اس وقت اس کے سامنے ساری زندگی کے لیے، بس ایک ہی منزل تھی- فلمی دنیا کا صدر مقام: فلم کیپٹل سٹی جو کہنے میں

ایف سی سی F.C.C یا صرف ایف سی F.C بن جاتا تھا، جہاں خاموش فلموں کے دور سے پہلے تین جزیروں پر بسے ہوئے چند گاؤں تھے اور مچھیروں کی بستیاں۔ ان کے بالمقابل ساحل پر، جو مین لینڈ کا حصہ تھا بس تاڑ اور ناریل کے درخت تھے۔ وہاں سے دور دور تک آبادی نہیں تھی کیونکہ اتنے بڑے ملک میں کسے ضرورت تھی وہاں جا کر بسے جہاں پینے کا پانی نہیں تھا۔ اب آدمی صرف ناریل کے پانی اور تاڑی پر تو نہیں جی سکتا ہے!

حسن وارد ایمن کے پاس اسے لیے لیے پھرنے کے لیے وقت ہی وقت تھا۔ تھوڑا بہت پیسہ ہر وقت اس کی جیب میں رہتا تھا۔ اس کے باپ مانڈلے میں تھے۔ جب جاپانی فوج نے وہاں حملہ کیا اور قابض ہوگئی تو ان کی خیر خبر کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ''ہوسکتا ہے زندہ ہوں، ہوسکتا ہے گولی کا نشانہ بن گئے ہوں۔'' لیکن دوسری بات کا امکان ایمن کے نزدیک کم تھا۔ ''کاروباری آدمی ہیں۔ سیاست اور حکومت سے ہمارا سات پشتوں سے تعلق نہیں ہے۔ خالص کاروبار کا آدمی ہر کہیں بس سکتا ہے: ہر قوم اور ہر مذہب والوں کے درمیان۔ ہماری قوم کا ایک اکیلا آدمی تمہیں جزائر میں بھی چین سے رہتا نظر آئے گا، فارموسا اور فرینڈ اڈ میں بھی۔ اسے ہر ایک سے کاروبار کرنا ہوتا ہے اس لیے ہر ایک کو مروت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ پھر وہ کسی کو کیوں برا لگے! جاپانی اگر ان سے پیسے کی مدد مانگتے ہوں گے تو جتنا وہ مانگتے ہوں گے اس سے سوا دینے کو تیار ہوتے ہوں گے۔ چائے مانگتے ہوں گے تو ساتھ میں دودھ کا پاؤڈر اور کھانڈ بھی دے دیتے ہوں گے۔ ہاں اگر ان سے جاپانیوں نے مخبر بننے کے لیے کہا ہوگا تو انہوں نے منہ لٹکا کر کہہ دیا ہوگا: یہ رول ذرا مشکل ہے۔ میں نے ایکٹنگ کبھی نہیں کی۔ اسکول ہی نہیں گیا تو ایکٹنگ کیا سیکھتا۔ اپنا بس ایک ہی رول ہے کاروباری آدمی کا۔

اور واقعی ان کی شکل دیکھو تو ترس آجائے گا: فقر و فاقے کی تصویر۔ مجھ سے زیادہ میرے باپ کو کون جانتا ہے؟ ماں بھی نہیں۔''

سو حسن وارد اپنے باپ کے لیے فکرمند نہیں تھا۔ ان کا چھالیہ، کتھے اور چھوٹی بڑی الائچی کا کاروبار تھا۔ ملک کے چاروں کھونٹ بڑے شہروں میں ان کے بھائی اسے سنبھالے ہوئے

تھے۔ کاروبار مندا ضرور تھا جاپانیوں کی جنگ سے ٹھنڈا نہیں ہو گیا تھا۔

پہلے فلم پروڈیوسر سے ملانے جب ایمن تمیز کو لے گیا تب اُسے زندگی میں پہلی بار اندازہ ہوا حقیقت میں اس کا دوست جس نے ایک دفعہ معصومیت سے پوچھا تھا کیا اس بازار سے گزرنے کے بھی پیسے ہوتے ہیں، آج ہر سوال کا جواب بڑے مہذب لہجے اور شائستہ زبان میں دے رہا تھا۔ فلم میں کام کرنے کا تجربہ رکھنے کے بارے میں اس نے کہا: ''کوئی، یونیورسٹی کی اسٹیج کا تجربہ رکھتا ہوں۔ شیکسپیئر، برنرڈ شا اور ٹیگور کے ڈراموں کو ڈائریکٹ بھی کیا تھا اور کبھی کاسٹ میں خود بھی شامل ہوتا تھا۔ شاید وہ تجربہ فلم میں کام آ جائے۔''

پروڈیوسر نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا ''کبھی کیوں؟''

''پلے لمبا ہو تو ڈائریکشن کا کام بڑھ جاتا تھا۔ ایکٹنگ چھوڑنا پڑتی تھی۔ پلے ون ایکٹ ہو یا چھوٹا تو رول بھی کرتا تھا۔''

پروڈیوسر نے بات کو سمجھ کر تعریف میں سر ہلایا۔ اُسے احساس ہوا اس کے سامنے مستقبل کا ایک بڑا اداکار بیٹھا ہے۔ پوچھا ''تعلیم کتنی ہے؟'' پھر ہنس کر بولے: ''اگر کسی کی تعلیم زیادہ ہو تو وہ فلمی دنیا میں زیادہ دن نہیں چل سکتا ہے۔''

تمیز نے انکساری دکھائی: ''نہیں نہیں۔ میں معمولی پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ بس بی۔ اے۔''

''خوب خوب۔ اور اس کے بعد کا تجربہ؟''

''برٹش آرمی میں کیپٹن تھا۔''

''چھوڑ دی؟'' انہوں نے گھبرا کر کہا ''Deserter[1] تو نہیں ہو بھائی؟ کل کو یہاں پوچھ گچھ ہو تم army deserters کو پناہ دے رہے ہو۔ اپنا فلم کا کونا بھی جائے۔''

تمیز نے کہا ''بالکل نہیں۔ میری مرضی کا کام نہیں تھا۔ یوں بھی جنگ ختم پر ہے۔ محاذ پر نہیں بھیجا

---

[1] بھگوڑے

جاسکتا تھا۔کلر بلائنڈ[۱] ہوں۔ افیسر تھا، پرنتو بلا وردی کا۔"

"او!" پروڈیوسر نے کہا۔

اسٹوڈیو سے باہر آ کر حسن وارو نے کہا: "بہترین ایکٹنگ کی، اور برٹش آرمی کے کیپٹن ہو یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔"

ایک دن ایمن نے کہا "آج کزن سے ملنے چلتے ہیں۔"

تمہید نے کہا "تیرا یہاں بھی کزن نکل آیا!"

"نکل آیا نہیں، نکل آئی۔"

اسٹوڈیو میں سیٹ کے سامنے ایک چیپ (cheap) سی نوجوان عورت دو مردوں کے ساتھ اس قالین پر بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی جو سیٹ کا حصہ تھا۔ ایمن نے وہاں رک کر ان لوگوں سے پوچھا "دل آرا بائی کہاں ہیں؟"

عورت نے کہا: "ڈائریکٹر کے باجو والے کمرے میں۔"

تمہید نے کہا: "میں سمجھا تھا یہی تیری کزن ہے۔"

"جب انہیں دیکھو گے تو سمجھ جاؤ گے ایمن کی کزن کیسی ہوتی ہے۔"

ڈائریکٹر کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ برابر کے کمرے میں بیٹھی ایک خوبصورت عورت کوئی ناول پڑھ رہی تھی۔ وہاں بھی اس کے سوا اور کوئی نہیں تھا، ہر طرف خاموشی تھی۔

ایمن نے کہا "لگتا ہے آج شوٹنگ نہیں ہے۔"

دل آرا نے کہا "ہونی تو تھی اور میں اسی ارادے سے آئی تھی۔ یہاں کوئی کام منظم طریقے سے

---

[۱] نظر میں رنگوں کی تمیز نہیں ہے۔

نہیں ہوتا ہے اتنے دنوں میں میں بس یہی جان سکی ہوں۔''
وہ ایمن یا اس کے دوست کو دیکھ کر ناراض نہیں تھی لیکن وقت اور اپنے شوق کے اکارت جانے پر جو چڑ اس میں پیدا ہوئی تھی اُسے چھپا بھی نہیں سکتی تھی۔
ایمن نے اس کی کزن اور کزن کے شوہر کے بارے میں پوچھا۔
''دونوں ایک بجے چھوڑنے آئے تھے، چار بجے لینے آئیں گے۔''
تملیذ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ''آپ کو فلمی دنیا کیسی لگی؟''
اس نے تلخ مسکراہٹ سے کہا ''کاش آرٹ کی پرستار کی جگہ لوہے کا بھیجا لے کر یہاں آئی ہوتی۔''

اسٹوڈیو سے باہر آ کر ایمن نے تعارف کرایا: ''ذہین عورت ہے اور ہم دونوں اور اُن دونوں سے زیادہ پڑھی لکھی ہے جو اس فلم کے اسکرپٹ رائٹر اور ڈائریکٹر ہیں۔ یہاں نام دل آرا ہے، اصل نام ادیبہ ہے۔ شادی شدہ ہے، ایک بچے کی ماں۔ فلم میں کام کرنے کے لیے اپنے میاں سے اجازت لے کر آئی ہے۔ قدم ٹک جائیں تو دونوں کو یہیں بلا لے گی۔ مگر مجھے نہیں لگتا قدم ٹکیں گے۔ جنوب کی سب سے بڑی ریاست کی رہنے والی ہے جس کا ہز ہائینس سربراہ دنیا کا تیسرا سب سے بڑا رئیس ہے جو چاہے تو اپنا تابوت ٹھوس سونے کا بنوا سکتا ہے اور قبر کی بھرائی ہیروں سے کرائے جس کی اس کی ریاست میں کانیں ہیں — یہ سب باتیں مجھے خود دل آرا بتا چکی ہے۔''
''مگر تمہیں اس کے دل تک پہنچنے کی راہ کیسے ملی؟'' تملیذ نے کہا۔
''جمالا کے شوہر سے، جمالا کا شوہر معظم ہے اور وہ تیرے دوست کا دوست ہے۔ جمال آرا دل آرا کی کزن ہے اس رشتے سے میں معظم کو بھی کزن کہتا ہوں، جمال آرا کو بھی اور ان سب سے بڑھ کر دل آرا کو۔''
''یعنی کزن کی ٹریل تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

''جو فلم کیپٹل سٹی میں تین اکٹوں کی ٹریل سے بڑھ کر ہے۔''

دو ایک اور ملاقاتیں تلمیذ کی دل آرا سے ہوئیں۔ واقعی خوب صورت عورت تھی جس کی خوبصورتی کو اس کے شوہر نے محض زوجیت پر نثار کرنے کی چیز نہ جانا ہوگا جو فلم کیپٹل سٹی بھیجنے پر راضی ہو گیا تھا۔ اس کی آواز بھی اچھی تھی، شاید گاتی بھی ہوگی، تلفظ اپنی ریاست والوں کا نہیں تھا نہ بولنے میں تذکیر و تانیث کی گڑبڑ کرتی تھی۔ تھوڑی بہت شاہی خاندان سے بھی تھی۔ پیسہ اُسے فلمی دنیا میں لے کر نہیں آیا تھا۔ وہ خود کہہ چکی تھی ''میرے اندر ایک کلبلاہٹ ہے جو کسی شکل میں باہر آنا چاہتی ہے۔''

تلمیذ نے اس موقع پر مودبانہ کہا تھا ''آپ کے اندر جو فنکار چھپا ہے وہ اظہار چاہتا ہے۔''

''فن یا فنکار؟''

''ایک ہی بات ہے۔'' تلمیذ نے جھینپ کر کہا ''میرا خیال ہے آپ ایک بڑی فنکارہ بنیں گی۔''

اپنی اپنی کامیابی کے لیے جن میں تلمیذ اور ایمن کا اٹھنا بیٹھنا تھا سب ہی ہاتھ پیر مار رہے تھے۔ ایمن کی معظم سے دوستی اسی نوعیت کی تھی۔ اُسے دل آرا کی پہلی فلم کے ہٹ جانے کا یقین کامل تھا۔ ''اس کے بعد پروڈیوسر ڈائرکٹر اس کے آگے پیچھے پھریں گے اور وہ اپنی ٹرمز اور کنڈیشنز پر کوئی فلم سائن کرے گی۔''

''اور اس کی اگلی ہی فلم میں تم میوزک ڈائرکٹر نہ سہی اسسٹنٹ میوزک ڈائرکٹر ہو گے اور ساتھ میں سائڈ ہیرو۔''

بعد کی زندگی میں ہر جگہ لوگوں کو جو تلمیذ کے بارے میں واقفیت تھی، یہ تھی:

بی۔اے ہے۔ برٹش فوج میں کیپٹن تھا کہ جنگ ختم پر آ گئی اور اس نے نوکری چھوڑ دی، اس کے بعد فلمی دنیا میں گیا۔ وہاں کوئی ترقی مورتی فلم کمپنی تھی، اس کی فلم 'نہتے سپاہی' میں کام کیا تھا لیکن وہ فلم غیر ملکی حکومت کے خلاف انقلاب کا نعرہ تھا اس لیے ریلیز نہیں ہوئی۔ فلمی دنیا وہمیوں کی دنیا ہے۔ ایک فلم کامیاب ہو جائے تو اس کے نام سے ملتی جلتی دس فلمیں بن جاتی ہیں'

اور اس تقسیم پر بھی۔ کامیاب فلم کے ہیرو، ہیروئن، میوزک ڈائرکٹر، ڈائرکٹر سو بھاگیہ شالی (نیکی) سمجھے جاتے ہیں اور دس فلموں کے لیے بُک ہو جاتے ہیں۔ اور جب کوئی فلم پٹ جائے تو نہ کوئی فنانسر اُس کی ٹیم کے ایک بھی فرد پر پیسہ لگانے کو تیار ہوتا ہے، نہ اس کے نام سے ملتا جلتا نام اپنی اگلی فلم کے لیے سننا پسند کرتا ہے۔

'یہ یہ حشر ہوا اپنے تمیز بھائی کا ایف سی میں۔'

فلم کیپٹل سٹی میں بھی تمیز کو سونے سے پہلے کئی دفعہ محسوس ہوا قبر میں لیٹا ہے اور قبر دونوں طرف سے سکڑ رہی ہے۔ جس طرح ۶ سال کی عمر سے اب تک سال، دو سال میں ایک دفعہ ہوتا آیا تھا۔ اس موقعے پر وہ جلدی جلدی دو، تین مرتبہ پہلا کلمہ پڑھ کر ہاتھوں پر پھونک کر انہیں منہ اور بازوؤں پر پھیر لیتا تھا۔ دماغ میں ایک خیال آتا: 'میں نے دل سے مذہب کب چھوڑا تھا!'

زندگی بھر تمیز کو وہ دن کبھی نہیں بھولے جو اس نے فلم کیپٹل سٹی میں گزارے تھے۔ سمندر کی ہوا، کوئی ہوا اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، کھل کر برسنے والی بارش جو پل میں اس طرح رُک جاتی تھی جیسے کسی نے باتھ روم میں شاور کو ٹونٹی گھما کر بند کر دیا ہو، شام کو میرینا کی فصیل پر بیٹھ کر تازی پینے کا لطف، یا ناریل کا پانی۔ لیکن ان سب سے کہیں بڑھ کر فلم کی ہیروئن اندو سے دوستی کے دن۔ ایوارڈ ونر تھی اسٹیج اور فلم کی۔ میری عزت کرتی تھی۔ جب جب ایمن کے ساتھ اس کے گھر گیا چیکو سنگترے اور کیلوں سے خاطر کرتی تھی۔ سنگترے خود چھیل کر سامنے رکھتی تھی۔ کیا عورت تھی! Paragon of beauty۔[1] پر اس کے ساتھ بڑی تم تے والی۔ سیٹ پر کوئی اس کے بازو کو ہاتھ لگا کر آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کا اشارہ نہیں دے سکتا تھا — چاہے وہ

---

۱ حُسن کامل، مثالی حُسن۔

سائلنٹ فلموں کے زمانے کا ڈائریکٹر ہو۔ یعنی اتنا سینئر!

پتی نہیں تھی، نہ سگریٹ نہ شراب۔ ایک دفعہ اس کا شوہر مجھے سا گرتٹ پر سیر کے لیے لے گیا تھا۔ رم، کوکونٹ واٹر میں یہ کہہ کر پلائی تھی "کومریڈ یہ چیز تم نے کبھی نہیں پی ہوگی۔" اندو ہمارے ساتھ تھی۔ اس نے وہاں بھی نہیں پی تھی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کا آدمی تھا اور جب رائل نیوی کے سیلرز نے ۱۸ فروری ۱۹۴۶ء کو بغاوت کی تو اس کا نام بھی اس سازش میں لیا گیا، مگر وہ روپوش ہو چکا تھا۔

اندو بڑی پتی ورتا والی عورت تھی۔ اس کے کمرے میں سنگھار میز پر پتی کی تصویر فریم میں لگی کھڑی تھی۔ کہتی تھی: "شوٹنگ کے لیے جانے سے پہلے ان کی پوجا کر کے جاتی ہوں۔ یہی میری رکشا کرتے ہیں۔"

نیوی میں بغاوت کی آگ لگانے والوں کی جب گرفتاریاں ہوئیں تو اپنے پتی کی ساری تصویریں اس نے غائب کر دی تھیں۔

'نبتے سپاہی' انگریزی حکومت نے ریلیز نہیں ہونے دی۔ فلم کے ریلیز نہ ہونے کا اندو کو افسوس تھا لیکن اس سے زیادہ اس خدشے کا کہ "اب شاید ہی سال دو سال تک کوئی دوسرا پروڈیوسر ڈائریکٹر آپ کو سائن کرے: ہم اندھ وشواسی لوگ ہیں آپ جانتے ہیں۔ superstitious people۔ میرا کیا ہے میرے لیے اسٹیج کی دنیا سدا کھلی ہے۔ پھر بھی میں آپ کے لیے کچھ کروں گی۔"

ان دنوں تملیذ کی ڈور ایمن کے ہاتھ میں تھی اور ایمن کی آوارہ گردی کے۔ ایک دن وہ تملیذ کو ایک کلب میں لے گیا جہاں ہر میز پر بوتل تھی اور اتنے گلاس جتنے پینے والے۔ اس نے ایک میز پر بیٹھنے کے بعد تملیذ کو کہنی ماری اور بھوئیں ایک عورت کی سمت اُچکائیں، جیسے پوچھ رہا ہو پہچانو کون ہے۔ پھر خود ہی آواز نیچی کر کے کہا "سائلنٹ فلموں کی ہیروئن اور ٹاکنگ فلموں کی ویمپ لکشمی۔ اصل میں مجیدن۔ یاد ہیں چاند رات، نل دمینتی، اجودھیا کی دھوبن؟"

اس کی میز پر بھی سب پی رہے تھے، وہ بھی پیے ہوئے تھی۔ سگریٹ ہاتھ میں لرز رہا تھا،

منھ کو لے جاتی تھی تو لگتا تھا نتھنے میں چلا جائے گا۔ بسم بے انداز ہ بھاری تھا۔

''اب؟'' تلمیذ نے پوچھا۔

''کبھی اس پرانے پروڈیوسر کے ساتھ رہنے لگتی ہے، کبھی اس کے۔ مغرور ہے۔ ایک دو ڈائیلوگ والا رول نہیں لیتی ہے۔''

تلمیذ نے اس کی طرف گھوم کر دیکھا، لیکن وہ وہاں نہیں تھی۔

دو، تین بوتلیں بیئر چڑھانے کے بعد جب تلمیذ مثانہ خالی کرنے گیا تو وہ وہاں کھڑی تھی۔ ہاتھ میں شلوار کا کمر بند تھا۔ بولی: ''ادھر آ۔'' تلمیذ پاس گیا۔ بولی ''باندھ دے۔'' تلمیذ باندھنے لگا۔ اس نے ڈپٹا: ''آنکھیں اوپر رکھ۔''

اُن ہی دنوں ایک ساتھی کی موت ہوئی۔ راجد حانی کے دنوں کا دونوں کا واقف تھا۔ ایمن خبر لایا تھا اور دفن میں شریک ہونے کی تیاری میں نہانے چلا گیا۔ واپس آنے پر اس نے دیکھا تلمیذ اسی طرح رات کے کپڑوں میں لیٹا ہے۔ بولا: ''چلنا نہیں ہے؟''

تلمیذ نے افسردگی سے کہا: ''میں دادی کے دفن میں بھی شریک نہیں ہوا تھا۔''

''تو بابا یہ تو تمہاری دادی نہیں تھا۔ ہمارے تمہارے سوا اس کا یہاں اور کون تھا۔''

تلمیذ نے سر کی جنبش سے راضی نہ ہونے کا اشارہ کیا، اور آنکھیں بند کر لیں۔

الیف سی کا زمانہ تلمیذ کے لیے ختم پر آ رہا تھا۔

دل آرا وہاں سے اپنے وطن جا چکی تھی جسے وہ ساؤتھ کہتی تھی۔ ایمن کو جس فلم میں ایکسٹرا کا رول ملا تھا مکمل ہوئی لیکن فلم کیپٹل سٹی سمیت ملک کے کسی بڑے شہر میں ریلیز نہیں ہوئی۔ وہ اس کے بارے میں اتنے جوش میں رہتا تھا جیسے جب بھی لگی پبلک یا تو صرف اُسے دیکھنے کے لیے

سینما جائے گی یا جب وہاں سے نکلے گی تو اس کے ذہن سے پوری فلم مٹ چکی ہوگی۔ بس ایمن کا رول باقی رہ جائے گا۔

ایک دن وہ خبر لایا: "یار تمیز میری فلم تمہارے نینی پور میں لگی ہے۔"

تمیز نے کہا: "گڈ شو۔ وہاں سینما ہال کب بنا؟"

ایمن نے کہا: "منڈوے میں دکھائی جارہی ہے قصبوں اور گاؤوں میں۔"

"پوری فلم یا وہ سین جس میں ایک یونیورسٹی اسٹوڈنٹ ہیروئن کے لیے کار کا دروازہ کھول کر کہتا ہے: "آیئے میڈم۔"

ایمن کا جوش بجھ گیا۔ دونوں میں دیر تک کوئی بات نہیں ہوئی۔ پھر تمیز نے اس خاموشی کو توڑنے کے لیے اس کی طرف کھلا ہوا سگریٹ کا پیکٹ بڑھایا اور جب وہ پہلا کش لے چکا تو کہا:

"اہم بات یہ ہے اس ناکامی سے تمہارا پروڈیوسر ہمت نہیں ہار بیٹھا ہے۔"

"ناکامی سی ناکامی ہے: جس کی فلم کو ڈسٹری بیوٹرز نے ہاتھ لگانے سے انکار کردیا اُسے کون فیری فورڈ اگلی فلم کے لیے فنانس دے گا۔"

تمیز ہنس پڑا: "تم نے مجھے یہاں بلاتے وقت جو کچھ لکھا تھا، اور کہتے رہے تھے اس میں یہ سب تو تھا ہی نہیں۔"

اندو، جسے تمیز قابل بھروسہ دوست کہنے لگا تھا، اس پر، اس کی مالی پریشانی اور فلم میں کام کرنے کے ختم نہ ہونے والے جوش کو دیکھتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ مہربان ہوگئی تھی۔ ایک دن اس نے کہا "تمہیں یوں پھرتے پھرنے دیکھ کر مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ کتنی آرزوئیں لے کر یہاں آئے ہوئے اور ہوا کیا پہلی ہی ناؤ جس میں بیٹھے تھے ڈوب گئی۔ خیر میں اب بھی تمہارے لیے کچھ کرسکتی ہوں۔"

تمیز کہتا تھا: "پھر اس نے ایک خط مجھے ڈائریکٹر ایم۔ عابد کے نام لکھ کر دیا جو لجاجت کی جگہ لگتا تھا اور ڈر ہے جو ایک سینئر افیسر نے جونیئر کو لکھا ہے۔ مجھے اُن دنوں ایک گورمنٹ

اوفس میں معمولی جوب مل گئی تھی اور ایسی خط و کتابت کو سمجھنے لگا تھا۔ میں نے جھک کر اس کے پیر چھوئے اور آنکھوں کو اس سے چھپا کر کہا "تھینک یو۔"

ڈائریکٹر ایم عابد اندو رام رتم کو اپنی اگلی فلم کے لیے سائن کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس کی اپنی پہلی دو فلمیں تقریباً فلوپ ہوئی تھیں اور وہ اندو کے رتبے کو پہچانتا تھا۔ اس کی اُن دو فلموں میں وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر رہا تھا جنہوں نے ہر بڑے شہر میں سلور جوبلی کی تھی۔ اس نے چھوٹے فلم کیپیٹل میں اسٹوڈیو کھولا تھا جو شاید پہلے کسی فیکٹری کا ہال یا گودام تھا۔ آرٹسٹ سے زیادہ کاروباری دماغ کا آدمی تھا۔ اس کا خیال تھا وہاں فلم پر لاگت فلم کیپیٹل سے کم آئے گی، کاسٹ اور میکنیشینز آسانی سے ملتے رہیں گے۔ "مجھ جیسے قسمت آزمانے والے یا فلم کیپیٹل کی ناکام ہستیاں۔" پچپن میل کی تو بات ہی تھی۔ صوبائی زبان میں فلم بنانے والا وہاں ایک اسٹوڈیو پہلے سے تھا۔

اُن دنوں تمام برطانوی نوآبادیات میں آزادی کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ جنگ ختم پر تھی لیکن ضرورت کی چیزیں نایاب بھی تھیں اور مہنگی بھی۔ سیلولائیڈ کا کوٹا کہتا تھا فلم آٹھ ہزار فٹ سے زیادہ نہ ہو، پھر دھارمک اور تاریخی فلمیں کیسے بنتیں جو پیسہ کھینچتی تھیں!

یہی نہیں کہ تمیز کو ایف۔ سی۔ سی میں ہونے والی رول برٹش نیوی میں بغاوت کی تاریخ یاد تھی – ۱۸ فروری، ۱۹۴۶ء، سننے والے دنگ رہ جاتے تھے – پرانی راجدھانی کے نزدیک رول ائیر فورس بیس کے کچھ ممبروں کے ڈائریکٹ آورڈ نہ ماننے سے انکار کی تاریخ، دنیا بھر کی ایکٹریسوں، ایکٹروں کی تاریخ پیدائش بھی اُسے ازبر تھیں۔ جب کسی ایکٹریس کا ذکر آتا کہ اس نے فلاں فلمی شخصیت یا ملٹی ملیونر سے شادی کی ہے وہ بغیر ذہن پر زور دیے کہتا: "ایک ایریز (Aries) ہے، دوسرا نیپچون (Neptune)، یا ایسی ہی کوئی بات "اُسے شوہر چاہیے تھا

اسکورپیو (Scorpio)، ملا ہے یورینس (Uranus) دونوں میں نہیں بنے گی۔"

تمام دوستوں اور ان کی بیویوں اور محبوباؤں کی پیدائش کی تاریخیں بھی اسے یاد تھیں۔ یہ نہیں دس بیس سال میں مدھم پڑ جائیں۔ بڑے بڑے فلم ڈائریکٹر، ایکٹر، جنرل اور لیڈر قسم کے لوگوں کی ہستی کا تعین اس کے دماغ میں Zodiacal signs (راس منڈل کے برج) اور ان کے ستاروں سے تھا۔ بہت سوں کی ہاتھ کی لکیریں اس کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ نہیں جانتا تھا تو حضرت آدم اور ماما حوا کی تاریخ پیدائش اور ان کے ستارے اور یہ کہ وہ ملتے تھے یا نہیں۔

ملنے والوں کو جو اوہام پرست ہوں وہ بلا فیس مشورے دیتا تھا۔ "اپنے نام کی اسپیلنگز بدلیے: حروف کے ٹوٹل ۳۵ یعنی ۵ جمع ۳ = آٹھ۔ آپ کے لیے آٹھ کا نمبر منحوس ہے: سیٹرن ہے۔ او کی جگہ یو، اے کی جگہ ای لگانے سے ٹوٹل بدل جائے گا۔ یعنی نئی اسپیلنگز کے حساب سے آپ کے نام کے بنے گیارہ۔ یعنی ا جمع ا = ۲۔ مون۔ آپ کو سوٹ کرے گا۔"

لوگ اس کی ذہانت کے تو قائل تھے ہی اس کی یادداشت کے اس سے زیادہ۔ لیکن اُسے دکھ ایک بات کا تھا: نہ تسنیم کی تاریخ پیدائش معلوم تھی، نہ کسم کی۔ دل آرا جب فلم کیپیٹل سے بدل ہو رہی تھی اس نے کہا تھا: یہ شہر آپ کو راس نہیں آئے گا۔ آپ ہیں لبرا (Libra) ترازو، اور یہ شہر ہے کینسر (Cancer) کیکڑا۔ پھر ناموں کے نمبر بھی ٹھیک نہیں کرتے ہیں: آپ جو ہیں ہیں یہ شہر ہے یورینس۔

دل آرا نے متاثر ہو کر کہا "وہاں سے چلتے وقت میں نے ایک جوتشی کو ہاتھ دکھایا تھا۔ اس نے کہا تھا: "آپ کی ریکھا آرٹسٹ کی ہے، لیکن جہاں جا رہی ہیں وہاں آپ کو اپنی مرضی کا کام کرنے کی آزادی نہیں ملے گی۔ جب تک اپنی مرضی کا کام کرنے کا وقت آئے گا آپ کمہلا چکی ہوں گی۔"

تمیز نے کہا "وہ جوتشی آرٹسٹ تھا۔"

دل آرا نے کہا: "آپ کی طرح۔"

تمیز کو اکا اس خوبصورت عورت کے اس چھوٹے سے جملے نے اُسے ساتویں آسمان پر پہنچا دیا

ہے۔

دل آرا یعنی ادیبہ Libra (میزان) تھی اور وہ خود Pisces (حوت) - دو مچھلیاں ایک دوسری سے مختلف سمت میں تیرتی ہوئی۔ شاید اس کی زندگی میں اگر میں آیا ہوتا تو بھی وہ کمھلا جاتی۔

دل آرا اپنے وطن جا چکی تھی

ایک دن تمیز اُسے خط لکھنے بیٹھ گیا۔ موقع عید کا تھا:

آج میں اور حسن وارد ایمن عید کی نماز کے لیے گئے۔ نہیں، لے جائے گئے کیونکہ جس فلم میں ایمن کو رول ملا ہے اس کا پروڈیوسر وہی ہے۔ آپ اُسے نہیں جانتی ہیں۔ نہ خدا کو ناراض کرنا چاہتا ہے، نہ بھگوان کو، نہ بغیر ستاروں کی مرضی کے ایک کلیپ سین دیتا ہے اور اس معاملے میں اس کا مشیر میں ہوں۔ اگر فلم کامیاب رہی تو شاید اگلی فلم میں مجھے ہیرو ہی کا رول دے دے۔ خیر وہ میری خوش فہمی ہے۔ وہ ہمیں زبردستی عید کی نماز کے لیے لے گیا۔ آپ بھی نمازی ہیں۔ اب جو بات میں کہنے جا رہا ہوں اس پر للہ ہنسیے گا مت۔ میں وہ دعا ہی بھول گیا جسے پڑھتے ہوئے سیدھے ہاتھ کی انگوٹھے کے پاس کی انگلی اٹھانا پڑتی ہے۔

خط کا جواب نہیں آیا اور تمیز کو اکثر خیال آیا' پتہ نہیں وہ میری بے وقوفی والی بات پر ہنسی یا نہیں۔ ہوسکتا ہے اب تک اپنی سوسائٹی میں واپس کھپ گئی ہو۔ ہوسکتا ہے دوسرے بچے کی ماں بننے کی تیاری میں ہو۔ یہ راز کھلا نہیں آخر وہ فلم کیپٹل آئی کیوں تھی۔ جب نہ رات کی شوٹنگ کے لیے تیار تھی نہ لوکیشن شوٹنگ کے لیے ایف سی سی سے باہر جانے کو۔ فن کے اظہار کی کلبلاہٹ یہاں لائی تھی اور سمجھوتا نہ کرنے کی خو واپس لے گئی۔

خیر وہ واپس چلی گئی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ شاید شادی شدہ ہے اور ایک بچے کی ماں مجھے پتہ ہی نہیں چلا کب میں اس سے خاموش عشق کر بیٹھا۔ اور محبت بھی ایسی کہ اگر اس تک پہنچ رہتی تو جنت میں بھی لے جائے جانے سے انکار کر دیتا' نیند میں ڈوبتے ہوئے تمیز کو خیال آیا۔

(۱۸)

آنے والے دنوں میں جن خیالات نے تمکینہ کا پیچھا نہیں چھوڑا ان میں سے یہ بھی تھے:
آندو نے بڑا اچھا خط دیا تھا جس کی بنیاد پر چاہتا تو ڈائریکٹر ایم۔ عابد کی ٹیم کا لائف ٹائم پارٹنر بن جاتا۔ مگر Minor Film City پہنچنے کے ماہ دو ماہ بعد ہی جن باتوں میں میرا دخل نہیں ہونا چاہیے تھا انہوں ہی نے ساری دلچسپی جیت لی: ایم اے کنٹریکٹ کتنے پر کرتا ہے دیتا کتنے ہے کاسٹ کو؟ میوزک ڈائریکٹر کو؟ شاعر کو؟ اسٹوری ڈائیلوگ اور اسکرین پلے لکھنے والے کو؟ اس نے کہانی لی ٹامس ہارڈی کی اس کا کریڈٹ دیا کس کو؟ شاعر اور اصل مکالمے نویس سے بارہ بارہ سو کا کنٹریکٹ تھا۔ پوری فلم کا نہیں، ہر ماہ کی تنخواہ کے۔ کیوں چھ ماہ کی شوٹنگ میں صرف دو موقعوں پر دو، دو سو دیے تھیں؟

نئی فلم کی موسیقی کے رکارڈ تیار ہو چکے تھے جن کے لیے شوٹنگ اسکرپٹ میں situations (موقعے) پیدا کرنے کا مشکل کام بے چارہ اصل اسکرین پلے مکالمے نویس کر رہا تھا کیونکہ ٹامس ہارڈی نے اپنے ناول میں اُن کے لیے گنجائش ہی نہیں رکھی تھی۔ رکارڈوں پر نام فلم کی ہیروئن کا تھا جس کا گلا یوروپین موسیقی کے لیے بنا تھا کیونکہ اس کی ماں فرنچ تھی۔ اس کا بچپن اور لڑکپن فرانس میں گزرا تھا، اور ایم اے اس فلم سے بیک وقت اُس پر اور فلم مارکیٹ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔

'لیکن کیا اس سب سے میرا تعلق ہونا چاہیے تھا؟ ایم ایف سی یا صرف ایم ایف، فلم کیپٹل سٹی کے مقابلے میں بڑا خوبصورت، پرسکون شہر ہے۔ نہ گرمیوں میں زیادہ گرم، نہ سردیوں میں زیادہ سرد۔ میں چاہتا تو اُس شہر کے حُسن ہی میں خود کو گم کر دیتا۔ کیا ہوتا تو باقی زندگی دوسری ہی ہوتی۔

'شروع میں بات ہنسی کی تھی۔ میں نے ہر جگہ کی طرح وہاں بھی سب پر اپنی پامسٹری کی دھاک چند دن ہی میں بٹھا دی تھی۔ کچھ ہی دن میں پورے اسٹوڈیو اور وہاں کی فلم انڈسٹری کو پتہ چل گیا ایک عددوں کے اسرار و رموز (numerology)، علم نجوم یعنی جیوتش (zodiacal signs) اور ہاتھ کی ریکھاؤں کا گہرا علم رکھنے والا ان کے جہان میں وارد ہوا ہے جو بتاتا ہے تاریخ پیدائش کے لحاظ سے کس کا کیا ستارہ ہے۔

میں عاجزی سے کہتا تھا ''ان تین کی ودیا میں نے ایک بنارس کے جیوتشی سے سیکھی ہے۔ جہاں شبہہ ہو یا ستارے کا اثر بدلنا ہو میں خط لکھ کر اُن سے مشورہ کر لیتا ہوں۔ میرا بتایا ہوا مستقبل کبھی غلط نہیں ہوتا ہے سوائے اس کے کہ کبھی کسی کو نہیں بتاتا ہوں تم خودکشی کرو گے یا کسی کو قتل کرو گے۔''

''اوہ، پھر لوگوں کے ہاتھ دیکھنے کا فائدہ؟'' فلم کی ہیروئن شوبھنا نے کہا تھا۔

''نہیں فائدہ ہے۔ میں ایسوں کو بتاتا ہوں آپ خطرناک رخ پر جا رہے ہیں، اپنا سوچنے کا طریقہ بدلیے۔''

یہ سُن کر شوبھنا نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

''جیوتشی جی نے ودیا دان دینے سے پہلے بچن لیا تھا 'اپنی جنم کنڈلی خود نہیں بناؤ گے، نہ اپنے ہاتھ کی لکیروں کو پڑھو گے۔' اور لاکھ نقصان اٹھانے پر بھی میں اپنے عہد پر قائم ہوں''۔

اس تعارف پر سننے والے کے دماغ میں جو اعتراض اٹھتا آخری بات اعتراض کرنے والے کا منھ پہلے ہی سے بند کر دیتی تھی۔

بنارس کے گھاٹ اس نے بس ایک بار ٹرین میں سے دیکھے تھے اور جیوتشی جی ایک خیالی

تخلیق تھے۔ رہا علم وہ ایمن کے فلم کیپیٹل سٹی جانے کے بعد اس نے اپنی یونی ورسٹی کی لائبریری سے لی ہوئی کتابوں سے حاصل کیا تھا۔

جس دن تنخواہ کی ادائیگی کے مطالبے پر خاکروب کے سامنے ڈائریکٹر کی تھوڑی سی خفگی سہہ کر کہ: "تم اکیلے ہی نہیں ہو میں بھی فائنینس کے ملنے کا انتظار کر رہا ہوں" جب وہ باہر نکلا تو اس نے پوری کاسٹ اور ٹیکنیشنز کی ٹیم کے سامنے کہا: "اس پر سینچر سوار ہے۔ فلم بنانے جا رہا ہے، کہانی انگلش ناول سے چوری کی ہے، گانے گوائے ہیں مہتاب نور سے جسے آپ چندابائی کے نام سے جانتے ہیں اور رکارڈوں پر نام ہے اس کا جس کا اس فلم کے بنتے بنتے نام بدل کر شوبھنا عابد ہو جائے گا۔ لیکن فائینینس ملنا آدھی فلم کے بعد رک جائے گا۔ بس چار ریلیں بنا پائے گا اور فلم ٹھپ ہو جائے گی۔ جہاں جائے گا اس کے ڈبے ساتھ لیے پھرے گا اور تم سے جو کنٹریکٹ ہوا ہے اس کے چوتھے پیسے بھی نہیں ملیں گے۔"

سب کو سانپ سونگھ گیا۔ یہ وہ شخص تھا جو ڈائریکٹر کا ماضی ان کا ہاتھ دیکھ کر بتا چکا تھا۔ جو کہہ رہا تھا سچ کہہ رہا تھا۔ ان میں سے بہت سے اندیشے پہلے سے سب کے دماغ میں تھے۔ فلم کی کہانی کا کریڈٹ بھی گانوں کی طرح ہیروئن کو دیا جائے گا۔ لیکن اس آخری بات نے کہ فلم ختم ہونے سے پہلے ہیروئن اس کی بیوی بن جائے گی اس کے بعد فلم کیپیٹل سٹی کی دنیا اس پر کھلی ہوگی سب کو ہڑبڑا دیا۔ کچھ ایسا ہی سب کا اندیشہ تھا۔

تلمیذ کی پیشینگوئی کے بعد کسی کو کیا امید رہ گئی!

ہیروئن تن تنائی ہوئی اوفس میں گئی اور جتنی فلم بنی تھی اس کے حساب سے پیسوں کا فوراً ادائیگی کا سخت لہجے میں مطالبہ کیا۔

سارے ٹیکنیشنز باہر کھڑے تھے۔

'ایک پل میں غصہ انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔ یا تو میں خود ڈائریکٹر اور ہیرو بننے جا رہا تھا یا جیب میں بغیر ایک پائی کے اسٹوڈیو کے باہر وہاں فٹ پاتھ پر پڑا تھا جہاں فلم کے پروڈیوسر، ڈائریکٹر نے مجھے پھنکوایا تھا۔ آخری لفظ جو میں

نے ڈائریکٹر سے کہے تھے میرا خیال تھا اُسے تاعمر یاد رہیں گے: ''تمہاری سروج مووی ٹون ختم ہوجائے گی اور ایس جے اسٹوڈیوز کو تالے لگ جائیں گے یا گھوڑوں کا اصطبل بن جائے گا، جو پہلے تھے۔''

(۱۹)

کسی کو نہیں معلوم ایک دوپہر جب کلیم الرحمٰن نے خود کو ایس جے اسٹوڈیوز کے باہر فٹ پاتھ پر پڑا پایا تھا اور بڑی مشکل سے اپنے کولھوں اور کندھوں کو سہلاتا ہوا دھیرے دھیرے کھڑا ہوا تھا اُس اشبھ دن سے لے کر اس صبح تک جب وہ پہلی بار اپنے دفتر میں سکون سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا یعنی ایک باعزت فرد کی زندگی شروع کر رہا تھا بیچ میں کن کن جوکھوں سے وہ گزرا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے کسی کو بھی رازداری کے لائق سمجھ کر ان تمام دنوں، اور راتوں کے حادثات اور واقعات کی تفصیل نہیں سنائی تھی۔ یا یہ کہ وہ سنائے جانے کے لائق نہیں تھے۔

اور اس سے بھی بڑی وجہ رازداری کی یہ تھی کہ برابر ترمیم کرتے رہنے کی وجہ سے وہ خود بھی ان کی اصل شکل بھول چکا تھا۔ نشے کی حالت میں وہ سر جھکائے خاموشی سے رونے والوں میں سے نہیں تھا، بکھان کرنے والوں میں سے تھا۔ بس ایک دفعہ ایک کمرشیل بلڈنگ کی اوپر کی منزل پر بنے ہوئے کاٹھ کے شراب خانے میں جسے وہ پیر جی کا آستانہ کہتا تھا اس کے منھ سے نکلا تھا ''سروج مووی ٹون چھوڑنے کے بعد میں نے اس کے اور ڈائرکٹر ایم عابد کے نام کی بحیثیں تبدیل کیں، نئے جنموں کے ساتھ اُسے کچھ دن وقفے وقفے سے خط پوسٹ کرتا رہا جو لوٹائے نہیں جاتے تھے۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟ اُسے دونوں کے نام ان اسپیلنگز کے ساتھ تسلیم تھے۔ پھر کیا ہوا؟ جو میں نے کہا تھا: فلم ادھوری رہ گئی۔ یہ مجھے بعد میں گانے اور مکالمے لکھنے

والوں نے بتایا تھا، وہ اپنی بقایا تنخواہ اور کنٹریکٹ کے روپے کو رو رہے تھے، پر ہیروئن سے ڈائریکٹر کا عشق ادھورا نہیں رہا۔ لیکن'' اس نے ایک بڑا گھونٹ لے کر کہا'' اُسے بھی آگے چل کر فلاپ ہونا ہے۔ بوکس اوفس پر فلاپ ہونے والی فلم کی طرح۔ ستارے کبھی جھوٹ نہیں بولتے تیں۔''

چند اور باتیں تب کی اس کے ذہن میں محفوظ رہیں: اُن میں سے ایک اس کی نئی نوکری مل جانے کی تھی- اگلے دن۔ بیچ کی رات اس نے ایک پارک کی بینچ پر خالی پیٹ پر کاٹی تھی۔ وہ نہ ملتی تو شاید اسے ایمن کے پاس پیدل چل کر جانا پڑتا۔ پچپن میل!

'اسٹوڈیو کے باہر سڑک پر پڑے رہنے میں مجھے ہتکی محسوس ہو رہی تھی، وہاں سے جتنی جلد ممکن ہو دور چلا جانا چاہتا تھا۔ ناریل بیچنے والے پاس سے گزر رہے تھے لیکن میں نے یہ سوال نہیں کیا کہ پیاسا ہوں اور مجھ کو بھی ایک ناریل کا پانی پلا دو اور اس کی ملائی بھی کھانے کو دو۔ جانتا تھا میری زبان سن کر اور میرے کپڑوں کو دیکھ کر وہ مفت میں پینے کو ناریل نہیں تھما دیتا اور نہ میں اس کی فیاضی کو قبول کرتا۔'

اگلی صبح تملیذ اس لائن میں کھڑا تھا جو فوج میں بھرتی کے خواہش مندوں کی تھی۔ جنگ ختم پر بتائی جاتی تھی، دو شہروں پر ایٹم بم گرائے جانے کے بعد جاپان نے گھٹنے ٹیک دیئے تھے، لیکن محاذ سے لوٹائے جانے والوں کی جگہ وہاں نئے ریکروٹ بھیجے جا رہے تھے، بغیر تسلی بخش ٹریننگ کے۔

تملیذ نے بھرتی کرنے والے انگریز اوفیسر سے انگریزی میں کہا: '' محاذ پر جانے کو بھی تیار ہوں اور اگر کسی دفتر میں رکھا گیا تو ٹائپ کر سکتا ہوں، خط ڈرافٹ کر سکتا ہوں اور بھی جو دفتر کا کام ہو۔''

''نام؟''

''تعبیر الرحمٰن'' وہ والد کا نام بتانے کو ہوا لیکن بغیر رکے انگریز اوفیسر نے اس کی تعلیم اردو میں پوچھی۔ تملیذ نے کہا'' گریجویٹ، میرے والد برٹش گورمنٹ کے ملازم تھے اور—''

''تم بھی برٹش گورمنٹ کو سرو کرنا چاہتے ہو؟'' بھرتی کرنے والے نے مسکرا کر کہا۔
اب تک سارے سوالوں کا جواب تمیز انگلش میں دیتا رہا تھا لیکن لگتا تھا فریق اول اردو بولنے کی پریکٹس کر رہا ہے۔

معمولی سے فزیکل چیک اپ کے بعد تمیز کو فوج میں لے لیا گیا۔ بھوکے پیٹ پر اس صعوبت سے گزرنے کے بعد اس نے درخواست کی اُسے بھرتی کرنے والے اوفیسر سے دوبارہ ملایا جائے۔ وہاں اس نے پھر انگریزی میں کہا: ''پرسوں سے بھوکا ہوں، بالکل خالی پیٹ۔ یہاں دوپہر کا کھانا ختم ہو چکا ہے اور —''

''اور تمہارے لیے شام تک انتظار کرنا کٹھن ہے۔'' پھر اس نے ایک پرچے پر لکھتے ہوئے کہا: ''ریکروٹ نائیڈو کو پانچ روپے دئے جائیں۔''

بھرتی کے دفتر سے سب سے نزدیک جو کھانے کی جگہ تمیز کے ذہن میں تھی اس کے بورڈ پر ہندی اور اردو میں لکھا تھا: پوتر بھوجن بھون۔ پانچ روپے جیب میں رکھ کر تمیز نے فورا اُدھر کا رخ کیا۔ اس وقت اُسے اپنا جسم گرم لگ رہا تھا اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

اسے ہاتھ پھیلا کر بتانے سے روکنے کے لیے کہ کیا چاہیے چوکی والے برہمن نے کہا: ''کھڑے رہو جو ہے وہ ملے جاتا ہے۔'' اُسے ڈر تھا ہاتھ پھیلا کر بتانے کی صورت میں ہاتھ کا سایہ بھوجن پر پڑتا۔

کھانے کے بعد جو مکمل ویشنو تھا: کیلے کے پتے پر دال چاول، اچار اور پاپڑ، ایک بار تو تمیز کے ذہن میں آیا 'بھاگ لو'۔ لیکن اس نے خود کو مشورہ دیا: 'اس نوکری میں برا کیا ہے؟ نہ برما بھیجے جاؤ گے، نہ آسام۔ اُدھر کا پورا محاذ ٹھنڈا پڑا ہے۔ چلو فوج کے بھی مزے دیکھیں۔ کھانے، رہنے کی جگہ اور بستر کی فکر نہیں کرنی پڑے گی۔ نہ علاج معالجے کی۔ سکھ سے رہو گے دوست۔ فی الحال ہیرو بننے کے خیال کو چھوڑو۔ جنگ ختم ہو گی تو خود ہی چھٹی ہو جائے گی — جیب میں پیسوں کے ساتھ۔ پڑے رہو دوست۔ پکڑے جانے پر Army Deserter (فوج کے بھگوڑے) کا تو چارج لگے ہی گا، نام غلط لکھوانے کا بھی!'

اُن دنوں یہ خبر پھیل رہی تھی کہ جاپانی سپاہ کی قید سے آنے والے بہت سے برطانوی فوجیوں کا کورٹ مارشل ہوگا کیونکہ وہ غدار بن گئے تھے۔ سو بھاگنے کی صورت میں ان کے ساتھ بھگوڑے بھی ہوں گے۔

ایک ہفتے بعد تملیذ پرانی راجدھانی میں تھا، ۱۹۱۱ء سے پہلے کی ملک کی راجدھانی، محلوں کا شہر، جہاں چڑیا گھر، میوزیموں اور پارکوں کے علاوہ فلم اسٹوڈیوز بھی تھے۔ لیکن جہاں اُسے کام پر لگایا گیا وہ جگہ پرانی راجدھانی سے دور تھی — رویٔل ایئر فورس کا اڈا۔

پرانی راجدھانی کے مقابلے میں روئل ایئر فورس بیس اس حد تک خاموش جگہ تھی کہ اگر وہاں ہوائی جہازوں کی ٹیک اوف اور لینڈنگ نہ ہو رہی ہوتی تو لگتا قبرستان ہے یا مرگھٹ۔ فوجیوں کی ضرورتیں پورا کرنے کے سامان سے بھری چند دکانیں تھیں، کلب جس میں سینما ہال بھی شامل تھا، فوجی بارکیں اور ہما شما کے لیے کوارٹرز۔ اُسے بارک میں جگہ ملی۔

تملیذ نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور اس فیصلے پر پہنچنے میں اُسے دیر نہیں لگی کہ بُرے پھنسے بچو۔ اس سے تو اپنے مٹی پور میں زیادہ زندگی ہے۔ یہ کہاں آ گئے!'

مگر جب وقفے میں ایک ساتھ کام کرنے والے نے کہا "Coming for a cup of coffee?"[1] اس دوستانہ آواز کو سن کر تملیذ میں کچھ جان پڑی۔ بولا: "چائے اور کوفی میرے لیے نہیں بنی ہیں۔ یہاں اور کچھ نہیں ملتا ہے؟"

"سب کچھ۔ بیئر، اسٹاوٹ، وہسکی۔"

اس کے منھ سے بے اختیار نکلا "بیئر۔ لیکن مجھے ابھی پہلی تنخواہ نہیں ملی ہے۔ اس لیے آج نہیں پھر کسی دن۔"

---

[1] ایک پیالی کوفی کے لئے چلتے ہو؟

"Drink today, pay later" ۔ پیو آج، ادا کل کر دینا۔ بلکہ آج میرے مہمان بنو۔"

بیئر کی ایک ٹھنڈی بوتل کے بعد جب تمکینہ نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو یہاں بھی وہی سب کچھ تھا جو فلم سٹی کیپیٹل میں — ناریل کے درخت، سبزہ ہی سبزہ، پھول، چڑیوں کی آوازیں، آسمان پر لدے کھڑے بادل۔ اور دور کہیں سمندر بھی تھا۔

جس افس میں اُسے لگایا گیا اس کی ہیڈ ایک سفید عورت تھی۔ شکل سے کوئی پرنسپل یا ہوسپٹل میٹرن لگتی تھی۔ وہ جب نہ ہوتو سب کی چھاتیاں جیسے سانس کے لیے کھل جاتیں۔ اونچی آواز میں باتیں ہونے لگتیں۔ گنگنانے کی آوازیں بھی اٹھتیں، اور ٹائپ رائٹر کیئر سے کھیلنے کی۔ وہ آتی تو سناٹا ہو جاتا۔ پہلے دن اس لڑکی نے جو برابر کی میز پر بیٹھی ٹائپ رائٹر پر بے دلی سے پٹ پٹ کر رہی تھی اس کی طرف سر لے جاتے ہوئے کہا: "تم سگریٹ نہیں پیتے ہو؟"

شروعات اچھی تھی۔ تمکینہ نے سگریٹ کا پیکٹ کھول کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "میرا نام تانیئر ہے۔"

اس نے سگریٹ لے کر سلگاتے ہوئے کہا "I am Maureen Hardy, call me just Maureen" [1] پھر جس کاغذ پر ٹائپ کر رہی تھی اُسے کھینچ کر نکالا اور مروڑ کر برابر رکھی ہوئی ٹوکری میں نشانہ لے کر پھینکا۔

تمکینہ نے کہا: "نشانہ اچھا ہے کیرم یا بلیئرڈ نہیں کھیلتیں؟"

اس نے خندہ پیشانی سے کہا: "دونوں میں سے ایک بھی نہیں۔ کیا تمہارے ملک میں عورتیں بلئرڈ کھیلتی ہیں؟"

تمکینہ نے کہا: "لوڈو اور اسنیکس اینڈ لیڈرز۔ اور شادی سے پہلے ایک پاؤں پر پھدک کر ایک خانے سے دوسرے خانے میں جانے کا کھیل۔ جس کا نقشہ اگر فرش پکا ہو تو کوئلے سے فرش پر بنایا جاتا ہے۔"

---

[1] میں مورین ہارڈی ہوں بس مورین کہو۔

''مجھے سیکھنا چاہیے۔''

اگلی شام مورین اسے کلب لے گئی۔ اس کا تعارف کرا کے نام لکھوایا اور بغیر تلمیذ سے پوچھے وہسکی کا آرڈر دیا۔

''یہاں کام دام کچھ نہیں ہے۔ سب یو کے جانے کا انتظار کر رہے ہیں۔ سفید آدمی کی جتنی ذمے داری اس ملک میں تھی پوری کر چکا ہے اور اس سے قبل کہ اُسے بوٹ کی ٹھوکر سے یہاں سے نکالا جائے خود نکل جانے کی جلدی میں ہے۔ تم کہاں سے آئے ہو؟''

تلمیذ نے کہا'' مائنز فلم سٹی سے۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''ٹرین سے چوبیس گھنٹے کے فاصلے پر۔''

مورین نے ناک سکیڑ کر کہا:''او! یہاں کی ٹرینیں بہت سست ہیں۔ مگر تم نے وہاں یہاں ایئر بیس میں بغاوت کی خبر نہیں سُنی تھی؟''

''کیسی بغاوت؟''

''رونل ایئر فورس کے کئی آدمیوں نے ڈائریکٹ اَورڈرز (direct orders) ماننے سے انکار کیا تھا۔''

''سُنی تھی۔''

''اٹھارہ فروری کو جو بغاوت رونل نیوی والوں نے کی تھی، بندرگاہ میں؟''

''وہ بھی۔''

''ہر جگہ، ہر جگہ بغاوت ہے اور ان سب کو کچلا نہیں جا رہا ہے۔ کتنے ناشکرے ہیں یہ لوگ! میں بھی واپس جانے کا انتظار کر رہی ہوں۔ تم تو ان میں سے نہیں ہو جو باغیوں کے ساتھی ہیں؟''

تلمیذ نے کہا:'' بالکل نہیں۔ کیا تمہیں شکل سے باغی نظر آتا ہوں؟''

''نہیں'' اُس نے مطمئن ہو کر کہا۔'' اتوار کو میرے ساتھ چرچ چلنا۔ تم پروٹیسٹنٹ ہو نا؟''

''ہاں'' تلمیذ نے کہا۔ وہ سچ بول کر اس دوستی کو ختم کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"یہ جگہ اتنی اجاڑ نہیں ہے۔ یہاں بہت کچھ ہے۔ پروٹیسٹینٹ چرچ اُن میں سے ایک ہے۔ باقی تمہارے کام کا نہیں ہے: دو کالج پرانی راجدھانی یونیورسٹی سے ملحق ہیں، اسلحہ کی فیکٹری، ایئر پورٹ۔ یہ چھاؤنی ۱۷۸۳ء میں بنی تھی اور ۔"

تملیذ نے اس کی بات روک کر کہا "تم پہلے یہاں ٹورزم کی گائیڈ تھیں!"

وہ ہنس پڑی۔ "کاش ہوتی۔"

تھوڑے ہی دن میں تملیذ کے اندر سویا ہوا ماہر اعداد numerologist دست شناس palmist اور ستارہ شناس astrologer جاگ اٹھا۔ ادھیڑ عمر کی مس ایکنن جو تملیذ کو پہلے دن کالج پرنسپل یا ہسپتال کی میٹرن نظر آئی تھی وہ بھی اُسے بے تکلفی میں Tab[1] کہنے لگی۔ ایک دن اپنی کوفی کے ساتھ اس نے تملیذ کی کوفی کے بھی پیسے دیئے۔ تھوڑی دیر اپنا دکھڑا رو کر جب وہ دوسری میز پر چلی گئی تو ٹھنڈی کوفی چھوڑ کر تملیذ اُفس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا جی یہاں نہیں لگ رہا تھا۔ سب کچھ ٹیمپریری ہے۔ باہر والوں کی طرح اس کے دماغ میں بھی یہاں سے چل کھڑے ہونے کا کیڑا کلبلا رہا تھا۔

وقت کے ساتھ اسٹاف بدل رہا تھا۔ لوگ جا رہے تھے اور ان کی جگہ دوسرے آ رہے تھے۔ مس ایکنن جا چکی تھی، اس کی جگہ ایک یوریشین عورت نے لے لی۔ ایک دن کسی نے گھر سے آنے والا خط پڑھ کر اعلان کیا: "سنو مورین نے شادی کر لی۔ اب وہ مسز کرسپ ہے۔"

"She was already very crisp, why got married" تملیذ نے کہا۔ سب ہنس پڑے۔

دست شناسی کے علاوہ دوسری خوبی جو تملیذ میں تھی وہ اس کی ٹائپ کی اسپیڈ تھی جو غلطیوں سے مبرا ہوتی تھی۔ وہ کسی کو بھی ٹائپ رائٹر پر اونگھتے دیکھ کر اس سے ٹائپ کا مواد لے کر چند

[1] Tabeer کا مخفف

منٹ میں ٹائپ کر دیتا تھا۔

مگر پرانی راجدھانی گھومنے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا، جس کا یہ علاقہ ایک حصہ تھا لیکن رائل ایئر فورس کی بیس ہونے کی وجہ سے اس سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ ملک میں ہنگامے ہو رہے تھے جن کے بارے میں جس نئی لڑکی سے دوستی ہوئی تھی کہتی تھی: "مجھے برا نہیں لگتا کہ یہاں کے لوگ ایک دوسرے کو ماریں، بلکہ ختم کر دیں۔ لیکن ٹرینیں، ریلوے اسٹیشن، امیونیشن فیکٹری، پوسٹ آفس برٹش گورمنٹ کے ہیں۔ ان پر حملے کے لیے ان شہدوں کو سخت سے سخت سزا ملنی چاہیے۔"

تمیز نے کہا: "لیکن یہ سب چیزیں ان کی زمین پر ہیں۔ اس لیے وہ کہتے ہیں اُن کی ہوئیں اور برطانوی حکومت کو انہیں چھوڑ کر یہاں سے اپنا بندیرا اٹھانا چاہیے۔"

"کیا! کیا!" جینسی نے چونکا ہو کر کہا "یہ تم کہہ رہے ہو!"

تمیز نے کہا: "میں نہیں مائی ڈیئر یہ لوگ کہہ رہے ہیں۔"

"او! لیکن اس ملک کو برٹش حکومت اگر چھوڑ کر چلی گئی تو یہ دوسرا اندھیرا براعظم ہو جائے گا۔ farewell to culture۔ نہ ٹرینیں چار دن سے زیادہ چل سکیں گی، نہ یورپ امریکا کے جہاز ان کی بندرگاہوں میں سامان اتاریں گے۔"

تمیز سر ہلاتا رہا۔

جینسی نے کہا "لیکن ایسا ضرور ہوگا۔ تم نے ریڈیو پر سنا جو یہاں والے برطانوی فوج میں تھے اور محاذ پر جاپانیوں سے مل گئے تھے اور وہاں انہوں نے اپنے انگریز افسروں اور ساتھیوں پر گولیاں چلائی تھیں، جنگ ختم ہونے پر پکڑ کر نئی راجدھانی لے جائے گئے، وہاں تاریخی قلعے میں اُن پر مقدمہ چلا۔ لیکن ہوا کیا لوگوں نے انہیں ہیرو بنا لیا۔" اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں "ہز میجسٹی کی حکومت کو لوگوں کے مطالبے پر نرم پڑنا پڑا۔ میں تمہیں بتاتی ہوں ہم برٹن (Briton) شرمناک حد تک بعض موقعوں پر نرم دل ثابت ہوتے ہیں۔" وہ رو پڑی۔

تمیذ نے کہا "What a pity" [1]۔

اس نے تمیذ کے گلاس کی تمچھٹ کو حلق میں ٹپکاتے ہوئے کہا: "میں یہاں سے جلد نکل جانا چاہتی ہوں۔ تم بھی نکل لو۔"

تمیذ نے اس کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا: "ہاں میں بھی نکل جانے کی سوچ رہا ہوں۔"

چیفی کے جانے کے بعد حسن وارد ایمن کی وہ بات یاد آنے پر تمیذ قہقہہ مار کر ہنسا جو اس نے پہلے پروڈیوسر ڈائرکٹر کے دفتر سے باہر نکلنے پر تمیذ کی صلاحیت کے بارے میں کہی تھی۔

رائل ایئر فورس کی نوکری چھوڑ کر تمیذ کو پرانی راجدھانی اپنی طرف بلاتی ہوئی محسوس ہوئی۔ محلوں اور باغوں کا شہر، پرانی وضع قطع قائم رکھنے والے نوابوں راجاؤں کا شہر، جہاں [2] کے پڑھے لکھے طبقے نے سب سے پہلے انگریزی لباس اختیار کیا تھا اور وہی سب سے پہلے اس سے بیزار ہوئے تھے۔ اس کی سڑکیں، پُل اور کہاں کیا ہے تمیذ کتنی ہی وہاں بننے والی فلموں میں دیکھ چکا تھا۔

'جیب میں پیسے ہیں، کیوں نہ کچھ دن یہاں کی خاک چھانوں۔ فساد ہوتے ہیں تو ہوا کریں میرا اُن سے کیا تعلق! نہ ایک سیاسی پارٹی میں ہوں نہ اُس کی مخالف پارٹی میں۔ نہ اس مذہب میں ہوں نہ اُس مت میں۔

بی۔اے ہوں، رائل ایئر فورس سے ریٹائرڈ، فلم بنانے کا تجربہ رکھتا ہوں، ڈرافٹنگ، ٹائپ رائٹنگ جانتا ہوں بہت جلد یہیں نوکری مل جائے گی اور ہوسکتا ہے باقی زندگی یہیں گزاروں، اس خوبصورت دنیا میں جو ہر سمت ہری ہی ہری ہے، ریت بالو کا نام نہیں، ندیوں اور بڑی بڑی آنکھوں والی خوبصورت عورتوں کا شہر۔'

---

[1] کیا افسوس کا مقام ہے۔

[2] رابندر ناتھ ٹیگور

پہلی نوکری ایک فلم ڈسٹری بیوٹر کمپنی کی تھی: بس اخبار میں اشتہار دیکھ کر وہاں چلا گیا تھا۔ جیب میں پیسے تھے اس لیے انٹرویو میں جتنی باتیں اس نے کیں اس کے اعتماد کو ظاہر کرتی تھیں۔ فلم کمیپٹل سٹی کا تجربہ وہاں بہت کام آیا۔

گھوش بابو نے پوچھا ''چھوڑ کیوں آئے؟''

تمیذ نے کہا ''جو فلم کا کوٹا یہاں ہے وہی وہاں ہے۔ آٹھ ریل سے زیادہ کی فلم نہیں بنائی جا سکتی ہے اور جو بناؤ اس میں جاپانیوں کا ظلم اور انگریزوں کی جرأت ہر سین کیا، ہر فریم میں نظر آئے۔''

گھوش بابو نے کہا: ''مگر جنگ تو ختم ہو چکی ہے اور انگریز ملک چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ انہیں اب اپنی بہادری کا پروپیگنڈہ کرانے کی کیا ضرورت ہے؟''

''وہ جا رہے ہیں لیکن سینسر بورڈ میں جو دیسی صاحبان بیٹھے ہیں انہیں کہاں خبر ہے کہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔ ان کی ذمہ داری جیسی کل تھی آج بھی ہے۔''

گھوش بابو کو اپنے سامنے ایک سامراج کو للکارنے والا نوجوان بیٹھا نظر آیا۔ خوش ہو کر انہوں نے سر ہلایا۔

تمیذ نے اپنی بات جاری رکھی: ''وہاں بہت تھوڑے بجٹ پر فلمیں بن رہی ہیں۔ ان میں سے بھی بہت سی جو فسادات پھیلے ہوئے ہیں ان کی وجہ سے ریلیز نہیں ہو پائیں گی۔''

''یہاں اس سے بدتر حال ہے۔ اب اس فلم کو لے لو جسے ہاتھ میں لیتے ہوئے ڈر رہا ہوں ''

''کیوں؟'' تمیذ نے گہری دلچسپی سے کہا۔

وہ اس کی تھیم کو واضح کرنے لگے۔ تمیذ نے اجازت لے کر ان کے سامنے سے ایک کاغذ اٹھایا اور اجازت ہی سے قلم۔ پھر ان کے نام کی ہجے پوچھیں اور فلم کا ٹائٹل اور حساب کتاب میں لگ گیا۔ گھوش بابو اس کے کام کو انہماک سے دیکھ رہے تھے۔

تمیذ نے ان کی تاریخ پیدائش پوچھی، فلم کے ڈائریکٹر، ہیرو اور ہیروئن کی۔ گھوش بابو کو اپنی

تاریخ پیدائش کے بارے میں کچھ شبہ تھا مگر باقی تین کی پیدائش کے بارے میں انہیں اتنا تک معلوم نہیں تھا کون کہاں پیدا ہوا تھا۔ تملید نے کاغذ ان کے سامنے رکھ کر کہا: ''خیر کوئی بات نہیں، ان کے ناموں کو بس اسپیلنگز انگلش میں لکھ دیجیے۔''

مزید حساب لگا کر اس نے مسکرا کر کہا: ''آپ یہ فلم ضرور لے لیجیے۔ فلم کے بوکس اوفس پر فیل ہونے کا امکان نہیں ہے۔''

اُس دن سے وہ گھوش بابو کے دفتر میں رہنے لگا۔ دن میں وہ اس کا بھی اوفس ہوتا تھا اور رات کو جب گھوش بابو گھر چلے جاتے تھے وہ میز کرسی سرکا کر سونے کے لیے جگہ نکال لیتا تھا۔ کام ٹھیک چل رہا تھا لیکن وہ نوکری اُسے اس وقت چھوڑنی پڑی جب گھوش بابو کے دفتر پر بلوائیوں نے حملہ کیا کہ ایک مسلمان کو تم نے پناہ دے رکھی ہے۔

بلوائیوں کے رخصت ہو جانے پر گھوش بابو نے لاکھ سمجھایا کہ ''بابا لوگوں کا یہ غصہ اتنے دن بھی نہیں رہے گا جتنے دن بے وقت کی بارش'' مگر تملید نے بہتری اسی میں سمجھی وہاں سے فوراً نکل لے: ''ہوسکتا ہے اگلا حملہ اس وقت ہو جب گھوش بابو دفتر میں نہ ہوں۔''

اگلی نوکری اُسے ایک کلیئرنگ اور فورورڈنگ کی فرم میں ملی۔ اُن دنوں وہ پرانی راجدھانی کے شاید سب سے گرے پڑے ہوٹل میں اپنے لیے جگہ ڈھونڈ سکا تھا، جہاں وہ رات کو صرف سونے اور صبح اٹھ کر نہا دھو کر باہر نکل جانے کے لیے رہ رہا تھا۔

پھر ایک دن فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے جو آدمی عین اس کے سامنے ایک قدم کے فاصلے پر آگے آگے تھا گولی کھا کر گرا۔ نجانے کیسے وہ مردہ جسم تملید کی ٹھوکر کھانے سے بچا۔

لوگ بھاگ رہے تھے، گلیوں اور مکانوں میں داخلے کی تنگ ڈیوڑھیوں میں دبکتے پھر رہے تھے۔ پولس کی سیٹیاں کچھ دیر کے بعد گونجیں۔ ایک ایک دو، دو کر کے لوگوں نے اپنی پناہ

گاہوں سے نکلنا شروع کیا۔

چند منٹ پہلے کی بات اُسے یاد نہیں تھی وہ لاش کو پھاند کر آگے بڑھا تھا یا کنی کترا کر۔ اُسے اس لمحے نے بتایا تم باوجود اپنی سیاسی، مذہبی حیثیت نہ رکھنے کے ایک سب کو نظر آنے والی حیثیت رکھتے ہو اور اس وجہ سے گھڑی بھر پہلے مارے جا سکتے تھے۔

تلمیذ نے اتنی اونچی آواز میں کہ برابر کھڑے ہوئے آدمی کو سنائی دیتی خود سے کہا:

[۱] "So, goodby to the Old Capital"

---

۱ سو پرانی راجدھانی کو خدا حافظ۔

(۲۰)

جب جب ٹرین کسی ایسے اسٹیشن پر رُکی جہاں باقاعدہ عمارت تھی، اُس میں اسٹیشن ماسٹر کا دفتر زنانہ اور مردانہ ویٹنگ رومز، وہاں دیواروں پر دو نمایاں پوسٹرز چسپاں تھے: ایک میں ایک بابو صاحب بھاگے جا رہے ہیں، بدحواس، اور اُن کے مُنھ سے نکل رہا ہے: 'معاف کیجیے مجھے ایک ویگن خالی کرنا ہے۔' پوسٹر کی آخری لائن تھی: ویگن کو ہمیشہ چلتا رکھیے۔

دوسرا پوسٹر گوبر کی توصیف میں تھا: گائے، بھینس، کسان، اور تصویر کے نیچے کی لائن تھی۔ گوبر اچھی کھاد ہے، اسے جلائیے مت۔

تلمیذ کے برابر میں بیٹھا ہوا بوڑھا ان پوسٹروں کو دیکھ کر ہر بار بڑ بڑا جاتا تھا۔ ''آخر اس کا مطلب کیا ہے؟''

''کاہے کا؟'' ایک بار تلمیذ نے پوچھا۔

''ان حکموں کا۔''

''کون سے؟''

''کیا جنگ ابھی اور چلے گی؟ پتہ نہیں میرا بیٹا گھر لوٹے گا بھی یا ابھی کسی اور فرنٹ پر بھیجا جائے گا۔''

دو اسٹیشن جب پیچھے رہ گیا تلمیذ نے بڑے میاں کو سگریٹ پیش کر کے کہا: ''مگر یہ حکم

کیسے ہوئے اور ان کا جنگ کے جاری رہنے اور آپ کے بیٹے کے گھر آنے نہ آنے سے کیا تعلق ہے؟''

بوڑھے کو تلمیذ میں اپنا بیٹا نظر آیا۔ بولے: ''تم گھر جا رہے ہو۔ ایسے ہی اُسے گھر آنا تھا، مگر حکومت کہتی ہے ویگن کو خالی رکھیے۔ کاہے کے لئے؟ رسد محاذ پر لے جانے کے لئے! ابھی اور ہمیں گیہوں کی جگہ جو، جوار کھانا پڑے گا۔ لالٹین کی جگہ کڑوے تیل کے چراغ جلیں گے۔ انگریزوں کے لئے یہ ویگن گیہوں، چاول، گھی، نون، مرچ، شکر سرحدوں کی طرف لے جاتے رہیں گے۔

''ہمیں تو کنڈے جلانے میں عذر نہیں، یہ کیوں پیچھے پڑے ہیں گوبر کی کھاد کھیتوں کو دو۔ کیوں؟ فصل ہوگی، گنا، ارہر، تلہن ہوگی اور وہ سرحدوں کو بھیجی جائے گی۔ لوگ انتظار کرتے رہیں گے اپنے بھائی، بیٹوں کا۔ مگر وہ تو لڑتے رہیں گے۔

''وہ اشتہار جو پہلے لگے تھے کیا بُرے تھے: ''لپٹن کی جا کو جا۔''

''وہ کیا؟''

''بڑی اچھی چائے ہوتی تھی جاپان کی۔ اب نہیں آتی۔ اس کے اشتہار بھی ہٹا لیے۔ مجھے ان گوروں کی نیت صاف نہیں لگتی۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ تم بھی تو گھر بیٹے جا رہے ہو۔'' تلمیذ نے ہمدردی سے سر ہلایا۔ ''کس محاذ پر تھے؟''

''ملایا کے۔''

''کبھی گولی وولی لگی؟'' تلمیذ نے نہ میں سر ہلایا۔ ''ماں باپ دیکھ کر خوش ہوں گے۔ کب سے انتظار کر رہے ہوں گے! خط پتر تو بھیجتے رہتے تھے؟'' تلمیذ نے اثبات میں میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ پلکیں جھپکائیں۔

''آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟''

''پرانی راجدھانی سے۔ تم وہاں سے گاڑی پر چڑھے ہوگے، میں وہاں کام کرتا تھا۔''

''کیا؟''

''رائے چند چودھری کا نام سنا ہوگا، ان کے اورکیسٹرا میں پیانو بجاتا تھا۔ تم نے ضرور اُن کی فلمیں دیکھی ہوں گی اور رکارڈ بھی سنے ہوں گے۔ بڑے گیان والا آدمی ہے۔ اور سب سامنے لکھی ہوئی میوزک کا ریاض کرتے تھے، پڑھنا جانتے تھے، میں زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں، مجھے بول کر گا کر بتاتے تھے کیا کرنا ہے۔ رکارڈنگ کے وقت وہ میری طرف نہیں دیکھتے تھے جانتے تھے غلطی نہیں کروں گا۔''

''کس اسٹوڈیو میں تھے؟''

''نیوتی۔''

''اور پیانو کیسے سیکھا؟''

''ایک انگریز عورت کو اپنی زبان سکھانے پر ملازم تھا۔ ایک دن وہ پیانو بجا رہی تھی۔ میں پاس جاکھڑا ہوا، گھنٹہ بھر اس کی انگلیوں کو دیکھتا رہا۔ شاید میری انگلیاں چل رہی تھیں، انہیں دیکھ کر اس نے پوچھا ''بجاؤ گے؟'' میں نے کہا ''ہاں۔'' وہ ایک طرف کو ہوگئی۔ میں کھڑا کھڑا کچھ دیر کیز (Keys) کو پرکھتا رہا۔ مجھے یاد تھا کس میں سے وہ کون سا سُر نکال رہی تھی، کس میں سے کون سا سُر نکال سکتا ہوں۔ پھر وہ اٹھ گئی اور مجھ سے بیٹھ جانے کو کہا۔ میں نے تھوڑی دیر میں الحنیا باداول کی دُھن ڈھونڈ نکالی۔ لڑکا تھا تو بانسری بجا لیتا تھا۔ سارے ساز ایک ہوتے ہیں۔''

کچھ دیر وہ سازوں کی دنیا میں کھویا رہا۔

''اب کیا وہیں رہو گے ماں باپ کے پاس؟'' تلمیذ نے سر ہلایا ''ہمیشہ کے لئے؟''

''ہاں۔ کچھ دن آرام کروں گا۔ پھر نوکری ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوں گا۔''

ڈبے کے سارے مسافر سو رہے تھے۔ بوڑھے نے بھی مطمئن ہوکر آنکھیں بند کرلیں۔ تلمیذ نے اس کی انگلیوں سے سگریٹ کا ٹکڑا لے کر باہر پھینک دیا جو خاتمے پر تھا۔

جب نئی پور آیا صبح کا دھندلکا تھا۔ بوڑھا کھچا کھچ بھرے ڈبے میں ٹیک لگائے سو رہا

تھا۔ تلمیذ خاموشی سے اپنا سوٹ کیس اور بستر کا ڈوری سے بندھا ہوا بنڈل لے کر پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ اسٹیشن ماسٹر کے دفتر کی دیوار پر کوئی پوسٹر چسپاں نہیں تھا۔ پلیٹ فورم کی سرخ بجری اُسی طرح پاک صاف تھی جس طرح وہ بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ اس پر نہ یہاں وہاں کھائے ہوئے دونے پڑے تھے، نہ بیڑی سگریٹ کے ٹکڑے اور گندے کاغذ۔ لگتا تھا یہاں جنگ نہ ہوئی تھی نہ جاری ہے۔ اس نے اسٹیشن سے باہر آ کر ایک ایک درخت پر نظر کی کہ اُن میں سے کتنوں سے آشنائی تھی، سر اٹھا کر صاف آسمان کو دیکھا، سوٹ کیس اور بستر کے بنڈل کو زمین پر رکھ کر تھوڑی اوپر کی اور دو تین بار گہری سانس لی جیسے یہاں کی ہوا کو جس میں پھولوں کی باس اور ہوا سے ملتے ہوئے پتوں کی جھرجھراہٹ تھی، پی جانا چاہتا ہو۔

وہ ایک بار پھر نینی پور میں تھا۔

جیسا ماں باپ کی زندگی سے دیکھتا آیا تھا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ پردے کے لئے لٹکائے ہوئے ٹاٹ کا نیچے کا حصہ لگتا تھا گل چکا ہے۔ دروازے کے عین سامنے جو نالی تھی اس کا رخ بدلا گیا تھا تاکہ کیچڑ وہاں نہ پھیلے، اب وہ عموداً بہہ کر سامنے کے کھنڈر کی طرف گئی تھی۔

اُسے دیکھ کر زندگی کا جو شور گھر میں تھا لمحے بھر کو تھم گیا۔ خود تلمیذ صحن میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اتنے سالوں میں جو ماں باپ کے گزر جانے کے بعد اس نے بورڈنگ ہاؤس، ہوسٹل، چالوں، رنڈوؤں اور چھڑوں کے ساتھ فلیٹوں اور بارکوں میں گزارے تھے وہ رشتے غارت ہو چکے تھے جو ایک گھر میں بسے ہوئے خاندان کے سب چھوٹے بڑوں کو ایک دوسرے سے باندھے ہوتے ہیں۔ نہ بہنیں اس کی طرف سینے سے چپٹ جانے کے لئے لپکیں، نہ بھائی بانہیں پھیلا کر آ کر اس سے لپٹ گئے۔ نہ ہی یہ سب وہ کر پایا۔ تینوں بہنوں نے ادب سے سلام علیکم کہا اور دو بھائیوں نے جو اس وقت گھر میں تھے پاس آ کر ڈرتے ڈرتے اس کی طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ اُن میں، نمبر ۲، کم عقل بھائی بھی تھا۔

پھر وہ اُسے اس کمرے میں مہمان کی طرح لے گئے جو زندگی میں عتیق الرحمٰن کا تھا اور اس آرام کرسی پر بٹھا دیا جس کی بینت پھٹنے سے رہ گئی تھی۔ دو بہنیں صحن میں کھلنے والے

دروازے میں کھڑی تھیں، تیسری دوسرے کمرے میں کھلنے والے دروازے میں۔ کم عقل باہر سے ایک منڈھیا لاکر اس پر بیٹھ گیا۔

تقسیم ارض کا ہز ماسٹرس وونس والا گرامفون ایک کونے میں رکھا تھا اور میز کے نیچے اس کالا وڈ اسپیکر۔ کوئی بہتر بات دماغ میں نہ پاکر تمکینہ نے کہا: "یہ بجتا ہے ابھی؟"

"کمانی ٹوٹ گئی۔ اب یہاں ٹھیک کرنے والا کوئی نہیں ہے۔" بڑی لڑکی نے کہا۔

کم عقل نے کہا: "اور سوئیاں بھی نہیں ملتی ہیں۔"

"رکارڈ ہیں ابھی؟"

"آپ لے تو نہیں جائیں گے؟" ریحانہ سب سے چھوٹی لڑکی نے جیسے ڈر کر کہا۔

"نہیں میرے کس کام کے ہیں۔"

تھوڑی دیر میں بڑی یعنی نمبر ۳ بہن بیا چائے لے کر آ گئی۔ ساتھ میں تل لگی ہوئی گھی کی ٹکیاں تھیں۔ پہلے چند سالوں میں بس اسی کے ساتھ تمکینہ کی کبھی کبھار خط و کتابت ہو جاتی تھی۔

"یہاں قلت تو نہیں ہے آٹے، چینی، دال، گھی کی؟"

"آٹا راشن سے ملتا ہے۔ ڈبل روٹی لو یا ایک درجن بسکٹ تو اتنا آٹا راشن سے کاٹ لیا جاتا ہے۔" اور اس نے ٹکیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا: "یہ ہم گاؤں والوں سے لیتے ہیں۔ راشن سے سستا ہوتا ہے پر۔"

چائے ختم کر کے تمکینہ نے سگریٹ روشن کی۔

"تم لوگ ابھی اس کرایے کے گھر میں رہ رہے ہو؟ اپنا گھر کیا ہوا؟"

"آپ اسے بیچنے آئے ہیں؟" کم عقل نے کہا۔

"نہیں نہیں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ بس پوچھا ہے۔"

بیا نے اعتماد کے ساتھ کہا "اُسے بیچ کر اور اُس میں وہ پیسہ ملا کر جو تایا ابا سے ہمیں ملا ہم نے اس مکان کو خرید لیا۔"

''اب یہ ہمارا ہے۔'' کم عقل نے بھی اعتماد سے کہا: ''تائے ابا سے ہمارا حصہ بھی ـــ''

''چپ۔'' بیا نے اس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے بہن کے ہاتھ سے اپنا منھ آزاد کر کے اپنی بات مکمل کی: ''لے کر آپ کھا چکے ہیں۔''

فضا ویسی نہیں تھی جیسے جب وہ ماں کی زندگی میں گھر آتا تھا اُسے ملتی تھی۔ ریحانہ اٹھ کر صحن میں جا کھڑی ہوئی تھی جہاں محلے کی تین لڑکیاں تخت پر سامنے سپارے کھولے بیٹھی تھیں۔ ایک کے سامنے رحل پر قرآن کھلا تھا۔ اُس تخت پر پہلے دادی نماز پڑھتی تھیں، پھر اماں۔ اب وہ ریحانہ کا اسکول تھا اور وہ ان کو سبق دے رہی تھی۔

تمیزہ نے پوچھا: ''وہ کلام مجید کہاں ہے جو اماں پڑھا کرتی تھیں؟''

کم عقل نے کہا: ''آپ اُسے لے جائیں گے؟''

''ہاں اور اُس کے ساتھ تمھیں بھی۔'' پھر اس نے صفائی میں کہا: ''میں یہاں سے کچھ نہیں لے جاؤں گا۔ بس دیکھنا چاہتا تھا۔''

شفیق وہ روزن تھا جس میں سے وہ اس گھرانے میں ہونے والی اُن باتوں کو سُن سکتا تھا جو اس کی غیر موجودگی میں ہوتی رہی ہوں گی۔ اس نے فضا کے تناؤ کو کم کرنے کے لئے کم عقل سے کہا: ''تم اب وہ کھٹ مٹھے پتے نہیں کھاتے ہو؟''

''جو گھاس میں کنارے پر اگتے ہیں؟'' شفیق نے کہا۔ ''کھاتا ہوں ـــ کبھی کبھی۔ بھائی جان آپ سگریٹ نہیں پلائیں گے۔''

بیا اور فیروزہ نے ایک ساتھ کہا ''نہیں بھائی جان۔ یہ رات بھر کھانستا ہے۔ سگریٹ پیے گا تو ڈاکٹر جوشی نے کہا ہے اسے ٹی بی ہو جائے گی۔''

''اور خون تھوکا کروں گا۔'' شفیق نے کہا۔

تھوڑی دیر وہ بیا سے جو اب اس گھر کو چلا رہی تھی خاندان والوں کے بارے میں پوچھتا رہا۔ اور سب سے آخر میں تسنیم کے بارے میں۔

"تسنیم آپا ٹھیک ہیں۔ اس سے زیادہ ہمیں نہیں پتہ۔ اُن کے میاں نہ انہیں کہیں آنے جانے دیتے ہیں، نہ خط لکھنے۔"

اس کا اندازہ غلط نہیں نکلا تھا۔ یقیناً ڈاکٹر صاحب نے اُسے کسی پنج کلان ملا کو بیاہا تھا۔

تمیز اٹھ کھڑا ہوا اور بولا: "میرا سامان یہیں پڑا ہے۔ میں تھوڑی دیر ادھر اُدھر گھوموں پھروں گا پھر تین بجے کی ٹرین سے آگے چلا جاؤں گا۔"

فیروزہ نے پوچھا: "دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھائیں گے!"

تمیز کے دو تین اطلاعات نے فضا کے تناؤ کو کافی حد تک کم کر دیا تھا۔

باہر جانے سے پہلے اس نے سوٹ کیس کھول کر بیا کے ہاتھ میں کچھ چیزیں تھمانی شروع کیں: "یہ چند چیزیں تم سب کے لئے ہیں۔ میں فوج میں تھا نا!"

"ہمیں معلوم ہے۔" فیروزہ نے کہا "اور خط ایک بھی نہیں لکھا۔"

"ایک پتا ہوتا تو لکھتا۔ جب تائے ابا نے لکھا: تمہارے حصے کی رقم ختم ہو چکی ہے، آگے پڑھنا ہو تو نوکری کرنی ہوگی۔ تب سے مختلف شہروں میں نوکریاں کرتا پھرا ہوں۔ آخر میں فوج میں تھا وہاں بس یہی چیزیں ملتی تھیں۔"

اس نے پھٹی ہوئی بنیت والی دوسری کرسی پر چیزیں رکھنی شروع کیں -- پرفیوم، مکھن، پنیر اور جام کے ٹن، چار ڈبے راشن کے جن میں سے ہر ایک میں جو (rye) کے بسکٹ تھے، ایک پیالی کے لئے چائے کی پتی، دودھ، شکر اور انڈے کے پاؤڈر کے پیکٹ اور منہ سے ہوا بھرنے کے تکیے۔

کچھ سلک جیسا کپڑا بھی تھا لیکن تھوڑا موٹا، جس میں لڑکیوں کو خاص دلچسپی محسوس ہوئی۔ قرآن پڑھنے والی لڑکیاں بھی وہاں آ کھڑی ہوئی تھیں۔

کم عقل نے سب سے پہلے ایک راشن کے ڈبے اور تکیے پر قبضہ کیا۔

کپڑے کو ہاتھ میں لے کر فیروزہ نے پوچھا ''یہ؟''

''پیرا شوٹ کا کپڑا ہے۔ بہت لوگ اس کے کرتے بنوا رہے ہیں۔ دھو کر استری نہیں کرنی پڑتی ہے۔''

تکیئے میں ہوا بھر کر شفیق نے فرش پر لیٹ کر اس پر اپنا سر رکھا، جیسے نیند آ رہی ہو آنکھیں بند کر لیں، لیکن تلمیذ کو دروازے سے باہر جاتے دیکھ کر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہو: ''بھائی جان میں بھی آپ کے ساتھ چل رہا ہوں۔''

''نہیں۔'' تلمیذ نے کہا ''میں اکیلا جانا چاہتا ہوں'' اور چل کھڑا ہوا۔

اس کے ذہن میں تھا کہاں کہاں جانا ہے — کمرکھوں کا باغ، جہاں برساتی نالے کے پاس جنگل جلیبی کے پیڑ تھے، جہاں گرگٹوں کا شکار ہوتا تھا اور مکڑی کو مارنے والے ہندو لڑکوں سے جہاد، جہاں ریلوے کوارٹروں میں سے ایک میں ایک ناٹھا آدمی ایک بے عقل (moron) لڑکی کو بیاہ کر لایا تھا، 'حقیقت پسند تھا' اور سنگھاڑوں کا تالاب۔

وہاں کی دنیا ایک سرِ مو نہیں بدلی تھی۔

آج بھی تالاب میں سنگھاڑے نہیں تھے۔ اگر ایک بھی نظر آتا تو وہ پتلون اوپر کر کے اور جوتے موزے اتار کر اس کے لئے ڈبیر میں گھس جاتا۔ ایسے دودھیا ملائم سنگھاڑے دنیا میں اور کہاں ہوتے ہیں!

تین بجے سے کچھ دیر پہلے وہ گھر لوٹا۔ ایک بہن جلدی سے پلیٹ میں سالن لے آئی، دوسری توے پہ روٹی ڈال رہی تھی۔ یہ خوشبو وہ بھول ہی چکا تھا کیونکہ بڑی بہن کے گھر میں کب اس نے باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھ کر کھانا کھایا تھا جب توے سے روٹی اتر رہی ہو!

اس نے کہا: ''ارے تم لوگوں نے یہ کیا کیا مجھے تو بھوک ہی نہیں ہے۔ پھر ٹرین کا ٹائم بھی

ہو گیا ہے۔''

بھنوں میں جو محبت سو گئی تھی اس کے جاگ اٹھنے نے اُسے کھانے پر مجبور کر دیا۔

''ایسا کھانا میں شاید بارہ تیرہ سال بعد کھا رہا ہوں۔'' اس نے شکر گزاری میں کہا۔

کھانے کے بعد اس نے پوچھا: ''یہاں سے لوگ دوسرے ملک کو نہیں جا رہے ہیں؟ تم لوگ نہیں جا رہے ہو؟''

ریحانہ نے پوچھا: ''انگلستان؟ جہاں انگریز جا رہے ہیں۔''

''نہیں'' تمیز نے کہا: ''بڑے شہروں سے لوگ نئے ملک کو جانے کی سوچ رہے ہیں، بلکہ بہت سے جا بھی چکے ہیں۔ یہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ مذہبی فسادات۔''

جیا نے کہا: ''نہیں۔ یہاں نہ کوئی اخبار پڑھتا ہے، نہ ریڈیو سنتا ہے۔ جیسے سب پہلے رہ رہے تھے اب بھی رہ رہے ہیں۔ رہا ہمارا گھر: نہ ہم اخبار لیتے ہیں نہ ریڈیو ہے۔''

فیروزہ نے اس کے ہاتھ میں جزدان میں بند قرآن شریف لا کر دیا: ''آپ پوچھ رہے تھے نا اماں کے قرآن مجید کو، یہ رہا۔''

تمیز نے جھک کر اُسے چوما اور واپس کرتے ہوئے کہا: ''میرا وضو نہیں ہے۔''

جیا نے کہا: ''کھول کر دکھا دو۔''

تمیز دیر تک اس کے کھلے ہوئے صفحات کو دیکھتا رہا، پھر سونگھ کر بولا: ''اماں کی خوشبو ہے ابھی تک۔''

چلتے وقت اس نے سب کے ہاتھ میں نوٹ تھمائے۔ صرف شفیق کو چاندی کے سکے دیے۔

''شاید کبھی اس سے زیادہ بھیج سکوں گا۔ اپنا پتہ بھی لکھوں گا۔ شاید تم لوگ وہاں آنا چاہو۔''

''نہیں بھائی جان ہم یہیں خوش ہیں۔'' ریحانہ نے کہا۔

''رشتے داروں سے جب ملنا ہو، جب انہیں خط لکھو میرا سلام لکھنا۔''

(۲۱)

سمندر پر پہلے دو دن سخت گزرے تھے۔ وہ خود بھی برتھ چھوڑ کر کیبن سے باہر نہیں نکلتا تھا، نہ اُن مسافروں سے ملاقات ہوئی تھی جن کے ساتھ جہاز پر سوار ہوا تھا۔ بس شروع کے آدھ گھنٹے یا پینتالیس منٹ میں بچوں نے عرشے پر دوڑ بھاگ کی تھی اور ان کے ماں باپ بھی پانی کی ہلکی بوچھار کا لطف لے رہے تھے، لیکن جب سب کو پیروں تلے فرش حرکت کرتا ہوا محسوس ہوا اور پیٹ نے متھنا شروع کیا تو بچوں نے گھبرا کر اپنے بڑوں کے چہرے کو دیکھا کہ یہ کس آفت میں لے آئے۔ پلک جھپکتے میں عرشے پر سناٹا طاری ہوگیا۔ سمندر انتہائی طیش میں تھا۔

اُن دو دنوں میں جو کھانا پکانے کا سامان ساتھ نہیں لائے تھے انہوں نے اسٹیورڈ کے پوچھنے پر ہر بار کہا: نہیں بابا کیسا کھانا، کہاں کی چائے! یعنی زندہ رہے تو آ کر پوچھ جانا۔ جو عورتیں اسٹوو اور چھوٹا موٹا باورچی خانہ ساتھ لے کر جہاز پر سوار ہوئی تھیں انہوں نے بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ بمشکل کھڑے ہوکر بچے کے لئے دودھ بنایا، اس کے منھ میں بوتل دی اور ساتھ لیٹ گئیں۔

ایک عورت اپنے ساتھ سرکے کی بوتل اور پیاز لائی تھی، لگتا تھا تجربے کار ہے، اس نے ایک پلیٹ میں پیاز کاٹ کر سرکے میں ڈبوئی اور برابر کی برتھ پر لیٹے ہوئے شوہر کے منھ میں دینے لگی۔ پھر کھڑے ہوکر اس نے تکمیذ سے کہا: ''لو بھائی یہ منھ میں رکھے رہو۔ الٹی نہیں ہوگی۔''

پھر وہ ایک پہلو پر لیٹ کر تھوڑے تھوڑے وقفے سے پیاز کے ٹکڑے منھ میں رکھنے لگی۔ اُن کے ساتھ کوئی بچہ نہیں تھا۔

اکثر جب برٹش اسٹیم شپ نیویگیشن[۱] کمپنی کا کوئی افسر تملید کے کیبن کے پاس سے گزرا تو اس نے خوش مزاجی سے پوچھا: ''اگر کرایہ ڈبل لے کر کسی دوسرے راستے سے جہاز کو لے جاتے تو کیسا رہتا؟''

اس نے ہر بار ہنس کر کہا: ''دوسرا راستہ ابھی آیا جاتا ہے۔ کل تک انتظار کرو۔ No extra charges''

جب سمندر کا مزاج ٹھنڈا ہوا اور بچے، بڑے اور بوڑھے اپنی بلوں سے نکل آئے تو لگتا تھا رات تک یہاں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ نہ بچے دودھ کے لیے روئے اور بھوک سے ٹھنکے تھے، نہ یہاں وہاں لوگوں کی منھ سے پھیلائی ہوئی گندگی تھی، عرشہ کسی صفائی پسند گھرانے کے صحن کی طرح صبح کی ہلکی دھوپ میں دھلا دھلایا نظر آ رہا تھا۔

ناشتے کے بعد تملید نے بیئر طلب کی اور رسی کو پکڑ کر لوہے کے پائپوں کی باؤنڈری پر ایک پیر رکھ کر دیر تک بے دھیانی میں سمندر کی لہروں کو دیکھتا رہا۔ پرندے کہیں کہیں بالکل پانی کی سطح سے لگے اڑتے نظر آتے تھے۔ ایک جگہ مچھیروں کی کئی کشتیاں ساتھ ساتھ تیر رہی تھیں۔

جب بیئر ختم پر آ گئی اور اس نے بوتل کو پانی میں پھینک کر نئی سگریٹ سلگائی تو اُسے خیال آیا 'یہ میں کہاں کا ارادہ کر کے چل پڑا ہوں! محض اس وجہ سے کہ اپنے یہاں کے شہروں کی بڑی آبادی اُس نئے ملک کو جا رہی تھی اور اس ملک سے اُس ملک کو آ رہی تھی جسے میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔'

کون سا ملک اس تھا کون سا اُس — وہ اس اُس میں الجھ کر رہ گیا۔

'نہ معلوم وہاں زندگی کیا شکل اختیار کرے گی؟ پرانے ملک میں اپنا ٹھور ٹھکانا تھا۔'

آج اُسے احساس ہوا وہاں اس شہر سے اُس شہر مارے مارے پھرنے میں اس خیال نے کبھی

---

[۱] British Steamship Navigation Company

اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا کہ ہر طرف سے مار کھانے، اپاہج اور مفلس ہو جانے پر بھی ایک جگہ ہے، خدا کے اس وسیع آسمان تلے، جو کبھی میری پہنچ سے دور نہیں ہوگی۔ مَنی پور — جہاں ماں، باپ اور اَن گنت دوسرے اپنوں کی قبریں ہیں۔ اس تمام اعتماد کے پیچھے ایک احساس چھپا تھا: میں کہیں کا ہوں اور ہمیشہ لوٹ کر وہاں جا سکتا ہوں۔

'اور جہاں جا رہا ہوں، انسانوں کا سمندر ہوگا۔ نہ کوئی قریبی رشتے دار، نہ دوست۔ نہ رہنے کو گھر، نہ ملازمت۔'

'خیر ایک دو ماہ اگر کوئی کام نہ بھی ملے تو ریلوے پلیٹ فورم، یا کسی مسافر خانے میں ٹھیر سکتا ہوں۔ یہ دو چیزیں وہاں ضرور ہوں گی۔'

رؤل ایئر فورس کی ملازمت سے جتنا بچایا تھا اس سے دُوگنا اس نے پرانی راجدھانی کی دو فرموں کی نوکری میں کما لیا تھا۔ ڈرافٹنگ اور ٹائپنگ وہاں اس کے بہترین حربے رہے تھے اور کوئی وجہ نہیں تھی نئے ملک میں ان دو کی مانگ نہ ہونے کی۔

جو آبادی اس نئے ملک سے بھاگی تھی اُن میں سب پڑھے لکھے لوگ تھے جن کا تعلق کاروباری دنیا سے تھا اور جو رہ گئے تھے سننے میں آتا تھا کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ ہیں، مچھیرے، بھیڑوں بکریوں گایوں بھینسوں کے پیچھے چلنے والے جنہوں نے اپنے بڑے شہروں کے تجارت کی عمارتوں کو کبھی اندر سے دیکھا تک نہیں ہوگا۔ جو کھیتوں کے مالک ہیں ان کی دلچسپیاں دوسری ہیں، اُن کی اپنے گاؤوں میں حویلیاں ہیں اور بڑے شہروں میں حویلیوں جیسے بنگلے۔ انہیں بھلا کلرکوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے! اُن کے نزدیک وقت پر جا کر اُفسوں میں بیٹھنے والے، وہ کسی فرم کے مینیجنگ ڈائریکٹر ہوں، بینک مینیجر، یا ٹرام وے کمپنی کے عہدے دار سب کلرک تھے۔

'یہاں ڈرافٹنگ، ٹائپنگ، باہر کے ملکوں سے خط و کتابت کام آئے گی۔ بھوکے مرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔'

'اور پامسٹری، نمرولوجی، ایسٹرولوجی؟ ان کا نئی زندگی میں کیا رول ہوگا؟'

'وہی تو نوکری دلوائیں گی۔'

'اور عربی رسم الخط اور قراۃ!'

'نئے ملک میں اس کی کھپت سی کھپت ہوگی! خطیبوں، قاریوں اور حافظوں کا ملک سُن کر ہی لوگ اُدھر بھاگے جا رہے ہیں۔'

کافی دیر وہ عرشے پر ادھر اُدھر پھرتا رہا۔ اس کے کیبن کی وہ خوبصورت روح والی عورت جس نے پہلے دن اس کی حالت دگرگوں دیکھ کر سرکے کی پیاز اُسے دی تھی ایک جگہ اسٹوو پر کھچڑی پکا رہی تھی۔ کھچڑی ہی ہوگی کیونکہ وہاں نہ دوسری پتیلی تھی نہ توا۔

ایک جگہ ایک چھ سات سال کا لڑکا اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ بار بار بہن کے ساتھ ایک ہی کھیل کیے جا رہا تھا: بیٹھا بیٹھا سر جھکا کر اونگنے لگتا اور بچی ڈر کر کہ بھائی کو الٹی ہو رہی ہے اس کی گردن اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگتی جس طرح اس نے اپنی ماں کو کرتے دیکھا ہوگا۔ اسی لمحے لڑکا اٹھ کر سیدھا بیٹھ جاتا اور ہنسنے لگتا۔ بچی ہر بار بوکھلا جاتی۔

تمیز نے پاس جا کر لڑکے سے کہا "کیوں تنگ کر رہے ہو بے چاری کو۔ اتنی محبت کرنے والی تو بہن ہے اور تم اسے ستا رہے ہو!" لڑکا جھینپ گیا۔ پھر اس نے دونوں کا سر تھپتھپایا۔

'بڑا اچھا دن ہے، کاش سب دن ایسے ہوا کریں۔'

اگلے دن دوپہر کے کھانے کے بعد تمیز سو رہا تھا کہ اس کے کیبن کے ساتھیوں نے اُسے ہلا کر کہا: "صاحب نیا دارالحکومت آ گیا۔"

تمیز اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُسے ہکا بکا دیکھ کر اسی عورت نے کہا: "آپ کو کیا کہیں آگے جانا ہے؟ اپنا پورٹ تو آ گیا۔"

اس وقت اس کے ذہن میں آیا تھا کاش یہ نیند سدا کے لئے ہوتی کیونکہ آنے والے دنوں کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ گھبرا رہا تھا۔

جہاز ایک میلوں لمبی کھاڑی میں داخل ہو رہا تھا۔ دور شفاف ہوا میں آسمان کے مقابل جہازوں کی فنلز، کرینیں اور کئی کئی منزلہ عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ مسافر ہر طرف، اوپر نیچے کی تمام

منزلوں پر اپنے کمروں اور کیبنوں سے نکل آئے تھے اور نئے ملک کے زندہ رہنے کے نعرے لگا رہے تھے۔ سوائے اُن کے جن کے لئے یہ آمد اب نئی نہیں رہی تھی۔ اور وہ بھی جن کی منزل کہیں آگے تھی۔

آج سے زیادہ تملیذ نے خود کو کبھی تنہا محسوس نہیں کیا تھا۔

جس رشتے کے چچا کے بیٹے نے اُسے نئے ملک کو اپنا گھر بنانے کے لئے کئی بار لکھا تھا وہ نئے ملک کے پایہ تخت میں چند ماہ پہلے اپنے باپ کے ساتھ آیا تھا اور اُسے اپنی مرضی کا نہ پا کر آگے چلا گیا تھا۔

'کاش جمال ہی یہاں ہوتا اور اس کا پتہ میرے پاس ہوتا تو ٹیکسی کر کے ڈرائیور کو بتاتا کہاں چلنا ہے۔ اب اس سے کیا کہوں گا اپنے گھر لے چلو! جس جہاز نے یہاں اتارا ہے اس کے کپتان سے جا کر کہوں واپسی پر لے لینا اور جہاں سے آیا ہوں وہیں اتار دینا؟'

اس دن جہاز سے اترنے کے بعد اس پر کیا بیتی تھی، کیا کیا تھا، کہاں کہاں گیا تھا اس کے دماغ کی سلیٹ پر سے کسی چھپے ہوئے ہاتھ نے پونچھ دیا تھا۔ بہت سوچنے پر بھی وہ اس دن کے واقعات کو ذہن میں نہیں لا سکتا تھا سوائے اس کے کہ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے رک کر اس کی بات سُنی تھی اور کہا تھا: ''خود کو پریشان کرنا فضول ہے، بہت سے اسی طرح یہاں آتے ہیں، کچھ دن گھبراتے ہیں پھر کسی نہ کسی کام میں لگ جاتے ہیں۔''

اسی نے نریمان ایسپلینیڈ کا پتہ بتایا تھا ''مخبر نے کو جگہ مل جائے گی، وہیں رہتے ہوئے رشتے داروں کا پتہ چلا لینا گُڈ لک ینگ مین۔''

نریمان ایسپلینیڈ کسی زمانے میں کھاڑی کے دہانے پر جہاں کھلا سمندر تھا، ہوا خوری اور آرام کرنے کی جگہ ہوگی۔ اب مالک یا مالکوں کی غفلت کی نذر ہو کر ایک سہ منزلہ عمارت رہ گئی

تھی جس کے چاروں طرف دھوپ سے جھلسی ہوئی گھاس کے لون تھے، جن میں بکریوں اور اونٹوں کی سوکھی ہوئی مینگنیاں بھی نظر آ سکتی تھیں، کیاریوں میں مرجھائے ہوئے پودے رہ گئے تھے اور ان کے رفیق سگریٹ، بیڑی کے ٹوٹے۔ جہاں نئی عمارتیں بیچ میں حائل نہیں ہوگئی تھیں سمندر بھی اپنی تمام مردنی میں نظر آتا تھا جو اتنا اپاہج بن جاتا تھا کہ کنارے پر لوگوں کے پھیلائے ہوئے کوڑے کو اٹھا کر نہ ان کے منھ پر مار سکتا تھا نہ بہا کر ساتھ لے جا سکتا تھا۔ اور کبھی اتنا شوریدہ سر کہ لگتا تھا اپنی دیوار جیسی اونچی لہروں سے عمارتوں کو بھی نگل لے گا۔ اور ناکام ہو کر وہ لہریں اپنے پیچھے کف چھوڑ جاتی تھیں۔

جس چوکیدار نے تمیز کی بات سنی اس نے کہا "بال بچے ساتھ ہوتے تو کسی کمرے میں ان کے لئے جگہ نکل آتی۔ تم چھڑے آدمی ہو جنرل وارڈ میں دو روپے روز پر رہو۔ بس ایک ہفتہ رہ سکتے ہو اس سے زیادہ رہنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"جنرل وارڈ میں!" تمیز نے حیران ہو کر پوچھا "ہسپتال ہے؟"

"نہیں بابا۔ رات کو رہنے کی جگہ ہے۔"

"اور باقی سارے کام؟"

"وہ بھی ہوتے رہیں گے۔ تم جا کر دیکھو تو۔"

جنرل وارڈ میں ہر دیوار سے متصل ٹھیرنے والوں کے ٹرنک، سوٹ کیس اور گول کیے ہوئے بستر یا ہولڈ ال فرش پر پاس پاس رکھے تھے۔ چند بستر بچھے تھے اور ان پر مسافر سو رہے تھے۔

تمیز ماحول کا جائزہ لے کر کچھ دیر داخلے کے دروازے پر کھڑا سوچتا رہا۔

ایک مسافر نے پوچھا: "نئے آئے ہیں؟ جگہ چاہیے؟ اس کونے میں جگہ خالی ہے۔"

چابی سے چلنے والے جاپانی ہوے کی طرح اس کونے میں تمیذ نے دیوار سے ملا کر اپنا سوٹ کیس کھڑا کیا اور بستر کھول کر لیٹ گیا۔ بلڈنگ کا جتنا حصّہ اس نے اب تک دیکھا تھا اس میں سے صرف چھت، جس پر اس کی آنکھیں تھیں، بے داغ تھی۔

نریمان ایسپلینیڈ کا نام اگر rehabilitation centre ہوتا تو وہ اس کی صحیح تعریف ہوتی۔ ہر کمرے میں کئی خاندان رہ رہے تھے۔ فرنیچر صرف مینیجر کے دفتر میں تھا۔ باقی کو اس کی کیا ضرورت تھی۔ لوگ آتے تھے بیوی بچوں کو کمرے میں چھوڑ کر رشتے داروں کی تلاش میں نکل جاتے تھے۔ جنہیں واقف یا رشتے دار مل جاتے خوش خوش لوٹتے، بستر لپیٹتے، عورتیں ٹرنکوں اور تھیلوں میں سامان ٹھونستیں۔ مینیجر اور چوکیداروں کو خدا حافظ کہہ کر وہ کنبہ اس بڑی آبادی میں جو ملک کا پایہ تخت تھا گم ہو جاتا۔

جنرل وارڈ والے بغیر کسی کو اپنا سامان سونپے صبح صبح نکل کھڑے ہوتے تھے، عملہ انہیں بتا چکا تھا ان کے سامان کی نگہداری چوکیدار کر رہے ہیں۔ رات کو کسی ایک بستر پر دو چار مسافر اس طرح جمع ہو جاتے جیسے میٹنگ ہے اور اس میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار ہو رہا ہے۔ ملک قائم رہے گا اس کا سب کو یقین تھا۔ خود اُن کا آنے والے دنوں میں کیا بنے گا۔ دل کے اس نازک تار کو چھیڑتے ہوئے سب ڈرتے تھے۔ جسے وہ چھوڑ آئے تھے لگتا تھا اب وہ وہاں نہیں رہا ہے، لوٹ کر کہاں جائیں گے؟

صبح سویرے تیار ہونے کی جگہوں پر لوگوں کی بھیڑ ہوتی تھی۔ ہاتھ میں لوٹے، مگّے، صابن دانیاں، منجن کی شیشیاں اور کندھوں پر تولیے اور دھلے ہوئے کپڑے۔

یہی سب عورتیں کر رہی ہوتی تھیں، سب ہی برقعوں میں ہوتی تھیں اور کچھ بچوں کو سنبھالے ہوئے۔

تمید کے ذہن میں یہ سب سین اس طرح باقی رہے جس طرح ڈوکیومینٹری فلموں کے کراؤڈ سین ہوتے ہیں: لوگ ایک دوسرے کو دھکا دیتے ہوئے چل رہے ہیں۔ خود اس کے ہاتھ میں ایک پوکٹ ڈائری ہے جس پر رشتے کی ایک بوڑھی خالہ کا تھوڑا بہت پتہ ہے، اور ایک تقی ڈوکٹر کا نام۔ رشتے کی خالہ سال میں ایک مرتبہ منی پور آتی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کی بیٹی ہوتی تھی۔ ماہ ڈیڑھ ماہ رہ کر جاتی تھیں۔ تب وہ بوڑھی نہیں تھیں، تمید کی ماں سے عمر میں کچھ ہی بڑی تھیں۔ دونوں کے لئے تمید کی ماں دو، دو جوڑے کپڑے بنواتی تھیں اور چلتے وقت بھی نیکی کا سلوک کرتی تھیں۔

اُن کا پتہ نئے ملک میں کس نے دیا تھا یہ تمید کو یاد نہیں رہا تھا۔ شاید بیبا نے یہ سُن کر کہ تمید اپنا ملک چھوڑ کر نئے ملک کو جا رہا ہے، یہ کہہ کر کہ "وہاں چنی خالہ بھی ہیں۔ شاید مل جائیں۔ ساجدہ آپا وہی کرتی ہوں گی جو یہاں کرتی تھیں، رسول پور میں۔ پورا پتہ کسی کو نہیں معلوم۔"
تقی ڈوکٹر کا ذکر اس دکاندار نے کیا تھا جس سے تمید نئی راجدھانی جانے سے پہلے چٹنیں خریدتا تھا: "جا رہے ہو؟ جاؤ۔ وہاں چھنو خاں بھی ہے۔ شاید کہیں نظر آجائے۔ اب وہ ڈاکٹر شبیر ہے۔ چھنو خاں نہیں۔"

اسپلانیڈ میں دو راتیں گزارنے کے بعد تمید کو یقین ہوگیا تھا وہ تالاب میں ڈوبنے والوں کی لاشیں تلاش نہیں کر رہا تھا، سمندر کنارے بیٹھا اس انتظار میں تھا کہ وہ میلوں دور ڈوبنے والی کشتی کے مسافروں میں سے کسی کی لاش وہاں لاکر پھینک جائے گا - بشرطیکہ اُسے شارکوں نے نہ کھالیا ہو۔

اور واقعی سمندر نے اس کے سامنے کسی کو لا پٹخا۔ لاش کو نہیں، ایک زندہ انسان کو جو میونسپل کارپوریشن کے مارکیٹ کی خوبصورت پتھر کی عمارت کے سامنے فٹ پاتھ پر دکان سجائے بیٹھا تھا اور اُسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا: "جلو میاں تم! پہنچ گئے؟ آگئے؟ کب آئے؟"
تمید کو بھی اُسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی - پیارے تھا جس کی دکان سے وہ اکثر دودھ

دہی لینے جاتا تھا۔ اس نے تلمیذ کو اپنے پاس دکان کے فرش پر بٹھا لیا جو ایک چھوٹی سی دری تھی، جس میں اغلب یہی تھا وہ اپنا بستر لپیٹے اس شہر میں وارد ہوا ہوگا اور اس وقت جس پر اس کا سامان سجا ہوا تھا: دہی بلونے کی رئی، چھلنی، چمچے، کیتلی اور باورچی خانے کا الم غلم — زیادہ تر المونیم کی سستی چیزیں جن کی اُن دنوں بھرمار تھی۔ جنگ ختم ہوچکی تھی اور ہوائی جہازوں کے ڈھانچے کباڑ میں بکتے تھے جن کا یہ سامان نیا جیون تھا۔ پیارے مشکل سے ایک بات کہہ پاتا تھا کہ کوئی راہ گیر رک کر کسی چیز کا سودا کرنے لگتا تھا۔

اس نے بغیر پوچھے تلمیذ کے لئے لیمونیڈ کی بوتل منگائی، اپنا پتا بتایا، نقلی ڈوکٹر کے ذکر پر ہنسا:

''اس کا کاروبار چل پڑا ہے۔'' پھر اس کا پتہ بتایا۔ ''اب وہ چھنو خاں نہیں ہے، شبیر خاں ہے۔''

یہ ملک اتنا بڑا سمندر نہیں تھا جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔ لوگوں نے جینے کی راہیں پیدا کر لی تھیں۔

''یہاں کاروبار اچھا ہے، وہاں نمنی پور میں مندا تھا۔ تم کیا کرو گے؟''

''ابھی تو رہنے کی جگہ ڈھونڈوں گا۔ پھر سوچوں گا کیا کر سکتا ہوں۔''

''تمہارے رشتے دار کوئی نہیں آئے؟''

''نہ وہ، نہ ملنے والے، نہ دوست۔'' تلمیذ نے بات کو مختصر کرنے کے لئے کہا۔

''ہوں گے، یہیں ہوں گے۔ سب مل جائیں گے۔'' پیارے نے پیغمبرانہ تیقن سے کہا۔

نقلی ڈاکٹر کا اصل نام چھنو خان تھا۔ لیکن تلمیذ کی ڈائری میں وہی نام لکھا تھا جو پیارے نے بتایا تھا۔ شبیر خاں اور اس کے آگے بریکٹ میں چھنو خان۔

ٹرام سے اترنے پر جس اسٹریٹ میں تلمیذ کو جانا تھا اس میں کچھ ہی فاصلے پر سیدھے ہاتھ کو دو پرانی عمارتوں کے درمیان بنی ہوئی ایک نئی عمارت تھی جس پر بجائے بورڈ کے دیوار پر لکھا ہوا تھا: ڈاکٹر شبیر خان اوف نمنی پور۔ اس کے نیچے: ایم۔ ڈی اور ایم ڈی کے بعد

بریکٹ میں .Higher than M.B;B.S ۔یعنی وہ عام ایم ۔بی ۔بی ۔ایس ڈاکٹر نہیں تھے۔ اس سے بڑی کوئی چیز تھے۔ ان کے یہاں مریضوں کا تانتا لگا تھا۔

تمیز کو پہچاننے کے لئے انہوں نے عینک ناک پر درست کی اور اپنی کنپٹی پر شہادت کی انگلی سے دستک دے کر بول اٹھے" ارے میاں تم، حقیقی بھائی کے بیٹے! کب آئے؟ بہن بھائی ساتھ ہیں؟ اور تمہارے تایا ڈاکٹر عزیز الرحمٰن؟"

یہ سن کر کہ اس ملک میں تمیز کے ساتھ اور کوئی نہیں آیا ہے ان کا رکا ہوا سانس باہر نکلا۔ پھر دیر تک مریضوں کو نظر انداز کر کے تمیز سے باتیں کرتے رہے جن میں زیادہ ذکر اپنا بسا ہوا گھر اور جمی ہوئی پریکٹس چھوڑ کر یہاں آنے کی ہمت کر بیٹھنے کا تھا:" سچ پوچھو تو جہاں میں تھا ایک چھوٹا سا تالاب تھا۔ اس میں کوئی تیر کر کہاں تک جا سکتا تھا! یہ جگہ کھلا سمندر ہے جہاں تک جا سکتے ہو، جتنے کی ہمت کرو۔ آ گئے، اچھا کیا۔ چار دن میں جم جاؤ گے۔"

ان کے حکم پر ایک لڑکا جو آنے والے بچوں کو زبردستی ان کے ماں باپ کے پاس سے ملنے نہیں دے رہا تھا چائے کے لیے کھنچ گیا۔

چنی خالہ کا نام سن کر انہوں نے کہا" ضرور وہ کہیں جھگیوں میں رہتی ہوں گی۔ وہ یہاں کہاں آ گئیں! نہ بیٹا ساتھ ہے نہ شوہر۔ وہیں رہتی رہتیں۔ میں انہیں جانتا ہوں، ان کے شوہر رسول پور میں عدالت کے اردلی تھے، میرے والد کے واقفوں میں سے تھے۔ بے وقت مرے۔ خیر، وہاں ان کے مدد کرنے والے تھے یہاں کون ان کی مدد کرے گا۔"

تمیز نے کہا:" ان کی بیٹی اسکول میں پڑھاتی تھی۔ یہاں بھی پڑھاتی ہوگی۔"

چھنو خان نے چونک کر کہا" اسکول میں پڑھاتی ہے! پھر تو مل جائے گی۔ کسی بھی لڑکیوں کے اسکول سے شروع کرو۔ پتہ مل جائے گا۔"

چوتھے دن تیسرے پہر نریمان اسپلینیڈ کے منیجر کے دفتر میں تمیز اپنا سوٹ کیس اور ہولڈول سنبھالے داخل ہوا۔

منیجر نے دیکھتے ہی کہا: ''مل گئی جگہ؟''

تمیز نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سر کو اتنی آہستگی سے جنبش دی جیسے نروان مل گیا ہو۔

''اگر اجازت ہو تو کچھ دیر آپ کے ساتھ بیٹھ کر سگریٹ پینا چاہتا ہوں۔''

''ضرور۔ ضرور۔'' منیجر نے اس کے سگریٹ کیس سے سگریٹ لیتے ہوئے کہا۔

حقیقت میں تمیز کچھ وقت وہاں ضائع کرنا چاہتا تھا کیونکہ جس کنوارے کلرک نے اسے رہائش دی تھی وہ اپنے کمرے میں مغرب کے بعد لوٹتا تھا۔

نئے ملک کے پایۂ تخت میں وارد ہونے کے بعد سے ہونے والے واقعات اور لوگوں کی باتیں اس کے ذہن میں محفوظ رہیں جب نریمان اسپلینیڈ کا منیجر اسے بتا رہا تھا وہ خود کہاں سے آیا تھا یہ جگہ اسے کیسے ملی تھی۔ کتنے دن کے لیے۔ اس کے بیوی بچے جب تک بہتر انتظام ہو ماموں کے ساتھ رہنے اندرون ملک چلے گئے تھے۔

''بچوں کے ماموں یا آپ کی بیوی کے؟'' تمیز نے شرارت سے کہا۔

''بچوں کے۔'' انہوں نے جھینپ کر کہا۔ پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولے ''یہ نوکری بھی عارضی ہے اور جگہ بھی عارضی۔ کبھی تفریح گاہ تھی، خالی پڑی تھی وزیر اعظم کے کہنے پر نریمان جی نے خدا ترسی میں پناہ گزینوں کے عارضی پڑاؤ کے لیے دے دی، دو روپے فی بستر کے ہیں ورنہ سال بھر ہی میں بلڈنگ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی ہے۔ نریمان جی وزیر اعظم کے بلئرڈ اور گولف کے ساتھی ہیں۔ یہ دور گزر جائے اس کی جگہ کچھ اور بنوائیں گے۔ ہوٹل یا بزنس سینٹر۔''

دوسری سگریٹ کے بعد تمیز اٹھ کھڑا ہوا۔

آنے والے دنوں میں راستے ناپتے ہوئے تمیز کو اتنے جانے پہچانے چہرے نظر آتے کہ اُسے شک ہونے لگا شاید وہاں کی ساری دنیا یہاں ڈھل کر آ گئی ہے۔ یہ وہ نوجوان ہے جو نئی راجد ھانی میں اپنے ساتھ ہوکی کھیلتا تھا۔ یہ قاسم ہے جو نینی پور میں ٹٹو پر بیٹھ کر آتا جاتا نظر آتا تھا۔ اس نے پڑھ لکھ کر نہیں دیا تھا، ماں کا چہیتا تھا اور اس کی ماں سب جانتے تھے باپ کی چہیتی دوسری بیوی ہے۔ جہاں چنی خالہ کی جھگی تھی وہ جگہ سارے شہر کے باہر تھی، ایک برساتی ندی کے دوسری طرف جہاں بارشوں میں جانا ناممکن ہوجاتا تھا اور وہاں والے اتنے دن انتظار کرتے کب پانی اترے اور وہ کام پر شہر جاسکیں۔

ساجدہ عمر میں اس سے بڑی نکلی، اپنی ماں کی طرح اس کی رنگت بھی گہری سانولی تھی، نقوش بڑے اچھے تھے اور آواز میٹھی۔۔ اس کی ہر بات میں بڑی بردباری تھی۔ جب جب تمیز وہاں گیا اگر ساجدہ اسکول سے نہیں لوٹی ہوتی تھی وہ خاموشی سے خالہ کے ہاتھ میں پانچ دس کا نوٹ دے دیتا تھا اور وہ بغیر کچھ کہے اُسے تکیے کے نیچے رکھ لیتی تھیں۔

جھگی میں بس ایک ہی چارپائی تھی جس پر دونوں ماں بیٹی سوتی تھیں۔ چارپائی کے نیچے دو جست کے صندوق رکھے تھے، ایک کونے میں ایک اٹھاؤ چولھا تھا جو خالہ نے بنایا تھا، اس کے برابر میں ایک انگیٹھی۔ مٹی لگا کر اُس زنگ کھائی انگیٹھی کے بھاگ جگائے گئے تھے۔

یہاں آنے کے بعد ان چند مہینوں میں دونوں کی کیسے گزر بسر ہوئی اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا، جب تک ساجدہ کو نوکری اس وجہ سے نہیں ملی تھی کہ اس کا اسکول پاس کرنے کا سرٹیفکیٹ ہندی میں تھا اور خود اُسے اردو برائے نام آتی تھی۔ سرٹیفکیٹ کا اردو ترجمہ اور اُردو روانی سے لکھنے پڑھنے کی رکاوٹیں اُس نے باآسانی پار کرلیں اور گھر چلا رہی تھی۔ وہاں اُن دونوں پر کیا بپتا پڑی تھی جو پردیس کو اپنایا، یہ سوال تمیز نہ ماں سے کر سکا نہ بیٹی سے۔

دو مہینے جو تلمیذ نے نئے ملک کے پایہ تخت میں گزارے سخت اور اکتا دینے والے تھے۔ جس کلرک کے ساتھ وہ رہ رہا تھا لگتا تھا زندگی میں پہلی بار ماں باپ سے جدا ہوا ہے۔ اکثر روتا ہوا سوتا تھا اور صبح اٹھ کر کہتا تھا "تین بجے سے جاگ رہا ہوں۔"

اُسے بڑی فکر یہ تھی اماں اس کے فراق میں رو رو کر آدھی ہوگئی ہوں گی۔

"اور تم؟"

وہ تلمیذ کے سوال کو نظر انداز کر کے کہہ چکا تھا "تلمیذ بھائی ایک دن، مہینے کی پہلی تاریخ کو اپنے مادری ملک جانے کا پرمٹ وہاں کے ہائی کمیشن سے جا کر لوں گا اور سالی اس نوکری کو جو یہاں لائی ہے لات مار کر دیکھ لینا یہ جا وہ جا "

"خوش قسمت ہو۔" تلمیذ نے قہقہہ لگا کر کہا کہ "تمہاری مادر بھی ہیں اور مادری ملک بھی۔"

وہ کسی کے دو کمروں کے گورمنٹ کوارٹر میں سے ایک میں کرائے پر رہ رہا تھا۔ اپنے حصے کے نصف کو اس نے تلمیذ کے ہاتھ کرائے پر اٹھا دیا تھا۔

پہلی نوکری جو تلمیذ کو ملی ایک بینک کی تھی، جس کا سارا سیٹ اَپ اُسے تھرڈ کلاس لگا۔ بینک ریجنٹ جس کی مین شاخیں جیسا کہ اندر کا ایک بورڈ بتاتا تھا برمنگھم (انگلینڈ) ایڈی لڈ (آسٹریلیا) اور جوہانس برگ (جنوبی افریقہ) میں تھیں۔ اس کے علاوہ بائیس اور شاخیں مختلف ملکوں میں تھیں۔ تنخواہ بری نہیں تھی، لیکن جس دن تلمیذ کے دماغ نے یہ سراغ لگا لیا کہ بینک کا مالک خود جنرل مینیجر ہے تیسے میں اُسے ساری رات نیند نہیں آئی۔ لگتا تھا جنرل مینیجر نے ساری

دنیا کو نہیں صرف اُسے دھوکا دیا ہے۔

پہلا مہینہ ختم ہونے میں ابھی وقت تھا۔ کچھ دیر وہ اپنی میز پر بیٹھا روزمرہ کے، بند تے کے الفاظ کے خط ناپ کرتا رہا اور جب ضبط کرنا ناممکن ہوگیا تو مینیجر کے کمرے میں داخل ہو کر بغیر کسی تمہید کے بولا: "آج مجھے یہاں کام کرتے ہوئے تین ہفتے ہوئے، میرا حساب صاف کر دیجئے۔"

خزانچی کے کاؤنٹر پر وہ شخص کھڑا تھا جو ابھی چند منٹ پہلے مینیجر سے پوچھ کر گیا تھا کیا بینک remittance (ترسیل زر) کا کام کرتا ہے؟ اُسے اپنے باپ کو رقم بھیجنی تھی۔

مینیجر نے پوچھا "کیوں؟ آپ کو معلوم ہے تنخواہ سب کو پہلی تاریخ کو ملتی ہے۔ مجھے بھی۔"

"آپ اپنے کو جب بھی دیتے ہوں۔ مجھے میری تنخواہ آج چاہیے۔ اس سے پہلے کہ بینک مینیجر نے کہا "ذرا دھیرج سے بات کیجئے۔"

لیکن تمیذ کا اپنے اوپر سے اختیار اٹھتا جا رہا تھا۔ کوئی چھپی ہوئی طاقت اس سے کہہ رہی تھی جو مل سکتا ہے ان clients (گاہکوں) کی موجودگی میں ملے گا۔ الفاظ کا لین دین جو بس آدمی کے قد جتنی اونچی لکڑی کی دیوار اور شیشے کے دروازے کے پیچھے ہو رہا تھا اُسے گاہک اور ملازم سب سن رہے تھے۔

باپ کو رقم بھجوانے والے نے کرنسی سنبھال کر اپنی جیب میں رکھی، دو گاہکوں کے چلتے ہوئے قدم رک گئے۔

"کیا بگڑتا اگر وہ ایک مہینے اور اس بینک میں گزار لیتا۔" کئی دن تمیذ کو یہ خیال ستاتا رہا۔ "پورے مہینے کی تنخواہ لے کر چھوڑتا، دوسری نوکری ملنے تک۔"

دماغ کے دوسرے حصے نے کہا۔ "یا کاروبار میں اس کے شریک بن کر ہزاروں کماتے۔"

'اور ایک دن دونوں جیل میں ہوتے۔'

'کیا برا تھا، وہاں سے نکل کر بجائے ایک اور بینک کھولنے کے دونوں مل کر انشورنس کمپنی کھول لیتے۔

(۲۲)

جمال کو نئے ملک میں جہاں ٹرانسفر کیا گیا تھا وہاں کا ٹرین کا کرایہ ہی اتنا تھا جتنے میں پرانی برٹش راجہ حانی میں تمیز تین دن کے کھانے اور چائے کا خرچ چلاتا تھا، وہ شہر جس کا نام اس سے سن کر پیارے نے کہا تھا ''وہاں کہاں جاتے پھر و گے وہ تو اللہ میاں کے پچھواڑے ہے۔''
یہ محاورہ جسے اس نے اتنے سال بعد سنا تھا دیر تک اُسے ہنساتا رہا۔ پر کیا کیا جاتا وہ کھاڑی پر آباد نئے ملک کے پایہ تخت سے اُوب گیا تھا۔ جہاں کے پڑھے لکھے لوگوں کا، جو وہاں آ کر بس چکے تھے، مرغوب موضوع گفتگو تھا: اس ملک میں حکومت بینک کے انٹریسٹ (منافع) کو سود قرار دے گی یا نہیں؟ اگر نہیں تو پھر ایک اسلامی سلطنت بنانے کی کیا ضرورت تھی!
دوسرا کہتا: اگر ایسا کیا تو بینک ٹھپ ہو جائیں گے، نہ لوگ ان میں پیسہ رکھیں گے، نہ وہ ایسا کاروبار ڈھونڈ سکیں گے جہاں بغیر انٹریسٹ کے کام چلتا ہو۔
دوسرا محبوب موضوع گفتگو تھا: اللہ کو خدا یا گوڈ God کہنا درست ہے یا نہیں؟ ایک رائے یہ تھی اللہ کے تمام نام ال سے شروع ہوتے ہیں۔ العزیز، الجبار، المتکبر، پورے ننانوے نام۔ باقی نام نادرست ہیں۔ مشکل یہ تھی بحث کرنے والے نہ عربی جانتے تھے، نہ عربی پڑھنا چاہتے تھے اور ان بحثوں کے چھڑ جانے پر بس تلوار کھینچنے کی کسر رہ جاتی تھی۔ ایسے ہی ان کے کتنے اور hobby-horses فکر اور گفتگو کے چہیتے موضوع تھے، جو اللہ کے ناموں میں خدا یا گوڈ سننے

کو تیار نہیں تھے وہ اُس کے لیے اللہ میاں سن کر خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے۔

جو تملیذ کی طرح آ کر بس نہیں پائے تھے وہ ہمیشہ بھیڑ میں پسینہ پونچھتے، فکر میں غرق، راستہ چلتے نظر آتے تھے۔ انہوں نے دس دس جگہ نوکری کی درخواستیں دے رکھی تھیں اور ہر جگہ، جہاں نوکری کی امید ہو، دل ہی دل میں دعائیں پڑھتے ہوئے جاتے تھے۔ اُن میں وہ بھی تھے جو فسادات میں گھر گیا، شہر کے شہر اجڑنے پر وہاں سے نکلے تھے اور وہ بھی تھے جو مالی آسودگی کی نئی زندگی کی تمنا میں آئے تھے اور اس خیال سے ڈرتے تھے اب کیا منہ لے کر گھر جائیں گے۔ ان کے شہر اجڑے نہیں تھے لیکن تعصب کے جادوگر نے اپنی چھڑی گھما کر انہیں رہنے کے ناقابل بنا دیا تھا۔

جو حکومت کر رہے تھے لگتا تھا ان کے اپنے الگ محبوب موضوعِ فکر ہیں۔ پہلے بینک نوٹوں، پوسٹل اسٹامپس اور لفافوں پر اگر پایۂ تخت کی کسی تصویر کے نیچے چھپا تھا دارالحکومت — چیف کورٹ یا سینٹرل پارک یا سٹی کورپوریشن کی نئی عمارت تو جلد ہی دارالحکومت پر موٹی سیاہ لکیر پرنٹ کر کے اس کی جگہ دارالخلافہ کر دیا گیا۔ اور یہ عمل کئی بار ہو چکا تھا۔ جیسے پس پردہ حکمرانوں میں رسہ کشی یا کوئی اور کھیل ہو رہا تھا۔

ڈھائی نوکریوں اور سدا مختلف فکروں میں گرفتار، مستقل حرکت میں رہنے والوں کے درمیان دو مہینے کسی طرح کاٹنے کے بعد تملیذ نے فیصلہ کیا جمال کی بات میں وزن ہے۔ 'مجھے جب تک یہاں قدم جمانے کا موقع ملے گا ساری جمع جتھا ختم ہو چکی ہوگی۔ یہاں ہر وقت موت کے فرشتے کے نزدیک ہونے سے اللہ میاں کا پچھواڑا بہتر ہے۔ وہاں موت کا فرشتہ دیر میں پہنچے گا۔'

آدھی آخری نوکری کمیشن کی تھی، شو کمپنی کی جہاں ہفتے کے آخری دن سیل کے حساب

سے پیسے ملتے تھے۔ گاہک کے جوتے اتارنے، اُسے نئے پہنا کر ایڑی کی طرف اندر اُنگلی گھما کر مطمئن کرنا کہ فِٹ ہیں، یہ کام اسے اپنے منصب سے گرا ہوا لگا۔

محمد علی رشتے کے چچا بھی تھے اور ماموں بھی، کیا کیا جاتا خاندان میں اتنی شادیاں آپس میں ہوئی تھیں کہ ہر فرد کا ہر دوسرے فرد سے دوہرا، تہرا رشتہ تھا۔ اُن کی بیوی مر چکی تھیں، اولاد میں صرف جمال تھا جس کے ساتھ تمیز کا کبھی زیادہ عرصہ ساتھ رہنا نہیں ہوا تھا، بس نمنی پور اور نئی راجد ھانی کی ملاقاتیں جب رشتے دار کسی تقریب پر جمع ہوا کرتے تھے اور جہاں جاتے تھے کئی کئی دن رہتے تھے۔ جمال سے تمیز کی رشتے داری سے زیادہ دوستی تھی۔ ایک بار اسلامک یونیورسٹی ٹاؤن بھی وہ اس سے ملنے آیا تھا اور دو دن ہوسٹل میں ٹھہرا تھا۔ ایم۔ اے کے بعد وہ برٹش امپیریل بینک میں لگ گیا تھا اور وہیں سے نئے ملک کے دور ترین اسٹیشن میں بھیجا گیا تھا جن دنوں تمیز رویل ایئر فورس میں تھا اور وہاں مستقل بغاوت کی سی کیفیت تھی اس نے پے بہ پے تین خط جمال کو لکھے تھے کہ امید تو یہ کر رہا تھا انگریز اس ملک میں سدا رہیں گے اور ان کے ساتھ میری نوکری بھی۔ اب لگتا ہے دونوں ہی ختم پر ہیں۔

دوسرے خط میں تھا: اُس اکھڑے پن سے نجات پانے کی آرزو میں تھا جو باپ کا گھر چھوڑنے کے بعد سے میرا مقدر بنی ہوئی ہے۔ جی چاہتا ہے پکی نوکری ہو، اپنا گھر، اپنی فیملی لیکن مجھے نہیں لگتا یہ آرزو پوری ہوگی۔

تیسرے خط کا جواب جمال نے اپنی نئی پوسٹنگ کی جگہ سے دیا تھا: میرے پاس آ جاؤ۔ ساری آرزوئیں پوری ہو جائیں گی۔

تلمیذ کا خط جمال کے آبائی قصبے اور خاندان کے گھیر[1] سے ہوتا ہوا اس تک پہنچا تھا۔ ویسے دونوں خط و کتابت کے چور تھے لیکن ایسے لوگوں کی خط نویسی کا جوہر اس وقت کھلتا ہے جب زندگی کوئی مشکل اکھٹری کرے۔ اگر نئے ملک میں تلمیذ پیر جمانے کے لیے بے تاب تھا تو جمال اُسے اپنے شہر میں پیر جماتے دیکھنے کے۔

"کیا ملک ہے!" ٹرین میں صبح آنکھ کھولنے پر تلمیذ کے دماغ میں پہلا خیال تھا۔ ڈبے کا ہر شخص دھول سے بھوت بنا بیٹھا تھا۔ بھوؤں اور پلکوں تک کو دھول نے نہیں چھوڑا تھا۔ رات جن چہروں کو ٹرین میں سوار ہوتے وقت دیکھا تھا اس وقت پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ جب ٹوئلیٹ میں داخل ہونے کا موقع ملا تو آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ باہر کا منظر کمپارٹمنٹ کے اندر سے زیادہ مختلف نہیں تھا ــ میلوں پیڑ پودے نہیں تھے، ہاں تھیں تو سینہر[2] اور ناگ پھنی جیسی جھاڑیاں۔ نہ جگہ جگہ ندیاں تھیں، نہ اُن پر پانی پیتے ہوئے ہرن اور تیندوے۔ اور کھیتوں کے آس پاس دانہ چگتے ہوئے مور یا تیتر بھی نظر نہیں آتے تھے۔ گھنٹہ گھنٹہ بھر اگلا اسٹیشن نہیں آتا تھا جو آتا تھا تو اطراف کے ویرانے کی طرح ویران۔

دھول سے تنگ آ کر لوگ بھی خاموش تھے۔ ٹوئیلٹ میں پانی ختم ہو چکا تھا کتنی دفعہ جا کر منھ دھوتے۔

لیکن آدھا دن گزرنے کے بعد سین بدلنے لگا اور جمال کے شہر پہنچنے سے پہلے ٹرین کو راستے میں دریا پڑے، نہریں اور کھیت، اس کے بعد کی زمین پتھریلی تھی اور اس میں بھی جگہ جگہ آبادیاں تھیں اور مکئی کی فصل۔

جس شہر میں جمال اور اس کے باپ آ کر بسے تھے لگتا تھا وسط ایشیا کی کوئی ملٹری آؤٹ

---

[1] گھیر: Enclosure محلے کا ایک ٹکڑا جس میں بیچ کی کھلی جگہ کے چاروں طرف ایک ہی خاندان کے افراد کے مکان ہوتے تھے اور باہر کی دنیا سے ملانے کا ایک مشترکہ پھاٹک۔

[2] زقّوم

پوسٹ ہے (military outpost)۔[۱] لوگوں کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، زیادہ تر کی رنگت سرخی لیے ہوئے سفید تھی اور ہاتھ اور پیر اتنے بڑے کہ کسی اور قوم کے اس نے نہیں دیکھے تھے، بعضوں کے سر پر سنہری ابھری ہوئی ٹوپی پر لپٹے ہوئے کلاہ تھے، زیادہ تر کے گرم کپڑے کی ٹوپیاں۔ ایسے لوگ اس نے فلم سٹی کیپیٹل اور پرانی برٹش راجدھانی میں دیکھے تھے— چوکیدار، خشک میوہ فروش اور سنہری ٹوپی پر کلاہ والے جنھوں نے خود کو صرف ایک کام دے رکھا تھا: جنھیں قرض دے رکھا تھا اُن سے سود وصولتے پھرنا— ان کے تعاقب میں رہنا۔ سو وہ ایسے شہر میں تھا جہاں پشتو بھی بولی جاتی تھی، دری (افغانی فارسی) اور اُزبک بھی۔ عورتیں برقعے میں تھیں۔ ایک سرخ گالوں والی سات آٹھ سال کی لڑکی گود میں بکری کے بچے کو سنبھالے ماں کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

محمد علی جتنے خوش تلمیذ کو دیکھ کر ہوئے اتنے مرحوم عتیق الرحمٰن کبھی نہیں ہوئے تھے۔ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ کھڑے ہو کر تلمیذ کو سینے سے لگایا اور مونڈھے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود آرام کرسی پر بیٹھ گئے جو شاید پچیس تیس سال پرانی تھی اور یہیں نیلام میں خریدی گئی ہوگی، ورنہ کیسے اُسے وہ اس ملک میں لائے ہوتے۔

جمال نے کہا: ''آرام سے بیٹھو، ابا سے باتیں کرو، میں بینک جا رہا ہوں۔''

لگتا تھا محمد علی بات کے لیے ترسے ہوئے ہیں، یہاں پہنچنے کا تذکرہ، کون کون پیچھے رہ گیا تھا اور یہ کہ اس شہر میں نہ اُن کا کوئی رشتے دار ہے جمال کے سوا۔ نہ دوست اور ملنے والا۔

''بس جمال کی نوکری یہاں لے آئی۔''

تلمیذ نے کہا: ''پھر تو تنہائی بہت محسوس ہوتی ہوگی۔''

---

[۱] بعید ترین فوجی چوکی۔

بڑے میاں نے آنکھ میچ کر کہا: "بالکل نہیں۔" اور چلم کے کوئلوں پر سے راکھ اڑا کر بولے "سب سے دور رہنے کے اپنے فوائد ہیں، آدمی خاندان والوں کے شکووں سے دور رہتا ہے، دن رات نہ اس تقریب میں جانا پڑتا ہے نہ اُس تقریب میں۔ نہ عیادت کو نہ تعزیت کو، نہ ہر موقعے پر خوشی کے اظہار کے لیے چاہے اپنے کھانے کو نہ ہو، جس کے ہاں جاؤ اُسے تحفے تحائف دے کر آؤ یا کیش! آپ مجھ سے متفق ہیں حضرت تلمیذ الرحمٰن؟"

"جی۔ جی۔ بالکل۔" تلمیذ نے گھبرا کر کہا "مگر سدا کی تنہائی —"

محمد علی ہنس کر بولے: "اُسے دور کرنے کا انتظام جمال کو کرنا ہے۔"

شام کو جمال نے کہا "ہم دونوں ایک دوسرے کی نیت کو جانتے ہیں اور اپنی اپنی ضرورت کو۔" اس وقت وہ باورچی خانے میں سالن تیار کر رہا تھا۔ پھر وہ تلمیذ کو ساتھ لے کر تنور سے روٹی لینے گیا۔ بازار میں وہی ہما ہمی تھی جو وہ ریلوے اسٹیشن سے گھر پہنچنے تک دیکھتا گیا تھا۔ لوگ چلتے میں تھوکتے تھے لیکن بغیر سر موڑے ٹھیک اپنی سیدھ میں۔ اکثر کے منھ سے جو نکلتا تھا وہ سڑک پر گرنے کے بعد سرخ یا سبز مرغیوں کی بیٹ لگتا تھا۔ ایک آدمی اتنی تیزی میں تھا کہ تھوک کو سڑک پر گرنے کا وقت نہیں ملا اور وہ خود اس کی واسکٹ میں سے جھانکتی ہوئی قمیص پر پڑا۔ تلمیذ کو اُلٹی آتی محسوس ہوئی۔

'یہ میں کہاں آ گیا! کیا میں یہاں سیٹل ہو پاؤں گا؟'

گھر پہنچ کر اس نے کہا "یہاں کیا کیا دیکھنا پڑتا ہے!"

جمال نے کہا "پرواہ مت کرو۔ اس سے زیادہ دیکھنا پڑے گا اور اس کے عادی ہو جاؤ گے بُرے لوگ نہیں ہیں۔ آہستہ آہستہ تم پر کھلتے جائیں گے۔ جمعہ کی نماز کے لیے بھی اگر تم جوتے ہاتھ میں تھامے اندر جاؤ گے تو یہ لوگ بُرا مان جاتے ہیں۔"

محمد علی نے کہا "ہاں یہاں مسجد میں جوتے چرانے کی رسم نہیں ہے۔ چاہے کتنے ہی قیمتی ہوں۔"

کچھ دن وقت تیزی سے گزرا، پھر اس کا گزرنا دوبھر ہوگیا۔

بڑے میاں اپنے ساتھ شطرنج کے مہرے اور بساط لے کر آئے تھے، مہرے پرانی طرز کے تھے، تقریباً ایک جیسے بس اونچائی اور اپنے گھیر میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ دن میں کئی کئی بار بازی جمتی، چائے بنتی، حقہ بھی صرف صبح تازہ کیا جاتا کبھی دو وقت، آگ بجھیا جاتی تو بڑے میاں تمکیز سے راکھ جھاڑنے کو کہتے۔ ایک دن انہوں نے تمکیز کو بیزار دیکھ کر حقے کی نال اس کی طرف کردی اور ایک بار پھر چال سوچنے میں ڈوب گئے۔

ایک رات جمال تمکیز کو سینما ہال لے گیا جہاں سارے تماشائی مرد تھے، ایک برقع تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ پبلک پوری توجہ سے فلم دیکھ رہی تھی۔ کوئی اچھا مکالمہ آ جاتا یا ہیرو کے ہیروئن کو اپنے بازوؤں میں جھپٹ لینے کا سین تو اکثر کے منھ سے نکلتا اوئی شاباش۔ پہلے دو گانوں پر خاموشی رہی لیکن تیسرا گانا ناچ کے ساتھ تھا اور تمکیز کو اسٹیج سے چھناکے کی آواز آئی اور یہ چھناکا ناچ کے دوران کئی بار ہوا۔ تمکیز نے حیرت سے جمال کی طرف دیکھا۔ جمال نے کہا: "کچھ نہیں اپنی پسند کا اظہار پیسے پھینک کر کر رہے ہیں۔"

"انہیں اٹھانے کون آ رہا ہے! ناچنے والی آئے گی؟"

"شو ختم ہو جائے پھر دیکھنا۔"

شو ختم ہونے پر ناظرین میں سے بہت سے اسٹیج پر چڑھ کر سکے اٹھانے لگے۔ تمکیز نے کہا: "اس پر لڑائی تو نہیں چھڑ جائے گی؟"

ایک تماش بین نے جس کی کمر کا ناپنا درزی کو دشوار ہوتا ہوگا اور جس کے سرخ گالوں سے لگتا تھا خون نکلنے والا ہے ہنستے ہوئے کہا "واللہ نہیں۔ تم یہاں نیا ہے۔ جس نے جتنے پیسے پھینکے ہیں بس اتنے اٹھائے گا۔ نہ ایک پیسہ کم، نہ ایک پیسہ زیادہ، نہ گیٹ کیپر کے لیے اکنی دونی چھوڑے گا۔"

اور یہی ہوا چند منٹ میں اسٹیج خالی ہوگیا۔

تمکینہ کی درخواستوں کے جواب آنے میں دیر ہو رہی تھی۔ ایک دن جمال نے بینک سے واپس آ کر کہا "لگتا ہے تمہارے لیے کاروبار میں راستہ پیدا ہو رہا ہے۔"

سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ جمال کے کہنے سے تمکینہ نے ایک دکاندار کے پاس نوکری کر لی جو خود چاول اور چینی بیچتا تھا اور چاہتا تھا برف کے کاروبار کو کوئی اور سنبھال لے۔ یعنی تخت پر برف کی سلوں کے پاس بیٹھنا، برف توڑنا، تولنا اور گاہک کے حوالے کرنا۔ رات کو چلتے وقت دکاندار سے حساب ہو جاتا تھا۔

لوگ راہ چلتے ہوئے بھی کچھ کو او پناہ گیر کہہ کر بات کرتے تھے اور تمکینہ سے بھی برف تلواتے ہوئے۔ پہلی رات کھانے سے پہلے تمکینہ نے جمال سے شکوہ کیا "یار یہ کیا بدتمیزی ہے جو آتا ہے وہ پناہ گیر کہہ کر بات کرتا ہے!"

جمال نے کہا "وہ بدتمیزی سے تمہیں پناہ گیر نہیں کہتے ہیں، اس سے بہتر لفظ ان کی ڈکشنری میں نہیں ہے۔ یہ لفظ تمہیں اس وقت بھی سننا پڑے گا جب کسی دفتر یا بینک میں کام مل جائے۔ بلکہ ایک گالی بھی سننے میں ملے گی جسے شکر اللہ کا تم نہیں سمجھ سکو گے۔"

"کیا؟"

"اگر اس میں پہلے 'مورو' کا لفظ آئے تو یاد رکھنا جنگل کے مور کا ذکر ہے، تمہارا نہیں۔"

جمال اور محمد علی پوری کوشش کر رہے تھے بیکاری اور تنہائی سے گھبرا کر تمکینہ ایک دن یہاں سے بھاگ کھڑا نہ ہو۔ جمال کا کہنا تھا "یہاں تم ایک سال گزار لو جس دن نوکری مل گئی سمجھو تمہارا اپنا گھر ہوگا، اپنی فیملی اور یہ لوگ تمہیں عجیب اور اکثر نہیں دلچسپ لگنے لگیں گے۔ ان میں اور عیب ہوں نماز اور روزے کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ روزے میں کسی کو کھاتے یا چائے پیتے دیکھ لیں تو اس کے لیے ان کا ایک ہی فتویٰ ہوتا ہے: کافر کا بچہ، اسلام پر ظلم کرتا

ہے۔ رمضان آرہے ہیں باہر سگریٹ پیتے ہوئے مت نکلنا۔''

اور واقعی وقت گزاری کے لیے تلمیذ کو برف بیچنا بھی برا لگنا بند ہوگیا۔ بازار کی زندگی اپنی علیحدہ دلچسپیاں رکھتی تھی۔ ایک دن کہیں دو آدمیوں میں جھگڑا ہوا۔ پھر گولی چلنے کی آواز آئی۔ دکاندار اپنا کام چھوڑ کر باہر نکل آئے اور اُدھر چل پڑے جدھر سے گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔ ان میں وہ بھی تھے جو اپنی اپنی دکانوں کو بے حفاظت چھوڑ آئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد دو سپاہیوں کے نرغے میں ہتھکڑیاں پہنے ایک آدمی آتا نظر آیا۔ پیچھے پیچھے راہ گیروں اور دکانداروں کا جلوس تھا۔

تلمیذ نے اپنے دکاندار سے جب وہ ہجوم کے ساتھ مجرم کو تھانے پہنچا آیا پوچھا ''کیا ہوا تھا؟''

وہ بہت ہنسا، اور دیر تک ہنستا رہا ''واللہ مت پوچھو۔ مرنے والا پینٹر ہے، ٹرکوں پر تصویریں پینٹ کرتا ہے، پسند کی جرنیلوں اور آکموں کی۔ اس نے کسی کے ٹرک پر جو تصویر پینٹ کی تھی وہ قاتل کا خزا کی ہے۔ اوتم خزا نہیں جانتا، اس کا بیوی کا۔ لوگ سمجھا رہے تھے اس نے نہ تمہارا خزا کا شکل دیکھا ہے نہ اس کا تصویر۔ پر کیسے اس کا تصویر بناتا۔'' وہ ہنسی سے دہرا ہوا جارہا تھا۔ ''اس کا ارادہ گھر جاکر اپنا خزا کو قرآن اٹھوا کر قسم کھلاتا تھا کہ واللہ وہ پینٹر سے کبھی نہیں ملا ہے مگر لوگوں نے اُسے پکڑ لیا اور پر جو ہوا تم نے دیکھ لیا ہے۔''

تلمیذ بھی ہنسنے لگا اور تعجب تھا اس موقعے پر وہ بھی ہنس رہا تھا۔

اس نے دکاندار سے پوچھا ''مور کا پشتو میں کیا مطلب ہے؟''

دکاندار نے بھونچکا ہوکر پوچھا ''کسی نے تمہیں کہا؟''

''نہیں۔ نہیں مجھے نہیں۔''

''او! بڑا برا لفظ بن جاتا ہے، اس کا مطلب ہے ما اور......''

تلمیذ نے کہا ''بس، بس میں سمجھ گیا۔''

کچھ ہی دن بعد دکاندار اُسے فلم دکھانے لے گیا۔ ایک سین میں ایک لڑکی روتے ہوئے اور غصے میں ولن کے سینے پر مکے مار رہی تھی: ''یہ تم نے کیا کیا، اب میں دنیا کو کیا منہ دکھاؤں

گی۔'' کسی نے اگلی صف میں سے اونچی آواز میں کچھ کہا اور وہ جملہ پورے ہال نے قہقہے کے ساتھ دہرایا۔ اس کے پہلے دو لفظ تلمیذ کو یاد رہے: ''چہ دا......''

تلمیذ نے خود کو بے وقوف محسوس کیا۔ اگر یہ لطیفہ تھا اور غم سے لطیفہ بن گیا تھا تو وہ اکیلا اُسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس نے دکاندار سے پوچھا ''کیا ہوا؟''

دکاندار دوبارہ ہنسنے لگا اور جب ہنسی تھمی تو اس نے صف والے کی طرف اشارہ کر کے کہا ''اس نے کہا تھا اگر اجل (حمل) سے اتنا ہی ڈرتا تھا تو بالغ کیوں ہوا تھا۔ واللہ تم نہیں سمجھو گے''۔

تلمیذ کو محاورہ تخلیق کرنے والے کی ذہانت پر رشک ہوا۔ اس محاورے یا گالی میں جو کچھ بھی ہے ضرور شاعری کی کوئی صنعت ہے۔ ''بلند پایہ محاورہ ہے۔'' اس نے دکاندار سے کہا۔

واپس آتے ہوئے دکاندار نے کچھ اور محاورے اُسے اپنی زبان کے سنائے اور ہر ایک پر کہتا رہا ''یہ اور بلند پایہ ہے۔''

جمال کئی دفعہ کہہ چکا تھا ''اس شہر میں لاکھوں آدمی ہوتے ہوئے بھی تنہائی محسوس کرتے ہو گے۔ اپنی زبان کم ہی سننے میں آتی ہے۔ ہر طرف پشتو ہی پشتو ہے، یا تھوڑی بہت دری اور ازبیک۔ لگتا ہے ہم کابل میں بیٹھے ہیں۔'' ایک موقعے پر وہ کہہ چکا تھا: ''ہمارے رشتے دار بھی عجیب نکلے۔ دنیا ادھر ڈھل آئی وہ وہیں کے وہیں پڑے ہیں۔ نہ جنبہ گل محمد۔'' پھر اسے ہنسی آ گئی۔

تلمیذ نے کہا ''کیا ہوا؟ تم بھی یہاں والے بن گئے ہو۔ سنجیدگی سے بات کر رہے تھے، اچانک ہنسنے لگے۔''

جمال نے کہا ''دنیا کی بھی عجیب ساخت ہے پناہ گیر اُدھر سے اِدھر آ رہے ہیں اور اِدھر سے اُدھر جا بھی رہے ہیں اور یہ ہے بھی صحیح اِدھر آنے والوں کو وہاں عافیت نظر نہیں آئی، یہاں آ گئے۔

ادھر والوں نے یہاں اپنی عافیت محسوس نہیں کی Went the other way ۔لیکن اُن کو کیا کہو گے جو یہاں اکثریت میں تھے اور وہاں گئے، جو وہاں اکثریت میں تھے یہاں پہنچے۔''

تمکینہ نے کہا ''کس کی بات کر رہے ہو؟''

''یہاں کے سنہری کالاؤ اور واسکٹ والے اپنے قرضداروں کے تعاقب میں وہاں گھوم رہے ہیں خاص طور سے اُن کے جو نیم انگریز ہیں اور برطانیہ، اوسٹریلیا مع قرضے کے نکل جانا چاہتے تھے۔ آج ہی میری ایک سود پر قرضہ دینے والے سے ملاقات ہوئی وہ اپنے کاروبار کو وہاں finalize[1] کر کے آیا ہے۔''

''کیسے؟ قرضدار کو قانون کے حوالے کر کے۔''

''اس سے بہتر طریقے سے۔ اس نے کیس کو ایک یہی same کاروبار کرنے والے سکھ کے ہاتھ بیچ دیا۔''

''اور وہاں سے کون اکثریتی ادھر آرہے ہیں۔''

''وہ ذرا نازک معاملہ ہے اور بہت کم۔ مثلاً ایک ہندو دھوبن نے مسلمان بچے لے کر پالا تھا۔ اُسے وہاں کام نہیں مل رہا تھا، پالنے والی ماں نے کہا 'جہاں تو وہاں میں' دونوں ادھر آگئے۔ پھر برادری والے، کم حیثیت لوگ۔ ان کے لیے نہ وہاں ملک کی تقسیم ہوئی نہ یہاں۔''

تمکینہ کے قدم اُس وسط ایشیا کے دورترین پڑاؤ میں جمتے جارہے تھے کہ حالات نے اس کے خلاف سازش کی، رمضان آپہنچا، گرمی سخت پڑ رہی تھی پانچواں روزہ تھا کہ دکاندار نے رازدارانہ اس سے کہا ''برادر تمکینہ یہی زمانہ پیسہ بنانے کا ہے۔''

''کیسے؟''

---

[1] نپٹ فیصلہ

''برف کی مانگ شام کو بڑھ جاتی ہے، سپلائی بہت کم ہے۔ ریٹ ڈبل کر دو۔''

تمیز کو پینٹر کا حشر یاد آ گیا: ''اگر کسی نے پستول یا روالور نکال لیا تو!''

''فکر نہیں'' اس نے خوش ہو کر کہا۔ ''اپنے پاس تھری ناٹ تھری ہے۔''

لوگ اسی ریٹ پر برف لینے لگے۔ کوئی کوئی کہہ بیٹھتا تھا: ''کاپر کا بچہ، بلیک کرتا ہے روزہ داروں سے۔''

دو دن ہی اس چمکتے ہوئے کاروبار کو ہوئے تھے کہ ایک پولیس کانسٹیبل افطار سے پہلے جب روزے کے توڑ کا وقت تھا آ پہنچا۔ اس نے پوچھا ''کیا حساب دیتا ہے برف؟''

تمیز نے جھوٹ سے کام لے کر اصل نرخ بتایا۔

جو برف خرید رہے تھے انہوں نے ایک ساتھ کہا: جھوٹ بولتا ہے۔

معاملے کی نزاکت کو سمجھ کر دکاندار کونسٹیبل کے نزدیک آ گیا، تمیز گاہکوں کو بے سوچے سمجھے برف دیتا رہا۔ لگتا تھا دکاندار اور کونسٹیبل اپنی زبان میں اس کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں دونوں کی بات کا ایک بھی لفظ وہ نہیں سمجھ پا رہا تھا جو اس نے عذر میں کہنا چاہا اُسے کہتے ہوئے بھی پولیس والے نے سمجھنے سے انکار کر دیا اور جو تمیز دکاندار سے کہہ رہا تھا اس کے جواب میں وہ صرف سنگا؟ سنگا؟[۱] کر رہا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

تمیز کو اتنا خوف زندگی میں پہلے کبھی نہیں لگا تھا۔ پولس والے کے اشارے پر وہ اس کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ رُخ تھانے کا ہے یہ اندازہ کوئی موٹی عقل والا بھی کر لیتا۔

دکاندار اس کی جگہ کھڑا ہو کر گاہکوں کو برف تول کر دینے لگا۔ انہیں نہ اس کی تول پر اعتراض تھا نہ قیمت پر۔

ایک تنگ جگہ کی بھیڑ میں سے گزرتے ہوئے آزاد رہنے کے پہلے ہی خیال پر تمیز نے کونسٹیبل کو برابر سے گزرتے ہوئے سائکل سوار پر وحشیانہ طاقت سے دھکا دیا اور بغیر دیکھے ہوئے کون کس سے کیا کر رہا تھا وہاں سے بھاگ نکلا۔

---

[۱] کیا؟ کیا؟

رشتے کے چچا کے گھر جانا فضول تھا۔ اگر پولس والا دکاندار سے پوچھنے گیا تو وہ گھر کا پتہ بتانے میں تامل نہیں کرے گا کیونکہ اسی میں اس کے چینی بلیک سے بیچنے کا جرم چھپ سکتا تھا، اُس کی بھی قلت تھی اور رمضان میں اس کی مانگ زیادہ تھی۔

(۲۳)

تیسرے دن بغیر کسی سامان کے تملیذ اپنی خالہ زاد بہن روشن آرا کے گھر پہنچا جنہوں نے کئی دن بعد بتایا ''تملیذ جس وقت تم یہاں آئے ہو میں تمہیں دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ چہرے کا وہ عالم تھا کہ لگتا تھا جیل سے بھاگے ہوئے ہو۔''

اس وقت تک نئے ملک میں نہ ٹرینوں کا نظام پوری طرح ٹھیک ہوا تھا نہ ریلوے اسٹیشنوں کا۔ وہ وقت جاچکا تھا جب اَن گنت لوگ پہلا گھر پلیٹ فورم کو بناتے تھے جب تک کہیں اور ٹھہرنے کی جگہ نہ مل جائے۔ ان گنت اپنے گھر، قریوں اور گراموں کو چھوڑ کر مناسب ٹرین ملنے کی امید میں کئی کئی دن پہلے سے آ کر پلیٹ فورم پر پڑ رہتے تھے کیونکہ فسادوں میں صرف انسان ہی نہیں مارے گئے تھے ریلوے انجن اور ڈبے تک انسانوں نے توڑے اور جلائے تھے۔ اُن کی جگہ نئے انجنوں اور ریل کے ڈبوں نے فوراً ہی نہیں لے لی تھی۔ لیکن رش کا وہی عالم ابھی تک تھا نہ ٹرین میں اس کا ٹکٹ چیک کیا گیا نہ اسٹیشن سے باہر نکلتے وقت۔

یہ دنیا ہی دوسری تھی۔ آبادی میں جس راجدھانی کو چھوڑ کر اسلامک یونیورسٹی ٹاؤن گیا تھا اتنی ہی، پر جگہ جگہ سے اُجڑی اور جلائی ہوئی۔

زندگی میں شاید پہلی بار تملیذ نے بہتری اسی میں سمجھی کہ سب کچھ بہن اور بہنوئی کو بتا دے۔ پہلا کام جو بہنوئی نے کیا وہ یہ تھا کہ اُسے اپنا شیونگ برش، صابن اور ریزر دیا اور

مشترکہ باتھ روم دکھاتے ہوئے کہا" پہلے اپنی آپا سے تولیہ لو، میرا کرتا پجامہ اور آدم زاد بن کر آؤ، پھر بات کریں گے۔"

ساری زندگی تمکید اُن دونوں کے خلوص کو نہیں بھول سکا ــــ روشن آرا آپا اور تہذیب بھائی جو صرف بہنوئی نہیں تھے، پرنانی کی اولاد میں سے کچھ اور بھی لگتے تھے، کولج میں پڑھاتے تھے اور وہاں سید صاحب کے نام سے پہچانے جاتے تھے۔ اُن کے کولج میں بھی تمکید کے لیے جگہ نکل آتی اگر اس نے ایم۔اے یا ایم۔ایس۔سی کیا ہوتا۔ بی۔ایس۔سی سے بھی کام چل جاتا: کسی نہ کسی کولج میں لیبورٹری انچارج لگ جاتا۔ بعد میں وہ عارضی ملازمت گورمنٹ کی پنشن ایبل نوکری میں بدل جاتی:

"خیر تم آرام سے رہو، بچوں سے دل بہلاؤ، اپنی آپا سے یہاں کے قصّے کہانیاں سنو، اخبار پر نظر رکھو۔ میں بھی کوشش کروں گا، تم بھی کوشش کرو۔"

روشن آرا نے کہا" میری خواہش ہے یہیں آباد ہو جاؤ۔ کوئی تو اپنا ہو اس پردیس میں۔"

تہذیب بھائی نے کہا" کوئی تو! گویا بچے اور میں تمہارا نہیں ہوں۔ اتنی ناشکری!"

روشن آرا آپا نے بغیر جھینپے کہا" یہ ان کا ٹیپ کا بند ہوتا ہے۔"

"ان کے ٹیپ کے بند کا جواب ٹیپ کا بند۔"

جب سید تہذیب احمد اور روشن آرا کو مع ان کی دونوں بیٹیوں کے ایک سال پہلے تاریخ نے بغیر پوچھے یہاں پہنچا دیا تھا اس شہر کا عجیب ہی حال تھا۔ پہلے کا تاریخی شہر جو صدی کی تیسری دہائی میں ملک کا فلم سینٹر بھی بن گیا تھا وہاں والوں کا کہنا تھا پہلے فیشن میں مشرق کا پیرس کہلاتا تھا۔ اور وہ بھی تھے جو کہتے تھے: اس کی رونق ہندوؤں اور سکھوں کے دم سے تھی، وہ گئے تو اپنے ساتھ یہاں کی رونق بھی لے گئے۔ ان کی جگہ اپنا ملک، اپنے شہر تیاگ کر آنے والوں نے لے لی ہے جنہیں صحیح کپڑے پہننا بھی نہیں آتا ہے۔ بدرنگ، بے جوڑ کپڑے، وہ خوبصورت لباس اور میک اپ والی ہستیاں کہاں چلی گئیں جو پاس سے گزر جائیں تو مہک آتی تھی۔

''مجنوں اور فرہاد رہ گئے ہیں، لیلائیں اور شیرینیاں کوچ کر گئیں۔''

روشن آرا کے منھ سے تکمیذ کی موجودگی میں پہلی بار سن کر تہذیب بھائی نے کہا ''یہ ان کا ٹیپ کا بند ہے۔''

شہر کی یہ تفصیل تہذیب بھائی نے سنائی تھی اور وہ ہی اُسے شہر کے جلے ہوئے حصّے دکھانے لے گئے تھے۔

''ہم جب آئے تھے یہاں اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی concourse[۱] میں زمین پر زندہ اور مردہ آدمیوں کی قطاریں لگی تھیں۔ ہر طرف سے بو ہی بو اٹھتی تھی، مرنے سڑنے والوں اور ان بے چاروں کے فضلے کی۔ اسٹیشن اگر جانا پڑے تو اُن لاشوں میں سے ہو کر جانا پڑتا تھا، کچھ کو پھلانگ کر۔ جب گھر میں، یعنی اسی ایک کمرے میں، میں نے کھانا پکانا شروع کیا تو جو بچ رہتا تھا وہیں بھجوا دیتی تھی، جاڑے تھے رکھنے سے خراب نہیں ہوتا لیکن جی نہیں چاہتا تھا اگلے دن کے لیے بچا کر رکھوں۔''

اور بھی کتنے ہی قصّے تھے جو تکمیذ نے سُنے۔ ایک طرف اگر لوگ بورڈر کے دونوں طرف اپنے مرنے والوں اور کھو جانے والوں کو نہیں بھولے تھے اور صحیح کام نہ ڈھونڈ پانے کی وجہ سے لگتا تھا نیم فاقے کی حالت میں ہیں تو دوسری طرف چینی اور آٹا کھلے عام ٹھیلوں پر بک رہا تھا، جب کہ دونوں پر گورمنٹ کنٹرول تھا اور راشن کارڈ سے ملتے تھے۔ بیچنے والے وہ تھے جنہیں اُن گھروں میں جن پر انہیں قبضہ ملا تھا چھوڑ کر جانے والوں کا اسٹوک ملا تھا۔ گھی، چاول، چائے اور کپڑا — کتنی ہی چیزیں ان گھروں میں انہوں نے پائی تھیں، وہ اسے اپنی خوش نصیبی کہتے تھے اور اس سے پہلے کہ بدنصیبی اپنا چہرہ دکھائے وہ اُسے جلد از جلد بیچ کر کہیں اور نکل جانا چاہتے تھے۔

''سرحد پار ایک آدمی جو پنساری تھا اُسے نئے شہر میں بکریوں، بھیڑوں اور دنبوں کا گلا ملا۔ اُسے قصائی بننے میں ہکی محسوس نہیں ہوئی: آدھی قیمت پر گوشت بیچنے لگا اور اس سے پہلے کہ

---

۱ ریلوے اسٹیشن کے باہر کا کھلا ہوا پختہ صحن جیسا علاقہ۔

مقامی قصائی اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے کہ کیوں مارکیٹ خراب کر رہا ہے، پبلک ہیلتھ ڈپارٹمنٹ سو رہا تھا، وہ سارے جانور لوگوں کو کھلا کر کہیں اور نکل گیا۔'' یہ واقعہ تہذیب بھائی نے سنایا تھا۔

روشن آرا آپا نے کہا ''میں نے کہہ دیا تھا ہم اس کے ہاں کا گوشت نہیں لیں گے، نجانے کس جانور کا ہو۔''

''اور یہ بھی کہا تھا 'مرے گھرے کا'۔''

وہ جھینپ گئیں۔

''میرا ایک واقف تھا، مٹھائی بنانے، بیچنے والا۔ یہاں ملک چھوڑ کر جانے والے کا جو مکان اسے کھول کر دیا گیا اس میں ایمپول میں ڈسٹلڈ واٹر بھرنے کی مشین اُسے ملی۔ آدمی ہوشیار تھا بے شرمی دیکھو خود مجھے بتا رہا تھا 'پہلے جو ڈسٹلڈ واٹر تھا ایمپولوں میں بھر بھر کے دوا فروشوں کو پہنچایا پھر جو ایمپول بچ رہے تھے ان میں نل کا پانی بھر کے۔ جو دوا فروش مجھ سے ایمپول لے رہے تھے انہیں مال ستا مل رہا تھا خوش تھے۔ پھر مشین کو بیچ کر جو پیسہ ملا اس سے اپنے خاندانی دھندے میں لگ گیا۔ زیادہ کی ہوس نہیں کی کہ جعلی دوائیں بنانے لگتا اور اب، اپنے کام میں برکت ہے'۔''

جنگِ عظیم کے بعد کا وہ دور لوگوں کو سالوں بعد تک یاد آتا رہا۔ بہتوں نے چاہا ایسی جنگیں ہوتی رہیں۔ بلا سے لوگ اُن میں مارے گئے تھے لیکن زیادہ تر غریب اپنی قسمت بدل کر گھر لوٹے تھے۔ آ کر قرضے چکائے، گھر بنوائے۔ لوگوں کے جسموں پر اچھا کپڑا نظر آتا جو لاکھ پیراشوٹ کا ہو دیکھنے میں سلک لگتا تھا۔ لوگ فوجی راشن کِٹ سے بھی خوش تھے – چائے کی پڑیا، سوکھا دودھ، اور انڈے کا پاؤڈر – ایسا کھانا شہروں کے اُن لوگوں کو جنت کا تحفہ لگتا تھا جو صبح روٹی چائے سے کھا کر کام پر جاتے تھے۔ مگر یہ تحفہ من وسلویٰ کی طرح جلد ختم ہوگیا۔

تمکین بتا چکا تھا: یہ چیزیں وہ پرانی برٹش راجدھانی سے نئی پور لے گیا تھا۔ ان لوگوں کے لیے نئی تھیں۔

Scanned with CamScanner

خود تہذیب بھائی کینیڈا سے آنے والی ملائم لکڑی کی پینسلوں ہی سے خوش تھے ورنہ پورے چھ سال وہ پینسلیں استعمال کی تھیں جن کا بنانا دشوار ہوتا تھا، سیسہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا اور لکڑی میں جھوسڑے پڑ جاتے تھے۔ سخت ترین لکڑی سے بنائی ہوئی۔ اب کاغذ بھی اچھا ملنے لگا ہے، رنگین پینسلیں اور ربر بھی۔'' جنگ اور چھ سال چل جاتی ہم سب غاروں کے دور میں پہنچ جاتے۔''

ایک دن وہ بولے ''سمجھ میں نہیں آتا یہ کیسا دور ہے۔ جنگ اور فسادات دو بڑی تباہیوں سے لوگ گزرے ہیں لیکن لگتا ہے دونوں میں سے ایک سے بھی انہوں نے کچھ نہیں سیکھا، لٹے ہیں اور دوسروں کو لوٹ رہے ہیں۔'' دیر تک وہ اس پیتا کا ذکر کرتے رہے جس نے تھوڑے ہی وقت میں لوگوں کی زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ ان کا سوچنے کا طریقہ بدل گیا تھا۔
''لگتا ہے وہ ٹمس پیر بننا بند ہو چکا ہے جس پر ٹیسٹ کیا جاسکے، ایلگی اور ایسڈ کی طرح، یہ خواہش یہ فعل نیک ہے، یہ خواہش یہ فعل بد۔'' پھر انہوں نے سوئی ہوئی بچیوں کی طرف دیکھ کر کہا ''ہم نے اپنے بڑوں سے جو تمیز سیکھی تھی کیا اچھا ہے کیا برا، کسی قسم کی نمائش درست پہناوا نہیں ہے، سادگی میں سکھ چین ہے، دولت کے پیچھے دوڑنا اوچھا پن ہے، ایثار بڑی چیز ہے۔ ویسی زندگی اس تیزی سے مٹ رہی ہے کہ یہ سوچ کر خوف آتا ہے انہیں بڑے ہونے پر کیسی زندگی ملے گی؟''
''مکیا چونوں کی۔'' روشن آرا آپا بولیں۔

تین ماہ بعد تلمیذ نے خود کو برطانوی پروٹیکوریٹ [۱] ع میں پایا۔ لیکن اس راز سے اس نے نہ بہن کو آگاہ کیا نہ دوست جیسے بہنوئی کو کہ اس کے جس نوکری کے پانے پر وہ اتنے خوش ہیں۔ اس کے لیے اس کا نیا نام تبریز ہے۔

---

[۱] برطانیہ کے زیر تحفظ دوسرے ملک کا علاقہ British Protectorate

(۲۴)

پھر ایک دن وہ آیا جب تمیذ، جرنلسٹ غیور کے ساتھ تیسرے پہر ایک بار میں بیٹھا بیئر پی رہا تھا۔ بائیں طرف کی قد آدم کھڑکیاں اُدھر کھلتی تھیں جدھر سمندر تھا، گلف یعنی خلیج ع کا ایک حصہ، اپنی وسعت میں بہت بڑی گھوڑے کی نعل۔

دونوں کئی بوتلیں خالی کر چکے تھے اور دونوں کے دماغ بھی باتوں سے خالی ہو چکے تھے۔ ایک بڑا جہاز آہستہ آہستہ لیگون میں داخل ہو رہا تھا، موٹر بوٹس، ٹھیرے ہوئے جہازوں اور کنارے کے درمیان آ جا رہی تھیں۔ بجھ پر یونین جیک ہوا کے تھمے ہونے سے بجائے لہرانے کے جھول رہا تھا۔ ذرا اچک کر دیکھنے سے نیچے کی چوڑی سڑک دیکھی جا سکتی تھی اور اس کا ٹریفک۔ یہ سڑک ایک پہاڑی میں کاٹ کر بنائے ہوئے درے سے ہوکر اسٹیمر پوائنٹ کو ع توائی سے ملاتی تھی — تقریباً دو مختلف دنیائیں: اسٹیمر پوائنٹ وہ جتنا بھی تھا موڈرن دنیا، توائی عربوں کی چھوٹی چھوٹی دکانوں کی دنیا جہاں چیزیں اسٹیمر پوائنٹ کی نسبت سستی تھیں۔ اور اگر اس سے بھی سستی وہی چیز چاہیے ہو تو دکانوں کے باہر فٹ پاتھ پر خریدی جا سکتی تھی، ایک سو پچیس شلنگ کی چیز مول تول کر کے بیس پچیس میں بھی مل جاتی اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا وہ یورپ یا امریکا کی بنی ہوئی نہیں ہے۔

جرنلسٹ غیور نے بوتل کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر گلاس میں آخری قطرے ٹپکاتے

ہوئے اُسے ایسی حرکت دی جیسے نچوڑ رہا ہو، اور اٹھتے ہوئے بولا ''تو تبریز اگر کام نہیں بن رہا ہے تو اور کچھ کرو۔ لیکن نوکری مت چھوڑنا۔ دوسرا کام اس کے ساتھ چلے گا۔ جیسے میں کر رہا ہوں۔ ٹلمور یاز اچھی فرم ہے، چپکے رہو۔'' اس نے ہاتھ سے ہلکا سا اشارہ فی امان اللہ کا کیا اور چل پڑا۔ حالانکہ اس کا خدا سے مطلق رشتہ نہیں تھا۔

تلمیذ نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے غیور کو زینہ اترتے ہوئے دیکھا اور جب ویٹر آیا تو ایک پلیٹ جھینگے اور وسکی کے لیے کہا۔ اس کا ارادہ ابھی چار بجے تک یہیں بیٹھنے کا تھا۔ اس کے بعد وہ ہوگا اور ٹلمور یاز کا میوزک ہاؤس۔ رات دس بجے تک۔

ایک بڑا جہاز alongside ہوا تھا یعنی کنارے لگا تھا، دوسرا لیگون میں داخل ہو رہا تھا۔ اُن کے مسافروں کا رخ، خاص طور سے وہ جو یورپ والے ہوں اور پیسے والے ہندوستانی، ادھر اُدھر گھوم کر بالآخر ٹلمور یاز کی طرف ہوگا: پیانو، وائیولن، ریڈیوگرام، ریڈیو اور ۷۸ آر۔ پی۔ ایم میوزک ڈسکس کا اتنا بڑا کلیکشن کہیں اور نہیں تھا۔ تمام آنے والے یہ امید لے کر آتے تھے ہر چیز جو ڈیوٹی فری خ میں ملتی ہے ایسی ہے جیسے مفت مل رہی ہو۔ ٹلمور یاز سے خریدنے میں یہ فائدہ تھا چیز نقلی نہیں ہوگی اور جس قیمت پر آج ملے گی اتنی ہی پر مہینہ پہلے ان کا کوئی واقف خرید کر لے گیا تھا، اور کل بھی اتنے ہی کی ہوگی — دس پندرہ شلنگ ادھر یا اُدھر۔

بوڑھا ڈیسینٹ ٹلمور یا تبریز سے اتنا خوش تھا جیسے اس کا اپنا بیٹا ہو: ادب سے بات کرتا ہے، انگریزی اچھی بولتا ہے گاہکوں کو شیشے میں اتارنا جانتا ہے۔ اور وقت کا پابند ہے۔ اس سے زیادہ کوئی اپنے ملازم سے کیا توقع کر سکتا ہے! جب کوئی میوزک رکارڈ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اور تبریز اس کے سامنے کہیں ہو تو ڈکرا[1] کہہ کر آواز دیتا تھا اور جب وہ نزدیک آجائے تو گاہک کو اس کے سپرد کر دیتا تھا: ''بیٹا اسے سنبھال۔''

دو سال تلمیذ نے گورمنٹ کی نوکری کی جس کے لیے اسے بھرتی کیا گیا تھا۔ جب دوسرے وہاں سے نکلنے کی تیاری کرنے لگے تو اس نے بھی استعفیٰ دے دیا کہ مزید نوکری کا

---

[1] بیٹا، لڑکا۔

ارادہ نہیں ہے اور بلمو ریاز کے یہاں آ گیا جہاں تنخواہ بھی پہلے سے بہتر تھی اور اپنی پسند کے گانے بھی دل چاہنے پر سن سکتا تھا۔

بلیک مارکیٹ کی دنیا سے بھاگ کر تلمیذ کے سینگ اس دنیا میں سمائے تھے، عرب دنیا کا حصہ، برطانوی عملداری میں — اس لیے پُرامن تھا۔ کیا ہوا اگر پہاڑیاں سبزے سے خالی تھیں اور دھوپ میں تپتی تھیں، زیادہ زندگی نہیں تھی لیکن جتنی تھی غنیمت تھی۔ کھانا پینا، رہنا سہنا سستا تھا۔ چند سال اگر ٹک جائے تو کتنے ہی جنوبی ایشیا والوں کی طرح اس کی بھی اپنی دکان ہوگی، چوڑی سڑک کے اس طرف جدھر سمندر تھا اور کئی لکڑی کی بنائی ہوئی عارضی دکانیں۔ پھر وہ اس فلیٹ کے کمرے کو چھوڑ کر جس میں ایک گجراتی مسلمان کے ساتھ رہ رہا تھا، علیحدہ کشادہ فلیٹ لے لے گا یا عربوں کے علاقے میں دو کمروں کا مکان۔ اس کے بعد بس ایک ہی کام کرنے کا رہ جائے گا — اس مکان کو آباد کرنا۔' اور اگر عرب گھرانے میں شادی ہو جائے تو یہ دربدری ختم ہو جائے۔ تسنیم نہیں ملی تو کیا اس کا سوگ ساری زندگی مناؤں گا۔' پھر خود ہی ہنس پڑتا تھا: ''میں کب تسنیم کے سوگ میں ہوں! کھاتا ہوں، سوتا ہوں، صاف کپڑے پہنتا ہوں، ریگستان پاس ہے، کب اس کی خاک چھان رہا ہوں۔ بس ایک لڑکی تھی — جیسے کُسم۔''

'لیکن اُن دو میں اور بعد میں زندگی میں آنے والی لڑکیوں عورتوں میں بڑا فرق تھا۔ تسنیم اور کُسم کے بارے میں کس دن ویسے خیال آئے تھے جیسے باقی سب کے لیے۔ نہ ان باقی سب میں سے کسی کی بھی واضح شکل ذہن میں رہ گئی ہے۔'

لیکن اُن دنوں جب اُس نے خود میں اور اس اجنبی ماحول میں مطابقت محسوس کرنی شروع کی تھی، گھر کے لیے اگر تھوڑا بہت ہڑکا بھی تھا تو وہ ختم ہو چکا تھا، اس کی ملاقات غیور سے ہوئی۔ ہر طرح سے ایک آزاد مرد جو نفسانی خواہشات کی بلند لہروں کی بھی بلند ترین چوٹی پر

تیرنے کا عادی تھا۔ وسکی کی بڑی پوری بوتل ختم کر کے بھی وہ کرایے پر حاصل کی ہوئی عورت سے اس کی اُجرت کی ایک ایک پائی وصول کرسکتا تھا۔ یہاں اس نے ایک برٹش فرم میں ملازمت کرلی تھی اور برطانیہ جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جب بھی کچھ جمع جتھا ہوجائے۔ برطانیہ دوسری جنگ کے بعد اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کررہا تھا اور اپنی سابقہ کولونیز سے کام کرنے والوں کو دونوں بازو کھول کرخوش آمدید کررہا تھا۔ مگر غیور چاہتا تھا بجائے کسی مل میں کام کرنے کے کسی اخبار کی نوکری ملے تو وہ ع کو خیر باد کہے۔ اُس کے لیے ع میں کچھ نہیں تھا۔ نشے کی پتیاں چباتے ہوئے عرب، ذرا شہر سے نکلو اونٹوں کی مینگنیاں، نہ سینما ہال تھے، نہ تھیٹر، نہ کیبرے ڈانسرز والے شراب گھر۔ وہ بھی کسی کے ساتھ ایک کمرے میں رہ رہا تھا۔

اپنا ملک کیوں چھوڑا تھا، یہ اس نے تمکینہ کو نہیں بتایا تھا۔ بس اتنا اندازہ تمکینہ کرسکا تقسیم ملک کے بعد اُس کا تعلق نئے ملک کے پایۂ تخت کے کسی اخبار سے تھا اور وہاں ایسے فیچر لکھتا تھا کہ جس کے بارے میں فیچر ہو اس کا مستقبل بنا بھی سکتے تھے، لیکن زیادہ تر اس کے برعکس ہوتے تھے۔ آمدنی اتنی تھی کہ اپنے تمام شوق پورے کرسکتا تھا، جو کماتا تھا اپنی ذات پر خرچ کرتا تھا، کوئی اس میں شریک نہیں تھا۔ پھر وہ ایک ڈپٹی کمشنر کے پیچھے پڑ گیا جس کا بھائی نئے ملک میں سیاسی سیڑھیاں تیزی سے چڑھ رہا تھا۔

''پھر وہاں سے یہاں آ گیا۔ وہاں نہ گورنمنٹ افسروں کے بارے میں کھل کر لکھا جاسکتا ہے، نہ سیاست دانوں کے۔ سب اُس حمام میں ننگے ہیں۔'' آخری بات اس کا ٹیپ کا بند تھا۔

لیکن شیخ باسط کو جس کے ساتھ تمکینہ رہ رہا تھا اس سے زیادہ کچھ کا پتہ تھا: ''وہاں سے غائب ہوا اور یہاں پہنچ گیا۔''

خیر غیور جیسا بھی ہو تمکینہ کو اس کے کردار میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ایک دن ساتھ پیتے ہوئے کہا تھا: ''تبریز تمہارا گھر بنا کے رہنے کا خیال اچھا ہے لیکن اتنی ہی آمدنی اگر رہی، ڈیسونٹ بلمور یا تمہیں کیا دیتا ہے؟ برطانوی شلنگ بارہ سو۔ پانچ سال میں بڑھا کر کتنا دینے لگے گا؟ چوبیس سو! تو مائی ڈیئر اتنے میں خانہ آبادی نہیں ہوسکے گی۔ دوسرا کام ڈھونڈنا پڑے گا

تب جا کر سال ڈیڑھ سال میں گھر لے سکو گے اور اس میں لا کر اپنی پیراگون اوف بیوٹی کو بٹھاتا۔"

یہ ٹرم اس نے تمیز کے منھ سے سُنی تھی۔ تایا کی لڑکی پیراگون اوف بیوٹی تھی، راجیشوری دیال کی بہن پیراگون اوف بیوٹی تھی۔ اور ملک کے جنوب کی ایک ریاست کی دلارا: "She too was a paragon of beauty" یہ تفصیل غیور کو تمیز کے ساتھ پیتے ہوئے ملی تھی۔ مشکل یہ تھی جرنلسٹ پوری بوتل وائٹ ہورس کی پی کر بھی نہیں بہکتا تھا اور اگر پکڑا جاتا تو بھی پولس اس سے معلوم نہیں کر پاتی سونا ٹ سے باہر بھیجنے میں وہ شریک تھا یا نہیں اور کون کون اس کے ساتھی تھے۔
"Tabrez think about it my dear۔ یہ شہر یا بندرگاہ جو بھی اسے کہو، اس میں جو بھی تم دیکھتے ہو: سوکھتے ہوئے سمندری نمک کے کھیت، سوکھی پہاڑیاں، بزنس چیمبرز، کیمرے، گھڑیاں، الیکٹرونک گڈز، پوت اور ریشم کے تھان اور زیورات – یہ صرف ان کا شہر نہیں ہے۔ یہ شہر خود چوبیس کیریٹ گولڈ ہے۔ پتہ نہیں تم یہاں کیسے پہنچ گئے! قسمت کے دھنی ہو، اور پیتے ہو غم غلط کرنے کے لیے۔"
تمیز نے فوراً پلٹ کر کہا: "میں نے کب کہا میں غم غلط کرنے کو پیتا ہوں! غم ہے ہی کہاں جو اُسے غلط کروں گا۔ جو تم بتاؤ کروں۔ ناچوں کودوں، ڈمرو بجاؤں؟"
غیور نے نصیحت کی: "گولڈ کی لائن اختیار کرو۔ مگر نوکری مت چھوڑنا۔ دونوں کام ساتھ چلاؤ۔ 'The Bilimorias' تمہارے لیے ہمیشہ سائن بورڈ کا کام کرے گا۔"

غیور کے جانے کے بعد آہستہ آہستہ وہ آدمی اس کے اندر مر گیا جس کا ساتھ تمیز کو پولس سے جان بچا کر بھاگنے پر نصیب ہوا تھا۔ جو اُسے برابر حوصلہ دلاتا آیا تھا: 'یہاں کی گرمی کی فکر مت کرو، نہ تنہائی کی، نہ خبز عربی (عرب روٹی) کی۔ اس کے بعد جو دن ہیں وہ اطمینان کے دن ہوں گے، نہ برٹش فوج تمہارے تعاقب میں ہوگی، نہ عرب پولس۔ تب اپنا فلیٹ ہوگا

[1] Paragon of beauty: مثالی حُسن، حُسن بہ کمالِ کمال، غالب۔ اعلیٰ ترین حُسن کی موڈل

یا گھر اور اپنی بیوی، وہ عرب ہو، اردو یا گجراتی بولنے والی شام کو تمہاری راہ دیکھتی ہوگی اور گھر پہنچنے پر تمہارے سامنے تمہاری پسند کا کھانا چنے گی، گھی کا تار نکال کر نہیں اور یہ اس کے منہ سے نہیں سنو گے 'سالن کم لو، زیادہ سالن کھانے سے گھر سے برکت جاتی رہتی ہے۔' وہ تمہیں کھاتے دیکھ کر خوش ہوگی۔ رات کو وہ اور تم ساتھ سوؤ گے۔ چند گھڑیوں کے لیے نہیں، ساری رات۔ پھر کہاں ضرورت رہے گی ادھر اُدھر منہ جھمالتے پھرنے کی۔ وہ شراب بھی چھینا دے گی، کپڑوں کا خیال وہ رکھے گی — وہ تمہارا گھر ہوگا۔

'ہاں یہ ہے اس آمدنی میں زیادہ بچایا نہیں جاسکتا ہے بلکہ جب تک اس لائق نہ ہوں کہ اپنا گھر، سوئٹ ہوم، بنا کر اس میں رہ سکوں یہ اوپر کے خرچے نہیں روکے جاسکیں گے۔ چاہے خود سے کتنے ہی وعدے کرو اندر سے جانتے ہو یہ زندگی کی تپائی ہی تمہارے پاس خالی وقت میں بیٹھنے کے لیے ہے: جس کا ایک پایہ عورت ہے، دوسرا شراب، تیسرا باون پتے۔ ان تین سے کہاں چھٹکارہ ہے۔ بعد کی دو ضرورتیں خود پیدا کردہ سہی، نمبر ایک کے بارے میں کیا خیال ہے یا شیخ تلمیذ، ثم تعبیہ ثم تبریز! سنو: اس کی مار بھی بری ہے، بلکہ پیٹ کی مار کے بعد سب سے بری۔ جس نے تمہیں کتنی ہی بار ذلیل کیا۔ کیا وہ بھی خود پیدا کردہ ضرورت ہے؟ تمہیں کیا دین کے بانیوں، رشی منیوں کو اس نے رُسوا کیا۔ اُن میں سے نہ کوئی شراب پیتا تھا، نہ جوا کھیلتا تھا۔'

جھینگے ختم ہو چکے تھے، وہسکی ختم پر تھی۔ کھڑے ہوتے ہوئے اس نے گلاس کا آخری گھونٹ سر پیچھے پھینک کر حلق میں ٹپکایا۔

'مجھے چانس لینا پڑے گا۔ غیور حقیقت پسند ہے۔ اور میرا خیال ہے اس لیے خوش بھی۔ کبھی میں نے اُسے ماضی کا شکوہ کرتے نہیں سنا۔ اور کون سا کام ہے جو اس نے نہیں کیا: جنسی بلیک میلنگ سے لے کر جن عورتوں سے دوستی تھی ان کے حمل گروانے تک۔ باسٹرڈ فخر سے کہتا ہے: ''کبھی میں نے abortionist کو اپنی جیب سے ایک پیسہ نہیں دیا۔ لڑکی اس پر راضی رہتی ہے کہ میں اس کے ساتھ کلینک جارہا ہوں۔ جتنی دیر میں ایبورشن ہو، جانتی ہے میں باہر بیٹھا رہوں گا۔ یہ کانٹا بھی اس کے دل میں نہیں چبھتا ہے کہ میں نے پیسے اُسی سے مانگے کہ اس وقت تم دے

دو، یا انتظام کرلو۔ کڑکی ہے۔ جب اخبار سے پے منٹ ہوگا وہ سارا کا سارا تمہیں دے دوں گا۔ کبھی شک نہیں ہونے دیا۔ جب اوپریشن تھیٹر سے باہر نکلتی ہے تو اُسے بازو تھام کر لے جا کر ٹیکسی میں بٹھاتا ہوں۔ راستے میں کہتا ہوں: کمزوری ہورہی ہوگی۔ خون بہت گیا؟ وہ کہتی ہے۔ ''نہ جانے کے برابر، تمہارے لیے تو جان دے سکتی ہوں۔'' میں کہتا ہوں: ''آؤ آئس کریم ود فروٹ جوس ہوجائے۔'' وہ احسان مندی سے مجھے دیکھتی ہے۔ پھر مائی ڈیئر جگ میں تبریز ایک گلاس فروٹ جوس جس میں آئس کریم ملی ہوتی ہے پینے کے بعد، اس کے پیسے بھی وہی دیتی ہے، اُسے وہاں چھوڑ دیتا ہوں جہاں سے اکیلی اپنے گھر یا جہاں کام کرتی ہو پڑھتی ہو جا سکتی ہے۔ اس کے بعد وہ عورت میرے لیے آؤٹ اوف باؤنڈ ہوجاتی ہے۔ اس میں چیٹنگ ویٹنگ کا دخل نہیں ہے: ڈمانڈ اور سپلائی کی اکیویشن ہے۔ ایک کی ضرورت دوسرا پوری کرتا ہے۔''

خیر میں ویسا بننے نہیں جارہا ہوں۔ بس دو چار consignment (کھیپ)۔ اس کے بعد اس لائن کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا۔ طلوریاز کو چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈیسنٹ طلوریا واقعی ڈیسنٹ آدمی ہے۔ ایک بھائی کولمبو میں یہی بزنس سنبھالے ہے۔ بن پڑا تو اس سے کہوں گا مجھے وہاں نکال دو۔

نئے کام کے لیے تمکینہ نے ایک شام اس بازار کا چکر لگایا جہاں سونا اس طرح بکتا تھا جس طرح نئی پور میں موسم میں آم اور خربوزے۔ دھڑی سے نہ سہی تول سے۔ بالکل عجیب بازار تھا۔ لوگوں کے چہرے پراسرار لگتے تھے۔ ان کے بھی جنہیں میں پہلے سے پہچانتا آیا ہوں وہاں پہنچ کر لگتا تھا جاسوسی ناول کے کردار بن گئے ہیں۔ ایک کھلی ہوئی بے رونق جگہ جسے نہ سڑک کہا جاسکتا تھا نہ میدان۔ لوگ جو دکانوں سے نکل رہے تھے اُن کے ہاتھ میں ریڈیو، کیمرے وغیرہ نہیں تھے۔ دکانوں میں سجے ہوئے سونے کے زیورات سڑک پر چلتے پھرتے

والوں کی نظر میں تھے لیکن کسی کو لوٹے جانے کا ڈر نہیں تھا۔ نہ بیچنے والے کو، نہ خریدار کو۔ بیچ بیچ میں سوفٹ ڈرنکس اور آئس کریم کی دکانیں تھیں۔ سگریٹ کی دکان میں سارے برانڈ باہر کے تھے، اپنی طرف کے نہیں۔ ایک چھوٹی سی دکان پان کی بھی تھی۔ بیچنے والا چھالیہ، تمباکو، الائچی کے بعد سوکھے پیلے چھوٹے چھوٹے پتے چُرمُر کر کے پان پر چھڑک رہا تھا۔ جب تلمیذ نے اس کے لیے منع کیا تو اُس نے پھونک مار کر انہیں اڑا دیا۔ مختلف ملکوں کے لوگ بے فکری سے ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ ایک دوسرے سے مشورے بھی لے لیتے تھے: کس ملک میں سونے کا ریٹ کیا ہے؟ تھوڑی دیر دکاندار سے زیور کے بارے میں بات کرتے تھے اور اس سے پہلے کہ ہاتھ میں تھمائے ہوئے زیور کو غور سے دیکھیں اپنا مطلب بیان کر دیتے تھے۔

ایک خریدار سے دکاندار کہہ رہا تھا: ''ڈرو مت۔ فری پورٹ ہے، کُھل کر بتاؤ۔ کتنا چاہیے؟ ڈلیوری کدھر لو گے ادھر یا جہاز میں؟''

ایک پہچان والے آدمی سے تلمیذ نے رک کر باتیں کرنا چاہیں کیونکہ دل کی رفتار اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی۔ لیکن وہ آدمی اپنی ہی فکر میں تھا۔ بغیر جواب دیے چل پڑا۔

گھبراہٹ تھوڑی کم ہونے پر تلمیذ نے ایک اور اپنی طرف کے آدمی سے پوچھا: ''ملاوٹ کا مال تو نہیں ہوتا ہے؟''

اس نے آنکھیں نکال کر تلمیذ کو دیکھا: یہ گڑ اور تیل کی مٹھائی کھانے والا دیہاتی کہاں سے آ گیا! اس کے بعد تلمیذ اپنے فلیٹ چلا گیا۔

اگلے دن پروگرام کے مطابق اُسے بازار میں غیور ملا اور ایک دکان پر لے جا کر اس نے پوچھا:

''کتنا لائے ہو؟''

''زیادہ نہیں۔ تین مہینوں میں بچت کتنی ہوتی۔''

غیور نے کہا ''شیخ باسط سے لے لیتے۔ وہ پیسے والا آدمی ہے۔''

''اس کے لیے من تیار نہیں ہے۔'' تلمیذ نے کہا۔

''اب جب اس کام میں ہاتھ ڈال رہے ہو تو من کو چھٹی دو۔''

چند دن بعد بوڑھے پارسی نے محسوس کیا تبریز کھویا کھویا ہے اور گاہکوں سے صحیح طرح بول نہیں رہا ہے، کبھی کسی سے ترشی سے بھی بات کرتا ہے۔ اشارے سے بلا کر اس نے سرگوشی میں کہا: ''کیم ڈکرا؟ سوں چھے؟ کسٹمر تیرے کو ناراج کیا؟''

تلمیذ نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا: ''No Pop,[1] so long I am with you no customer will annoy me''

ایک دوپہر جب لیگون میں سناٹا تھا، نہ جہاز نہ حرکت کرتی ہوئی کشتیاں، بلموریاز سے اٹھ کر تلمیذ اُس ہندو گجراتی کی دکان میں گیا — سڑک کے پار نزدیک ہی تھی، جس سے تھوڑی بہت دوستی ہوگئی تھی۔ جب طبیعت اچاٹ ہو اُسے وہاں بیٹھنا سہاتا تھا۔ ست نارائن اُسے سر اٹھا کر دیکھتا، خوشی میں سر کو جنبش دیتا اور دوبارہ سر نیچے کر کے اُس گھڑی میں چمٹیا سے پرزے درست کرنے لگتا جس کی مرمت وہ اس وقت کر رہا ہوتا تھا۔ سیدھی آنکھ پر گھڑی سازوں کا ٹریڈ مارک لینس مستقل لگا رہتا تھا۔ چند ایک میڈیکل آئٹم بھی بیچتا تھا، وزن لینے کا مشینیں،

---

[1] نہیں بزرگوار جب تک تمہارے ساتھ ہوں، کوئی گاہک مجھے نہیں کھلے گا۔

فاؤنٹین پین اور معمولی قیمت والی گھڑیاں۔ تمیز ہی کی عمر کا تھا، خود کو چھڑا کہتا تھا اور خوش ہو کر ایک بار کہہ بھی چکا تھا ''تو تم تبریج بھائی اپنی طرح چھڑا آدمی ہے۔'' وہ خود تمیز کی پسند کا کوئی رکارڈ لگا دیتا جو شاید گاہکوں کو مدعو کرنے سے زیادہ اس کے تنہائی کے ساتھی تھے۔ دکان کی پشت پر سمندر شیشے میں سے نظر آتا تھا اور یہ سب کچھ تمیز کو بہت پسند تھا۔

ست نارائن نے بغیر سر اٹھائے کہا ''سونا بیچنے والے سونا کھرا بیچتے ہیں۔'' تمیز چونکا، سونے کا تو یہاں ذکر ہی نہیں تھا ''پن خود کھرے نہیں ہوتے ہیں۔''

تمیز نے رکارڈ پلیئر کی آواز بڑھاتے ہوئے کہا ''کیسے؟''

''کاروبار چلانے کے لیے برٹش افسروں کو خیر خواہی میں خریدنے والے کا نام بھی بتا دیتے ہیں۔ سب کا نہیں۔ دس میں سے ایک کا۔ اور اُس پورٹ کا بھی جہاں مال جا رہا ہے۔ ایسا نہ کریں تو گورمنٹ ایک دن میں اکھا بازار بند کرا دے وے۔ مہینے میں دو چار ایسے کنسائمنٹ اگر پکڑے گئے تو مطلب ہے کسٹم والے صحیح کام کر رہے ہیں — یہاں کے بھی اور وہاں کے بھی جہاں مال جا رہا ہے۔''

تمیز کو لگا دل اچانک پسلیوں سے جا ٹکرایا۔

اُن دنوں وہ شیخ باسط کا ساتھ چھوڑ کر ع تو ائی میں ایک چھوٹے سے کمرے میں رہ رہا تھا۔ یہ قدم بھی اس نے سوچ سمجھ کر اٹھایا تھا۔ اس رات وہ ڈرتا ڈرتا اپنے کمرے میں پہنچا جیسے چور کسی گھر میں داخل ہو رہا ہے۔ لائٹ اون کرنے پر اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ غیر حاضری میں کمرے کی تلاشی لی گئی تھی۔ سوٹ کیس کھلا پڑا تھا اور کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ یہ خیال اُسے نہیں آیا یہ کام کوئی چور بھی کر سکتا تھا۔

آخری کھیپ کے پیسے اُسے نہیں ملے تھے۔ جلدی میں جو کچھ لے سکا، کیمرہ، گھڑی، کپڑے اور ست نارائن کی زبان میں نقد نارائن سنبھال کر جیٹی پہنچا۔ وہاں نہیں جہاں بڑے مسافر جہاز کھڑے تھے، اُس طرف جہاں کارگو شپس آتے تھے، مال بردار۔ اُن میں سے ایک چھوٹا جہاز جو اپنے طول و عرض میں بمشکل ٹینس کورٹ جتنا ہوگا بغیر ملاحوں کے وہاں جیٹی سے بندھا کھڑا

تھا۔ کوئلہ عرشے پر بکھرا ہوا تھا۔ روشنی تھی لیکن زندگی کا پتہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا ع وہ پورٹ ہے جہاں کچھ بھی چیک نہیں کیا جاتا ہے - نہ کیا لائے ہو، کیا لے جا رہے ہو؟ یا کون ہو؟ سفر کے ڈوکیومینٹس بھی ہیں یا نہیں؟

ایک جگہ وہ اندھیرے میں ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

رات گئے جہاز کے ملاح پیے ہوئے لوٹے، سب کے سب سفید تھے، ان میں پتہ ہی نہیں چلتا تھا کس کا تعلق کریو (Crew) سے ہے کون کیپٹن ہے، کون چیف افیسر، کون چیف انجینئر؟

جب اس کی آنکھ کھلی پورا چاند آسمان میں اٹھ آیا تھا اور جہاز کی نوک (prow) کے پانی کو چیرنے کی پیہم آواز آ رہی تھی اور لہروں کے جہاز کے جسم سے ٹکرانے کی۔

صبح اٹھ کر ملاح بہت ہنسے "So we have a stowaway on board" وہ بار بار ایک دوسرے سے کہتے تھے۔ انہیں تعجب تھا ایک کوئلہ لے جانے والے جہاز کو کسی نے بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے لیے چنا ہے۔

کیپٹن کا انگریزی الفاظ کا ذخیرہ بہت محدود تھا، اس نے تلمیذ کے کندھے پر تھپکی دے کر "No worry comrade" [۱] اور گویا جہاز کے اطراف انگلی گھما کر کہا: "She is yours"۔ اگلے چند کٹے کٹے جملوں میں ایک دوسرے کو پتہ چل گیا وہی تلمیذ کا ہوم پورٹ تھا جو 'Greta' کا Next Port of Call تھا۔

اور جس جہاز کے لیے کپتان نے کہا تھا اسے اپنا سمجھو، اس کے عملے میں سے کوئی بھی شیو نہیں کرتا تھا، سب کے ناشتے میں بیئر ہوتی تھی، دو تین سلائیس روٹی، مکھن، انڈے اور سیاہ کوفی۔ دن کے کھانے میں اور رات کے کھانے میں زیادہ فرق نہیں تھا۔ گاڑھا سوپ جو تلمیذ کو اگا کچلے ہوئے لوبھیئے کا ہے، گوشت، اور وہ کیسا بھی ہو سکتا تھا، آلوؤں کا انبار جو کسی بھی شکل میں ہو سکتا تھا۔ اور کھانے کے بعد کوئی سخت ڈرنک از قسم واڈ کا، برانڈی، وسکی، رم یا جن۔

---

۱ "فکر مت کرو کومراڈ۔ یہ تمہاری ہے۔" جو گریٹا کی آخری بندرگاہ تھی وہی تلمیذ کی منزل مقصود

تین دن بعد صبح کا وقت تھا، ناشتے کے بعد تمیز عرشے پر ایک جگہ جہاں چھاؤں تھی آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ سمندر کی ہوا اتنی خوشگوار تھی کہ وہ سوتا جا رہا تھا جب ایک بوڑھے ملاح نے پاس سے گزرتے ہوئے کہا: ''Your port there comrade''[1] اس کا اشارہ سامنے کی طرف تھا۔

پھر اس نے بائیں طرف ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا: ''This here on portside is our port, actually her port''

آخری بات اس نے اپنے پائپ کو برابر کی لوہے کی دیوار سے ٹکرا کر کہی۔

تمیز اٹھ بیٹھا: سامنے، مغرب کی طرف وہ لمبی کھاڑی میلوں زمین کو کاٹتی ہوئی ساحل کے اندر گھسی چلی گئی تھی جسے وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اور اس کے اختتام پر جہازوں کے فنل، مستول اور کرینیں۔ اور اُن کے پیچھے اور دائیں بائیں میلوں تک عمارتوں کی قطار نظر آ رہی تھی۔ مگر کوئی بھی چیز صاف نہیں تھی۔ ساری تفصیل دھند میں تھی۔ ایک بڑا جہاز کھاڑی کے دہانے سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ موٹر بوٹ تھی جس پر جھنڈا لہرا رہا تھا۔ کھاڑی عرض میں اتنی تھی کہ اس میں بحرِ اعظموں میں جانے والے کئی جہاز میلوں پہلو بہ پہلو چل سکتے تھے اور ایک دوسرے کے پاس سے گزر سکتے تھے۔

جدھر بوڑھے یوروپین ملاح نے بائیں ہاتھ سے اشارہ کیا تھا ایک اجاڑ جیٹی پر ایک زنگ لگا جہاز اتھلے پانی میں کھڑا تھا۔ اس کے جسم کا جو حصہ پانی سے اوپر نکل آیا تھا اس پر سیپیاں لسی ہوئی تھیں۔

ساحل سے کچھ فاصلے پر مچھیروں کی کشتیاں پھر رہی تھیں، دور اُن کے جھونپڑوں کا گاؤں اور کھجور کے درخت نظر آ رہے تھے۔

---

[1] تمہاری بندرگاہ وہ رہی کومراد۔ ادھر الٹے ہاتھ پر ہماری بندرگاہ ہے، حقیقت میں اس کی۔

جہاز وہاں رکا جہاں نہ باقاعدہ جیٹی تھی، نہ امگریشن، کسٹمز یا صحت کے کاغذات چیک کرنے والوں کیلیے پوسٹس۔ اور اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ یہاں سے شہر یا بندرگاہ لے جانے کے لیے بس یا ٹیکسی کا انتظام ہوگا۔

سارے ملاح جہاز کے فنل کے نیچے جمع ہو گئے۔ کسی کے ہاتھ میں بیئر کا ٹن تھا، کسی کے اسناؤٹ کی بوتل، کسی کے وہسکی کا گلاس۔

"To Greta" سب نے جہاز کے نام پر جام ہوا میں بلند کیے اور گھونٹ لیا۔ جیسے اپنے گھرانے کی کسی چہیتی عورت کو یہاں دفن کرنے آئے ہوں۔

بوڑھے ملاح نے، جس نے تلمیذ کو اس کی اور جہاز کی آخری منزل دکھائی تھی گلوگیر ہو کر کہا:

"On her thirty[1] years. Nice girl. No trouble, never." ۔

جام منہ سے لگانے والوں میں تلمیذ بھی تھا، کوئی نہیں کہہ سکتا تھا اُسے جہاز کی موت کا دکھ نہیں تھا۔ ایک ہستی جس نے برے وقت میں اس کا ساتھ دیا تھا۔

گزرتے ہوئے سالوں میں اپنی گزرتی ہوئی زندگی کو دیکھ کر اکثر اسے خیال آیا: "میں نے گریٹا Greta کو چنا نہیں تھا کہ کہاں جارہی ہے، اگر اس کا رخ کسی اور ملک کی طرف ہوتا تو آج کو میری زندگی کچھ اور ہوتی۔"

---

[1] "اس پر تیس سال، بڑی اچھی لڑکی ہے، کوئی تکلیف نہیں دی، کبھی نہیں۔"

(۲۵)

لیکن اس دفعہ یہی شہر جہاں پہلے بڑی مشکل سے دو ماہ گزار پایا تھا تلمیذ کو جلد اپنا لگنے لگا۔ بڑی وجہ برٹش پرومیکوریٹ کے بچائے ہوئے پیسے تھے۔ اس نے ایک ڈوکٹر کے گھر میں آدھا کمرہ کرایے پر لے لیا۔ ایک دیوار سے سٹا ہوا اس کا پلنگ تھا، دوسری سے دوسرے کرایے دار کا۔ کمرے سے باہر تنگ دالان میں ٹاٹ کے پردے کا پارٹیشن تھا۔ اس کا بڑا حصّہ ڈوکٹر صاحب کی بیوی کا باورچی خانہ تھا۔ دونوں کرایے دار دالان کے تنگ حصّے میں سے ہوکر صحن میں نکلتے تھے جہاں دو ضروری جگہیں تھیں۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کے لیے مالکۂ مکان کو آواز دینی پڑتی تھی جس پر وہ 'او ماں' کہتی ہوئی چونک جاتی تھی جیسے اس کی اُسے توقع ہی نہیں تھی کہ دونوں کرایہ داروں کو اُن جگہوں کی ضرورت پڑ سکتی تھی، ورنہ اُسے ان سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ صحن سے فارغ ہوکر وہ تھوڑی دیر میں دن بھر کے لیے غائب ہوجاتے تھے۔

ڈوکٹر صاحب جنوب میں سے کہیں کے تھے اور نئے ملک میں آنے سے پہلے سائن بورڈ پینٹر تھے۔ یہاں انہیں جو دکان کسی نے دلوائی اس میں ایک میز، تین کرسیاں اور کتابوں سے خالی ریک پڑے تھے۔ اس سامان کو دیکھ کر اچانک اُن پر آشکارہ ہوا حقیقت میں اب اُن کا فن اُن کے کام آئے گا۔ چنانچہ اُن کے فن کا بہترین نمونہ وہ سائن بورڈ تھا جو دکان پر لگا تھا:

ڈاکٹر طالب علی۔ ڈی یو، اے وی، اے پی

ماہر طب یونانی، آیورویدک، ایلوپیتھی

وہ زمانہ ایسا عجیب تھا کہ پھر نہ آیا اور لوگ باقی زندگی اسے یاد کیا کیے۔ لگتا تھا پورا ملک اس شہر میں سما گیا ہے۔ نجانے کہاں کہاں کے دیکھے ہوئے چہرے — وہ آدمی جس کی دکان سے چھوڑے ہوئے ملک کی نئی راجدھانی میں سیکنڈ ہینڈ کتابیں لیا کرتا تھا، وہ نوجوان جو ہوکی اچھی کھیلتا تھا، ایک دن اس کی کیپٹن سے تلخ کلامی ہوئی تھی اگلے دن چاقو چھپا کر لایا تھا کہ اگر پھر کیپٹن نے اس کا فاؤل دیا تو — مگر اس دن اس کا کھیل بہت اچھا تھا اور اختتام پر کیپٹن نے اُسے گلے لگاتے ہوئے کہا ''کھیل میں بھی کیا دشمنی ہوا کرتی ہے!'' ایک لڑکے نے بتایا ''آج خلیل چاقو لے کر آیا ہے۔'' جب وہ چاقو نکلا اور اُسے کھولا گیا تو مسرور کے منھ سے نکلا ''ارے باپ رے! اپنے دوست کو مارنے کے لیے لایا تھا۔'' خلیل نے شرمندہ ہوکر کہا ''پاگل ہوگیا تھا۔''

قتی بھی نظر آیا جس کا فوج گنج میں موڈرن قسم کا ہیئر کٹنگ سیلون تھا۔ وہاں اس کی دوستی کبھی کبھی شفقت میں بدل جاتی تھی اور تمیز کا فری شیو بھی کر دیا کرتا تھا۔ یہاں بھی اس کا وہی رویہ رہا۔

سب تھے مگر قریبی رشتے داروں میں سے کوئی نہیں تھا، نہ کسی نے جو اپنے تھے مٹی پر چھوڑ کر یہاں آنے کی تکلیف گوارا کی تھی۔ نئے دوستوں سے وہ کہتا ''آتے تو اچھا لگتا، نہیں آئے تو اور اچھا لگ رہا ہے۔ نام رکھنے والا تو کوئی نہیں ہے؟ جو جی چاہے کرو۔ گھر کوئی رپورٹ نہیں پہنچائے گا؛ یہ کر رہے تھے، وہ کر رہے تھے۔''

پایۂ تخت آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ ڈاکٹر طالب علی اپنے کلینک سے اس وقت جوش میں بھرے گھر لوٹے جب تمیز صبح کا اخبار دیکھ کر گھر سے نکلنے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ پرچہ اس کی جیب میں تھا جس پر اس نے نوکری کے لیے خالی جگہوں کا نام اور پتہ نوٹ کیا تھا۔ دروازہ پانوں پاٹ کھول کر داخل ہوئے اور بولے ''تمیز صاحب آج آپ کی قسمت کا تالا کھل گیا۔''

''کیا تالے کی چابی آپ کے ہاتھ آ گئی ہے؟''

انہوں نے سمجھانا شروع کیا کہاں جانا ہے، کس نمبر کی بس اُدھر جاتی ہے، باہر بورڈ پر کیا لکھا ہوگا۔

تمکینہ نے سنجیدگی سے کہا ''کیا اُن کا بورڈ آپ نے پینٹ کیا ہے؟''

انہوں نے جوش میں کہا ''میرے کمپاؤنڈر نے۔''

''وہ بھی یہ کام کرنے لگا!''

''کون سا؟''

''سائن بورڈ بنانے کا۔''

انہوں نے جھنجھلا کر کہا ''یہ بھی کوئی مذاق کا وقت ہے۔ میں آپ کی نوکری کی فکر میں ہوں کہ آپ گھر بار کے ہو جائیں۔''

تمکینہ محسن کے صبح شام چکر لگانے میں ان کی سالی کو دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا اُس سے زیادہ وہ اُس کے گھر بار کی ہو جانے کی فکر میں ہیں۔ چند سال پہلے تک لوگ جہاں جہاں پشتہا پشت سے بسے ہوئے تھے وہاں ان کی زندگی اپنے ہر پہلو میں منضبط تھی، اس میں تبدیلی نہیں آئی تھی، نہ وہ تبدیلی کو آنے دیتے تھے۔ جس کے باپ دادا نے تجارت نہیں کی تھی وہ مشورہ دینے پر کہ آمدنی کم ہونے کا شکوہ ہے دکان کھول لو، کہنے والے کو ایسی نظروں سے دیکھتا جیسے اپنی آبرو میں بٹا لگا لینے کے لیے کہہ رہا ہو۔ خاندان، ذات یا مادری زبان سے باہر شادی کی بات کو کون سنتا تھا! اور یہاں یہ صاحب بے جانے بوجھے، ایک نئے ملک میں آنے کے بعد، ایک غیر سے اپنی سالی کی شادی کی بات کی فکر میں ہیں! تمکینہ ڈاکٹر صاحب کی اس خاموش تجویز کو پہلے بھی رد کر چکا تھا۔

جن دو اخبار کے پتوں پر اس دن تمکینہ نے طالع آزمائی کی تھی وہاں اس کے پہنچنے سے پہلے ایک پر ایک ریٹائرڈ بینک کیشیئر کو لے لیا گیا تھا اور دوسرے پر ایک نوجوان ٹائپسٹ کو۔ اور دونوں فوراً کام پر بٹھا لیے گئے تھے۔ اس کا کہنا کہ ''آپ نے پہلے سب candidates (امیدواروں) کو انٹرویو کیا ہوتا، پھر اُن میں سے جو top پر ہوتا اُسے اپوئنٹ کرتے۔'' دونوں

میں سے ایک جگہ بھی نہیں سنا گیا۔ اُن میں سے ایک نے کہا "جو ب ہمارے یہاں نکلی ہے اس کا فیصلہ ہمیں کرنا تھا، تمہیں نہیں۔" تمکید نے کہا "پھر اخبار میں اشتہار کیوں دیا تھا؟" اور بغیر جواب سنے باہر نکل آیا۔ دوسری جگہ کہا گیا "پوسٹ ملازم کی نکلی تھی فرم کے مالک کی نہیں۔ چلتے بنو۔"

دن بھر کا غصہ اس نے ڈاکٹر صاحب پر نکالا "وہ کوئی جگہ تھی جہاں آپ نے مجھے بھیج دیا۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"میرے اسٹیٹس (مرتبے) سے نیچے کی تھی۔ میں ایک برٹش پورٹ میں اسٹینوگرفر رہ چکا ہوں۔ وہ جگہ جونیئر کلرک کی تھی، جہاں آپ نے بھیجا تھا۔"

مختصر سے سکتے کے بعد ڈاکٹر طالب علی نے کہا "غصے میں ہو، کھانا نہیں کھایا ہوگا۔" اور پچھ اور کہنے جارہے تھے کہ تمکید نے کہا "ہوٹل سے کھا کر آیا ہوں — اور ہر دن سے زیادہ۔"

ڈیڑھ ماہ بعد اس نے اپنے اکاؤنٹ کا جائزہ لیا اور کہا ایک ماہ اور قسمت آزمائی کی جاسکتی ہے۔

ایک جگہ انٹرویو کے دوران تنگ کلامی ہوگئی۔ انٹرویو کرنے والا ایک دوائیں بنانے والی کمپنی کے مالک کا بیٹا تھا، عمر میں اس سے چھوٹا۔ جگہ سیلز مین کی تھی۔

اس نے پوچھا "اس سے پہلے تم کیا بیچتے رہے ہو؟"

"آپ کا مطلب ہے میں؟"

"جی ہاں" کم عمر نو دولتیہ ڈائریکٹر جو درخواست دینے والے کو خود اس کی نظروں میں گرانا چاہتا تھا اس بیچ میں سگار سلگا چکا تھا، اپنی کرسی گھما کر میز پر پیر رکھتے ہوئے بولا۔

"کچھ نہیں۔ نہ تمہارا اشتہار سڑکوں پر تمہاری دوائیں بیچتے پھرنے کی نوکری کے لیے ہے، نہ میں ایسی نوکری کرنے آیا ہوں۔"

''تمھیں جواب دینے کی تمیز نہیں ہے۔''

''تمھیں سوال کرنے کی تمیز نہیں ہے۔'' کہہ کر تلمیذ اٹھ کھڑا ہوا۔

جب دو نوکریاں چند دن سے زیادہ نہ چل سکیں تو اس نے جمال کو خط لکھا۔

(۲۶)

اپنی نئی زندگی کے لیے تمیز عقیدت مندی سے کہتا تھا: "اس کی بنیاد اسکواڈرن لیڈر جبار نے رکھی تھی۔" پھر کہتا "مگر یاد نہیں پڑتا ان سے آپ اور کہاں پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔
"انہوں ہی نے بزنس کا مشورہ دیا تھا۔ اور جب میں نے ہمت کر کے حامی بھر لی اور کہا اس کے لیے تو افس چاہیے ہوگا اور connections۔ تعلقات۔"
تو انہوں نے کہا "اس کی فکر مت کرو، نہ تمہیں سگریٹ پان کا کھوکھا لگانے کے لیے کہہ رہا ہوں نہ آٹے دال کی دکان، تمہیں کمرشیل ایریا میں افس کھولنا ہوگا — کوارٹروں یا محلوں میں نہیں۔ میں نظر رکھوں گا کہ کوئی موقع کی جگہ مل جائے۔ رہے کنیکشنز، وہ پیدا ہو جائیں گے۔"
میں نے اپنی مالی حالت ان کے سامنے رکھ دی۔
انہوں نے بٹوے کو کھولے بغیر میری طرف انگلی سے سرکاتے ہوئے کہا "اپنی مالی حالت کو جیب میں لیے مت پھرا کرو۔"
'ہم ان کے ایئر فورس کے بنگلے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ برآمدے کے سامنے سڑک کے پار جو وسیع میدان تھا اس میں سے ایک ایئر فورس کا چھوٹا سا ہوائی جہاز اٹھا۔ میں ان کی بات کو توجہ سے نہیں سن رہا تھا، وہ جمال سے اپنی رشتے داری سمجھا رہے تھے جو بڑی پیچ دار تھی اور پردادیوں تک پہنچتی تھی۔ میرا جی چاہا کہوں جیسی بھی ہو میرے بڑے کام کی ہے۔ لیکن میں نے

کہا" خود اُن سے میری رشتے داری اتنی ہی پیچیدہ ہے۔"

حقیقت میں وہ اُس صبح میرا ہی انتظار کر رہے تھے کیونکہ ہفتہ بھر پہلے وہ جمال سے وہاں جانے پر ملے تھے جہاں سے بھاگ کر میں اُس برنش پروٹیکٹوریٹ کی عرب بندرگاہ گیا تھا۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا" آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔"

انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:" مجھ سے دوستی رکھنی ہے تو آپ جناب کو چھوڑ دو۔"

" شروع میں جن دو حضرات کے ساتھ مل کر میں نے بزنس شروع کی تھی، کنیکشنز پیدا کرنے کے لیے، اُن سے جبار بھائی ہی نے مجھے ملایا تھا۔ جبار بھائی کھلے دماغ ہی کے نہیں کھلے دل کے بھی آدمی تھے۔"

' کرینا سے اترتے وقت' وہ تو جب ہی مرحومہ کردی گئی تھیں، میرے ذہن میں بھائی جمال تھے۔ میرے پولس سے ڈر کر باہر بھاگ جانے سے پہلے وہ مجھے اپنے شہر میں بسانے کا ارادہ رکھتے تھے - ہوسکتا ہے یہاں بھی وہ کام آئیں۔ ان کے شہر دوبارہ جانے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ برنش پورٹ سے انہیں لکھ چکا تھا اس دن کیا بیتی تھی جو بغیر اُن سے اور چچا سے رخصت لیے بھاگ کھڑا ہوا تھا۔' اخبار میں نام چھپ چکا ہے' یہ حقیقت سے زیادہ میرا قیاس تھا۔ ایک بعد کے خط میں انہوں نے لکھا تھا: اچھا ہوا جو یہاں سے نکل گئے ورنہ شاید سال دو سال دھکے ہی کھاتے۔ اگر قسمت کے دھنی ہوتو زیادہ سے زیادہ ایک دن چاول دال کی اپنی دکان ہوجاتی۔

' انہوں ہی نے اسکوارڈرن لیڈر جبار کا پتہ مجھے لکھا تھا اور میرا انہیں ملاقات پر بتا چکے تھے۔

اسکواڈرن لیڈر جبار جیسا ہمیشہ مدد کو تیار آدمی میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ نہ انہوں نے کبھی میرے ماضی میں جانے کی کوشش کی، نہ میں نے اپنے بارے میں غیر ضروری باتوں سے انہیں لادا۔ ویسے میں ایسا آدمی ہوں بھی نہیں جو اٹھتے بیٹھتے اپنے دکھوں کی کتھا دوسرے کو

سناتا رہتا ہے، اور اگر وہ نہیں تو اپنے کارنامے۔ اس میں کسی کو کیا لطف ہوتا کہ ابا نے جو پیار اپنی پہلی اولاد کو دیا اگر اس کا چوتھائی بھی مجھے دیتے تو آج کو میں نیو یارک کی زمین پر، وہ جتنی بھی آزادی ملنے کے بعد بچی تھی، کھیتی کرتا، اُن ڈبروں میں سنگھاڑوں کی پیداوار کو بڑھاتا، مچھلی پالتا — خود کو بھی پالتا اور بہن بھائیوں کو بھی۔

'میرا خیال ہے جوانی گزرنے کے بعد نہ محبت میں ناکامی کی داستان سنانے میں کچھ مزہ رہ جاتا ہے نہ سننے میں۔'

'اور یہ بھی عجیب بات ہے بہت کم ایسے دیکھنے میں آئے جن کی محبت کامیاب ہوکر، شادی پر ختم ہوئی اور وہ اس داستان عشق کو دوستوں کو سناتے۔ شاید سارے ہی شادی کے بعد بیوی کو نہ سہی اس سے عشق کو پردے میں بٹھا دیتے ہیں۔

'اسکواڈرن لیڈر جبار کو جنہیں میں پہلی ہی ملاقات میں جبار بھائی کہنے لگا تھا، اگر میرے ماضی میں دلچسپی تھی تو خلیج بنگال کے انتہائی شمال کے برٹش ایئر بیس کے دنوں میں، جہاں میں بڑے اور چھوٹے فلم کیپیٹل میں دھکے کھانے کے بعد پہنچا تھا۔

''ایک جگہ فوج کے لیے بھرتی ہو رہی تھی۔ میں نے ڈیوٹی اوفیسر سے انگریزی میں کہا:''فوج میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔'' فوراً اندر بلا لیا گیا۔ فوج میں داخلے کے لیے جو تحقیقات ہوتی ہیں — ''

''دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کو پہنچتے پہنچتے سلطنت برطانیہ اُن تمام تکلفات کو بھلا چکی تھی۔ پھر؟'' انہوں نے کہا

''میں نے کہا گھر والوں کی اجازت کے بغیر آیا ہوں کیونکہ ہز میجسٹی کی گورمنٹ..... '' انٹرویو کرنے والے نے کہا:''Wanted to serve His Majesty's Government''

میں نے کہا ''Yes sir'' اور دبے لفظوں میں کہا: 'ساتھ کچھ بھی گھر سے لے کر نہیں نکلا ہوں۔'

'اُو' معاملہ سمجھ کر اس کے منہ سے نکلا۔ مجھے کچھ ایڈوانس مل گیا۔ اور وہاں سے پرانی برٹش راجدھانی پہنچا دیا گیا۔

بیچ کی بہت سی باتیں پی گیا کیونکہ وہاں کے شب و روز زندہ دلی کے شب و روز تھے جن

کا ذکر میں جبار بھائی سے کیا کرتا۔'' ان ہی دنوں روئل ایئر فورس کے ہمارے ہی ایئر بیس کے کئی ایک افسروں نے ڈائرکٹ اورڈرز ماننے سے انکار کردیا۔ اُدھر ۱۸ فروری ۱۹۴۶ء کو روئل نیوی والوں نے بغاوت کردی۔''

''اور تم نے کیا کیا؟'' انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''ڈرا، جتنا ڈر سکتا تھا ڈرا۔'' میں نے ان کے سنجیدہ سوال کو مذاق میں اڑا دیا ''نہ آرمی جوائن کرتے وقت وردی ملی تھی، نہ چھوڑتے وقت اتارنی پڑی۔ سخت دکھی تھا زندگی میں پہلی بار اتنی اچھی نوکری ملی تھی اور وہ بھی بگڑتے ہوئے حالات کی وجہ سے چھوڑنی پڑ رہی تھی۔ ادھر اُدھر پھرا۔ پھر وہ ہری بھری خوبصورت دنیا چھوڑ کر جس کی خوبصورتی میں جنگ عظیم بھی کمی نہیں لا سکی تھی اس اجاڑ بندرگاہ میں پہنچ گیا جہاں کی پہاڑیوں اور ریت کا رنگ ایک جیسا ہے، جہاں اونٹ ببول کی پتیاں چباتے ہیں اور آدمی ارک کی۔ اونٹ عربی میں بلبلاتے ہیں اور آدمی اُسی میں اپنی محبت اور نفرت کا اظہار کرتے ہیں...... ''The British Protectorate of

جبار بھائی نے میری بات پوری کردی اور بولے ''اور؟''

''اب یہاں ہوں۔''

جبار بھائی کو نہ میرے گریٹر فلم کیپیٹل سٹی میں دلچسپی تھی نہ لیسر یعنی چھوٹے فلم سٹی میں۔ وہ ان آدمیوں میں سے نہیں تھے جو جس سے ملیں اس کے ماضی کی کھوج میں رہتے ہیں۔ اُن کی ایئر فورس میں شروع کی ٹریننگ انتہائی جنوب میں ہوئی تھی اس لیے وہ میرے ایئر بیس کے اطراف کی دنیا سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے۔ انہیں دلچسپی تھی تو روئل ایئر فورس میں اور اس سے بھی بڑھ کر ایئر فورس والوں کے احکام ماننے سے انکار کرنے میں۔ بولے: ''آزاد ہند فوج سے سابقہ نہیں پڑا؟''

میں نے کہا ''نہیں۔''

بولے ''برما کے فرنٹ پر جانا نہیں ہوا تھا؟''

میں نے کہا ''میں بے وردی کا سپاہی تھا، جہاں بھرتی ہوا تھا وہاں سے شاید دس میل بھی نہیں

بلا۔"

بولے: "اچھا ہی ہوا، سبھاش چندر بوس سے ایک بار ملے ہوتے تو اس کے ہو رہتے۔ ایک آزادی کا متوالا جو ہر قیمت پر اپنے ملک کے لیے آزادی خریدنے کو تیار تھا، اس کے لیے فاشسٹ طاقتوں کو بھی اپنے ملک پر چڑھا لاتا۔"

میں نے کہا: "آپ کا کبھی اُس سے ملنا ہوا؟"

وہ جیسے خواب کی دنیا میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ماضی کے سرور سے نکلتے ہوئے بولے: "بس ایک بار دیکھا تھا اور سنا بھی تھا۔ جو کچھ بھی اس کے سیاسی خیالات رہے ہوں politically immature[1] ہندوستان کے لیے آزادی کا خواب دیکھنے والا، ہٹلر اور تو جو تک کی مدد سے اُسے لانے کو تیار تھا۔ اس کی آرٹریز میں جو خون تھا تیزی سے دوڑنے والا خون تھا۔ عدم تشدد والے ہندو گاندھی اور قانون پر چلنے والے مسلمان جناح کی طرح کا نہیں اور جب عوام بغاوت پر اترے ہوں تو وہ ایسے فاشسٹ گرم خون کی گردش والے کے پیچھے چلنا چاہتے ہیں۔ اس میں جھوٹ اور تصنع نام کو بھی نہیں تھا۔"

"آپ نے اس کی فوج جوائن نہیں کی؟"

"کرتا تو برما یا آسام میں مارا گیا ہوتا۔ یا اگر صاحب بہادروں کی حکومت یہاں دو ایک سال اور رہتی تو کورٹ مارشل مقدر ہوتا۔ خیر وہ فارموسا میں مارا گیا یا مرا اور ہمارے ساتھی کورٹ مارشل سے بچ گئے۔ میں تو جب ٹریننگ میں تھا لیکن سچ کہتا ہوں یہ خیال ضرور آتا تھا رائل ایئر فورس میں اگر ایک دن گروپ کیپٹن بن گیا تو بھی دل میں یہی رہے گی اُن کی خدمت کر رہا ہوں جنہوں نے ہمارے دادا پر دادا کو سرعام پھانسی دی تھی اور مصطفےٰ کمال کو قتل کرانے کے لیے ہمارے ہی یہاں سے آدمی بھیجا تھا۔ ان دنوں اگر میرے پر لگ چکے ہوتے، سمجھ رہے ہو نا؟ تو شاید چھپ چھپاتے امپھال یا رنگون پہنچ جاتا اپنے ایئر کرافٹ میں۔"

کچھ دیر وہ خاموش بیٹھے بن جلے سگار کو انگلیوں میں پھراتے رہے پھر بولے: "بہت

[1] سیاسی طور سے ناپختہ

اچھا آدمی تھا، نازک جذبات رکھنے والا گوریلا سپاہی، جب جاپان کی پسپائی شروع ہوئی اور نظر آرہا تھا کھیل ختم ہونے کو ہے اس نے انڈیا کے سپاہیوں سے جو اس کی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے کہا تھا 'جو چاہے ہتھیار ڈال کر واپس برٹش آرمی میں جاسکتا ہے۔'

'پھر انہوں نے اپنا لمبا پتلا پان تیلا سگار منھ میں لگایا، وہ نہیں جو چرچل کے منھ میں نظر آتا تھا، میں نے اُسے ماچس کی تیلی کی لو دکھائی۔'

'کیا آدمی تھا اپنا جبار بھائی' – تملیذ دیر تک ان ہی خیالات میں ڈوبا رہا۔ انہوں نے چاول والا بلڈنگ میں میرے لیے آفس ڈھونڈ کر دیا۔ معمولی پگڑی پر، ان کے آدمی میرے ساتھ آفس کا کُل فرنیچر لینے بازار گئے۔ ٹائپ رائٹر ہرمیز،[۱] کا جسے وہ کہتے تھے صرف محبت کے خط love letters لکھنے کے لیے بنایا گیا ہے لیکن بس وہ ہی میری بساط میں تھا، وہ خود میرے ساتھ لینے گئے۔ ایک چھوٹا سا قالین ان کی بیوی یعنی نصرت بھابھی نے دیا تھا– اور یہ سب اس وجہ سے کہ جمال بھائی ان کے رشتے دار تھے تھوڑے بہت اور دوست بہت زیادہ۔

'وہ جب تک تھے ایک طرح سے میں ان کی اور بھابھی کی پناہ گاہ میں تھا۔ اُن دونوں کو کبھی پتہ ہی نہیں چلا میں نئی اور پرانی راجدھانی، اسلامک یونیورسٹی ٹاؤن، فلم کیپٹل سٹی اور لیسر فلم سٹی[۲] میں کیا کرتا رہا تھا۔ وہ دونوں میرے بارے میں بس اتنا جانتے تھے کہ ایک نوجوان ہے جو اسکول کے دنوں میں اپنے ماں باپ کو کھو بیٹھا اور اب بھٹکتا پھر رہا ہے۔

'کبھی کبھی جب وہ ایئر بیس سے شہر آتے تھے، اپنی چھوٹی سی برٹش کنورٹیبل کار میں تو اوفس میں بھی آن دھمکتے تھے۔ کہتے ''تمہاری حاضری چیک کرنے آیا ہوں، چائے کا اورڈر دو۔'' پھر سگار سلگاتے اور جتنی دیر بیٹھیں بس یہ جاننا چاہتے تھے میرا جی کام سے تو نہیں اُچاٹ ہوا ہے۔

'ان کا اثر مجھ پر اس وقت بھی رہتا تھا جب ان کی پوسٹنگ کسی اور شہر کی ہوئی ہو۔

---

۱ Hermes

۲ Lesser Film City

پھر وہ دن آیا جب مجھے اطلاع ملی ان کی موت پُراسرار طریقے سے ہوگئی۔

اوفس کو چپڑاسی پر چھوڑ کر ان کے شہر پہنچا اور باہر کچھ دیر بیٹھ کر چلا جانا چاہتا تھا کہ بھابھی نے اندر بلا لیا۔ میں ان کے سامنے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے، انہوں ہی نے زبان کو تھام لیا تھا۔

بھابھی بولیں: ''اندر کیوں نہیں آئے تھے؟''

میں نے کہا: ''آپ کا پردہ نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ آپ عدت میں ہیں نا!''

میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ آنسو ان کی آنکھوں پر منڈلا رہے تھے۔ یہ وہ چہرہ تو نہیں تھا جسے میں ڈھائی تین سال سے دیکھتا آیا تھا۔

ایک بار پھر آنسو میری آواز پر غالب آ گئے۔

انہوں ہی نے مجھے ساری بات بتائی۔ ''چھٹی کا دن تھا جب جبار کو انسٹرکشنز ملیں فلاں وزیر کو، جو اپنی پارٹی کے ہیڈ بھی ہیں، فلاں صوبائی کیپٹل لے کر جانا ہے۔

چاہتے تو کسی اور کا نام بتا دیتے لیکن ایک تو وہ زیادہ کام سے گھبرانے والے آدمی نہیں تھے دوسرے وہاں ان کی چھوٹی بہن کا گھر بھی ہے جس کے بچوں سے انہیں بہت پیار تھا۔ ان کے لیے پہلے سے کپڑے کھلونے اور کتابیں لے رکھے تھے جیسا کہ ہمیشہ سے کرتے آئے تھے۔

''تمہیں معلوم ہے فلائٹ سے پہلے سب ہی ایک پیگ لے لیتے ہیں مگر جبار کبھی کبھار ہی چکھنے والے آدمی تھے — بس مجبوری درجے، ساتھ دینے کو۔ اور جتنے competent (ماہر) پائلٹ تھے وہ بھی تمہیں معلوم ہے۔ وہ اگر جہاز اڑا رہے ہوں مجھے نیند آ جاتی تھی، ملٹری ایئر کرافٹ ہو یا سول۔ کسی اور کے ساتھ میں پورے وقت '' ان کی آواز کچھ دیر ساتھ نہ دے سکی۔

''اس دن فلائٹ سے پہلے انہیں وہسکی کا پیگ اسٹیورڈ نے پیش کیا تھا، وہ بھی پورا نہیں پیا۔ وہاں ان صاحب کو لے جا کر سول ایئرپورٹ پر اتارا، ٹیک اوف کیا، جہاز کو ملٹری ایئر بیس پر چھوڑ کر گھر جاتے۔ دیکھنے والوں نے بتایا پھر ہمیں نہیں معلوم انہیں کیا ہوا۔ ایئر کرافٹ اس طرح اوپر

اٹھا اور ہوا میں گھوما جیسے بیٹری کنٹرولڈ ٹوئے موڈل [۱] اور اڑانے والا اُسے ہوا میں قلابازیاں کھلا رہا ہو۔ بس چند سیکنڈوں کی تو بات تھی۔ جس آدمی نے بڑے سے بڑے موسم میں فلائٹ کی ہوں وہ اس دن جب نہ آسمان میں بادل تھے نہ ہوا تیز تھی اچانک اُسے کیا ہوا!''

'اب ان کی آواز رُندھ گئی۔ میں نے نصرت بھابھی سے بھی زیادہ جرأت مند عورت نہیں دیکھی۔ تھوڑے وقفے کے بعد جو بات انہوں نے کہی وہ میں بھی اخباروں میں پڑھ چکا تھا اور ریڈیو کی خبروں میں بھی سن رکھی تھی: ان وزیر صاحب کی جان بچ گئی اور ان کے ساتھ جو ایک دو اور تھے ان کی بھی۔ جگہ جگہ نمازِ شکرانہ ادا کی گئی ورنہ پلان انہیں مارنے کا کیا گیا تھا۔ ایئر کرافٹ اڑانے والے کی میت کا سب اہتمام ایئر بیس پر ہوا، لکڑی کے تابوت میں اُسے گھر لے جانے کے بعد فوجی قبرستان میں ملٹری اعزازات کے ساتھ دفن کر دیا گیا۔

''ایئر کرافٹ کو کیا ہوا تھا؟ ظاہر ہے فلائٹ سے پہلے اس کے سب سسٹمز اور بوڈی کو چیک کیا گیا ہوگا۔ پچھلے ایک سال میں ایئر فورس میں شامل کیے جانے والے ہوائی جہازوں میں سے تھا یا جبار کو کیا ہوا تھا کبھی کوئی نہیں جان سکے گا۔ گھر ان کا بیگیج آیا اس میں چوکلیٹ اور وہ سب تھا جو اپنی بہن اور بھانجیوں کے لیے لے کر گئے تھے۔''

'میں اگر کوشش کرتا تو بھی نہیں کہہ پاتا بھابھی صبر کیجئے۔

نصرت بھابھی کا آخری خط جو ملا مارسیلز سے تھا: امید ہے تمہاری بزنس ٹھیک جا رہی ہوگی۔ اس کے بعد جو خط آیا اُن کی بڑی بہن کا تھا، وہیں سے: آپ کو یہ پڑھ کر دکھ ہوگا نصرت ہمیں چھوڑ گئی۔

'اگر پوچھا جائے کہ میری زندگی کا بہترین دور کون سا تھا تو فوراً بغیر سوچے کہوں گا: اُتنا جتنے دن جبار بھائی اور نصرت بھابھی کا سایہ میرے سر پر رہا۔ پتہ نہیں وہ مجھے کیا سمجھتے تھے لیکن میں محسوس کرتا تھا ان کے دلوں میں میرے لیے ماں باپ کی چاہ ہے، اور میرے دل میں بھی ان کے لیے بیٹے کی محبت تھی۔ لیکن hold on، ایسے باپ کی نہیں جو اٹھتے بیٹھتے اخلاقی سبق ازبر کراتا ہو۔

---

[۱] battery controlled toy model

'وہ ایک ایئر ہوسٹس کا قصہ سناتے تھے جو کیریئر کے شروع میں اُن پر مرمٹی تھی۔ ''میں کہتا تھا تمہاری میری لائنیں جدا ہیں، کوئی سیویلئن کیپٹن ڈھونڈو، اپنی لائن کا۔ اس کے مرنے کا چانس مجھ سے بہت کم ہوگا۔ مجھے خود کو انشور کرانے کے لیے اُس کا چوگنا دینا ہوگا جتنا اُسے۔

''ہاں بھائی، تمہارا جبار بھائی کوئی بے نگنی کا ولی اللہ نہیں تھا۔

''مگر ہوا ایک دن یہ تھا وہ اپنی کمپنی کی ایک نئی روٹ پر inaugural flight[1] میں ماری گئی، اور میں کیسے کیسے سیکنڈ ورلڈ وار کے کھٹارا ایئر کرافٹ اڑانے کے بعد آج بھی زندہ ہوں ۔۔اچھی لڑکی تھی۔ Very graceful and dignified۔

''اپنی نصرت بھابھی کو یہ بات بتانے کی کوشش مت کرنا۔ مجھ سے زیادہ انہیں اس کی موت کا دکھ ہوا تھا۔''

---

۱ افتتاحی پہلی اڑان

(۲۷)

جب اس نے برٹش پروٹیکٹوریٹ[۱] کی عرب بندرگاہ سے آ کر، اسکواڈرن لیڈر جبار کے مشورے پر اس شہر میں امپورٹ ایکسپورٹ کا اوفس کھولا تھا اور فرم کو رجسٹر کرایا تھا مال امپورٹ کرنے کا کام خود کرتا تھا، مال کو ڈیلرز تک پہنچانے کا کام بھی خود کرتا تھا۔ امپورٹ کی دنیا میں اس کی فرم کی حیثیت کیٹگری ہولڈر کی تھی۔ جب حکومت نئی امپورٹ پولیسی کا اعلان کرے گی سب کی طرح اُسے بھی پتہ چلے گا کتنے کی سلائی کی مشینیں جاپان سے امپورٹ کر سکے گا، کتنے کے بلیڈز اور سرجری کے آلات سولنجن جرمنی سے" بینک گئے جتنے کی اجازت ملی ہے اتنے کا لیٹر اوف کریڈٹ[۲] کھولا۔ آدھی، پون یا کل رقم پیشگی کا۔ باہر سے مال کے چل پڑنے کی اطلاع بینک کو آ گئی، انہیں باقی رقم ادا کی، مال کسٹم سے چھڑایا، گودی سے اٹھایا، ڈیلرز سے خط و کتابت خود کی، خود اپنے شہر کے تھوک فروشوں سے سودا کیا۔ مال بک گیا۔ اُس سودے میں منافع ہی منافع تھا اور جب سارا امپورٹ کیا ہوا مال بک جائے سکون ہی سکون۔"

پھر ہوا یہ کہ" یاروں نے آسان راستہ دکھایا۔ اس سب میں clamjamphrie[۳]

---

۱ British Protectorate (برطانیہ کے زیرِ تحفظ ملک یا شہر)

۲ بینک کی مالی ضمانت کی دستاویز

۳ بکواس۔ بکھس بکھس

بہت ہے۔" اس کا پسندیدہ لفظ۔ "مزہ جب ہے جب گھر بیٹھے کھاؤ ۔ بینک مینیجر کو دوست بناؤ۔ اگر اُسے اور سرکاری لوگوں کو شیشے میں اتار لیا تو اگر حکومت کچے مال امپورٹ کرنے کے لیے سوفی صد رقم پیشگی ادا کر کے ہی ایل سی کھول سکتے ہو تو وہ تمہیں راستہ دکھائے گا کہ یہ کام ۲۰ فی صد پر بھی ہوسکتا ہے۔ جب مال آئے گا وہ یا سرکار والوں میں سے کوئی تمہارا تعارف کسی بڑے بیوپاری سے کرا دے گا جو اگر سارا کام خود کرنے پر سو ملتے تو وہ اسی دے کر سارا بوجھ تمہارے سر سے اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لے گا۔ ایل سی کی باقی رقم وہ بھرے گا، مال خود گودی سے اٹھائے گا، کسٹم ڈیوٹی بھرے گا، سیل ٹیکس دے گا یا یہ دونوں کام کھلا پلا کر پورے کر لے گا۔ بھاگ دوڑ پر اس کا خرچہ آئے گا پھر ظاہر ہے وہ ہی فیصلہ کرے گا مال کس قیمت پر لوگوں کو ملنا چاہیے۔"

اور واقعی جب بڑا امپورٹر ایل سی کی رقم دیکھ کر اس کے ہاتھ میں بیس پچیس ہزار رکھ دیتا تو وہ نوٹوں کی گڈی کو چوم کر کہتا: "جیو گورمنٹ بادشاہ۔ تم میرے سسر ہو، میں تمہارا داماد۔"

کبھی جب تملیذ اپنی زندگی میں آنے والی عورتوں کا جائزہ لیتا تھا کون کہاں ملی تھی، کس سے کتنے دن تعلق رہا، اور اس تعلق کی نوعیت کیا تھی تو وہ اس نتیجے پر پہنچتا تھا: 'میری طرح ہر مرد، ہر فعال زندہ مرد (active - functioning male) کے دماغ میں دو طرح کی عورتوں کے خیال آتے ہیں: ایک کے بدی کے ساتھ، دوسری کے اپنے ساتھ ہمیشہ ایک خوشی لے کر آتے ہیں۔ تقدس نہیں۔ ویسی عورت کے نہیں جو کوٹھے پر بیٹھی ہو اور فرشتے وہاں اس کے دوپٹے پر نماز پڑھنے کے لیے آتے ہوں۔ ویسی پاکیزہ ہستیاں فلمی کہانیاں لکھنے اور فلم ڈائریکٹروں کے یہاں ہوتی ہیں، زندگی میں دیکھنے میں نہیں آتیں۔'

اس طرح اپنی زندگی میں آنے والی عورتوں کو جب وہ دو خانوں میں بانٹ چکتا تو اکثر

ایسا ہوتا جیسے اچانک سرواپلی اسٹریٹ پر چلنے والی ایک عورت نے جو برقع پہنے تھی نقاب الٹ کر پوچھا: ''اور میرے بارے میں کیا خیال ہے؟''

یہ بھی تعجب کی بات تھی کبھی اس نے امینہ سے اتنے دن کے ساتھ کے باوجود یہ نہیں پوچھا تھا: تم کس شہر میں پیدا ہوئی تھیں؟ کب پیدا ہوئی تھیں؟ پوچھا ہوتا تو یاد رہتا Zodiac (راس منڈل) کے کس مہینے میں پیدا ہوئی تھی۔ کبھی یہ بھی نہیں پوچھا: تمہارے گھر والے سالگرہ کے دن تمہیں کیا دیتے ہیں؟ ہوسکتا ہے وہ اُن ہستیوں میں سے ہو، جن کی پیدائش میونسپل رکارڈ اوفس میں درج نہیں کرائی جاتی ہے اور وہ خود بھی نہیں جانتیں کس سنہ یا مہینے میں پیدا ہوئی تھیں۔

'اچرج، مہا اچرج' اس نے ہمیشہ فلمی مکالمے میں کہا' مجھے دنیا بھر کی مشہور ایکٹریسوں کا ستارہ معلوم ہے، نہیں معلوم تو بے چاری امینہ کا نہیں معلوم۔'

ایک عمر گزر جانے کے بعد ایک بار آ جانے پر اُسے امینہ کا خیال کئی دن تک آتا رہتا تھا اور وہ جانتا تھا یہ قدرت کا کرم ہے کہ ان تمام ناپسندیدہ ہستیوں کے درمیان جن کی یاد اس کو دق کرتی رہتی تھی یہ خیال اس عورت کا ہوتا تھا جسے پچاس ساٹھ سال بعد خود اس کے محلے میں سے بھی کوئی نہیں جانے گا کہ ایسی بھی کوئی ہستی تھی نہ اس کے رشتے داروں کو پتہ ہوگا کون تھی۔ زیادہ سے زیادہ سو برس بعد۔' پھر میری طرح وہ بھی جیسے کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔

اُس نے میرے ساتھیوں میں سے کبھی ایک میں بھی دلچسپی نہیں لی، نہ کبھی کسی کو اپنی طرف بڑھنے دیا اور سب اُسے کیا سمجھتے تھے؟ ایک عورت جس کا نکاح کے بغیر مجھ سے تعلق تھا — جیسے چوری کا ریڈیو، کیمرا، ریکارڈ پلیئر یا گھڑی۔

'مجھے ڈاکٹر حنفی نے بے وجہ ہسپتال میں داخل کرا رکھا تھا کہ'' تمہارا وزن گر رہا ہے اور کہتے ہو شام ہوتے ہوتے آنکھیں جلنے لگتی ہیں۔ تمہیں بے وجہ اینٹی بائیوٹکس دیئے گئے ہیں۔ مجھے ڈر ہے اُن سے تمہارے جسم میں انفیکشن سے لڑنے کی طاقت ختم ہوگئی ہے — قوت

مدافعت۔''

'اگر جبار بھائی زندہ ہوتے تو مجھے ایئر فورس کے ہسپتال لے گئے ہوتے۔ تب نہ وہ تھے، نہ نصرت بھابھی۔ پچھلا سیزن اچھا رہا تھا۔ جاپان سے امپورٹ کی ہوئی سوئنگ مشین، جرمنی کے پنامابلیڈ، برٹش فاؤنٹین پین سب کا بازار میں توڑا تھا اور سب کے لیے مارکیٹ اچھا جا رہا تھا۔ دیسی چیزیں کوڑی کام کی نہیں تھیں، الارم گھڑیوں پر لیبل لگا ہوتا تھا Foreign Made یا Made as Foreign، لوگ انہیں باہر کا بنا ہوا سمجھ کر خریدتے تھے اور پچھتاتے تھے۔ دوسری عالمی جنگ نے لوگوں کو اچھے کپڑے، شیونگ بلیڈ، گھڑیوں، الارم کلاکوں، کیمروں کے لیے ترسا دیا تھا۔ اگر میں ہر سیزن میں دس لاکھ کا مال بھی جاپان، جرمنی یا سوئیڈن سے امپورٹ کرتا تو لینے والے بہت تھے۔ سنہری دور تھا، ایسا دور پھر لانے کے لیے دنیا کو تیسری عالمی جنگ لانی ہوگی اور ساری دنیا ویسی ہی ہوجائے جیسی تب تھی۔ جاپان سے سوئنگ مشین امپورٹ کی، باہر ڈبوں پر لکھا ہے 'میڈ ان جاپان'، مشین پر کچھ نہیں کہ کہاں کی بنی ہوئی ہے۔ اور ساتھ میں اُن میں سے ایک کی دراز میں جو دھاگے کی ریل اور قینچی رکھنے کے لیے ہوتی ہے ایک پیکٹ ہے چھوٹی سی سنہری پلیٹوں کا جن پر لکھا ہے 'میڈ ان جرمنی' اور وہیں ایک پیکٹ میں سنہری اسکرو ہیں کہ لگاؤ اور بیچو۔ عقلمند کے لیے اک پنہاں اشارہ۔ دکانوں پر جاتا تھا تو وہ ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ 'سیٹھ کیا خبر ہے؟'

میں بتاتا اتنی سوئنگ مشین جاپان سے آ رہی ہیں، اتنے کیمرے اور جرمنی سے سولنگن اسٹیل کے فلاں فلاں آئٹم۔

'مجھے مال چھڑانے بھی نہیں جانا پڑتا تھا، سب کام وہ کرتا تھا جس سے سودا ہوجائے۔

'جیب میں پیسے تھے، میں نے کہا بہت تھک لیا۔ آؤ آرام کرو۔ حنفی نیز رتھ ہوسپٹل کے اسٹاف پر سینئر ڈاکٹر تھے۔ سارا انتظام امریکی اسٹینڈرڈ کا تھا، میٹرن جرمن تھی۔ مجھے کمرہ وہ ملا جس کی کھڑکیاں سمندر کی کھاڑی کی طرف کھلتی تھیں۔ یہی پرائیوٹ کمرہ تھا۔ دوسرے بیڈ پر ایک اور مریض تھا لیکن اُسے چوبیس گھنٹے سلا کر رکھا جا رہا تھا۔ اس لیے آرام کسی بہترین ہوٹل کے سنگل

بیڈ کمرے کا تھا۔ روم سروس تھی۔ نرسیں خوبصورت تھیں، لگتا تھا سوچ سمجھ کر رکھی گئی ہیں۔ یہ بات میرے علم میں بعد میں آئی ڈاکٹر حنفی کا بھی ہسپتال میں شیئر ہے اور نیز رتھ سے مراد وہ نہیں تھی جسے سمجھ کر مریض وہاں آتے تھے۔

وقت کے ساتھ ساتھ تمام شہروں میں ایسے کلینک اور اسکول کھل رہے تھے جن کے مالک مسلمان یا ہندو تھے، عیسائی بہت کم، لیکن اُن کے نام کسی عیسائی سینٹ یا براہ راست بی بی مریم اور حضرت عیسیٰ سے جڑے ہوتے تھے۔ ڈاکٹر حنفی امریکا کے پڑھے ہوئے تھے اور نئی قوم کی نبض پر ان کی بھی انگلی تھی۔

'دوسرے مریض کے ساتھ اس کی بیوی رہتی تھی اور جب وہ نہ ہوتو ایک سترہ اٹھارہ سال کا لڑکا۔ عیادت کو آنے والوں میں ایک برقع پوش ہستی کو میں چند ہی دن میں جان گیا۔ وہ اپنے چہرے کو چھپانے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ اس کا نام خود بیمار کے منھ سے پتہ چل گیا ــ امینہ۔ وہ خوبصورت نہیں تھی اور چہرہ ایسا تھا کہ اگر کسی فلم کے لیے چن لی جاتی تو کیمرہ مین جس کے لیے وہ نئی ہوتی تنگ آ جاتا کہ کس رخ سے اس کا exposure (وا ہوتا) بہتر ہوگا، کیونکہ زاویہ بدلنے کے ساتھ اس کا چہرہ بدل جاتا تھا۔ کئی دفعہ میں نے دھوکا کھایا۔ سامنے سے وہ کچھ تھی، دونوں رخوں سے کوئی اور۔ خیر رنگت نہیں بدلتی تھی۔ میں نے اُسے بولتے بھی سنا: اس کی آواز ایسی تھی کہ اگر نرس ہوتی تو گھبرائے ہوئے سے گھبرائے ہوئے مریض کی اس کے چند لفظوں سے ڈھارس بندھ جاتی۔

'ایک دن جب اس کا مریض ــ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا رشتے میں چھوٹی بہن کا جیٹھ ــ باتھ روم میں تھا اور جٹھانی گھر سے نہیں آئی تھیں، نوجوان کسی کام سے گیا ہوگا، امینہ نے بغیر جھجک مجھ سے کہا ''کل بھائی جان گھر جارہے ہیں۔''

'وہ چاہتی تو سنانے والے لہجے میں یہ خبر سنا سکتی تھی۔ مثلاً جیٹھ سے باتوں کے دوران مگر اس نے ایک سیدھی سادی بات کو سیدھے سادے الفاظ اور لہجے میں براہ راست مجھ سے کہہ دیا۔

میں نے کہا "کہاں؟"

"بھائی جان کا گھر...... میں ہے، میں...... میں رہتی ہوں۔"

ایک لمحے کو میں ٹھٹک گیا۔ بھائی جان کا گھر بنگلوں کے علاقے میں تھا کوئی چار سو گز کا، کوئی ہزار کا، اس کا وہاں جہاں بے شمار بستے تھے۔

میں نے کہا "بہت تھوڑی ملاقات رہی۔"

اس نے ہمت کر کے کہہ ڈالا "آپ چاہیں تو قائم رہ سکتی ہے۔"

میں نے سائڈ ٹیبل کی دراز میں سے پرس نکال کر ایک وزٹنگ کارڈ اس کے حوالے کیا۔ اس نے کارڈ پر ایک نظر ڈال کر ٹھوڑی کی جنبش سے بتا دیا کہ انگریزی نہیں پڑھ سکتی ہے۔ میں نے بغیر ایک لمحہ ضائع کیے ایک ہاتھ سے کارڈ واپس لیا دوسرے سے قلم دراز سے نکالا اور دفتر اور ہوٹل کا پتہ لکھ کر کارڈ دوبارہ اس کے حوالے کیا۔ میں نے پوچھا "نام بھی لکھتا ہے؟" اس نے کہا "جانتی ہوں، تلمیذ صاحب۔"

اگلے دن امینہ کے جیٹھ کو جٹھانی اور اس کا بیٹا گھر لے گئے۔ میں رشتوں کا حساب لگانے میں کمزور ہوں: وہ شاید امینہ کے جیٹھ جٹھانی نہیں تھے۔

چلتے وقت میں نے پوچھا "کتنے دن یہاں رہے؟"

انہوں نے کہا "اکیس دن۔"

"فائدہ ہوا؟"

جیٹھ اور جٹھانی نے قدرے خفگی سے ایک ساتھ کہا "فائدہ کیا ہوتا مرض ہی یہاں کے ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آیا۔"

جیٹھ صاحب نے کہا "بس آرام کرلیا، اب جا کر کاروبار دیکھوں۔"

اس شام میں نے ڈاکٹر حنفی سے کہا "ڈاکٹر اب چھٹی کراؤ بہت آرام کرلیا۔"

انہوں نے کہا "ٹمپریچر چارٹ نورمل چل رہا ہے۔ اب شام کو آنکھیں......"

میں نے جملہ پورا کیا "نہیں جلتی ہیں۔ کھانا بھی جسم کو لگ رہا ہے۔" (یہ اُن کے الفاظ تھے)

انہوں نے کہا'' یہ سب مکمل آرام سے ہوا ہے۔ ایک اور ہفتہ سہی۔''

میں نے کہا'' نئی پولیسی آ گئی ہے۔ مجھے جانا ہے۔''

'اس کے بعد آنے والے دنوں میں امینہ کو میں نے ہر اعتبار سے ایک قابل بھروسہ ہستی پایا۔ اگر میں اس کے آنے پر چائے اور سینڈوچ کا آرڈر دوں یا کھانے کا تو ٹھیک تھا۔ کچھ نہ منگواؤں تو بھی ٹھیک تھا۔ اس نے کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ گھر سے کھا کر نکلی ہے یا گھر پر کھانا اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ پیسے؟ وہ اس سے بہت اوپر تھی - خودداری کی حد تک۔

'شوہر والی ہے، یہ میرا خیال تھا۔ لیکن بچوں والی نہیں۔ اس کے جانے کے بعد بہت سے سوال میرے دماغ میں اٹھتے تھے: اس کا شوہر کیا کرتا ہے؟ بچے کیوں نہیں ہوئے؟ ماں، باپ؟ وہ شاید نہیں تھے۔ اتنی دیر جو میرے ساتھ رہ کر جاتی ہے تو کوئی سوال نہیں کرتا ہے، کہاں گئی تھی؟ اتنی دیر میں کیوں لوٹی؟ گھر میں خوش ہے یا نہیں؟

'جس علاقے میں وہ رہ رہی تھی صرف شریف لوگوں کا علاقہ نہیں تھا۔ دفتروں میں کام کرنے والے کلرکوں، چپراسیوں، اسکول ماسٹروں، پولیس کے سپاہیوں اور دکانداروں کے گھر پاس پاس تھے اور اُن ہی میں کہیں سمائی ہوئی کچی شراب، شام کو تاڑی، چنڈو اور چرس کے اڈے بھی تھے۔ یہ سب انفورمیشن میرے پیؤن (چپراسی) کی تھی۔ اس کے گھر کے سامنے کی مسجد میں رمضان میں ایک بزرگ دکاندار اعتکاف میں بیٹھتے تھے، اور تراویح ہوتی تھی۔

'لیکن شاید میں خود بھی ان سوالوں کے جواب نہیں چاہتا تھا جو میرے ذہن میں اٹھتے تھے۔ اگر کسی کے گھر میں گوریا اپنا گھونسلا بنا لیتی ہے تو وہ کب چاہتا ہے کہ یہ جانے صبح سے شام وہ کہاں کرتی ہے۔

میں امینہ سے خوش تھا، وہ مجھ سے۔

شروع میں اُسے کپڑے، پرفیوم اور مصنوعی جیولری قسم کی چیز دیتے ہوئے میں جھجکتا تھا کہ گھر نہیں لے جائے گی، لے جائے تو اس کا کیا جواب دے گی کہاں سے آیا۔ مگر جس دن وہ میرے دیے ہوئے جاپانی پرنٹ کے کپڑے کی قمیص پہن کر آئی تو میری جھجک دور ہوگئی۔

اس نے پوچھا ”ٹھیک کل ہے؟“

میں نے کہا ”تم پر جچ رہا ہے۔ کپڑے کی قسمت جاگ اٹھی۔“

وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ شاید ایسا خراج اس کے شوہر نے کبھی نہیں دیا تھا۔

ایک دن وہ ایک نوجوان کے ساتھ آئی اور بولی ”یہ میرا بھائی ہے سلیم۔ اگر تمہارا کوئی چپراسی نہیں ہوتا تو کبھی اسے کام پر لگالو اور جو کچھ سکھا سکتے ہو سکھا دو — تاکہ اس کی زندگی بن جائے۔ لیکن دوسرے کی روزی بند کرانے کا گناہ میں نہیں کر سکتی۔“

تمہید نے پوچھا ”تعلیم کتنی ہے؟ بیٹھ جاؤ۔“

سلیم پھر بھی کھڑا رہا ”نویں ختم کی ہے۔ ہائی اسکول پورا کرنے کا ارادہ ہے۔“

”کتابیں کا پیاں ہیں؟“

”جی ہیں۔“

”فیس؟“

اس نے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”ہو جاتی ہے۔“

تمہید نے پرس نکال کر پچاس روپے اُسے دیے۔ سلیم نے ہاتھ نہیں بڑھایا اور بہن کو دیکھا۔

امینہ نے کہا ”لے لو اور گھر جاؤ۔ میں ابھی کچھ دیر یہیں ٹھہروں گی۔“

سلیم شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔

آنے والے دنوں میں کتنی ہی بار تمہید کی سلیم سے ملاقات ہوئی۔ لیکن یا تو وہ بہت کم بولنے والا انسان تھا یا یہ کہ اس عجیب وغریب تعلق نے، جو امینہ اور تمہید میں تھا اور جس کی بنیاد پر وہ تمہید کی زندگی میں داخل ہوا تھا، اُسے تقریباً گونگا بنا دیا تھا۔

اگلی ملاقات میں کریدنے پر تمہید کو اندازہ ہوا تھا کورس کی کتابیں ہر سال اس کے پاس ہوتی تھیں، کچھ اپنی کچھ ساتھیوں سے مستعار مل جاتی تھیں۔ فیس، کو پیوں، پنسل، قلم، روشنائی جیسے خرچے باجی دیتی تھیں اور وہی مٹی کے تیل کے پیسے بھی دیتی تھیں۔ کبھی مانگنے پر فوراً، کبھی دو

ایک دن بعد۔ یعنی جہاں سلیم رہتا تھا وہاں بجلی نہیں تھی اور وہ جگہ ایمنہ کا علاقہ نہیں ہوسکتی تھی۔ کوئی جگہ اُس سے بھی بدتر۔ جہاں شرفا جھونپڑیاں ڈال کر رہ رہے تھے؟

اس ڈر سے کہ کہیں اس کنبے کی پوری ٹریجڈی کھل کر سامنے نہ آجائے تملیذ نے کہا "تم فکر مت کرو۔ پڑھتے جاؤ جب فیس دینی ہو میرے پاس آجایا کرو۔"

اس سے یہ نہیں پوچھا گیا کپڑوں کی تو تنگی نہیں ہے۔ تب سے تملیذ اس کا اسکول کا خرچہ گاہے بگاہے دیتا تھا کیونکہ وہ ہر ماہ مانگنے آتا ہی نہیں تھا۔ اس کی خاموشی اور سنجیدگی سے یہی اندازہ کیا جاسکتا تھا جیسے جلدی میں ہے: اُس دن کا انتظار کررہا ہے کب بہن کے پاس ضرورت لے کر جانے سے نجات ہو۔

جس ماہ سلیم تملیذ سے فیس لینے نہیں آتا تھا یا بہن کے کسی کام سے آتا تھا اور سمجھ جانے کے باوجود تملیذ اُسے کچھ نہیں دے سکتا تھا تو اس کی کمی بعد میں پوری کردیتا تھا اور کبھی اس بے وجہ نصیحت کے ساتھ: "ہوسکے تو ہاتھ روک کر خرچ کرنا۔ ہوسکتا ہے کل میرے پاس پیسے نہ ہوں۔ حقیقت میں میری بھی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔"

لیکن لڑکے کے جسم پر ایسی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی جو اشارہ کرتی ہو وہ اپنے اوپر بے ضرورت ایک پیسہ بھی خرچ کرتا ہوگا۔ اس کے بال تک روکھے ہوتے تھے اور اکثر کٹوانے کے منتظر، بڑھتے ہوئے۔ جیب میں قلم کی جگہ پینسل ہوتی تھی۔ اس عمر میں زندگی نے اُسے متین بنا دیا تھا۔ اُس کی عمر کے لڑکے جن کی پشت پناہی بڑے نہ کررہے ہوں اور جو لڑکپن سے مزدوری کرنے والے طبقے سے بھی نہ ہوں اس عمر میں بہت کچھ کیا کرتے ہیں، ان کی اپنی دنیا سے پوشیدہ زندگی ہوتی ہے۔ سلیم اُن سے مختلف تھا۔ زندگی سے اس نے سمجھوتا کررکھا تھا اور جب تک اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو اُسے اس رشتے میں کوئی خرابی نظر نہیں آتی تھی جو بہن اور تملیذ میں تھا۔ یا یہ کہ خرابی نظر آتی تھی لیکن اس سے کم جو بہن کی زندگی میں تملیذ کے نہ آنے سے ہوتی۔

(۲۸)

ہوٹل کے ایک کمرے کے گھر اور ایک پیئون کے اوفس کے زمانے میں تمیز کے انکم ٹیکس کا کام جو پلیڈر کرتا تھا، مہر علی، وقت کے ساتھ، ساتھ پینے والا بن گیا۔ سال کے سال وہ خود تمیز کی آمدنی، خرچ اور دولت کے ریٹرن (گوشوارے) مکمل کر کے داخل کراتا تھا، اس کے حق میں فیصلہ کراتا تھا اور معاوضے میں کیا چاہتا تھا؟ وہی جو شادی شدہ وکیل مرتضیٰ قریشی۔ لیکن اس کے لیے وہ موکلوں کے گھروں میں نہیں جھانکتا پھرتا تھا۔ وہ صرف عورتوں سے دوستی چاہتا تھا اور جانتا تھا اس کے لیے قدرت نے اس میں کوئی مقناطیس نہیں جڑا تھا۔ تمیز میں ایک نہیں کئی مقناطیس جڑے تھے۔

آنے والے دنوں میں تمیز اپنی اُس دور کی زندگی کے واقعات کو اس طرح آگے پیچھے دوڑا کر دیکھا کرتا تھا جیسے فلم ڈائریکٹر دن بھر کی شوٹ کی ہوئی فلم کے رش پرنٹ دیکھتا ہے۔ خود ایک سیکوئنس، زندگی کی ایک قسط، کے ختم ہونے پر کبھی کبھی کہہ اٹھتا تھا ''اُس دن کی شوٹنگ کے رش پرنٹ دیکھ لیے۔ باقی کل۔'' اور ان الفاظ کے منھ سے نکلنے پر چہک اٹھتا تھا جیسے فلم سٹی کیپیٹل کا کوئی ڈائریکٹر ہو۔ اپنی اس فلم کو اس نے ایک نام دے رکھا تھا The Life and Times of a Debauch (ایک اوباش کی زندگی اور اس کا زمانہ)۔ اور پہلی بار اس نام کے ذہن میں ابھرنے پر دیر تک ہنستا رہا تھا۔

تلمیذ کی زندگی کی تاریخ کے اُس دور میں کچھ عورتیں وہ تھیں جو آ کر اس پر بند ہو جاتی تھیں۔ اُن پر وہ کسی دوسرے کو دعوت نہیں دیتا تھا۔ دوسری وہ جو اس پر بند نہیں ہوتی تھیں۔
مہر علی اس تقسیم کو نہیں بھانپ سکا تھا۔ تلمیذ اس کے امینہ کی طرف بڑھنے کو ٹال جاتا تھا۔
اوفس میں جب جب مہر علی نے تلمیذ سے امینہ کے بارے میں کہا ''کیسی عورت ہے! ہاتھ بڑھاؤ کہ اپنے ہاتھ میں لے لے تو سمٹ جاتی ہے، مطلب کی بات کہو تو اٹھ کھڑی ہوتی ہے!''
تلمیذ خاموشی سے اس کی شکایت سنتے ہوئے مسکراتا رہتا۔ حقیقت میں اس پر آ کر بند ہو جانے والی صرف ایک عورت تھی، امینہ۔

اُس زمانے میں جس شب پروگرام بنتا تھا مہر علی، مرتضیٰ قریشی اور اس قسم کے دوسرے دو تین 'بنڈل باز' ساتھیوں نے اس کی فرمائش کی ہوتی تھی اور تلمیذ کو یا تو ان کا احسان چکانا ہوتا تھا، یا اُن سے کوئی نیا کام لینا۔ تلمیذ جانتا تھا سب کے سب بزدل تھے — سب کے سب بدحیا، بیویوں یا ناکامیوں کے بدحیا کیے ہوئے۔ دو ایک سے ان کی ناکامی کی داستان سن کر وہ کہہ چکا تھا ''تم Made in Germany'' ہو۔ پرفیکٹ، بے عیب چائنا سیٹ۔ تمہاری ماں نے تمہیں بلانقص کا بیٹا بنایا تھا، بیوی نے ویسا ہی رہنے دیا — بس ایسے ہی رہو۔''
آخری بات مہر علی پر عاید نہیں ہوتی تھی۔
وہ عورتیں جنہیں امپورٹ ایکسپورٹ کی دنیا کے تاجر او۔جی۔ایل کہتے ہیں — ایسا مال جو چاہے بغیر اسپیشل لائسنس کے امپورٹ کرے — اور تلمیذ کی دوست تھیں وہ اُن پر ہنستی نہیں تھیں اور یہی فرق وہ اپنی بیویوں اور اُن میں پاتے تھے۔ مشترکہ عورت در سس منکوحہ۔
اُن لوگوں کی شکلیں یاد آ جانے پر، جیسے بھک منگے ہوں، تلمیذ کو ہمیشہ ہنسی آ جاتی۔

کبھی اس کی آنکھوں میں جج رئیسہ بربط کا بیڈروم گھوم جاتا۔ مرتضیٰ قریشی کی اُن کے الفاظ میں 'پون بہتر'۔

یہ بات انہوں نے اپنی بیوی کے لیے تلمیذ نے 'آپ کی better half' (نصف بہتر) سُن کر کہی تھی: ''نصف بہتر نہیں صاحب، پون بہتر کہیے۔''

لوگوں کا کہنا تھا اُن کی بیوی انہیں پاس نہیں پھٹکنے دیتی تھی۔

ایک بار وہ نشے میں تلمیذ سے پھوٹے تھے: ''کہتی ہیں تم مجھے بیماری لگاؤ گے۔''

تلمیذ نے کہا تھا ''آپ وکیل ہیں وہ جج۔ دونوں میں فاصلہ بہرحال رہنا چاہیے۔''

انہوں نے اپنی بات جاری رکھی ''کبھی تم نے وہ گڑیا گڈے دیکھے ہیں جنہیں پلنگ پر پاس پاس لٹانے کی کوشش کرو تو ایک پھدک کر اپنا سر دوسری طرف کر لیتا ہے We are puppen de kussen''

''وہ کیا؟''

''جرمن ہے: مقناطیسی گڑیا گڈے۔ وہ ہم دونوں ہیں۔ میں گڈا ہوں لیٹا رہتا ہوں، وہ گڑیا ہیں: پھدک کر دور چلی جانے والی۔ مجال ہے دونوں کے سر ایک سیکنڈ کے لیے پاس پاس ہو سکیں۔''

''آپ نے وہ کہاں دیکھے تھے؟''

''صاحب جب رئیسہ جاپان گئی تھیں وہاں سے خود لائی تھیں۔ یعنی ہم دونوں kissing poop-puh ہیں۔ ان لفظوں کو بھی میں نے زندگی میں پہلی بار اُن کے مُنھ سے سُنا تھا۔ جرمنی ہی کا بنا ہوا وہ کھلونا تھا۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ بولے: ''آیئے۔ میں آپ کو اُن کا بیڈروم دکھاؤں۔''

اس وقت رئیسہ بربط گھر پر نہیں تھیں۔ کمرہ اتنا رنگوں بھرا تھا کہ لگتا تھا کسی بچے کی نرسری ہے۔

دیواروں پر رنگین کاغذ چسپاں تھے جن پر پھول پتیاں تھیں، تتلیاں، چھوٹی چھوٹی پُھل چسپی جیسی چڑیاں۔ یہاں وہاں جانور بھی تھے۔ بچے کو ڈرانے کی جگہ خوش کرنے والے۔ ایک شیشے کی الماری میں مختلف ملکوں کی گڑیاں تھیں جو مختلف ملکوں کے سفر میں جمع کی گئی تھیں اور miniature (چھوٹے چھوٹے) موسیقی کے آلات۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کی تصویریں اور ان کے درمیان جج رئیسہ بربط کے بچپن کی ایک سیاہ اور سفید تصویر۔

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے تمیذ نے کہا: ''آپ واقعی گندے ہیں۔''

مرتضیٰ قریشی کے بارے میں مشہور تھا اگر موکل کم عمر ہو اور شادی شدہ وہ خود اس کے گھر کیس فائل لے کر جاتے تھے۔ دوسرے ان کے ایسے کیس کبھی فیصلے کا دن نہیں دیکھتے تھے۔

وکیل صاحب کے گھر سے رخصت ہوتے وقت تمیذ نے پوچھا:

''کیا پہلی رات سے آپ دونوں چِت تھے؟ وہ گندے گڑیا جن کا نام ابھی آپ لے رہے تھے۔''

''کھل کر بات کرو۔'' وہ بولے

''میرے ذہن میں آپ کی پہلی رات کا سین یوں ہے: آپ حجلۂ عروسی میں داخل ہوئے۔ وہ تکیے پر سر رکھے لیٹی ہیں۔ آپ نے ان کے برابر میں سر رکھا: انہوں نے قلابازی کھائی اور سرپائنتی پہنچ گیا۔ پھر آپ نے قلابازی کھائی سرپائنتی پر، ان کا سر سرہانے اور سہاگ رات اسی میں بیت گئی۔''

مرتضیٰ قریشی نے روہانسو ہو کر کہا: ''نہیں پہلے تین مہینے میں ایسے نہیں ہوا تھا۔''

''اور اب؟''

''صاحب: وہ کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے[۱]

تمیذ نے سگریٹ بٹ کو جوتے تلے مسلتے ہوئے کہا ''اور تب سے آپ اپنا دل باہر بہلا رہے ہیں۔ آپ انہیں کیا کہتے ہیں رئیسہ یا بربط؟''

---

۱ مومن

''بربط ان کا شاعری کا نام ہے۔ رئیسہ قادری سرکاری نام جو عدالتی کاغذوں اور بینک کے چیک وغیرہ کے لیے ہے۔ میں انھیں بے ربط کہتا ہوں۔''

''رابطہ آپ سے نہیں ہے، خود کو بے ربط کہیے۔ ان کا تو شاعری سے رابطہ ہے۔ ویسے میرا ایک سنجیدہ مشورہ ہے۔''

''کیا؟''

''اپنا کیس ان کی عدالت میں کسی دوسرے وکیل سے پلیڈ کرائیے۔''

مرتضیٰ قریشی نے اُسے گھور کر دیکھا۔

وہاں سے روانہ ہونے کے وقت سے کافی دیر بعد تک تملید ہنستا رہا' کیا کیا نمونے قدرت نے پیش کیے ہیں۔ دیکھنے میں ہیوی ویٹ نہ سہی بوکسنگ کے میڈیم ویٹ چیمپئن ہیں مگر بجائے شوگر رے رو بن سن کو چیلنج کرنے کے شوق ہے دوسروں کی فائنس کا حال ریڈیو پر راؤنڈ بہ راؤنڈ سننے کا۔'

اُس پوری ٹیم میں جو غم غلط کرنے کے لیے کسی شام اُدھر کا رخ کرتی تھی جدھر کھاڑی کے دونوں طرف آبادی ختم ہوجاتی تھی، دونوں طرف لیگون تھیں اور ان کے کناروں پر رنگ رلیاں منانے والوں کے لیے ہٹ بنی تھیں۔

وہ شامیں اندھیرا ہونے پر شروع ہوتی تھیں جب اُن باعزت، سفید پوش لفنگوں میں سے ایک کار کا انتظام کرتا تھا۔ پھر تملید کے وہ کارآمد دوست ہوتے تھے، ساتھ میں ایک کارآمد عورت دوست اور دوسری تملید کی وفادار دوست۔ دیکھنے میں چست ہوشیار قسم کے تندرست مرد لیکن جنسی بھک منگے، جوان اور ادھیڑ عمر والے جن میں سے اکثر کی بیویاں تھیں اور کچھ کی جوان اولاد۔

'کیا سین ہوتا اگر کوئی کسی پہاڑی سے دیکھتا: اندھیری رات ہے، یا پورے چاند کی، ایک کار اُس سنسان سڑک پر چلی جارہی ہے۔ مسافروں کے ساتھ پیاس بجھانے کو وہسکی اور

سوڈا ہے اور بھوک کا انتظام، جو ایک بھوک کے مٹنے پر اور بڑھ جائے گی: مرغی کی ٹانگیں اور سینہ یا بکری کی چوپس۔ وائے وہ مرغی اور بکری کا بچہ جس کی قسمت میں شراب کے ساتھ اُن کے پیٹ میں اترنا ہوتا تھا، بجائے کسی نیک آدمی کی غذا بننے کے! کیا وہ مرغی اور بکری بھی روزِ حشر سوال کریں گی؟

'لگتا تھا کسی مہم پر جا رہے ہیں اور مہم نمٹا کر ابھی لوٹیں گے، ہوٹل میں دوبارہ کھانا کھائیں گے اور اپنے گھر جا کر سو رہیں گے! نہ بیوی کو شبہہ ہوگا کیا مہم سر کر کے آئے ہیں، نہ ماں باپ کو۔'

یہ کمپوزیشن اُن آخری پانچ سالوں میں نہیں ٹوٹا تھا — تین چار بھک منگے، ایک مشترکہ عورت۔ بہتر، مہذب الفاظ میں a collectivized woman۔ جو تکمیذ اور اس کی وفادار دوست کے نزدیک اتنی قابلِ عزت نہیں ہوتی تھی۔ جتنے سال چاول والا بلڈنگ میں اس کا آفس رہا مشترکہ دوست عورتیں بدلتی رہیں۔' ہر ایک کسی غائب دنیا سے آئی تھی، آئی اور واپس اُسی میں غائب ہوگئی۔ دوسری عورت دوست نے اس کی جگہ لے لی۔'

لیکن جو عورت پورے نو سال نہیں بدلی اس کی اتنی ہی وفادار رہی جتنی اپنی شوہر کی ہوگی، یعنی اگر کوئی شوہر تھا تو۔'اگر میں سوچوں میں نے زندگی میں کوئی نیک کام کیا ہے تو وہ اس کے بھائی کو پڑھانا تھا۔ بس میری اتنی کمائی ایمان داری کی تھی اور ایک نیک انسان کے مصرف میں آئی۔'

'ایسی عورتیں کہاں سے آتی ہیں؟ گھر سے کیا کہہ کر آتی ہیں کوئی نہیں جانتا۔ لیکن ہوتی ہیں، یہ اہم پوائنٹ ہے، اور وقت پڑنے پر پیاسی زمین پر بادل کی طرح کہیں سے آ جاتی ہیں۔ اگر پیاسی زمین سے بادل کو بیر نہ ہو۔'

وہ وفادار عورت ایک دفعہ آنے پر بہت خاموش تھی۔ زیادہ پوچھنے پر رونے لگی اور جب تلمیذ کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس آیا کہ چپ کراؤں وہ اس سے لپٹ گئی: ''مجھے چھوڑنا مت۔ مجھے چھوڑنا مت۔''

لیکن کب اس نے اس کی ذمے داری لی تھی جو چھوڑنے کا سوال پیدا ہوتا!

شوہر نے اس کے لیے کچھ نہیں کیا تھا۔

کبھی امینہ اس کے دفتر کا چکر بھی مار جاتی تھی، لیکن زیادہ تر ہوٹل کے کمرے میں ملنے آتی تھی۔ برقعے میں۔ اوفس آنے کا مطلب ہوتا تھا پریشان ہے۔ اس کے پوچھنے پر ''کچھ چاہیے ہے؟'' کبھی ''ہاں'' کہتی تھی، کبھی نہ میں سر ہلا دیتی تھی۔ کبھی اس کے ہاں کہنے پر تلمیذ کو کہنا پڑتا تھا ''آج کڑکی ہے۔'' پھر بھی جتنا ہوے میں ہو دے دیتا تھا۔ بیوی کی طرح مانگنے کا اُسے حق مل چکا تھا یا اس نے اُسے حاصل کر لیا تھا، لیکن بیوی کی طرح ضد کرنے اور نہ ملنے پر تپیا دکھانے کا حق اُسے نہیں ہے یہ وہ جانتی تھی۔ اسی میں اس کی خودداری تمیذ کو نظر آتی تھی۔

تلمیذ نے امینہ کو نوجوانی سے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے تیس پینتیس کی عمر کو پہنچتے ہوئے دیکھا تھا اور اکثر سوچتا تھا' یہ میری جیسی کیوں ہے؟ ہرجائی لیکن محدود۔ عبادت سے دور، گناہ و ناد کے بارے میں شاید اس نے کبھی سوچا ہی نہیں ہے۔'

جب پیٹ کے اوپریشن کے لیے جنرل وارڈ میں داخل تھی اور وہ اُسے دیکھنے گیا تھا تب بھی حالانکہ جانتی تھی مرتے مرتے بچی ہے اور بچہ ہونے کا امکان نہیں رہا تب بھی خدا اور اپنے ناخدا سے ذرے بغیر (یعنی اگر ناخدا رکھتی تھی) اس نے جو باتیں کی تھیں زندگی بھر تمیذ کے ذہن میں ابھرتی رہیں۔'' جی چاہتا ہے ٹھیک ہو جاؤں تو پھر تمہارے ساتھ سینماؤں میں جاؤں۔ بوکس میں تم ہو اور میں، پھر کوئی ہوٹل، کشتی میں تمہارے ساتھ، تمہارے لیے گلاس

میں برف ڈالوں اور سونے کے رنگ کی شراب، اس میں سوڈا ملاؤں جتنا تمھیں پسند ہے، تمہاری سگرٹ سلگاؤں۔''

ان سب باتوں کے بیچ میں اس کا ہاتھ پیٹ پر جاتا تھا جہاں ٹانکے ہوں گے لیکن کوئی ذکر وقت آنے پر بخشے نہ جانے کا نہیں آیا تھا۔ بالکل تلمیذ کی طرح جب وہ متعدد بار پکڑے جانے سے بچا تھا۔ جب ریٹ سے زیادہ پر برف بیچنے پر پکڑا گیا تھا اور پولیس مین کو ایک سائیکل سوار پر دھکا دے کر بھاگ نکلا تھا۔ اس نے نہ تب قصور قبول کیا تھا نہ جب، جب وہ بڑی بہن اور بہنوئی سے جھوٹ بولتا تھا روزہ ہے۔ تب روزہ کھانا گناہ نہیں تھا، بہن بہنوئی کے حکم کو توڑنے کی جیت تھا۔ سوال جواب پر وہ ان دونوں سے دور کھڑا ہو کر بات کرتا تھا، ڈرتا تھا اس کی سانس میں بسی دیسی کی بو اور سگریٹ کا دھواں ان کی ناک تک نہ پہنچ جائے۔

'اگر میری جیسی نہ ہوتی تو میں اُسے طلاق دلواتا اور شادی کر لیتا کیونکہ جس سوسائٹی میں گیارہ بارہ سال سے ہے جب وہیں نہ بگڑی تو آگے کہاں بگڑے گی۔ رہا، ایمان تو وہ اس میں ہے۔ شراب سے کہتی تھی ''ایمان جاتا رہتا ہے'' اسے دردبھری ہنسی آئی۔ دوسرے کے لیے بوتل سے انڈیلنے اور اُسے پلانے سے نہیں۔'

وارڈ میں وقت آنے پر وہ اشارے سے اسے دور ہو جانے کو کہتی تھی۔ اور اگر اس کے ملنے والے پہلے سے وہاں موجود ہوں تو تلمیذ کو وارڈ میں داخل ہوتے دیکھ کر وہی اشارہ کر دیتی تھی۔

اس کی یاد آنے پر بہت دیر تک تلمیذ غمگین ہو جاتا لیکن اپنی درگت کو بھولا رہتا۔

'میں نے زندگی ہر طرح بسر کر کے دیکھ لی۔ کچھ نہیں بنا۔ صرف وہ خوش قسمت ہوتے ہیں جنہیں زندگی بنی بنائی ملتی ہے۔

'اکثر کپڑے، ٹائیاں اور بیلٹس ایسی ہوتی ہیں کہ الٹو تو دوسری طرف دوسرا ہی ڈیزائن اور رنگ ہوتا ہے، جیسے دوسری ہے۔ زندگی کو تو اے خدا میں نے اس چادر کی طرح پایا جس کی دو نہیں چھ سات بلکہ ان گنت طرفیں ہیں اور پلٹ پلٹ کر اوڑھا اور پہنا لیکن ہوا کیا: اس الٹ پھیر میں

چادر جلد پھٹ گئی۔'

(۲۹)

جن دنوں تمیز کے دماغ میں اپنی خودنوشت کے لیے 'ایک اوباش کی زندگی اور زمانہ'[۱] کا ٹائٹل ابھرا تھا اور اُسے وہ اپنی لائبریری کی دوسری کتابوں کے درمیان رکھا ہوا دیکھنے لگا تھا۔ عنابی چمڑے کی جلد میں، جس کے دھستے پر سنہری حروف میں ٹائٹل اور مصنف کا نام نمایاں ہے، اس نے خود کو تھوڑے فاصلے سے دیکھنا اختیار کر لیا تھا۔

اپنے اُن دوستوں کو بھی جو سمندر کے کنارے کی رات کی پارٹیوں میں التجا کر کے شریک ہوتے تھے وہ 'بیسویں صدی کے نامور کوک روچ رسیا'[۲] کہنے لگا تھا جو رات کو نمودار ہوتے تھے، پیٹ بھرتے تھے اور کونوں کھدروں میں اگلی شب کے لیے غائب ہوجاتے تھے۔ جب بھی وہ رات آئے۔ اُن پر وہ دل کھول کر ہنستا تھا: 'زندگی نے ان سب کو کیا بنا دیا ہے! پتہ نہیں جب جوانی کی ڈگر پر تنے تنے چلے ہوں گے اپنے بارے میں کیا رائے رکھتے ہوں گے؟ ویلینٹینو؟[۳] حرم رکھنے والے نواب صاحب؟ ان میں سے ہر ایک جب مجھ سے پہلی بار ملا تھا کیسا لیے دیے تھا۔ متانت کا مجسمہ اور اب فرمائش کرتے ہیں: "تمیز بہت دن ہوگئے۔ کچھ انتظام کرو۔" جیسے گڑگڑا کر بھیک مانگ رہے ہوں۔

مہرعلی بھی ان پارٹیوں میں شریک ہوتا تھا لیکن وہ دوسروں سے مختلف تھا۔ صرف دوسرے کا مہمان ہونا نہیں جانتا تھا، میزبانی بھی اس کی فطرت میں تھی اور یہ اس کے باوجود تھا کہ تمیز سے اپنے کام کی فیس نہیں لیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ شام کو تھکا ہارا تمیز کے آفس میں پہنچتا اور جب کوٹ اتار کر اور ٹائی ڈھیلی کر کے ایک کرسی میں پڑ جاتا اور تمیز پوچھتا "کیا چلے گا؟" تو وہ کہتا: "کچھ نہیں۔ آؤ شریفوں کی طرح کسی ڈیسینٹ ریسٹورنٹ میں چل کر چائے پئیں، کھانا کھائیں۔"

---

۱ Life and Times of a Debauchee

۲ The Famous Cockroach Debauchers of 20th Century

۳ Rudolph Valentino

تمیذ کہتا: "پیسے کاٹ رہے ہیں؟"

وہ کہتا "ایک اصیل مرغ ذبح کیا ہے۔"

تمیذ کو اس پر پیار آ جاتا: 'مجھے مرغا نہیں سمجھتا ہے، اسی لیے ذبح بھی نہیں کرتا ہے۔'

گھر کا تنہا آدمی تھا۔ وہ اور بوڑھی ماں۔ باپ مر چکے تھے۔ بڑے بہن بھائی یا تو دنیا سے رخصت ہو چکے تھے یا اس ملک سے۔ تمیذ جانتا تھا اس کی ماں کو کوئی لڑکی پسند نہیں آتی ہے اس لیے ملنے والوں، رشتے داروں نے رشتے لانے چھوڑ دیئے تھے۔ پھر بھی وہ زندہ دل تھا۔

ایک دن مہر علی نے کہا "تمیذ چلو ایک پارسی شادی میں چلتے ہیں۔ تم نے پہلے نہیں دیکھی ہوئی۔" اس کے ہاتھ میں خوبصورت رنگین کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ تھا۔

تمیذ نے کہا "تمہارا کا انت ہوگا۔ میں بغیر بلائے پہنچ جاؤں؟"

اس نے جیب سے بلاوے کا کارڈ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا "نہیں تم 'and family' میں آتے ہو۔" ("مع اہل خانہ" میں)۔

شادی ایک بڑے ہوٹل میں تھی۔ اس کا مالک بھی ایک پارسی تھا۔ لیکن شرکت کرنے والے صرف پارسی نہیں تھے۔ لان میں آرکیسٹرا سنجیدہ قسم کی مغربی سنگیت کی دھنیں سنا رہا تھا لیکن اتنی دھیمی کہ نزدیک بیٹھے ہوئے مہمان بھی ایک دوسرے سے بات کر سکتے تھے۔

جس پارسی لڑکی نے مہر علی کو مدعو کیا تھا ڈاکٹر تھی، اس نے دونوں کو لے جا کر فوارے کے نزدیک بٹھایا جدھر قدرے اندھیرا تھا اور بولی "کیا پئیں گے؟" مہر علی نے کہا "بس پیاس بجھانے والی چیز۔" وہ ہنس پڑی۔ "اور آپ کے دوست؟" تمیذ نے کہا "ginger ale"۔

"بس؟"۔ "بس" دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

اس کے جانے کے بعد مہر علی نے سرگوشی میں کہا "وہ دو شخص جو داخل ہو رہے ہیں۔ انہیں ذہن میں رکھو۔"

تمیذ اُن دونوں کو جن کا بڑی آدر سے سواگت کیا جا رہا تھا دیکھنے لگا۔

مہر علی نے کہا "چھوٹے قد والا موٹا آدمی جج ہے، لمبے قد والا موٹا آدمی ڈاکٹر۔"

تمیذ کو اُن میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی سوائے اس کے کہ شاید دونوں ہی دھاگڑ پینے والے تھے۔

مہر علی نے کہا "ان کا قصہ باہر نکل کر سناؤں گا۔"

لوگ گروپس میں اندر ڈائننگ ہول میں جاتے اور وہاں سے نکلتے رہے۔ ایک بار پھر میزبان ڈوکٹر نے پاس آ کر کہا "اگر بھوک زیادہ نہیں ہے تو آپ دونوں گھر والوں کے ساتھ کھائیں گے۔"

تمیذ کو وہ لڑکی graceful لگی اور اس کے پاس سے چلے جانے کے بعد اس نے مہر علی سے کہا "ان کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے تو میں قیامت کے دن تک بھوکا رہنے کو تیار ہوں۔"

مہر علی ہنس پڑا "مس خورشید مستری۔ کارڈیولوجسٹ ہیں۔"

کھانا اور تمام شادیوں کے کھانے سے مختلف تھا۔ ہر ایک سامنے چاندی مڑھی ہوئی ٹرے میں لایا گیا۔ اس میں سب کچھ تھا — میٹھی چٹنی بھی۔

کھانے کے دوران دونوں موٹے آدمی، ایک لمبا ایک چھوٹا دور کے دروازے میں نظر آئے اور میزبان اپنے دونوں مہمانوں سے "excuse me please" کہہ کر اُن کی طرف گئی۔ دوسرے گھر والے بھی وہاں پہنچ گئے تھے — غالباً ان کی آمد کا شکریہ ادا کرنے کے لیے۔

جس کمرے میں شادی کا کھانا ہوا تھا اس میں نہ سگرٹوں کا دھواں تھا نہ زیادہ کھا جانے والوں کی ڈکاروں کا تعفن، لیکن باہر کی ہوا اس سے بھی بہتر تھی۔ بغیر طے کیے ہوئے دونوں تمیذ کے ہوٹل کی طرف چل پڑے۔

مہر علی نے اچانک پوچھا "ذہن میں ہیں دونوں؟"

"بالکل۔ سناؤ تمہیں اُن میں اتنی دلچسپی کیوں ہے؟"

''اس لیے کہ وہ موٹا بے گردن کا لمبا آدمی یہاں کی تینوں جیلوں کا سینئر موسٹ ڈوکٹر ہے، زبردست پیسے والا ہے۔ ہمیشہ سے سب مرنے والے قیدیوں کو ایک ہی سرٹیفکیٹ دیتا آیا ہے: Death due to heart attack (اچانک دل کے دورے سے موت) اور کوئی اس کے سرٹیفکیٹ کو چیلنج نہیں کرسکتا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد دونوں ایک پلیا کی چوڑی منڈیر پر بیٹھے ہوا کا لطف لے رہے تھے اور مہرعلی اُن ڈوکٹر اور جج کا قصہ سنا رہا تھا۔

''یہاں جیل کی دنیا میں اور پریس والوں کو بھی پتہ ہے یہ وہ ڈوکٹر ہے جس نے ایک نرس کا پوسٹ مورٹم اپنی فوریزک میڈیکل لائن کے شروع کے دنوں میں کیا تھا اور ایک ہی کیس میں اپنی زندگی بنالی۔ ملک بھر میں یہ ڈبا برطانیہ کی ڈگری رکھنے والا پہلا پولیس سرجن تھا۔

''ہوا یہ کہ اس کی خوش قسمتی سے اس بے چاری نرس کے ایک امیر گھرانے کے ایک بے مصرف زندگی گزارنے والے نوجوان سے تعلقات ہو گئے تھے۔ شاید وہ اُس کے وارڈ میں داخل ہوا ہوگا یا وہاں کسی مریض کو دیکھنے جاتا ہوگا۔ وہ نرس خود جیسا کہ میں نے بہتوں سے سنا ہے باعزت لیکن تھوڑے غریب گھرانے کی تھی۔ نوجوان نے اس سے شادی کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ نرس پر crisis کی گھڑی کے نزدیک آتے جانے پر بھی اُسے ٹال رہا تھا۔ نرس سے غلطی یہ ہوئی کہ اسے لاکار بیٹھی 'شادی کرو ورنہ میں ساری بات تمہارے گھر والوں کو بتا دوں گی اور اپنے گھر والوں کو بھی۔ پھر مجھے پرواہ نہیں ہے کیس عدالت میں جائے گا یا پریس میں'۔''

''خیر یہ تنفس اس کی دھمکی تھی۔'' مہرعلی نے سگریٹ نیچے پانی میں پھینکتے ہوئے کہا۔'' نہ نوجوان کے ماں باپ سے ملنے گئی نہ انہیں خط لکھا۔ نوجوان نے خود اپنے باپ کو بتایا: 'باوا یہ کر بیٹھا ہوں'۔

اس نے کہا 'اس کا مجھے علم تھا کہ نوجوانی کے جوش میں کدھر جارہا ہے اور جانتا تھا وہ ایسا کرے گی۔ چھوٹے گھرانے کی عورت ہے، اس سے اور کیا امید ہوسکتی تھی! تو نے اُسے پیسہ دیا؟'

نوجوان نے کہا 'اس نے لینے سے انکار کردیا'۔

بڈھے نے کہا 'تو بنا راستے سے کیا مُنّا پالنا؟'

'نوجوان نے باپ کی شے پا کر ایک گھٹیا سے دوست سے جو شکل سے کن میلیا لگتا ہے — میں نے اُسے دیکھا ہے — وہاں کے ایک حکیم سے جہاں رنڈیاں بیٹھتی ہیں، سنکھیا خریدوائی۔

عدالت میں دو گواہوں نے بتایا انہوں نے نرس اور اس نوجوان کو اس کی کار میں اس کلب کے پاس دیکھا تھا جو پہلے صرف انگریزوں کے لیے تھا اور اب اس میں یوریشین اور دیسی لوگ بھرے رہتے ہیں۔ کار کی شناخت بھی دونوں نے کی۔ وقت وہ تھا جب ٹریفک وہاں نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے — اندھیرا تھا، وہ کہہ رہی تھی:

'تم نے مجھے یہ کس چیز کا انجکشن لگا دیا ہے؟ ارگٹ کا نہیں ہے۔'

یہ بات سن کر دونوں دوبارہ کار کے بالکل پاس سے آہستہ آہستہ گزرے۔ ساری تفصیل اخباروں میں چھپی تھی۔ نوجوان کہہ رہا تھا: 'انجکشن لگانے سے پہلے تمھیں بتا چکا ہوں پیٹ صاف کرنے کا ہے۔ پیٹ صاف ہو جائے پھر شادی ہو سکے گی۔ اباجی، امی جی کو شبہ ہے کہ تم پیٹ سے ہو۔ بچہ کسی اور کا ہے اور اسی لیے تم مجھ سے شادی کرنا چاہ رہی ہو۔ وہ ہرگز اس شادی پر راضی نہیں ہوں گے۔ میں کہہ چکا ہوں تم کنواری ہو۔

'جب درد شروع ہو تمھیں مجھے بتانا ہے۔ میں نے دائی سے معاملہ طے کر لیا ہے۔ اسی نے انجکشن دیا تھا۔ وہی صفائی کرے گی۔ ابھی تمھیں اس کے پاس لیے چلتا ہوں۔'

''میں نے سنا تھا انجکشن سے پہلے وہ نرس کو اورنج جوس میں کوئی strong hypnotic دے چکا تھا جس کا پینے کے بعد بھی بے چاری کو شک تک نہیں ہوا۔ جب وہ نیند میں ڈوبتی جا رہی تھی تب اس نے اُسے انجکشن دیا تھا۔

دونوں گواہوں نے عدالت کو بتایا تھا 'وہ کہہ رہی تھی: میں بیہوش ہوتی جا رہی ہوں۔ تم نے مجھے کوئی زہر کا انجکشن دیا ہے؟ اس وقت لگتا تھا وہ چیخنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ہمیں شیشے سے اندر جھانکتے دیکھ کر اس نوجوان نے ہم پر پستول تان دیا تھا۔ ہمارے پاس سے ہٹتے ہی وہ کار کو تیزی سے چلا کر لے گیا۔'

""پھر نوجوان پکڑا گیا۔ جیل گیا، کیس چلا۔ پولیس سرجن، یعنی جس لمبے موٹے آدمی کو تم نے شادی میں دیکھا تھا، اس کی رپورٹ ملزم کے حق میں تھی۔ کیس سوئی سائیڈ کا تھا، وجہ ظاہر ہے بیچاری لڑکی کی پریگنینسی[1] تھی۔""

دونوں تالاب سے پانی کی طرف پیر لٹکائے بیٹھے تھے۔ تمیز جوتے کی ایڑیوں سے کنکریٹ پر ٹھوکے دے رہا تھا۔

""نوجوان نے کہا: 'ہوسکتا ہے مجھے اس نے اپنے وارڈ میں دیکھا ہو جہاں میں اپنے ایک دوست کو دیکھنے جاتا تھا لیکن مجھے یاد نہیں۔' ایک سوال پر اس نے کہا 'وہ دوست تب ہی مزید علاج کے لیے جرمنی چلا گیا تھا، ہوسکتا ہے زندہ نہ ہو۔' اس بات پر استغاثے کے وکیل نے جرح کرنی چاہی لیکن عدالت نے اجازت نہیں دی۔

پھر ضمانت پر نوجوان اپنے گھر گیا۔ اس کی شادی دھوم دھام سے ہوئی اور ہفتہ دس دن گھر میں گزار کر اپنے جیل کے کمرے میں آ گیا۔ یہ خطرہ نہ ہونے والی دلہن کو تھا نہ دلہن دینے والوں کو کہ دولہا کی زندگی جلد ختم ہوسکتی ہے۔ جیل کے کمرے میں دلہن اس سے ملنے آتی تھی۔
وہ کمرہ یہ تمیز کسی اچھے ہوٹل کے کمرے سے کم تو نہیں ہوگا؟""

تمیز نے ہاں میں سر ہلایا۔ لگتا تھا وہ رو دے گا۔

""کیس پھر چلا۔ وہاں بھی اس کی بیوی ہر پیشی پر آتی تھی۔

جج نے یعنی اس دفعہ فٹ ۳ انچ کے موٹے آدمی نے فیصلہ سنایا: یہ ٹھیک ہے نوجوان نے نرس سے شادی کا وعدہ کیا تھا اور ماں باپ کے اصرار پر کہیں اور شادی کر رہا تھا جس کی اجازت اس کا مذہب دیتا ہے۔ مگر اس شادی کے لیے اُسے اپنی دوست، یا اگر وہ پہلی بیوی بھی تھی، کو راستے سے ہٹانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ایک انتہائی رئیس گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ باپ مختلف جائیدادوں کے علاوہ ایک فلم اسٹوڈیو اور متعدد سینما ہالوں کا مالک ہے۔ ایسے آدمی کا بیٹا دونوں عورتوں کو علیحدہ علیحدہ ذاتی مکانوں میں رکھنے کا خرچہ باآسانی اٹھا سکتا تھا۔

[1] حمل

''ایک اور بات جو اخباروں میں نمایاں طور سے چھپی یہ تھی کہ جج نے جرح کے دوران کہا تھا:
'حقیقت یہ ہے نرس نے خودکشی کی ہے کیونکہ وہ نرس تھی اور انجکشن لگانا جانتی تھی۔'

''استغاثے کی یہ دلیل کہ انجکشن سے پہلے ملزم نے نرس کو کوئی بڑی خواب آور دوا دی تھی تو کسی کولوجسٹ [1] کی رپورٹ سے ثابت نہیں ہو سکی۔

''آخری پیشی پر نرس کے ماں باپ خاموش بیٹھے تھے۔ انہوں نے لوگوں کے کہنے میں آ کر وکیل کیا تھا اور بے چاروں کو ملا بھی تو شہر کا سب سے سستا وکیل۔ لوگ نہ کہتے تو ان کا ارادہ اتنے بڑے آدمی کے بیٹے سے ٹکر لینے کا نہیں تھا۔

''لوگوں کا کہنا ہے جج نے اس مہربانی کے لیے اتنی رقم لی تھی جو ملک کی رشوت کی تاریخ میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ اور ہمارے ڈوکٹر نے ــ؟ اس نے پہلے ہی بڑے کیس میں بنگلہ ہوا لیا سمندر کے کنارے، امریکی آٹھ سلنڈر کی کار لی اور تب سے اس کی گردن غائب ہونی شروع ہوئی اتنی کہ اب سر ڈائریکٹ سینے سے جڑ گیا ہے۔''

تمیذ نے اٹھتے ہوئے کہا ''گردن کا تکلف ختم ہو گیا۔ چلو چھٹی ہوئی۔''

''کا ہے کی؟'' مہر علی نے کہا۔

''آخری بات میری نانی ہر کہانی کے ختم پر کہتی تھیں۔''

---

١ ماہرِ سمیات

(۳۰)

''میری زندگی کا سب سے افسوس ناک دن وہ تھا جب میں شام کو میجسٹک ریستوراں امینہ کے ساتھ گیا تھا۔ اس کے کہنے سے میں ایک عام سی ہندوستانی فلم دکھانے اسے لے گیا تھا اور وہاں سے اٹھ کر ریستوراں میں کھانے کے لیے حالانکہ وہ کہہ چکی تھی 'بھوک نہیں ہے۔' میں نے کہا 'پھر بھی۔' باہر لان میں پینے والے میزوں پر بیٹھے تھے اور وہاں سے گزر کر اندر کیبن میں جاتے ہوئے میں نے اُن کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''ابھی میں نے جنجر ایل کا ایک ہی گھونٹ لیا تھا کہ بیرے نے وزٹنگ کارڈ سائز کا ایک پرچہ تشتری میں لاکر پیش کیا: غیور' برٹش عرب پرومیکوریٹ' انگریزی میں تھا اور اس کے نیچے اردو میں' کیسے ہو تبریز؟'

میں نے سر ہلایا اور باہر نکل آیا۔ وہ مجھ سے تبریز کہہ کر گلے ملنے کو تھا کہ میں نے اُسے خاموش کرنے کے لیے کہا 'تملیذ۔ کل ملوں گا۔'

وہ مسکرایا: 'اپنے بھی یہی دھندے ہیں۔ پردہ داری کیسی۔ جانتا ہوں ساتھ میں بھابھی نہیں ہیں۔ پھر؟'

میں نے کہا 'کوئی پردہ داری نہیں۔ کل ملوں گا۔'

'یہیں؟'

'ہاں۔'

''رات میں مجھے غیور دو طرح ستاتا رہا۔ ایک میرا نام لے کر، دوسرے اس کے قبضے میں میرے برٹش عرب پرومیکو ریٹ کے دن تھے۔ پتہ نہیں ان سے کیا کام لے گا؟ پھر دل کہتا: کام کیا لے گا، ہوسکتا ہے کوئی تھرڈ ڈگری کام سمجھائے۔ مگر میری بزنس ہے۔ کیٹگری ہولڈر ہوں۔ اس کے کہے میں کیوں آنے لگا۔ وہ شام میری زندگی کی منحوس ترین شام تھی اور اس کے بعد کی رات سخت اذیت سے بھری رات۔

''غیور اتنے سالوں میں بالکل نہیں بدلا تھا۔ وہاں بھی اسے کھلانے پلانے کی ذمے داری میری تھی، یہاں بھی۔ وہاں بھی میرے کپڑے پہن جاتا تھا اور واپس نہیں لاتا تھا، یہاں بھی یہی کر رہا تھا۔ جو نہیں بدلا تھا وہ تھا اس کا گنجا چمکتا ہوا سر اور پیلے دانت۔ یہاں اس کی ذات میں یہ اضافہ ہوا جب کوئی جگہ نہیں ملتی تھی تو عورت کو لے کر میرے ہوٹل کے کمرے میں آتا تھا۔' جگہ چاہیے۔'

''اسی نے پتہ لگایا تھا گورمنٹ کے کس محکمے کے کس دفتر میں باہر سے آئٹم امپورٹ کرنے کا کتنا بجٹ تھا اور اگر کام میں نہ لایا گیا تو وہ lapse کرنے والا ہے۔ یعنی زائل ہوجائے گا۔ یہ بات اُسے اس کے گرہ کٹ بھائی شان الٰہی نے بتائی تھی۔

کسی اور کو کیوں نہیں بتائی؟ میرا خیال ہے جیسے ہم چہرہ دیکھ کر کبھی کبھی بھانپ لیتے ہیں یہ شخص فلاں خاندان کے فلاں شخص سے ملتا جاتا ہے، گرہ کٹ بھی بغیر منہ سے ایک لفظ نکالے

ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ ہیڈ کلرک شان الٰہی اگر اپنے محکمے کے بجٹ کو جانتا تھا تو اس سے بس اتنا پتہ چلتا ہے اپنے کام میں efficient (مستعد) تھا، ہر چیز پر نظر رکھتا تھا۔ وہ تھا اس سازش کی روح رواں۔''

•

''مجھے وہ دن کبھی نہیں بھولے گا جس دن ہیرو (غیور) تین بجے کے قریب میرے آفس آیا تھا، خاموش بیٹھا رہا کیونکہ تین کاروباری آدمی وہاں بیٹھے تھے۔ جب ایک ایک کر کے وہ چلے گئے تو ہیرو میز کے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھا اور بولا 'تمیذ لگتا ہے ہمارے دن پھرنے والے ہیں۔'

میں نے کہا 'مطلب؟'

بولا 'خوش حالی بس نکڑ پر ہے۔ پہلے کھانے کا آرڈر دو۔'

کھانا کھاتے ہوئے میں اس کی بات کو بھول گیا تھا کہ بے کچھ نہیں۔ تھرل دے رہا ہے۔ لیکن جب ریستوران کا بیرا برتن اٹھا کر لے گیا تو اس نے سر میرے نزدیک لا کر کہا 'ڈیئر ایک پروپوزل ہے اور اس میں تمہارا امپورٹ کا تجربہ کام آئے گا۔'

میں نے کہا 'امپورٹ ایکسپورٹ کا۔'

بولا 'نہیں۔ بس امپورٹ کا۔'

پھر سگریٹ سلگا کر اس نے بتایا 'تم جانتے ہو رپورٹنگ کے سلسلے میں میری گورمنٹ کے مختلف محکموں میں اسٹاف سے واقفیت ہے، بلکہ ذاتی تعلقات۔ ان میں سے ایک ہیڈ کلرک سے ساتھ پینے کی دوستی ہو گئی ہے ــ'

میں نے کہا 'اس کی پیتے ہو گے۔'

'آج اس نے بتایا: اس کی بات کا سلسلہ میری دخل اندازی سے ٹوٹا نہیں۔' باہر کی ایک فرم سے

اس کے ڈیپارٹمنٹ کی خط و کتابت ہوگی۔ سامان امپورٹ کرتا ہے، سرکار اگر آپ کا تعاون ہوجائے تو کام آسان ہے۔'

جب میں نے اس سے تعاون کی حامی بھر لی تو اس نے بتایا 'سپلائی کے لیے اورڈر نکلنے والا ہے، تین مہینے میں سپلائی کی ڈیٹ کا۔ کوئی اس باہر کی فرم کا آدمی یہیں چاہیے خط و کتابت کے لیے۔'

میں نے کہا 'ہے۔'

'دفتر ہے؟'

میں نے کہا 'ہے۔'

بولا 'بینک ہے؟'

میں نے کہا 'اس کا انتظام ہوجائے گا۔ آگے بولو۔'

اس نے کہا 'خط و کتابت کے بعد اورڈر جائے گا۔ بینک میں ایل۔سی کھلے گا۔'

پھر غیور میری طرف انگلی بڑھا کر بولا 'اور وہ سب کچھ ہوگا جو تم کرتے ہو۔ بس مال نہیں آئے گا۔'

میں نے کہا 'دستخط؟'

بولا 'وہ شان الٰہی کرے گا، بہت دنوں سے مشق کر رہا ہے۔'

میں نے کہا 'شان الٰہی کون؟'

'اسی ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ کلرک۔ یار بعض اوقات تم اپنا دماغ بالکل بند کر لیتے ہو۔'

''بعد میں پتہ چلا ان کاغذوں پر دستخط کسی تیسرے آدمی کے ہوتے تھے، آگے چل کر اُس رنگے ہوئے سیار مرتضیٰ قریشی کا رول آتا ہے جس نے رہنمائی کی اور صاف بچ کر نکل گیا، کپڑوں پر چھینٹ بھی نہیں آئی۔

میں مرتضیٰ قریشی سے صرف مشورہ لینے گیا تھا کہ جرنلسٹ غیور، جو سمندر کنارے کی پارٹیوں میں شریک ہوکر اُن کا دوست بھی بن گیا تھا، خبر لایا ہے: فلاں گورمنٹ دفتر میں اتنا unutilized budget ہے، جس مد میں تھا اس کے لیے کام میں نہیں لایا گیا ہے، سال ختم ہونے کو ہے، اُورڈر نکلنے والا ہے باہر سے سپلائی کا۔ کوئی باہر کی فرم کا آدمی چاہیے ہے خط و کتابت کے لیے۔

میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اُن کے چہرے پر رونق آ گئی جیسے ریس میں جتائے جانے والے گھوڑے کا نمبر مل گیا ہو۔ بولے 'ڈیر کا ہے کی کرتے ہو مائی ڈیئر فرینڈ، ایسے موقعے زندگی میں بار بار نہیں آتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے وہ بجٹ recurring nature کا ہوگا۔ استمراری۔'
مجھے معلوم تو نہیں تھا وہ کیا ہوتا ہے مگر اُن کی موج کے ساتھ میں بھی بہہ گیا۔ بولا: 'ہاں ایسا ہی ہوگا۔'

سوچتا ہوں وہ بھی کس پائے کا بدمعاش ہے! چھپا ہوا!

پھر انہوں ہی نے کہا 'کل آپ[1] اپنے دوست اور ہیڈکلرک شان الٰہی کو لے کر میرے اوفس میں آیئے تو ساری logistics طے ہو جائے گی۔ ہر سال آمدنی ہوا کرے گی۔'

اگلے دن مرتضیٰ قریشی نے کہا 'ایک پریس سے رابطہ کرنا ہوگا جہاں نئی فرم کے لیٹر ہیڈ، لفافے اور رسید بک چھپیں گے۔ وہی ربر اسٹامپس بنوا کر دے گا۔'

میں نے کہا: میرا کوئی خاص پریس نہیں ہے۔ آپ کا کام Younus Enterprises والے کرتے ہیں۔ وہی سہی۔

انہوں نے کہا 'وہ درست نہیں ہے۔ مسرور بیگ سے کرایئے۔ وہ پہلے بھی ایسے ہوائی کام کرتا رہا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی خاطر باہر جانے والوں کے لیے پروفیسروں کے لیٹر ہیڈ چھاپتا ہے، پورے پیڈ نہیں بس چند پنّے۔ لفافے چھاپتا ہے اور اس کا کام ہائی کوالٹی کا ہوتا ہے۔ آپ کو دس پروفیسروں کے سرٹیفکیٹ چاہیے ہوں بس اُن دس کے نام اور ڈگریاں بتا دیجئے۔' پھر انہوں نے میرے ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا 'ڈگریاں بھی چھاپتا ہے۔ trustworthy (بھروسے کا) آدمی ہے میرا اور فیور کا بھی۔'

بیچ میں میری کہی ہوئی بات 'کیا اُسی نے آپ کی ڈگریاں چھاپی تھیں؟' انہوں نے نہیں سُنی۔ 'چاہیں تو کسی باہر کی یونیورسٹی کا رسرچ اسکولرشپ کسی بی ایس سی فیل کو دلا دیں، چاہے باہر کے ایم ایس سی تھرڈ ڈیویژنر کو یہاں پروفیسر بنوا دیں۔''

---

[1] بازی کی اگلی چالیں

''غیور جرنلسٹ، شان الٰہی ہیڈ کلرک، مسرور بیگ ضابطہ پریس کا مالک! میری سمجھ ہی میں نہیں آیا میں کن درندوں کے نرغے میں ہوں، جیسے شیر کے شکار کے لیے یہ درندے مجھے چارے کی طرح استعمال کر رہے تھے اور میں اس پر خوش تھا۔ اس سے پہلے نہ میں نے اس ہیڈ کلرک کی شکل دیکھی تھی، نہ مسرور بیگ کی۔ تعجب کی بات ہے ایک کرپٹ آدمی جس کے لیے سب کچھ جائز ہے کیسے پتہ لگا لیتا ہے اس کے کرپشن میں وہ شخص شامل ہو سکتا ہے جس نے یہ کام پہلے نہ کیا ہو اور راز کو راز رکھے گا؟ بیس تیس لاکھ کی آبادی کے شہر میں جو پیسہ بنانے کی پروجیکٹ اس نے سوچی ہے اُسے پورا کرنے میں کون کون اس کا ساتھی بن سکتا ہے۔ یا کروڑوں آبادی کے ملک میں کتنے افراد مل کر ایسا کام خاموشی سے کر سکتے ہیں!

''اس پہلی ملاقات میں شان الٰہی نے مجھ سے بغیر جھجکے کہا' ہر گورمنٹ محکمے میں ایسا بجٹ ہوتا ہے جو اگر کام میں نہ لایا جائے تو سال ختم ہونے پر lapse کر جاتا ہے۔ ختم شد۔ اور جہاں چند ضرورت مند اُسے خاموشی اور ہوشیاری سے اس طرح کام میں لے آئیں کہ باہر کی کسی فرم سے، فرضی فرم سے خط و کتابت ہو۔ وہ کاغذ پر مال سپلائی کرے اور اس کی ادائیگی پچاس فیصد پیشگی، پچاس فیصد مال ملنے پر چیک کی صورت میں ہو جایا کرے وہاں سمجھئے وہ بجٹ صحیح مصرف میں آ گیا'

تھوڑی دیر خاموشی سے وہ میرے پیچھے کی دیوار کو دیکھتا رہا، جیسے گہری سوچ میں ہو۔ پھر بولا 'ایک محکمے سے باہر کا آدمی کاغذ پر ایسی فرم کھولے گا جس کا وجود نہیں ہوگا، کہیں اس فرم کے کاغذات اور لفافے چھپیں گے۔ فرم کے پروپرائٹر میں اور دفتر کے آدمی میں خط و کتابت ہوگی۔

میں نے کہا: 'مگر لفافے پر اسٹامپ اور مہریں تو یہیں کی ہوں گی۔'

شان الٰہی نے غیور کی طرف دیکھا۔ دونوں مسکرائے پھر اس نے اعتماد سے کہا 'ڈاک ہر جگہ ہیڈ کلرک کے پاس آتی ہے۔ سیدھی صاحب کے پاس نہیں جاتی ہے۔ وہ پڑھ کر اس پر نوٹ لکھتا ہے۔ وہاں سے وہ کاغذ فائل میں لگ کر اندر صاحب کے پاس پہنچتا ہے۔ لفافہ باہر ہی ویسٹ پیپر باسکٹ میں جاچکا ہوتا ہے۔ صاحب کی approval (منظوری) کے بعد وہ کاغذ ہیڈ کلرک کے پاس واپس آتا ہے۔ satisfied?[1]'

پھر پینترا بدل کر اس نے کہا 'پہلے آپ مطمئن ہو جائیے پھر اس کام میں ہاتھ ڈالیے گا۔'

میں نے کہا: 'خطرہ؟'

مرتضیٰ قریشی بولے 'خطرہ کا ہے کا؟ کوئی تم ان کاغذات پر دستخط کرو گے یا چیک پر تمہارے دستخط ہوں گے! میں سارا procedure[2] سمجھ گیا ہوں۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'

اٹھنے سے پہلے شان الٰہی نے کہا 'اُس فارن فرم کے کاغذات اور لفافے جہاں بھی چھپیں اُن پر سارے ٹرانزیکشن کا دارومدار ہوگا یعنی authentic[3] ہونے چاہئیں۔'

غیور نے کہا 'وہ کام ہمارے بھروسے کا آدمی کرے گا۔'

اب میں سوچتا ہوں وہ گھڑی نہایت منحوس تھی جس کے لیے اس دوپہر غیور نے کہا تھا تمہاری میری خوشحالی بس نکڑ پر ہے۔ نہیں حقیقت میں وہ گھڑی نحوست کی تھی جس دن غیور سے پہلی ملاقات اُس عرب برٹش پر ڈیکوریٹ کے اسنیپر پوائنٹ کی ایک بار میں ہوئی تھی۔"

آنے والے دنوں میں جب شرم، غم اور غصّے کے جذبات مدہم پڑ گئے تو ایک طرح سے

---

۱ مطمئن ہو گئے؟

۲ ساری کارروائی

۳ اُن کے اصل ہونے میں شک نہیں ہونا چاہیے

سکون سے بیٹھے ہوئے تمیز کو اس ساری اسکیم پر ہنسی آتی تھی۔ ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ کو جو اپنی سادگی اور دیانت داری کی بنا پر پہچانے جاتے تھے اس پروجیکٹ یا اسکیم کی ہوا بھی نہیں لگی تھی کہ جو شخص اُن سے 'سر' کے بغیر بات نہیں کرتا تھا، ان کے وضو کے وقت لوٹا اور تولیہ لیے کھڑا ہوتا تھا، جانماز بچھاتا تھا، نماز ختم ہوجانے کے بعد اُسے تہہ کرتا تھا دستخط کے لیے رجسٹر یا فائل کھول کر سامنے رکھتا تھا وہی اُن کے دستخط بھی کرتا تھا۔ اور اُن سے بہتر، نہ بدلنے والے۔

نئی کاغذی فرم کھلواتے وقت مرتضیٰ قریشی نے تمیز سے کہا تھا ''تمہاری ایک فرم پہلے سے قائم ہے، یہ دوسری ہے۔ تمام تاجروں کی کئی کئی فرم ہوتی ہیں اس لیے—''

''میں جانتا ہوں۔'' تمیز نے کہا۔

''تم سارا procedure جانتے ہو۔ زیادہ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس اس کا خیال رکھنا کہ کسی بھی اسٹیج پر، کہیں بھی، ان دو فرموں کے معاملات گڈمڈ نہ ہونے پائیں۔ ذمے داری کا کام ہے۔''

فرم کا نام 'Neptune Traders Incorporated' تمیز نے کافی سوچ بچار کے بعد astrology[۱] اور numerology[۲] کے حساب سے رکھا تھا۔ خود اپنے نام کی ہجے بھی وہ اسی لیے تبدیل کرتا رہتا تھا— کس ستارے کے اثر میں ہونے سے اُسے خطرہ ہے اور کیسے ستارے کو بدلا جاسکتا ہے۔ آٹھ سے منحوس نمبر اس کے لیے کوئی نہیں تھا اور وہ اس سے ہمیشہ بچتا تھا۔ ۸، ۱۷، ۲۶ اس کے دشمن تھے — چاہے ہسپتال کا کمرہ نمبر ہو، ٹرین میں برتھ کا نمبر، یا تاریخ۔ معیز کے انگریزی ہجے اُس نے مقرر کیے۔

---

۱ نجوم، جیوتش

۲ اعداد کا پُراسرار علم

اگلی منزل تھی وکیل مرتضیٰ قریشی کے نئی فرم 'چیمپئن ٹریڈرس انک' کے پروپرائٹر کو ایک بینک میں متعارف کرانے کی اور وہاں لے جانے سے پہلے وہ تمیز سے کہہ چکے تھے نئی فرم کے لیے جو تمہارا نام ہے پسند آیا؟ وہ اس بینک کے بھی لیگل ایڈوائزر تھے اور بینک منیجر کی بیٹی کی طلاق اور سابقہ شوہر سے جہیز، زیورات اور مہر کے حاصل کرنے کے طویل مقدمے میں وکیل بھی۔ مقدمہ بہت الجھا ہوا تھا، تمام جائداد، طلاق اور وراثت کے مقدموں کی طرح۔

لیکن جس تندہی سے یہ کام مرتضیٰ قریشی کر رہے تھے اس کی وجہ سے بینک مینیجر ہمایوں ان کے ہاتھ بک سا گیا تھا۔ بینک میں نئی پارٹی کو انٹروڈیوس کرنے کا کام اس نے No problem[1] کہتے ہوئے خود کر دیا۔

مرتضیٰ قریشی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک لفظ بھی اُن کاغذات میں نہیں ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ نہ ان کے دستخط کہیں تھے۔

وہ تمیز کی اس نئی فرم کے بھی لیگل ایڈوائزر تھے جس نام سے کینگری بک چل رہی تھی — صرف زبانی طور پر۔

بینک سے نکل کر مرتضیٰ قریشی نے کہا "بالکل صاف معاملہ ہے۔ جن Gin[2] کی طرح شفاف۔ تمہارا باقاعدہ انکم کا انتظام ہو گیا۔ کہیں کوئی روڑا نہیں اٹکائے گا۔ اٹکائے گا تو ہم کس دن کے لیے وکالت کا دفتر کھولے بیٹھے ہیں!"

بعد میں تمیز کتنی ہی بار ہنسا کہ اس بینک میں جب پہلا چیک پچھتر ہزار روپے کا پیش کیا گیا تو گننے کے لیے ایک ایک کے نوٹ ملے اور یہ کام کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بینک کے اسٹرونگ روم میں بند ہو کر فرش پر بیٹھ کر کرنا پڑا جس کا دروازہ پلائی وُڈ کا تھا جو جگہ جگہ سے پچک کر اکھڑ گئی تھی۔ بند کرنے پر بولٹ بھی اپنے خانے میں نہیں ٹھیرتا تھا۔ دروازے کو بھڑا

---

۱ یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔
۲ ایک بے رنگ شفاف شراب

ہوا رکھنے کے لیے مرتضیٰ قریشی اس سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

تلمیذ نے تمسخر سے کہا ''کیا بینک ہے جس میں نہ دس کا نوٹ ہے نہ سو کا۔ بس چھٹا۔ شاید پنوازیوں، بھکاریوں کا بینک ہے جو اپنی روز کی کمائی یہاں جمع کراتے ہیں۔''

مرتضیٰ قریشی نے نوٹ گنتی ہوئی انگلیوں کو بغیر روکے کہا ''Good for our purpose''
(ہمارے کام کے لیے درست ہے)

مرتضیٰ قریشی کی شہرت اپنے حلقے میں دو نکات کی بنا پر تھی: ان کا کوئی کیس پچھلے پندرہ بیس سال کی پریکٹس میں کبھی کسی فیصلے پر ختم نہیں ہوا تھا۔ لوگوں کا کہنا تھا: وہ ایسا کیس ہاتھ میں لیتے تھے جس میں یا مدعی ایسا ہوتا جس کے مرنے کی جلد توقع کی جا سکتی ہو یا مدعا علیہ کی۔ مرجانے پر پس ماندگان سے فیس دوبارہ لیتے تھے کہ 'وہ فیس تو مرحوم کے لیے تھی۔ آپ اگر کیس کرنا چاہتے ہیں تو مجھے پھر سے hire کیجئے۔'

پچھلے تمام کاغذات مرنے والے کے وارث کے ہاتھ میں کسی منزل پر نہیں آتے تھے۔

'دوسرے۔' خیر وہ کام وہ تلمیذ کے ساتھ نہیں کر پائے اس لیے اس کا کیا مذکور۔

(۳۱)

تیسرے چیک کے کیش ہونے تک تمیذ کی مالی حالت اتنی سدھر چکی تھی کہ وہ سوچ رہا تھا گھر کرائے پر لے لیا جائے، چھوٹا سا بنگلہ، اور وہاں وہ ہو اور اس کی بیوی۔
چیک کیش کرانے کے لیے ہر بار اُسے بینک جانا پڑتا تھا۔ وہاں سے آ کر اسٹریٹ' ٹریڈنگ کورپوریشن کے دفتر میں رقم کی تقسیم ہوتی تھی، یا مرتضیٰ قریشی کے دفتر میں۔

چوتھی بار جو کچھ ہوا اس نے ایک بار پھر جھٹکے سے تمیذ کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔
جس کلرک نے اُس سے چیک کی پشت پر دستخط کرائے تھا۔ تمیذ کو کچھ دیر کھڑا رہنا پڑا۔ ایک بار پھر کلرک نے اس سے کسی اور کاغذ پر دستخط کرائے، انہیں دیکھا اور کہا ''تکلیف کی معافی ذرا دیر ٹھہریئے۔''
تمیذ کا دل زور سے پسلیوں سے ٹکرایا اور اس سے قبل کہ کلرک چیک لے کر واپس آئے یا خود نیا بینک منیجر اُسے اندر آنے کے لیے کہے وہ وہاں سے بغیر چیک کا انجام دیکھے بھاگ کھڑا ہوا۔ اپنے دفتر واپس آ کر اس نے مرتضیٰ قریشی کو فون کیا، شان الٰہی کو اور مسرور بیگ کو۔ غیور کا نہ کوئی مستقل دفتر تھا، نہ فون نمبر۔

' Strait Trading Corporation

مرتضیٰ قریشی نے بس اتنا کہا ''بس تم کچھ دن کے لیے غائب ہوجاؤ۔''
لگتا تھا شان الٰہی کے پاس دوسرے موجود ہیں۔اُس نے کہا ''چیک؟ کیا چیک؟ جب کام ہوجائے گا آپ کو پے منٹ کردیا جائے گا۔'' اور فون رکھ دیا۔
مسرور بیگ نے کہا ''پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے'' اور خدا حافظ کہہ کر فون رکھنے والا تھا کہ جیسے دوسرے خیال نے اُسے آن دبوچا: ''مجھے آج رقم کے ملنے کی امید تھی جس سے لائن مین، کمپوزر وغیرہ کی ہفتے کی تنخواہ ادا کی جاتی اور پریس کا بجلی کا بل۔ خیر دیکھا جائے گا۔ خدا حافظ۔''
لگتا تھا مسرور بیگ کو خوف سے زیادہ مایوسی ہوئی ہے۔

تمکینہ اس سے زیادہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ نئے بینک منیجر نے اس کے پیچھے آدمی دوڑایا ہوگا یا پولیس کو رپورٹ کی ہوگی اور کچھ نہ کچھ ضرور ہونے والا ہے۔ ایسا جو زندگی میں کبھی پہلے نہیں ہوا تھا۔

کئی دن وہ ہوٹل کے کمرے سے جو پچھلے چھ سال سے اس کا گھر تھا باہر نہیں نکلا۔ دفتر کا چپراسی آتا تو اسے اپنا نام بتانا ہوتا تھا، صرف 'میں ہوں صاحب' کہنے سے کام نہیں چلتا تھا۔ کمرے میں ڈاک جمع ہوتی رہی، جواب کیسے دیتا ٹائپ رائٹر اور تمام اسٹیشنری اوفس میں تھی۔

ایک دن تیسرے پہر مسرور بیگ ملنے آیا اور دیر تک بیٹھا۔ اس کا خیال تھا تمکینہ اب تک پولیس لوک اپ میں ہوگا۔ بتانے لگا سراغ رساں اس کے رابطہ پریس آئے تھے۔ چیزیں تہہ و بالا کر کے رکھ دیں۔ کیا چھاپتے ہو؟ پچھلے سال بھر میں جو چیزیں چھاپی ہیں ان کا اندراج کس رجسٹر میں ہے؟ کسی سیاسی پارٹی سے تعلق ہے؟

''جتنی دیر وہ پریس میں رہے میرا دل دھڑکتا رہا کہیں باوجود تمام احتیاط کے نیپچون ٹریڈرز انکورپ[1] کا کوئی کاغذ ضائع کیے جانے سے پریس میں بچ نہ رہا ہو۔ یا نئی ملٹری حکومت کی خلاف چھاپے ہوئے پوسٹروں یا لٹریچر میں سے کوئی؟
''خوش قسمتی سے جب سے نیپچون کا کام ہاتھ میں لیا ہے نہ ایسا کوئی باہر اعلیٰ تعلیم کے لیے جانے

[1] Naptune Traders Incorp

والا آرزومند آیا جو اپنے پروفیسروں کے لیٹر ہیڈ چھپواتا نہ ہی کسی نے یونیورسٹی کی سند چھپوائی۔

''چلتے چلتے انہوں نے پوچھا 'تلمیذ کو جانتے ہو؟'

'تلمیذ الرحمٰن؟' میں نے پوچھا

'ہاں۔'

''اور مجھے بتانا پڑا آپ مجھ سے اپنی فرم Strait Commercial Corporation کے کاغذات چھپواتے رہے ہیں، کبھی کبھی۔

پھر انہوں نے نیپچون ٹریڈرز کے بارے میں سوالات کیے: اس کے کرتا دھرتا کون ہیں؟''

تلمیذ نے کہا ''اپنا نام بتا دیتے، اور شان الٰہی اور غیور کا۔ یا شان الٰہی، غیور اور مرتضیٰ قریشی کا: اتحاد ثلاثہ۔''

مسرور بیگ نے کہا ''اور آپ؟''

''محض کارندہ۔''

دونوں میں نیچی آواز میں کافی دیر باتیں ہوتی رہیں کیونکہ کمرے میں چھت کے نزدیک گرل کا روشندان تھا جو اس گیلری میں کھلتا تھا جس میں نیچے سے مین زینہ آ کر کھلتا تھا۔ ویسا ہی روشندان برابر کے دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔

تلمیذ نے چائے منگائی جسے مسرور بیگ نے سکون سے پیا۔ لگتا تھا وہ زمانے کا نہ صرف گرم و سرد چشیدہ ہے بلکہ قانون کی ایجنسیوں کا خوف کھو چکا ہے۔

''انہوں نے تم سے کہا تھا وہ ادھر آئیں گے؟''

''نہیں۔ لیکن کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔''

بالآخر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

تیسری منزل سے دیکھنے پر اسٹریٹ کا ٹریفک نظر آتا تھا جو کم ہو چکا تھا۔ کافی دیر تمیز کمرے کی بالکونی میں کھڑا رہا۔ ٹریفک کم ہوتا جا رہا تھا۔ اب دو، دو چار چار کر کے نیچے دل پسند ہوٹل کے مانند لے ریستوران سے نکلنے والے نظر آ رہے تھے۔ اُن میں سے کوئی کھانے کے بعد پان کے لیے سامنے، الٹے ہاتھ پر پان سگریٹ کے کیبن پر رکتا تھا، رکشا مل جائے تو رکشا لے کر ورنہ رات کی ٹھنڈی ہوا کا لطف لیتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ اُن دنوں رات میں وہ لطف نہیں رہا تھا جو ہمیشہ سے پہلے ہوتا تھا۔ ریستوران، دکانیں، اکا دکا پرائیویٹ فرموں کے دفتر ۲ بجے تک کھلے ہیں اور چہل پہل سے لگتا ہی نہیں تھا دن ختم ہو گیا۔ خود تمیز اسی رات کی چہل پہل کی دنیا کا آدمی تھا۔

دوست اور لڑکیاں شام گزار کر جہاں بھی گزری ہو، شراب کے بعد علیحدگی سے پہلے پروگرام کے آخری ایکٹ کے آخری سین کے لیے ریستوران جاتے تھے۔ تمیز مہمان نوازی کے لیے پہچانا جاتا تھا اور ہر منزل پر وہی بل ادا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا: ٹٹی کی کمائی میں سب کا حصہ ہوتا ہے۔ وہاں سے اٹھ کر دوست اپنی راہ لیتے تھے اور تمیز لڑکیوں کو ان کے علاقے میں چھوڑ کر ٹیکسی یا گھی کا رخ دلپسند کی طرف کراتا تھا۔ گرتا پڑتا اپنے کمرے میں پہنچتا اور سو جاتا۔ کبھی کمرے کا دروازہ کھلا بھی رہ جاتا۔

اس وقت وہاں نیچے جب دکانیں بند ہو چکی تھیں، پان والا بھی جا چکا تھا، رکشا والے میور اسٹریٹ[1] کے فٹ پاتھ پر آ بیٹھے تھے، ان کی رکشائیں کچھ فاصلے پر ان کی پشت پر کھڑی تھیں۔ اُن میں سے دو نے اسٹیل کی تھالیوں کو طبلے کی طرح بجانا شروع کیا، گانا شروع ہوا جس میں کبھی سب شریک ہو جاتے تھے، کبھی کوئی خاموش ہو جاتا، ایک نوجوان وقفے وقفے سے صحیح مقام پر لے میں سیٹی بجاتا تھا، لگتا تھا بانسری اس کے ہونٹوں سے لگی ہے۔ ان کے چہرے صاف نظر نہیں آ رہے تھے مگر وہ سب وہ تھے جن کے رکشا میں تمیز سوار ہو چکا تھا — ایک بار نہیں، کتنی ہی بار۔

---

[1] Muir Street

کھاڑی سے آنے والی ٹھنڈی ہوا نے ان لوگوں کو مست کر دیا تھا۔

ایک اور دن گزر گیا اور کوئی نہیں آیا۔ تینوں عاقلوں میں سے ایک بھی نہیں۔ شان الہی، غیور اور مرتضیٰ قریشی نے کوئی پیغام نہیں بھیجا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ 'سب کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔' بینک منیجر ہمایوں سازش میں شریک نہیں تھا۔ اس کا نام اگر آئے گا بھی تو صرف اس وجہ سے کہ خود اس نے تمکید کی بیچیون ٹریڈرز انکورپ کا اکاؤنٹ اپنی برانچ میں کھولا تھا بغیر کسی قابل اعتماد شخص کے تعارف کرائے۔ 'لیکن وہ آدمی ایسا ہے یوم حشر بھی اپنے چہرے کی وجہ سے بغیر کوئی الزام آئے چھوٹ جائے گا۔' مرتضیٰ قریشی اس سے کہہ چکے تھے "میرا نام نہ آئے۔ انٹروڈکشن کے کارڈ پر میرے دستخط نہیں ہیں۔ تم نے مستعدی دکھانے اور مجھے خوش کرنے کے لیے اپنی ذمے داری پر یہ کام کیا تھا۔"

سرور بیگ مرتضیٰ اور غیور کا آدمی تھا لیکن لگتا ہی نہیں تھا اُسے جیل جانے کا خطرہ تھا۔

صبح گیارہ بجے کے قریب اسے ہوٹل کے ویٹر نے دروازے پر کھٹکا کر کے جگایا۔ لگتا تھا ناشتے کے لیے پوچھنے آیا ہے۔

دروازہ کھولنے پر اُس نے دیکھا ہوٹل کا منیجر، ویٹر اور دو بھاری جسم والے فرد جو بش شرٹ اور میریلین کے ٹراوزرس میں تھے اُس کے سامنے کھڑے ہیں۔ اُن میں سے ایک نے حکم دینے والی آواز میں کہا "اندر آسکتے ہیں؟ کچھ پوچھنا ہے۔"

تمکید نے بھی اتنے ہی مصنوعی تپاک سے کہا۔ "جی آیئے۔"

اُسے معلوم تھا اس کے علاوہ کچھ اور نہیں کہا جا سکتا ہے۔

دونوں نے پہلے منیجر، پھر ویٹر سے تمکید کی طرف انگلی سے اشارہ کر کے کہا: "یہ؟ کون ہیں؟"

"تمکید الرحمٰن صاحب۔"

"شناخت کر رہے ہیں؟"

"جی۔"

اس کے بعد انہوں نے اُن دونوں کے نام اپنے اپنے پیڈ پر لکھے اور ہاتھ سے رخصت کی اجازت دے دی۔ اور اس طرح کرسیوں پر بیٹھ گئے کہ تمیز اُن کے درمیان بیڈ پر، ٹانگیں فرش پر ٹیکے بیٹھا تھا۔

تمیز سوچ سوچ کر ان کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا، کہیں ایسی بات اُس کے منھ سے نہ نکل جائے کہ مرتضیٰ قریشی بعد میں کہیں تم نے یہ کیوں کہا۔

ایک نے کہا ''آفس نہیں گئے؟''

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کئی دن سے۔''

''جس دن چیک کے پے منٹ سے پہلے وہاں سے چلے آئے تھے؟''

''جی۔'' اور اُسے خیال آیا یہ اُس نے مجھ سے کیا کہلوا لیا!

دوسرے نے ساتھ ہی کہا ''آفس بھی نہیں کھلا ہے۔'' یعنی دونوں وہاں ہوتے ہوئے آئے تھے۔

''چپراسی کو چھٹی دی ہے۔''

ان میں سے ایک کمرے کی تلاشی لینے لگا - کپڑے، ذاتی نوعیت کے خط، میز پر رکھی ہوئی ایونجیلین ایڈمز، کیرو اور بین ہیم [1] کی Laws of Scientific Palm Reading، خط لکھنے کا پیڈ اور پوسٹل لفافے۔

اُدھر سے ناامید ہو کر انہوں نے کہا ''ہم دفتر دیکھنا چاہتے ہیں۔''

تمیز نے کہا ''دفتر بند ہے اور چابی—''

''چپراسی تمہیں دے کر جاتا ہے۔''

کمرے سے باہر نکلتے ہوئے ایک نے کہا ''اپنی گھڑی اور قیمتی چیزیں، اگر کوئی بدن پر ہیں تو انہیں یہیں چھوڑ جاؤ۔ الماری میں۔''

''بیوی بچے ہوتے تو انہیں دے کر جاتے۔''

---

[1] Evangeline Adams, Chiro, Benham

نیچے پہنچنے پر انہوں نے کہا ''کمرے کی چابی ہوٹل منیجر کو دے کر جاؤ۔''
''ہمیں اس کی ضرورت ہوگی۔''

تمیز خود میں اتنی جرأت نہ پیدا کرسکا کہ کہے اس سب کے لیے آپ کے پاس وارنٹ ہے؟

اوفس میں انہوں نے تمام فائل دیکھے۔ کاربن پیپر کے چپٹے بوکس کو کھول کر ان میں سے جو استعمال شدہ تھے انہیں کھڑکی کی طرف کر کے دیکھا جو تمیز کی میز کی پشت پر تھی۔ کمرے میں ہلکی سی بو سگریٹ بجھانے کی پیتل کی کٹوری میں سے آرہی تھی جس کے پیلے پانی پر ڈوبے ہوئے ٹوٹوں کے کاغذ پھول کر اوپر آ گئے تھے اور تمباکو نیچے بیٹھ گیا تھا۔

ایک نے تمیز سے کہا ''اپنے ٹائپ رائٹر پر اپنی فرم کا نام اور پتہ ٹائپ کرو۔''

اس کاغذ کو اس نے کاربن پیپرز کے ساتھ بوکس میں احتیاط سے رکھا۔ دونوں نے کچھ اور کاغذات سنبھالے اور تمیز سے کہا ''You are under arrest''۔

تمیز نے کہا ''کس جرم کی پاداش میں؟ میں ایک معمولی بزنس مین ہوں۔ ٹیکس پے کرتا ہوں۔'' اس کا لہجہ گڑگڑانے کا تھا۔ اپنے حق کے لیے لڑنے والے کا نہیں۔

دونوں ہاں میں سر ہلاتے رہے۔

''میرا گھر تک نہیں ہے۔ آپ نے دیکھا ایک معمولی ہوٹل کے کمرے میں مسافروں کی طرح رہتا ہوں۔''

''چپ چاپ چلو گے یا بھاگنے کی کوشش کرو گے؟''

''I am innocent'' ۔ بھاگنے کی کوشش کیوں کروں گا۔''

''اسی لیے ہم ہتھکڑی ڈال کر نہیں لے جا رہے ہیں۔''

دوسری منزل کے اوفسوں کی قطار کے سامنے سے، جو سب کھلے ہوئے تھے، وہ حتی الامکان اس طرح چلتا ہوا گزرا جیسے بزنس کے لیے آئی ہوئی پارٹی کے دو افراد کے ساتھ جا رہا ہو۔

---

۱ ''تم گرفتار کیے جاتے ہو۔''

۲ معصوم ہوں

(۳۲)

جب تمیز قانون کے ارگڑے میں آ گیا اور پولیس لوک اپ میں رکھا گیا تو گنتی کے جو چند صحیح فیصلے اس نے ساری زندگی میں کیے تھے ان میں سے ایک وہ تھا جو شدید افسردگی کے عالم میں وہاں اس نے کیا تھا: کسی سے اس بات کو نہیں چھپاؤں گا کیونکہ یہ کہنے کے بعد پھر مجھے لوہے کی چوڑیاں پہنادی گئیں اور سسرال لے جایا گیا با آسانی اپنی معصومیت کے دو لفظ کہے جاسکتے ہیں۔ لیکن ہمدردی کے لیے آنے والے سے ساری بات کو جھٹلانے کے بعد سننا پڑے گا: اخبار میں کچھ اور دیا ہے اور فلاں نے تمھیں کوئن الزبتھ روڈ پر لے جائے جاتے دیکھا تھا۔ تم ہتھکڑی میں تھے اور اس کی چین سپاہی کے ہاتھ میں تھی۔ دوسرا سپاہی تمہارے پیچھے چل رہا تھا۔ فلاں نے تمھیں پولیس وان میں بٹھائے جاتے دیکھا تھا۔ جیل لے جائے جارہے تھے یا کھاڑی باغ (Creek Garden) میں تفریح کے لیے؟

ہوا یہ تھا اُسے ہتھکڑیاں پہنا کر دو پولیس کے سپاہیوں کی معیت میں گیارہ بجے کے قریب جب بازار اپنی پوری رونق پر تھے ایک پولیس اسٹیشن سے دوسرے پولیس اسٹیشن کو پیدل لے جایا گیا تھا۔ پرنسس این اسٹریٹ سے کوئن الزبتھ روڈ، چائنیز شو شوپ کے سامنے سے ہوتے ہوئے جن کی اصل لائن ہیروئن اور کوکین کی اسمگلنگ تھی لیکن شوکیس میں سالوں

سے گنتی کے چند جوتے سجے چلے آ رہے تھے، ایک بڑی دکان کے سامنے سے گزر کر جو تمیز کے ایک پرانے دوست کی تھی اور باہر کے مال کے لیے خصوصاً عورتوں کی پسندیدہ تھی جس کے بارے میں یہ راز نہیں تھا دس فیصد درآمد شدہ ہوتا ہے، نوے فیصد اسمگلنگ کا، اور راہ میں دونوں طرف پڑنے والی دکانوں پر بغیر نظر ڈالے بھی اُسے جان پڑتا رہا تھا دکاندار کاؤنٹر چھوڑ چھوڑ کر اُسے دیکھنے کے لیے باہر آ کھڑے ہوتے جا رہے تھے۔ اور یہ سب اس کے منھ کو لگے ہوئے تالے کو توڑنے کے لیے کیا جا رہا تھا تا آں کہ دوسرا پولیس اسٹیشن آ گیا۔

وہاں جو افسر وردی میں میز پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا اس کے سامنے تمیز کو کھڑا کر دیا گیا۔ کافی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر تمیز کو دیکھا۔ دو ایک سوال کیے اور جب تمیز نے منھ نہیں کھولا تو وہ اٹھ کر اس تک آیا، ایک غلیظ ترین گالی دی اور اتنی زور سے تھپڑ مارے کہ تمیز نے شاید شراب کے نشے میں بھی کبھی کسی کو نہیں مارے تھے۔ یہ بے عزتی کا وہ لمحہ تھا جس سے ہر شریف آدمی زندگی بھر ڈرتا ہے لیکن جب ایک بار اس سے ہو گزرے تو اُسے احساس ہوتا ہے میں کبھی شریف تھا ہی نہیں۔ عام آدمیوں جیسا ہوں جن کے حصے میں عزت ذلت باری باری آتے رہتے ہیں اور اگر زندگی کے خاتمے پر حساب جوڑنے بیٹھیں تو پتہ پڑتا ہے عزت کم ہی نصیب ہوئی۔ اس لمحے کے گزر جانے پر تمیز کو جو خیال آیا وہی تھا جو دوسروں کو آتا ہے: 'اب جو بھی کروں درست ہوگا۔'

بعد میں جب اُسے لوک اَپ میں بند کر دیا گیا تو اسے تعجب تھا میری سرشت کو کیا ہوا تھا جو فوری بدلے میں نہ میرے منھ سے اتنی ہی غلیظ گالی نکلی، نہ ہاتھ اٹھا۔ بغیر جانے ہوئے اس نے اپنی نئی حیثیت کو تسلیم کر لیا تھا۔

عدالت کے سامنے پیش کیے جانے سے پہلے تمیز کا بھرم خود اپنی نظروں میں ٹوٹ چکا تھا۔

جن دنوں تمیز پولیس اسٹیشنوں میں گھمایا جا رہا تھا اور ایک پلان کے مطابق اس کی بچی کھچی عزت توڑی جا رہی تھی کہ منھ سے پھوٹے گا اور کون کون اس گورمنٹ فنڈ پر ڈاکا ڈالنے کی سازش میں شریک تھا اُسے باہر سے برابر پیغام ملتے رہے تھے، کبھی مڑے تڑے پرچوں کی

صورت میں کبھی زبانی: گواہوں اور وکیلوں کی جرح میں گھر کر ہمت مت چھوڑ بیٹھنا۔ تمہیں رہا کرانے کی پوری کوشش ہو رہی ہے۔

چنانچہ گالیوں، تھپڑوں اور حوالات میں رات کو بند کیے جانے کے بعد جہاں اس کے رفیق مچھر اور کھٹمل ہوتے تھے، وہ خاموش رہا اور تعجب کرتا تھا مجھ میں اتنی برداشت کہاں سے آ گئی!

اُن دنوں اس کے ملنے والوں اور گنتی کے چند دوستوں کو جنہیں اول تو یہی معلوم نہیں تھا آخر کیوں وہ اچانک خورد برد یا غبن قسم کے الزامات میں دھر لیا گیا ہے یہی نہیں پتہ چلتا تھا وہ ہے کس تھانے یا تھانے کی حوالات میں۔ انہی حیران ہونے والوں میں امینہ بھی تھی۔

عدالت میں پیشی کے دن مرتضیٰ قریشی نظر نہیں آیا کیونکہ بظاہر اُس کا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ غیور بہرحال جرنلسٹ تھا — وہ کہیں کسی سیاسی واقعے کو cover کرنے گیا ہوا تھا، کسی باہر کی نیوز ایجنسی کے لیے۔ شان الہٰی کیسے ہوتا! اس اسکیم سے سب سے زیادہ وہی مستفیض ہوا تھا اور اغلب یہی تھا ملک سے باہر جا چکا ہے۔ بینک منیجر ہمایوں کو زیادہ سے زیادہ اوپر سے وارننگ دی گئی ہوگی: تم نے بے سوچے سمجھے اس پارٹی کا اکاؤنٹ کھولا؟ اور اس نے کہہ دیا ہوگا: پریشر تھا کہ بینک گھاٹے میں جا رہا ہے، بینک کی closing تھی، نئے اکاؤنٹس کے لیے نئی پارٹیاں ڈھونڈو۔ لے دے کے ایک مسرور بیگ رہ جاتا تھا جو اُسے اطلاع دینے آیا تھا کہ کیس کھل گیا ہے۔ عدالت میں وہ عجیب شان بے نیازی سے کھڑا تھا۔

(۳۴)

اُس کیس میں سزا تلمیذ کو ہوئی۔ ہیڈ کلرک شان الٰہی روپوش تھا۔ وکیل مرتضیٰ قریشی اور جرنلسٹ غیور کے خلاف کیس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ پریس کے مالک مسرور بیگ کو جس نے دونوں طرف کے لیٹر ہیڈ اور لفافے چھاپے تھے معمولی سزا ہوئی۔ اس کا قصور بس اتنا ہی تھا کہ جو اُسے بتایا گیا وہ اس نے چھاپ دیا۔ آخر کو تمام ہی پریس چھپے چوری سیاسی سرپھروں اور پارٹیوں کے منشور اور ایسا لٹریچر چھاپتے رہتے ہیں جو حکومت وقت کے بھی خلاف ہوتا ہے اور ملک کی آبادی کے مختلف فرقوں کو ایک دوسرے سے لڑوانے کے کام کا ہوتا ہے۔ اس سے یہ کام تلمیذ نے کروایا تھا، صرف تلمیذ نے۔

عدالت میں وہ کیشیئر پیش ہوا جس نے تلمیذ سے چیک کی پشت پر دستخط کرائے تھے اور پہلی مرتبہ کے دستخط سے اُسے تعجب ہوا: معیز الرحمٰن کی جگہ بے خیالی میں تلمیذ الرحمٰن نے لے لی تھی۔ دوسری بار ایک اور علیحدہ کاغذ پر دستخط درست تھے - معیز الرحمٰن۔ وہ چیک لے کر بینک منیجر کے پاس گیا اور یہ دونوں نئے آدمی قبل اس کے کہ چیک لیے کاؤنٹر پر واپس پہنچتے تلمیذ وہاں سے جا چکا تھا۔

ڈاکئے محب علی نے تلمیذ کو کٹہرے میں کھڑے دیکھ کر کہا ''جی سرکار میں انہیں جانتا ہوں۔ دفتر میں بھی اور ان کے ہوٹل کے کمرے میں بھی میں ہی ڈاک لے جاتا رہا ہوں۔

رجسٹرڈ بھی اور بے رجسٹرڈ بھی۔"

اس نے اقرار کیا "دونوں فرموں نیپچون[1] اور اسٹریٹ[2] کی ڈاک رجسٹرڈ میل سے آتی تھی اور بغیر رجسٹری ملک کے اندر سے آنے والی ڈاک بھی۔ میں بس دستخط کرا کے لفافے حوالے کر دیتا تھا۔ مجھے تسلیم ہے میں نے کبھی غور نہیں کیا دستخطوں میں کیا فرق ہوتا ہے۔

"جی ہاں صاحب بڑے دریا دل آدمی ہیں۔ ہمیشہ سے۔ مجھے ہر رجسٹرڈ میل پر پانچ روپے دیتے تھے، عید بقرعید پر دس، اور دو دفعہ میری بیوی کے علاج کے لیے بھی مدد کی۔ پہلی دفعہ تین سو، دوسری دفعہ سو۔"

جج کو یہ بات بری طرح کھٹکی جو آلات دفتر کو سپلائی کیے گئے تھے ان کا اس محکمے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مثلاً پچاس ہزار روپے کے جیومیٹری سیٹ، چھوٹے جانوروں کو کوئی لیبوریٹری میں چیرنے کے disection box اور مائکروسکوپ! ان کے اپنے بیٹا بیٹی سائنس کے طالب علم تھے اور وہ جانتے تھے ان چیزوں کی کہاں ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی اگر واقعی سپلائی کی جاتی تو پورے صوبے کے ہائی اسکولوں اور کولجوں کے لیے کافی ہوتے۔ یہ اختراع مسرور بیگ کی ہی ہوسکتی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ جیومیٹری اور بائیولوجی کے جرنل وہ سالوں سے چھاپتا آیا تھا۔ یا یہ کہ اس کے مشورے سے امپورٹ آئٹم کا انتخاب کیا گیا تھا اور یہ اختراع کسی کی بھی ہوسکتی تھی۔

غیور نے اپنے تحریری بیان میں عدالت کے گوش گزار کیا تھا کہ وہ تفتیشی رپورٹنگ کرتا ہے اور اسی سلسلے میں اس کے علم میں آیا تھا کہ کس رقم کو متعلقہ محکمے میں استعمال نہیں کیا گیا ہے

---

[1] Neptune

[2] Strait

اور صرف میں نہ لانے سے محکمے کا کتنا نقصان ہو سکتا ہے۔ بجٹ lapse کر جائے گا۔ اگر وہ چاہتا، یا اُسے عدالت اجازت دے، تو اب اخبار میں دے سکتا تھا بغیر ضرورت مائکروسکوپ، dissection boxes، جیومیٹری سیٹ محکمہ زراعت اور خوراک نے امپورٹ کیے اور وہ وہاں بھی نہیں پہنچے تھے ہوا میں غائب ہو گئے تھے۔

تلمیذ نے کورٹ سے نکلتے ہوئے مسرور بیگ سے کہا "جج صاحب ایسی دور کی کوڑی لائے جو پروزیکیوشن کے وکیل کو نہیں سوجھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے رول بدل لیں، کامیاب رہیں گے۔"

لیکن اس بات میں اگر کوئی طنز تھا یا مزاح تو اس کا اثر مسرور بیگ پر نہیں ہوا۔ بات ٹالنے کے لیے اس نے کہا: "شان الٰہی جانتا تھا یہ سوال ضرور اٹھے گا، ایک نہ ایک دن، اس لیے وہ ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔"

پولیس وین میں جیل لے جائے جاتے ہوئے تلمیذ بڑبڑایا "ان دو مردودوں غیور اور شان الٰہی کا قتل تو مجھ پر فرض ہو گیا ہے۔"

اس بات کو جاننے میں تلمیذ کو کافی وقت لگا کہ مسرور بیگ پہلے بھی کئی دفعہ قانون کی زد میں آ چکا تھا۔ اس کا کام ہی ایسا تھا، اور ہر بار بچ نکلا تھا۔ کبھی پولس کا اس سے کام آ پڑتا تھا کبھی پولس کو اس سے مروت کا سلوک کرنا پڑتا تھا۔ پولس اس سے سیاسی اشتعال انگیز، پوسٹر اور پبلک میں بانٹنے کے اشتہار چھپواتی تھی، گنتی کے چند، جن کی بنیاد پر حکومت کے خلاف آواز اٹھانے والے پکڑے جا سکتے تھے اور جب وہ کسی پرائیوٹ پارٹی کا کام کرتا تھا تو کیس کھل جانے پر پولس اس سے رعایت برتتی تھی۔

تلمیذ کو اکثر خیال آیا ایک بیوی بچوں والا آدمی کیا پولس سے ملا ہو سکتا ہے؟

جیل کے پھاٹک میں جب پولیس وین داخل ہوئی تو اُسے اپنے اندر سے سنائی دیا

''اور مرتضیٰ قریشی کو چھوڑ دو گے؟''

اس نے سر کو جھٹکا دے کر کہا ''ہرگز نہیں۔''

برابر میں جو بوڑھا اور اس کے ساتھ نوجوان لڑکی بیٹھی تھی اس کے 'ہرگز نہیں' پر چونک پڑے۔ اس لڑکی پر اپنے ایک مہمان پر گولی چلانے کا جرم عائد ہوا تھا۔ بوڑھا اس کا نانا تھا اور مرنے والا پولس کا ایک اُبھرتا ہوا اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ۔ جیل کے گیٹ پر بہت سے لوگ اور پریس فوٹوگرافر ان دونوں کو دیکھنے اور فوٹو کھینچنے کے لیے پہلے سے موجود تھے۔

(۳۴)

جس جیل میں سزا ہونے کے بعد تلمیذ نے خود کو پایا اس کے بورڈ پر صاف نظر آتا تھا پہلے کچھ اور لکھا تھا، بعد میں اس پر سفید پینٹ کر کے لکھا گیا تھا: جیل دولت جمہوریہ......

جو نام سفید کوٹ کے پیچھے سے جھانکتا نظر آتا تھا وہ تھا His Majesty's Prison۔ یعنی شہنشاہ- کی جیل، اور اس کے اوپر برطانیہ کا emblem (شہنشاہیت کا نشان)۔ جتنی چیزیں جیل میں تھیں لکھنے کے پیڈ، لفافے، فورم، چینی کے برتن، چمچے، کانٹے چھری موجودہ دور کے قیدیوں کے لیے نہیں تھے۔ تولیے، چادریں، ٹوئلٹ پیپر وہ سب بھی ان قیدیوں کے لیے نہیں تھے: سب پر برطانیہ کا ایمبلم تھا اور H.M.P.۔ یہ ساری چیزیں گورمنٹ کے افسروں کے لیے تھیں اور اگر کوئی سفید قیدی آ جاتا ہوگا تو اس کو ملتی ہوں گی۔ دیکھنے والا سمجھ سکتا تھا برطانیہ کی حکومت کو اس ملک سے رخصت ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے اور نئے آنے والوں نے ابھی ان غیر ضروری جزویات کی طرف توجہ نہیں دی ہے۔

شروع شروع میں تلمیذ کی سمجھ ہی میں نہیں آیا وہ اچانک کہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ 'مجھ سے میرے ساتھیوں نے دھوکا کیا' اس کے دماغ کی ایک ہی رٹ تھی۔ 'خود آرام سے گھومنے پھرنے اور کھانے پینے کی دنیا میں ہیں۔ مجھ سے کہتے رہے: منھ سے مت پھوٹنا اس جرم میں تمہارا کون کون شریک تھا۔ ہمارے کہنے پر چلے تو ہم تمہیں بچا لیں گے۔ لیکن جب

معاملہ پولس کی حراست سے کورٹ میں پہنچنے کو تھا تو مرتضیٰ قریشی کہنے لگا ''کیس بڑا ہے۔ کسی بڑے وکیل کا اسے ہاتھ میں لینا ضروری ہے۔'' حالانکہ وہ خود وکیل ہے اور میری طرف سے عدالت میں پیش ہوسکتا تھا لیکن اس نے مشورہ دیا ''بیرسٹر احمد عبدالرحمٰن سے پیروی کراؤ۔ میرا اس مقدمے میں وکیل کی حیثیت سے پیش ہونا کیس کو پیچیدہ بنا دے گا اور تمہیں لمبی سزا ہوگی۔''
یہ نہیں کہہ رہا تھا مجھے اپنی کھال پیاری ہے۔'
ہر وکیل جانتا ہے کس جرم سے جھوٹ پہ جھوٹ بُلوا کر اور جھوٹے گواہ اور جھوٹی شہادتیں پیش کر کے اپنے موکل کو اگر بچا نہیں سکتا ہے تو بھی حساب لگا سکتا ہے زیادہ سے زیادہ کتنی سزا ہوگی، اور اسی کے پیسے برابر لیتا رہتا ہے۔ اور اگر وکیل خود جرم کرنے کا ارادہ کرے تو پہلے سے حساب لگا کر رکھتا ہے سزا سے بچ نکلنے کے لیے کیا راستے ہوں گے۔ مرتضیٰ قریشی ویسا ہی وکیل ہے۔
'میں سزا بھگت لوں تو سب سے بدلہ لیتا ہے۔ غیور سے، اس کی قسم میں خود کو دے چکا ہوں۔ کہنے کو جرنلسٹ ہے، جرائم کی رپورٹنگ وہ باہر کے پریس اور ریڈیو کے لیے بھی کرتا رہا ہے لیکن خود مجرم کا دماغ رکھتا ہے۔ مجھ سے کہہ چکا ہے ''اگر مقدمے میں کسی بھی اسٹیج پر میرا نام آیا تو مجھے بتانا پڑے گا برٹش عرب پروٹیکٹوریٹ کی بندرگاہ میں تمہارا نام تبریز تھا، اس مقدمے میں تم معیز ہو۔ نجانے اور تمہارے کتنے نام ہوں گے۔ تم پہلے بھی نام بدل کر جرائم میں ملوث رہے ہو۔ عدالت میری بات مانے گی کیونکہ کرائم رپورٹنگ میرا شعبہ ہے۔'' غنیمت ہے تعلقات کی گرم جوشی میں اسے میں نے یہ نہیں بتایا تھا برطانوی فوج میں میرا نام تعبیر الرحمٰن تھا۔ ورنہ اس وقت وہ بھید اس کے ہاتھ میں حکم کا ترپ ہوتا۔ Trump of Spades۔
میں نے کہا ''غیور تم اپنے کو میرا دوست کہتے ہو اور بجائے دلدل سے نکالنے کے، اور گہرائی میں دھکیلنے کی دھمکی دے رہے ہو۔''
'بولا: ''ارے جہاں دوستی کی بنیاد شراب، جوئے اور عورت میں شرکت کی ہو وہاں سب چلتا ہے۔ دنیا میں پرمانینٹ وفاداری نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اگر ہے تو وہ سیاست کی دنیا میں ہوگی۔ آگے قسمت وہاں ٹرائی کرنا۔''

(۳۵)

جیل میں پہنچ کر تمیز کو تعجب ہوا نہ وہ اوفس سے پکڑ کر لے جاتے وقت رو رہا تھا، نہ لوک اپ میں پہلی بار بند کیے جانے پر۔ اس وقت جب اُسے پرنسس این اسٹریٹ سے کوئن ایلزبتھ روڈ ہتھکڑیوں میں پیدل لے جائے جانے کا حکم انسپکٹر پولس نے دیا تھا اور جب پولس انسپکٹر نے تھانے میں گالیاں دی تھیں تب بھی آنکھیں سوکھی رہی تھیں۔' جب گالیوں اور تھپڑوں کے بعد حوالات میں بند کیا گیا اور خاموش رہا تھا انسپکٹر سمجھا ہوگا عادی مجرم ہوں جیل برڈ (جیل کا پنچھی) اور میں اسی پر حیران تھا اتنی برداشت مجھ میں کہاں سے آگئی ہے! نہ آج جیل میں پہنچنے پر رو رہا ہوں۔ میری آنکھوں کو کیا ہوا ہے؟

'آخر میں ہوں کیا؟

'آنکھوں کو بار بار زور دے کر میچنے سے بھی آنسو نہیں نکلتے۔ آخری بار میں کب رویا تھا؟ گھر سے پہلی بار راجد ھانی بھیجے جاتے وقت۔ لیکن جلد ہی بڑے بھائی جان نے آنسوؤں کو سَلب کرلیا۔ ہاں اتنا تھا اگر چھٹیوں میں نینی پور جاتا تھا اور اماں چمٹائیں تو آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔ لیکن راجدھانی پہنچ کر وہی خشک کی خشک۔ جس پر بڑے بھائی جان چڑتے تھے:

''کمبخت پکا مجرم ہے۔ سزا کا اس پر مطلق اثر نہیں ہوتا ہے۔ مت کیا کرو اس کی مجھ سے شکایت۔'' وہ بڑی آپا سے کہتے۔'

آنسوؤں کو سلب کیے جانے نے اپنے پیچھے جو خلا چھوڑا تھا وہ تمام عمر اس کا ساتھی رہا۔

جیل کا پہلا دن تمیز کے لیے رحمت بن کر آیا: صاف کپڑے جو پہننے کو ملے، ہتھکڑیوں سے آزاد ہاتھ، چلنے پھرنے کی جگہ، سونے کی جگہ، ساتھیوں کی بول چال اور اس سے ہمدردی کا برتاؤ سب عجیب لگ رہے تھے۔ اگر آئینے میں شکل دیکھتا تو شاید خود کو پہچان بھی نہ پاتا۔ وہ رو نہیں رہا تھا لیکن شکل کسی ایسے شخص کی سی تھی جو کنبہ اور دولت کھو بیٹھنے پر بغیر رُکے آٹھ پہر رویا ہو۔

دوسرے دن ایک قیدی نے اس سے آ کر کہا ''تمھیں کاسوکارا بلا رہا ہے۔''

تمیز کی سمجھ میں اس کی بات ہی نہیں آئی۔ بولا: ''جیلر؟''

قیدی نے صحن میں اُگے ہوئے پیپل کے پیڑ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا ''وہ۔''

وہاں درخت کے سائے میں جو پلنگ بچھا تھا، جس پر چادر اور تکیہ نظر آ رہا تھا ایک بھاری جثے والا سیاہ آدمی تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا یا لیٹا تھا۔ ایک قیدی اس کے پیر دبا رہا تھا۔ تھوڑے فاصلے پر اینٹوں کے چولھے پر پتیلا چڑھا تھا اور ایک اور قیدی ویسے ہی چولھے پر توے پر روٹی ڈال رہا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ پتیلے میں کفگیر گھما دیتا تھا۔

کوئی نہیں جانتا ہے جس پر دنیا تنگ ہو جاتی ہے اگر کچھ خوش قسمتی اس میں باقی ہے اس کے لیے جیل میں کتنی ہی چیزیں جو وہاں کی نہیں ہوتی ہیں کہاں سے آ جاتی ہیں — غیر ضروری تک: سگریٹ، شراب، پرفیوم، خوشبودار تمباکو اور اگر پان کا متوالا ہے تو قوام، الائچی۔

تمیز کو یہ دخل اندازی اس جمود سے اچھی لگی جس نے جیل کے گیٹ میں داخل ہونے کے وقت سے اس کے دماغ کو دبوچ رکھا تھا۔

کاسوکارا نے اسے اپنے برابر میں پلنگ پر بیٹھنے کی دعوت دے کر ایسے سوال کیے جن کے جواب وہ خود جانتا تھا:

''کل آئے ہو؟ بہت دکھ میں ہو؟ کھانا بھی نہیں کھایا؟ رات بھر نہیں سوئے؟ اُس کیس میں پکڑے گئے ہو نا جس کا اصلی مجرم غائب ہے: شان الٰہی؟''

تمیز کے آنسو بہہ نکلے اور ہچکیاں لے کر رونے لگا۔

کاسو نے ہمدردی سے کہا: ''گھبراؤ مت، اصلی مجرم کا فرار ہو جانا تمہارے حق میں جائے گا۔ کیس زیادہ دن چلایا ہی نہیں جا سکے گا۔''

تمیز اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''کسے وکیل کیا ہے؟''

''کوشش ہو رہی احمد —''

''عبدالرحمٰن کی؟ اچھا وکیل ہے اور اچھا آدمی۔ تمہارا کیس ہاتھ میں لے لے تو ان کا باپ کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تمہیں کیسے پتہ چل سکتا تھا کہ وہاں کتنا ایسا پیسہ پڑا ہے جسے خاموشی سے ہڑپ کیا جا سکتا ہے! دفتر کا آدمی، بیچ کا آدمی، بینک لے جانے والا آدمی کہ اس کا اکاؤنٹ کھولو، سب بہن — غائب ہیں۔''

''یہ باتیں وکیل نے کیوں نہیں کہیں۔''

''سستا وکیل پھانسی پر لٹکوا سکتا ہے۔ پیشی کے لیے بڑا وکیل لینا۔ احمد عبدالرحمٰن نہ ہو تو اس کی ٹکر کا۔''

پھر اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا: ''وہ مرتضیٰ کرپشی وکیل نہیں، سالا دلال ہے۔ اُسے کیسے جانتے ہو؟''

''میری فرم کا کام کرتے ہیں — کرتے تھے۔ اچھی آرام کی گزر رہی تھی ان لوگوں نے مروا دیا۔''

کاسوکارا نے اسٹیٹ ایکسپریس ۵۵۵ کی ڈبیا تمیز کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''لو پیو۔''

سگریٹ کے بعد تمیز نے اپنی روداد سنانی شروع کی: ''کوئی جیب کاٹتا ہے تو پرس اڑا لے جاتا ہے، گھر میں ڈاکا ڈالتا ہے تو زیور۔ ان لوگوں نے مجھے بھروسے میں لے کر میری روح خشک لی ہے۔ عزت، شرافت سب کچھ۔ اور قلاش کر دیا۔''

کاسو نے کہا ''روپے کے نقصان کا مت سوچو اور نہ جیل آنے کی بے عزتی کا، نہ ہتھکڑی لگا کر

ایک اسٹریٹ سے دوسری تک پیدل لے جائے جانے کا، کہ ایک دنیا نے دیکھا ہوگا۔ اندر سے سب گنہگار مجرم ہیں۔ اور اس بیٹی — ملک میں جو پیدا ہوتا ہے بے عزتی نصیب میں لکھوا کر لاتا ہے۔ روپے کے نقصان کا بھی مت سوچو۔ اگر تمہارا دفتر بھی لٹ گیا تو یاد رکھو میں تمہیں کام دوں گا۔ اور پگھار ڈپٹی کمشنر سے زیادہ۔''

تلمیذ کے سر سے بڑا بوجھ اتر گیا اور سینے میں بھی فراخی محسوس ہوئی۔

آنے والے دنوں نے بتایا کاسو کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ بڑے سے بڑے افسروں کی اس نے پیسے پر رال ٹپکتی دیکھی تھی۔ اور یہ آدمی پیسہ بانٹتا بھی تھا اور پیسہ ٹھکراتا بھی تھا۔ وہ ملک کے ہیڈ اور فوجی بڑے سے بڑوں سے لے کر مٹ پونجیا وزیروں تک کے لیے اسمگلنگ کرنے کا اعزاز رکھتا تھا۔ بشرطیکہ وہ اس کا احسان مانتے۔

''اور جب نہیں کر سکا کہ صاحب زندگی کی اُس فلم کا شو ختم ہوا، ڈبوں میں بند کر کے ڈسٹری بیوٹر کو لوٹا دی گئی، اب نئی فلم کا شروع ہے۔ تم بھی نئی فلم شروع کرو نہیں تو کسی اور کو پکڑو اس کام کے لیے۔ انہوں نے بہت زور لگایا۔ دھمکیاں دیں، مگر میرا خیال ہے کیسا بھی بُرا آدمی ہوں مجھ میں جو خون ہے وہ اُن سے بہتر ہے: اپنے باپ کا ہے۔ اور اُن میں جیسا خون تھا انہوں نے ویسا کیا۔ سب خچر کی اولاد ہیں۔ غلط الزاموں، جرموں میں ماخوذ کرا کے یہاں پہنچوا دیا گیا۔ خیر میرا کھیل ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ ایک کام مت کرنا: جیسے ہو ویسے رہو۔ نئی زندگی شروع کرنے کا خواب کبھی مت دیکھنا، نہیں تو پھر ذلیل ہو گے۔''

کاسو اُن پر مہربان تھا جو اس کی خدمت کرتے تھے۔ فلموں میں اسمگلروں کے ہیڈ جیسے دکھائے جاتے ہیں یا جرائم کے تاریک اڈے (den) کے گرو ان کی سی رعونت اس میں نام کو نہیں تھی۔ اس کے بارے میں تلمیذ نے طے کرلیا یہ اپنے لیے کام کرنے والوں سے پردے کے پیچھے سے بات نہیں کرتا ہوگا اور نہ جو ملنے آئے اس کی طرف میز پر فل بوٹ چڑھائے پیر

پھیلائے، سیاہ چشمہ لگائے بیٹھا ہوتا ہوگا کہ کروبات۔

اس کے ایک خدمت گار قیدی پر بُرا وقت آن پڑا: بیوی کو پیٹ کا بڑا اُوپریشن کرانا تھا اور سب جانتے تھے بھلا آدمی ہے جیل میں بے قصور آیا ہے۔ کاسو نے تمیز سے پرچی لکھوائی اور قیدی سے کہا: ''سپرنٹنڈنٹ صاحب کے سیکریٹری کو دے دو کہ تمہارے گھر بھجوا دے آج ہی۔''
اس کی شامت آئی تھی۔ بولا: ''اور پتہ؟''

کاسو نے منھ میں آئی ہوئی گالی کو لگام دیتے ہوئے کہا ''اب وہ بھی میں بتاؤں گا!''

کاسو کے لیے بیئر کے ٹن، وہسکی، سوڈے کی بوتلیں، پانچسو پچپن یا عبداللہ کا ڈبا پابندی سے آتا تھا۔ بریانی روز پکتی تھی۔ مرغی، مچھلی، جھینگے تلے جاتے تھے۔ کپڑے دھونے، استری کرنے والے، پیر دبانے والے ہر ایک کو اُس کا حصہ ملتا تھا۔ بیئر کا ایک ٹن یا وہسکی کا پیگ تمیز کو بھی ملنے لگا۔ جو خط و کتابت انگریزی میں ہورہی تھی اُسے تمیز سے پڑھواتا تھا اور دو ایک کے جواب کا بھی اپنی بے ڈھنگی زبان میں املا دیتا تھا۔ بحری اسمگلر اپنی انا کی بنا پر یہاں پڑا تھا لیکن عام قیدیوں کی طرح نہیں— کسی عتاب میں آئے ہوئے بڑے سیاسی لیڈر کی شان سے۔ وہ کاسو دارا کے کام کا آدمی ہے یہ تمیز نے پہلے دن سے جان لیا تھا۔

بعض قیدی جیل کے بڑے افسروں کے اتنے منھ چڑھے تھے کہ فلم دیکھنے تک گئے، ہیڈ کونسٹیبل اور کونسٹیبل کے ساتھ۔ باہر جاکر وہسکی خود پیتے تھے اور کونسٹیبلوں کو بھی پلاتے تھے اور جیل میں جب وردی والے کام وقت پر نہیں کرتے تھے انہیں گالیاں دیتے تھے۔ اُن میں سے کچھ پیسے والے تھے جو اُن کے پاس اڑ کر آیا ہوتا تھا۔ کچھ کا تعلق سیاسی پارٹیوں سے تھا۔ کاسو دونوں قسم کے قیدیوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ انہی میں سے دو ایک ساتھ جانے والے کونسٹیبلوں کو چکما دے کر غائب بھی ہو چکے تھے۔

''مگر میں نے کبھی ساتھ جانے والے کونسٹیبلوں اور انسپکٹر سے دغا نہیں کی۔ اُن غریبوں کی نوکری کیوں بگاڑوں! شو ختم سے پہلے سینما ہال سے اٹھ جاتا ہوں اور کہتا ہوں: اب گھر چلو۔

تم بھی چل کر سوؤ اور میں بھی۔ ایک دفعہ تمہاری بھابھی کو بھی گھر سے سینما ہال لے گیا تھا۔''

بعد میں اس کا ایک جملہ ہمیشہ تمیز کے کام آیا: ''غم مت کرو دوست۔ ایک دن تم بھی چھوٹ جاؤ گے — کوئی غم قبر میں ساتھ جانے کے لیے نہیں آتا ہے۔''

تمیز کو تعجب یہ تھا ایک بالکل نئی جگہ گناہ اور جرم کی دنیا والوں نے کیسے اُسے ڈھونڈ کر اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔

تمیز کے سوال کے جواب میں کہ ''آپ نے کیسے اتنی تھوڑی سی واقفیت میں مجھے اپنے اتنے قریب کرلیا؟'' کاسو نے کہا: ''بھائی اس دھندے میں شریک بھائیوں کی خبر رکھنی پڑتی ہے جیسے دوسرے دھندے والے رکھتے ہیں۔ رنڈی، دوسری رنڈی کو لاکھ شریف عورتوں کے کپڑوں میں ہو پہچانتی ہے، اور بھڑوا بھڑوے کو۔ شاید تمہیں پتہ پڑ گیا ہوگا، یا میں نے بتایا تھا؟ مجھ پر قتل کا الزام ہے اس سب کام کا نہیں جو میں نے کیے ہیں، اس کا جو مجھ سے کہا گیا تھا کرو اور میں نے انکار کردیا۔ ان کے لیے اسمگلنگ کو پہلے ہی منع کر چکا تھا، اب سالے ایک رانڈ بڑھیا کے جوان بیٹے کو مروانا چاہتے تھے اس کی اکیلی اولاد کو، کہ کروں اور ہمیشہ کے لیے ان کا غلام بن جاؤں۔ سونا، چرس، افیم ہزار دھندے ہیں ساری زندگی ان کے لیے کرتا رہوں۔ میں نے اوپر کہلوا دیا: یہ کام کسی دوسرے سے کراؤ یا خود کرو۔ میں یہ خون اپنی جان پر لیے نہیں مرنا چاہتا ہوں۔ پیٹ بھر کر کھاؤ، بہت ہے۔ قتل کا الزام ہے پھر بھی رات کو کبھی کبھی گھر ہو آتا ہوں۔ فلم کا بتا چکا ہوں۔ میرے حکومت پر بڑے احسان ہیں۔''

اور واقعی یہ حکومت پر اس بحری اسمگلر کے احسانات تھے کہ ایک پیشی پر جہاں اس نے سارے راز بھرے کورٹ اور پریس والوں کے سامنے اگلنے شروع کردیے: کون کون، نام

بنام، اس سے کیا کراتا رہا تھا۔ پچھلوں میں سے اور اُن میں سے جو اس وقت اقتدار میں ہیں، اور بیان جاری تھا کہ اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔

اس دن کاسو بہت خوش جیل لوٹا، قتل کا ذکر ہی نہیں آیا تھا اور سب جان گئے آگے وہ کیا کہنے والا تھا۔ جج کو اپنی سیٹ عزیز تھی: اس نے کہا ''کمرے میں گھٹن کی وجہ سے اجلاس ملتوی کیا جا رہا ہے۔''

اس نے تلمیذ سے پوچھا ''بھائی تم بتاؤ گھٹن کیا ہوتا ہے؟''

تلمیذ نے کہا ''حبس، جہاں گرمی ہو اور ہوا نہ ہو۔''

کاسو کی چھاتی سے کھل کر قہقہہ نکلا ''وہ تو سارے ملک میں ہے۔''

سب جان گئے اُس کی میزبانی بس دو ایک دن کی اور ہے۔

جیل کے دروازے تک سارے قیدی جنہیں کاسو اپنا سمجھتا اور کہتا تھا اُسے چھوڑنے گئے اور رخصت ہوتے وقت جو وصیتیں انہیں کہیں اُن میں تلمیذ کے لیے وہی وصیت تھی: ''نئی زندگی اسٹارٹ کرنے کی کوشش مت کرنا، ایک بار ذلیل ہو گئے ویسے ہی رہو۔ پھر شریف آدمی بنو گے پھر ذلیل ہو گے۔'' اور ایک بار پھر اپنا پتہ بتایا۔ شاید اس دن کو ملا کر اتنی بار جتنے دن تلمیذ کا اور اس کا ساتھ رہا تھا۔

کاسو تلمیذ کے دماغ سے جمود اس طرح دھو کر گیا تھا کہ بعد میں اس نے خود کو جیل میں تنہا محسوس نہیں کیا۔

سردیاں شروع ہو گئی تھیں لیکن اتنی نہیں کہ قیدی اپنی بارکوں سے باہر نہ نکلیں۔ کچھ جو گاؤں والے تھے کچے صحن میں اِدھر اُدھر سے بٹور کر سوکھی شاخیں، ٹہنیاں، سوکھے پتوں کا الاؤ

بنا لیتے تھے۔ جو خوش نہیں تھے چپ چاپ بیٹھے رہتے، جو جیل کی زندگی سے رضامند ہو چلے تھے وہاں بیٹھے دنیا جہان کے قصے سنایا کرتے، خاص طور سے اپنے پھنسنے کی داستان، جب پیشی پر گئے تھے وہاں کیا سُن کر دیکھ کر آئے۔ اُن میں پڑھے لکھے بھی آن بیٹھتے تھے۔

ایک گاؤں والا سنانے لگا اس کے برابر کے گاؤں میں ایک نوجوان نے ایک امیر زمین دار گھرانے کی عورت سے محبت بنالی۔ ''سچی بات تو یہ ہے دونوں ترازو کے پلڑے تھے اور ڈنڈی سیدھی تھی۔ عورت ایک بچے کی ماں تھی، نوجوان کی منگنی ہو چکی تھی۔ لیکن نہ وہ اپنے آدمی کو پسند کرتی تھی کہ پیر ن تھا، نہ یہ اس کو جو اس کے نصیب میں ہونے والی تھی کہ اس سے عمر میں بڑی تھی۔ رات کو زمین دار کے آدمی نے نوجوان کو کھجوروں میں دیکھا جہاں اس کو اس گھڑی نہیں ہونا چاہیے تھا — حویلی کے پیچھے۔ بھلا اس کا وہاں کیا کام تھا! عورت اُسے نظر نہیں آئی، نوجوان اُن لوگوں کے ہاتھ نہیں آیا۔ عورت نے فصل پر چھڑکنے کا تیل پی لیا۔ کیس اتنا بگڑ گیا کہ زمین دار والے اُن غریبوں کے گھروں اور کھڑی کھیتی کو جلانے کے لیے چل پڑے۔ پھر فیصلہ یہ ہوا اس نوجوان کے رشتے والے اپنی ایک جوان عورت انہیں دیں۔''

''کس کو؟ اس کو جس کی بیوی مری تھی؟''

''نہیں اُن کے مردوں کو۔''

''ان کا کیا گیا تھا جو بدلے میں انہیں عورت دی جاتی!'' کئی ایک نے ایک ساتھ کہا۔

''اب اُن کی عورتیں اور لڑکیاں کھیتوں میں چھپتی پھر رہی تھیں — دو نہر میں کنارے کے درخت کی جڑوں کو پکڑے پانی میں لٹکتی رہیں۔ بس گاؤں میں ایسے ہی کھیل ہوا کرتے ہیں راتوں کو۔''

مزہ لینے کو جیل والے بھی آ گئے تھے۔

''آخر کو اُسی غائب نوجوان کی جوان پھوپھی اُن کے ہاتھ آ گئی: گھر میں چھت سے چپکی ہوئی تھی۔ ایسے جیسے چھپکلی ہو۔ اُسے کھینچا تو چھت بھی اس کے ساتھ گری —''

سننے والے ہنسنے لگے۔

''سوکھی لکڑیوں اور کھجور کے پتوں کی تو تھی ہی۔ پھر اُسے انہوں نے زمین دار کے جوان بیٹوں،

بھانجے، بھتیجوں، چاچوں کو دے دیا، لو اس کا منہ کالا کرو۔''

''کہا ہوتا اس سے اپنا منہ کالا کرو۔''

''اس جگہ کو لوگوں نے ایسے گھیر رکھا تھا جیسے کوئی تماشہ ہو رہا ہو، بچے بوڑھے، عورتیں اپنے اور اُن کے کچھ دور کے گاؤوں کے بھی۔ وہ اپنی جان بچانے کو آدمیوں کے گھیرے میں ایسے بھاگ رہی تھی۔''

''جیسے پچھلے زمانے میں کسی غلام کو جس سے کوئی خطا ہوئی ہو یا مالک کو چھوڑ کر بھاگا ہو ہاتھ میں کٹار دے کر ایرینا میں کھڑا کر دیتے تھے اور چاروں طرف سے اس پر بھوکے بھیڑیے یا چیتے چھوڑ دیتے تھے کہ کر اب اپنا بچاؤ۔''

''ایرینا کیا؟''

تلمیذ نے کہا ''سمجھو بہت بڑا اکھاڑا اور کبھی کبھی وہ اس میں نہتا ہوتا تھا۔''

قصہ سنانے والے نے کہا ''بالکل بالکل، وہ بھی نہتی تھی۔ اس کی چیخیں آسمان کو جا رہی تھیں۔ مجال ہے اُس کے آدمیوں میں سے کوئی آگے بڑھ سکتا۔ ان کے ہاتھوں میں سب ہی ہتھیار تھے۔''

''پھر؟'' کسی نے اکتاہٹ سے کہا۔

''پانچ آدمیوں نے اس اکیلی سے بدلہ چکایا۔ پھر جب بھیڑ چھٹی تو وہ گھیرے کے بیچوں بیچ ایسی پڑی تھی جیسے لاش، آنکھیں کھلی آسمان کو تکتی ہوئی۔ آخری حرامی سے یہ بھی نہیں ہوا کہ جب اٹھا تو اس کا جسم ہی ڈھک دیتا۔''

''یا اس کے ہی آدمی بڑھ کر اس پر مٹی ڈال کر اس کی شرم ڈھک دیتے۔''

''ایک فقیرنی نے اس کی آنکھیں اپنے ہاتھ سے بند کیں۔ لیکن کچھ دور جا کر جو اس نے پلٹ کر دیکھا تو آنکھیں پھر کھلی تھیں۔ وہ چیخ کر وہاں سے بھاگی۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔

ایک ادھیڑ عمر قیدی نے کہا ''ایک اور طریقہ بھی ہے: بڑی ہونے سے پہلے لڑکیاں معاملہ سُلجھانے کو دوسری کے جوان کیا بوڑھوں کو بھی دے دی جاتی ہیں۔ اور وہ کب اُن کے بڑے ہونے کا

انتظار کرتے ہیں۔ جو مزہ چھیلے (بچے) میں ہے وہ جوان بکرے کے گوشت میں کہاں۔'' (کسی نے کہا: بکری کے گوشت میں) پھر کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے کہا ''ایسا ہوتا ہے دیکھ چکا ہوں۔''

ایک اور نے کہا ''اپنا اپنا طریقہ ہے انصاف کا۔ کہیں قتل کرنے والے کو پھانسی دے دیتے ہیں، کہیں لکڑی کے کندے پر اس کی گردن رکھ کر تیغے سے سر اُڑا دیتے ہیں اور کہیں ایسے ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ بس جیل۔''

جس قیدی نے پہلے کبھی سنایا تھا اس نے اخبار میں پڑھا تھا جوان عورت اپنے بڈھے مرد کو زہر دے کر اس کے چھوٹے بھائی کے ساتھ فرار ہوگئی اور دونوں کا پتہ ہی نہیں چلا کدھر گئے۔ ایک دن بتانے لگا: ''کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے اگر کسی پیسے سے مضبوط گھرانے کا کوئی مرد دوسرے گھرانے کے کسی آدمی کے ہاتھ سے مارا جائے جو غریب مسکین ہو۔''

''لیکن قتل اس نے صحیح کیا ہو۔''

''تو عدالت میں یا جرگے کے سامنے مارنے والے گھرانے کی عورتیں مرنے والے کے باپ بھائیوں کے پیروں پر دوپٹے ڈالتی ہیں کہ اب بیٹی، بہن کی عزت تمہارے ہاتھ ہے۔''

''اور؟''

''وہ کبھی مانتے ہیں اور کبھی نہیں بھی مانتے۔''

ایک پڑھے لکھے قیدی نے کہا ''فرسودہ قبائلی نظام نے اپنی لاج رکھنے کو ایسی خوبیاں اپنے لیے گھڑ رکھی ہیں۔ جیسے بہن کی لاج۔''

ایک رات ایک قیدی جو اوروں کی نسبت زیادہ پڑھا لکھا تھا اور زیادہ بولنے کا بھی عادی نہیں تھا اپنی زندگی کا ایک واقعہ سنانے لگا: اس کا جانا اس علاقے میں ہوا تھا جہاں تا حدِ نگاہ درخت ہیں، نہ جھاڑیاں، نہ ہی پہاڑیاں۔ وہاں ایک ہاتھ پر ریل کی پٹڑی ہے جو چھوڑے ہوئے تیر کی طرح میل ہا میل سیدھی چلی گئی ہے۔ دن میں جب سورج سے امان نہ ہو تو اجاڑ، سپاٹ میدان میں پانی کا شبہ ہوتا ہے۔ انگریزوں نے وہاں ریل گاڑی کا ایک ہالٹ بنایا ہے۔ اترنے والے ٹرین سے اتر کر میل بھر چل کر سڑک پر پہنچتے ہیں اور اُسے پار کر کے ایک گاؤں کو جاتے ہیں جہاں نہر ہے، گاؤں اور ایک مزار۔ لیکن وہ سب نہ ٹرین میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو نظر آتا ہے نہ سڑک سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اُس ویرانے میں جب عرس ہو لگتا ہی نہیں ہے باقی سارے سال اس زمین پر نہ ایک قطرہ مینھ کی بوند کا پڑتا ہے نہ کوئی ڈھور چرنے کو آتا ہے۔ ہر طرف آدمی ہی آدمی ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ عورتیں اور بچے۔

''میں عرس کے دنوں میں ایک دفعہ وہاں گیا تھا۔ سرکاری کام سے۔ کتنوں ہی کو لینے بیل گاڑیاں آئی ہوئی تھیں باقی میری طرح دھوپ میں بھوکے پیاسے چلے جا رہے تھے۔ مجال ہے جو کہیں دھتورے یا سینہوڑ (زقوم) کی جھاڑی کا بھی سایہ ہو۔

''خیر میں چلا جا رہا تھا اور بدقسمتی سے جگہ سے ناواقفیت کی وجہ سے ساتھ چھتری بھی نہیں لایا تھا۔ ایک جگہ چلتے چلتے لوگوں کے قدم سست پڑنے لگے اور تھوڑی ہی دور پر پتہ چلا لوگوں نے بھیڑ لگا لی ہے اور سب اونچی آواز میں بول رہے ہیں۔ میں بھیڑ کو چیرتا ہوا اندر تک پہنچا، شاید اللہ کی مرضی تھی کہ میرے منہ سے نکل رہا تھا گورمنٹ کا آدمی ہوں ورنہ کون اندر گھسنے دیتا۔

''وہاں بیچ میں ایک بوڑھی عورت بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کی کھال باریک تھی اور اس میں چُنّٹیں ہی چُنّٹیں تھیں، رنگ گیہواں تھا مگر خوف سے کاغذ کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔

وہ سر سے پیر تک کانپ رہی تھی اور بار بار کہہ رہی تھی 'بابا میں مسلمان ہوں۔ بابا میں مسلمان ہوں۔' لیکن اس کی کوئی نہیں سن رہا تھا۔ دو چار داڑھی والے جنہوں نے بھیڑ اکٹھی

کر لی تھی کہہ رہے تھے' جھوٹ بولتی ہے۔'

'ہم جب آئے تو پتھر کے آگے سر ٹیک رہی تھی۔'

بوڑھی عورت کلمہ طیبہ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس میں خوف سے اٹک اٹک جاتی تھی۔

ایک نے کہا: 'کافر ہے، بت پرست۔ کلمہ تک ٹھیک سے نہیں آتا ہے۔'

تیسرے نے کہا' زندیق ہے دین سے پھر گئی ہے اور کلمے کا کیا ہے وہ تو شیطان کو بھی یاد ہے۔'

بڑھیا نے کہا' نہیں بابا میں مسلمان ہوں۔ ظہر کی نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا '

ایک آدمی نے کہا' جھوٹ بولتی ہے۔ ابھی ظہر کے ختم ہونے میں ڈھائی گھنٹے پڑے ہیں۔'

بڑھیا نے کہا' بے شک پڑے ہوں گے، پر میرا وضو اتنی دیر نہیں رہ سکتا ہے۔ ٹوٹنے والا تھا۔

میں نے کہا لاؤ یہیں پڑھ لوں۔'

میں نے پوچھا' پھر کیا کیا؟'

بولی' لوگ سامنے سے جا رہے تھے ان سے بچانے کو یہ پتھر کا ٹکڑا میرے ہاتھ میں آیا اُسے سامنے رکھ لیا۔ ساری عمر میں نے نماز قضا نہیں کی ہے۔'

وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

کسی نے کہا' سب اس کے من کا گھڑا ہوا ہے۔ عرس میں جا رہی ہے، اندر سے کافر ہے۔ پتھر کے آگے سر ٹیکتے ہم نے اُسے دیکھا ہے۔'

کہنے والے کی ساتھ کی عورتوں اور بچوں نے بھی ہاں ہاں کہتے ہوئے سر ہلائے۔

بڑھیا نے کہا' میں عرس میں نہیں جا رہی ہوں۔ اپنی بیٹی کو دیکھنے جا رہی ہوں۔'

کسی نے اس کی بیٹی کا نام پوچھا اور اس کے داماد کا۔ بڑھیا کی مت کٹ گئی تھی مختلف ادھورے نام اس کی زبان پر آ رہے تھے۔ ایسے خوف کا سامنا شاید اس نے زندگی میں نہیں کیا تھا۔

'یہاں کیسے آئی تھی؟'

'ریل گاڑی سے۔ بیٹی کی بیماری کا خط آیا تھا۔ بہت بیمار ہے۔ پتہ نہیں زندہ بھی دیکھوں گی یا نہیں۔ کوئی ساتھ آنے والا نہیں تھا، اکیلی چل پڑی۔'

'سب من گھڑت ہے۔ ٹرین میں نماز پڑھ سکتی تھی۔' ایک تیس چالیس سال کی تندرست عورت نے کہا۔
گھیرے میں میرے اُلٹے ہاتھ پر جو بچی کھڑی تھی اپنے بھائی سے پوچھ رہی تھی 'بھائی اس نے کیا کیا ہے؟' لڑکے نے کہا 'اسے کلمہ نہیں آتا۔'
ایک جوان آدمی نے آگے بڑھ کر وہ سِل نما پتھر اٹھایا جو بڑھیا کے آگے کھڑا تھا اور بولا 'اسی کو سجدہ کررہی تھی۔' پھر اس سے پہلے کہ کوئی سمجھ سکتا وہ کیا کرنے والا ہے اُسے بڑھیا کے سر پر پوری طاقت سے دے مارا۔ مجھے نہیں یاد کہ اس کی ایک چیخ بھی نکلی ہو۔ وہ بس ایک طرف کو ڈھے گئی۔ دیر سے روکا ہوا پیشاب اس کے نیچے سے بہہ نکلا اور اس کے سر سے بہہ کر جو خون مٹی پر گر رہا تھا کئی دن تک سوتے جاگتے میری نظروں میں گھومتا رہا۔ وہ مجھے مرتے دم تک یاد رہے گا۔ میں تیزی سے بھیڑ سے باہر نکل آیا کیونکہ لوگ اس پر کنکریاں مار رہے تھے۔ وہ لڑکا بھی جس نے اپنی بہن کو بتایا تھا اسے کلمہ نہیں آتا۔ اور بغیر وہ کام کیے جس کے لیے گیا تھا لوٹ آیا۔ گھر پہنچتے پہنچتے تیز بخار نے مجھے پکڑ لیا تھا۔"
کہانی ختم کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی بارک کی طرف چلا گیا۔ باقی قیدی بھی شرمندہ سے وہاں سے خاموشی سے چل دیے۔

ایک قیدی جو پڑھا لکھا تھا اور فوجی حکومت کے خلاف مضمون لکھنے پر پکڑا گیا تھا روزانہ ہی وہاں آن بیٹھتا تھا اور ان لوگوں کی باتیں توجہ سے سنتا تھا۔ دن میں قیدیوں نے اسے زیادہ تر کتابیں رسالے ہی پڑھتے دیکھا تھا اور اکثر ایک طرف بیٹھ کر کچھ لکھتے بھی۔ چوری چھپے، کیونکہ یہ اس کی سزا میں شامل تھا کہ اُسے لکھنے کو کاغذ، پینسل، قلم کچھ نہ دیا جائے۔ نہ ہی مذہبی کتابوں اور حکومت کی کارکردگی کی توصیف میں لکھی ہوئی کتابوں کے علاوہ کچھ اور۔ ملک

کے موجودہ ہیڈ جو نیوی کے ایڈمرل تھے ان کی خودنوشت کی چار جلدیں جیل کی لائبریری میں موجود تھیں اور ان پر دھول نہیں جمنے دی جا رہی تھی۔ وہ ضخیم کتاب ہر گورمنٹ دفتر، بینک، تمام تعلیمی اداروں میں موجود تھی اور ہر ایک پر، ہر ایک نے اُن سے دستخط کرائے تھے۔ وہ کتاب اعلیٰ سرکاری نوکری کے امتحان کے لیے کورس میں شامل تھی۔ پھر بھی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جو خود پڑھا لکھا تھا جانتا تھا بیدار کی ضرورت کچھ اور تھی۔ وہ ایسے قیدیوں پر پہلے سے کرم فرمائی کرتا آیا تھا۔ بیدار کو اس کی دوستی کام آ رہی تھی۔ فرسودہ قبائلی نظام والی بات اسی نے کہی تھی۔

ایک رات الاؤ کی محفل میں قیدی اُس سے کہنے لگے ''صاحب آپ بھی تو کبھی اپنی رائے دیا کریں۔ مانا ہم جاہل ہیں۔ پڑھ نہیں سکتے مگر پڑھے لکھوں کی بات تو سمجھ سکتے ہیں۔''

اس نے شرمندگی سے کہا ''کیا بولا کروں؟ مجھ سے زیادہ دنیا تو آپ سب نے دیکھی ہے۔ میں شہر کا آدمی ہوں۔ میں تو بس جیب کٹنے، گاڑی کا چالان ہونے اور آٹے تیل میں ملاوٹ کا رونا روتے دیکھتا آیا ہوں۔ یا یہ کہ آج یونیورسٹی، کولج کے لڑکوں نے ہڑتال کی ہے، کل گولی چلنے سے دکانیں بند ہوگئیں۔ کسی بے قصور کی کار ہجوم نے غصہ اتارنے کو جلا دی۔ بھلا ان روز کے قصوں کو سنانے میں کیا مزہ ہے۔''

''پھر بھی۔''

ایک قیدی نے بیڑی کا بنڈل اس کی طرف بڑھایا۔

'' کچھ عجیب سا نہیں لگتا ہے عورتیں لڑکیاں ایسے استعمال کی جا رہی ہیں جیسے جرمانے کی رقم کمزور بھر رہے ہوں اور طاقتور وصول کر رہے ہوں!''

جن کی بات سمجھ میں آئی انہوں نے سر ہلائے، باقی خاموشی سے اٹھ کر اپنی بارکوں کو چلے گئے۔

ایک اٹھارہ بیس سال کے لڑکے نے کہا: ''جاتے ہوئے انگریز ان باتوں کو ٹھیک نہیں کرتے گئے؟''

بیدار نے کہا ''ان باتوں میں لوگوں کا پھنسا رہنا اچھا تھا۔ یہ نہ رہتیں تو اٹھ کر آزادی کے لیے بغاوت کرنے والوں میں شامل ہو جاتے۔''

اسی نے کہا" پر اب جب آزادی مل گئی ہے تب ان باتوں کو کیوں ہونے دیا جارہا ہے؟"
" یہ نہ ہوں تو لوگ اور بغاوتوں میں لگ جائیں۔ اور بغاوتیں کیسی بھی ہوں حکومت کو پسند نہیں آتی ہیں۔"

اُن ہی دنوں جیل سے باہر کی دنیا میں یہ خبر اڑی ہوئی تھی کہ ایڈمرل گورمنٹ ہیڈ کا، جو اُس کی اپنی منشا سے بادشاہ کہلانے لگا تھا، ستارہ گردش میں ہے۔ نیوی، ایئرفورس، آرمی، پولس کے اعلیٰ افسر اور جاگیردار اور بڑے بڑے زمین دار جو پہلے اس کی صلاحیتوں اور عوام کی خدمات کا جس گاتے تھے آہستہ آہستہ اس سے دور ہوتے جارہے ہیں۔ حتیٰ کہ مغرب کی بڑی طاقتیں بھی اس سے مُنہ چرا رہی تھیں۔ ایک طاقت ور ملک کے حکمران نے اپنی بیٹی کی شادی میں تمام دوسرے حلیف ملکوں کے سربراہوں کو شرکت کی دعوت دی تھی مگر اس ملک کے ایڈمرل صدر کا نام اس لسٹ میں نہیں تھا جو مدعٗین کی تھی۔

یہ خبر بھی تھی تمام بڑے شہروں میں اُس طاقت ور ملک کے حکمران کے خلاف جلوس نکالے جائیں گے، اس کے پتلے جلائے جائیں گے اور شاید اُس ملک کا جھنڈا بھی نذرِ آتش کیا جائے گا۔

پھر ہوا یہ اپنی تمام اکڑفوں طاق پر رکھ کر ایڈمیرل صدر اپنی بھینس کے دودھ جیسی سفید یونیفورم میں تمغے سینے کی آرائشوں کے اُن پیر صاحب کے دربار میں حاضر ہوئے جہاں ہمیشہ سے ملٹری اور سول سب ہی لیڈر ہمیشہ سے حاضری دیتے آئے تھے۔
ایسی خبر جیل میں آنے سے کیسے رک سکتی تھی۔

پیر صاحب نے ایڈمیرل کو سجدے سے سر اٹھانے کے لیے اُن کے ہیٹ پر اپنا عصا مارا اور جب وہ اٹھ کر مؤدب ہو بیٹھے تو کہا
"تمہاری صدارت بچتی نظر نہیں آتی ہے۔" اور صدر کے پھر؟ کہنے پر گویا ہوئے "بس اُسے بچانے کا ایک طریقہ ہے جیسے پہلے بادشاہ خوشی کے موقعے پر قیدیوں کو رہا کرتے تھے، موت کی سزا معاف کردیتے تھے تم بھی کسی کو پھانسی سے بچاؤ۔ نئی زندگی دو۔"

ایڈمیرل صدر نے وہیں بیٹھے بیٹھے گردن گھما کر اپنے اے ڈی سی[1] سے پوچھا: ''کوئی ہے پھانسی گھر میں؟''

اس نے کہا: ''جی حضور ہے۔ معشوق علی خاں۔ اس نے ایک نہیں کئی قتل کیے ہیں۔ بلیک وارنٹ پر ہے۔''

ایڈمیرل نے پوچھا۔ ''اس کی معافی کی درخواست آئی ہے؟''

اس نے کندھے اچکا کر کہا ''شاید آئی ہو۔''

''نہ بھی آئی ہو تو جاں بخشی کا حکم لکھ کر بھیج دو۔''

اس خبر کا آخری حصہ یہ تھا: معشوق علی خاں کے باپ نے پیر صاحب کی خدمت کے لیے اس کی بارہ سالہ لڑکی، یعنی اپنی پوتی دی: ''آپ کے پیر دبائے گی'' اور اوپر سے پانچ لاکھ روپے۔

کچھ ہی دن بعد الاؤ والوں نے بھانپ لیا وہ نوجوان ان میں سے غائب ہے جسے فوجی حکومت کے خلاف مضمون لکھنے کے جرم میں پکڑا گیا تھا۔ پھر یہ خبر آئی اُسے اس زندان میں منتقل کر دیا گیا ہے جو شیر شاہ سوری کے بنوائے ہوئے قلعے میں ہے جہاں خطرناک سیاسی قیدی رکھے جاتے ہیں اور جو جسمانی سزا اور نفسیاتی اذیت کے لیے بدنام ہے۔ یہ کام اس وقت مکمل خاموشی سے کیا گیا تھا جب پوری جیل سوئی پڑی تھی۔

ملاقات والے دن تلمیذ سے ملنے والے کبھی کبھار ہی ہوتے تھے۔ اس بہن کو چھوڑ کر جو ڈیڑھ ہزار میل پرے بیٹھی تھیں اور چچی خالہ اور ان کی بیٹی ساجدہ کے علاوہ جو شروع میں ایک جنگی میں اسی شہر میں آبسی تھیں اور اب نہ جانے کہاں تھیں شاید ہی کسی اور رشتے دار نے اس God forsaken country (اجاڑ ملک) میں جیسا کہ وہ کہا کرتا تھا، آنے کی زحمت گوارہ

---

[1] ایڈی کانگ

کی تھی۔

باپ کی چہیتی تلمیذ کی بڑی بہن کلثوم راجدھانی ہی میں رہ گئی تھیں اُسی بہادر گنج والے گھر میں، بڑے بھائی جان مر چکے تھے۔ اُن کے بچوں میں وہ چیز نہیں تھی جس کے لیے انگلش میں کہتے ہیں نئی چراگاہ کی تلاش میں نکلتے۔ پتہ نہیں کس کس کی شادی ہوئی تھی۔

نمبر دو بڑی بہن زینب بیاہ کر پورب کے شہر رام نگر گئی تھیں، وہاں ان کا گھر گلاب باڑی میں تھا۔ وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بچے؟ وہیں ہوں گے۔

تسنیم؟ وہ اگر اس ملک میں آئی بھی ہوتی تو مجھ سے ملنے آتی! اخبار میں جعلسازی اور گرفتاری کی خبر پڑھ کر اگر کبھی پہلے تھوڑا بہت لگاؤ اُسے مجھ سے تھا وہ بھی ختم ہو جاتا۔ اچھا ہوا، یہاں کوئی نہیں آیا۔'

امینہ بہادر لڑکی، جو ساری عمر لڑکی ہی رہے گی، ایک دن تلمیذ کی گرفتاری کے تیسرے یا چوتھے دن اُس سے ملنے پہلے دفتر گئی اور اُسے تالہ لگا دیکھ کر دل پسند ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھ کر، پھولی ہوئی سانس کے ساتھ تیسری منزل پر پہنچی۔ اُسے بھی بند دیکھ کر تھکی تھکی سی نیچے اتری اور اشارے سے مانڈلے ریستوراں کے برمی بیرے کو باہر بلایا۔ وہ ہاتھ کی ٹرے رکھ کر خاموشی سے اس کے پاس آیا اور زینوں کے نیچے کی خاموش جگہ میں امینہ کو لے جا کر بولا "وہ تو گرفتار ہو گیا۔" امینہ کے دل کو دھکا لگا۔ بیرے کی آنکھوں میں خبر کی سچائی کو پڑھنے کی کوشش کی اور اعتبار کر کے بولی "کہاں ہیں؟"

اس نے کہا "ٹھیرو" اور منیجر سے پوچھنے چلا گیا۔ وہاں سے آ کر بولا "منیجر بولتا ہے تجربہ بتاتا ہے پولیس لوک اپ میں ہوگا، ڈھونڈ لو۔ ابھی جیل نہیں گیا ہوگا۔"

"لوک اپ کہاں ہے؟"

"وہ تو بہت سے ہیں — ہر پولس تھانے میں۔ اب مجھے کام کرنا ہے۔ خود پتہ لگاؤ۔"

تلمیذ کے جیل میں آنے کے پانچویں دن جو ملاقات کا دن تھا وہ اس بڑے کمرے میں

کھڑی تھی جہاں قیدیوں کے ملاقاتی آتے تھے۔ تلمیذ کو قیدیوں کے کپڑوں میں دیکھ کر اس کے آنسو نکل آئے دونوں دیر تک خاموش رہے۔ پھر تلمیذ نے سکوت توڑا:

''تم نے ڈھونڈ لیا!''

اس نے پیر سے ایک چپل نکال کر اس کا تلا تلمیذ کو دکھایا۔

تلمیذ ہنس پڑا ''چھید ہوگیا۔ میں سمجھا تھا ماروگی۔'' امینہ بھی ہنس پڑی۔ تلمیذ نے کہا ''باہر نکل آؤں ایک درجن سینڈل چپلیں لے دوں گا۔''

''تا کہ پھر تمہیں ساری عمر ڈھونڈتی رہوں۔ تکلیف میں تو بہت ہوگے؟''

''بالکل نہیں۔ تکلیف میں باہر تھا اور جب پولس لوہے کے کڑے پہنا کر ایک تھانے سے دوسرے تھانے لے جاتی تھی اور ساری دنیا دیکھتی تھی۔''

''او ما! ایسا کیا تمہارے ساتھ!''

''مارا بھی بہت۔''

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ لمبی ریلنگ اور اس کے پیچھے کی جالی کے ایک طرف ملنے کے لیے آنے والے تھے دوسری طرف قیدی آ اور جا رہے تھے۔ دونوں میں سے کسی نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ ملنے والے نکل پلیٹیڈ ریلنگ سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے۔ امینہ نے پائپ پر چوڑیوں سے کھٹ کھٹ کرتے ہوئے کہا ''یہ نہ ہوتی بیچ میں تو جالی کے پاس منھ لا کر تمہارے ہاتھوں کو پیار کرتی۔''

تلمیذ نے کہا ''اس میں تمہاری چوڑیاں بھی نہ ٹوٹتیں۔'' کچھ دیر خاموشی رہی۔ ''اکیلی آئی ہو؟''

امینہ نے ہاں میں سر ہلایا۔

''سلیم کہاں ہے؟''

''گھر میں بیٹھا پڑھ رہا ہے۔''

بچے ہوئے گنتی کے منٹوں میں دونوں میں کام کی باتیں ہوئیں: ''جیل سے نکلنے کا چانس ہے؟''

''ہے۔ یہ تو بس عارضی قید ہے۔ کب تک حوالات میں رکھتے! جگہ کی کمی تھی اس لیے یہاں بھیج دیا۔''

پھر وہ جیسے خود سے دیر تک باتیں کرتا رہا: ''حوالات خدا کی زمین پر سب سے بری جگہ ہوتی ہے۔ یا خود پٹ رہے ہیں یا جو ساتھ میں بند ہے اسے باہر نکال کر انسپکٹر یا سب انسپکٹر کے سامنے کھڑا کیا گیا ہے۔ پہلے تو لگتا ہے اس پولس افسر سے زیادہ مہذب آدمی دنیا میں نہیں ہے: آپ جناب سے بات کر رہا ہے جیسے کسی شریف گھرانے کا آدمی ہے۔ بیوی بچوں کی خیریت، امی ابو یا ڈیڈی ممی کی خیریت — ماں باپ کی نہیں۔ کیوں یہاں خراب ہونے آئے ہو! شکل سے شریف آدمی لگتے ہو۔ یہ کام تم سے کس نے کروایا تھا — یا ایسی ہی کوئی اور بات۔ اور جب ملزم اپنے پورے ایمان کو کام میں لا کر عاجزی کا اظہار کرتا ہے کہ اسے نہیں معلوم تو سوال کرنے والے کے اسی منھ سے غلیظ ترین گالیاں نکلنے لگتی ہیں۔ لیکن اس بار امی ابو، کے القاب ماں بہن بیٹی سے بدل جاتے ہیں۔ جیسے نوکری کو قبول کرنے کے فورم پر دستخط کرتے وقت اس نے اپنے اندر کے انسان کو چھٹی پر بھیج دیا ہو اور اس کی جگہ اس میں ایک ریچھ آ بیٹھا ہے جو کسی خانے بند نہیں ہے: گوشت، بھٹے، شہد، مچھلی — زمین پر، پیڑ پر، پانی میں اس کی دسترس سے کچھ باہر نہیں ہوتا ہے اور دنیا میں اگر کسی سے ڈرتا ہے تو اپنے سے بڑے، زیادہ طاقتور ریچھ سے۔ پھر وہ ملزم پٹ رہا ہوتا ہے اور جب مارنے والا تھک جائے تو اسے دوبارہ حوالات میں ڈال دیا جاتا ہے۔'' یہ سب کہتے ہوئے تمیز لرز رہا تھا۔

''اس کے بعد'' اس نے سر اٹھا کر کہا ''یہ جیل جیسے جنت ہے۔ یہاں ایک طرح کی آزادی ہے جو پولس لوک اپ میں ہو ہی نہیں سکتی۔ یہاں سپرنٹنڈنٹ، کونسٹیبل، سنتری پھر بھی آدمیوں کی زبان میں بات کرتے ہیں، وہاں والے آپس میں بھی اسی گالی گفتار میں۔ اپنے سے بڑے افسروں کا ذکر بھی مادر، بہن، بیٹی کو بیچ میں لائے بغیر نہیں کرتے...... ''

امینہ اس کی شکل دیکھ رہی تھی لیکن وہ اس سے دور تھا۔

پھر اس نے امینہ کو دیکھتے ہوئے کہا: ''اگر ضمانت ہو جائے تو میں کل رہا ہو جاؤں گا۔''

''کیس ختم ہو جائے گا؟''

''نہیں کیس چلے گا۔ پھر میرا مقدر جو بھی فیصلہ ہو۔''

امینہ نے پوچھا ''ضمانت کی کوشش تمہارے دوست کررہے ہیں؟ یا رشتے دار؟''

''کوئی نہیں۔ تمہیں معلوم ہے اس ملک میں میرے رشتے دار نہیں ہیں۔ ہوتے تو تم نے انہیں دیکھا ہوتا۔''

''اور وہ مرتضیٰ قریشی اور گیور تمہارا دوست؟''

''مطلب کے ہیں اور پھنسانے والے۔ ان کی سزا میں بھگت رہا ہوں۔ کوئی نہ حوالات میں آ کر جھانکا، نہ یہاں۔ ہاں اُن کے پیغام ملتے رہتے ہیں: ہرگز مُنہ سے مت پھوٹنا اس کام میں تمہارا شریک کون تھا۔ ابھی تمہارا کیس ہلکا ہے۔ ہم تمہیں چھڑا لیں گے۔ بہت ہوگی سال دو سال کی قید۔ لیکن اگر وکیل یا جرنلسٹ کے نام آئے تو یا تمہیں چپ رہنا ہوگا یا کہو گے یہ نام میں نے پہلے نہیں سُنے، ورنہ تمہیں چپ کرا دیا جائے گا۔ اس کے اور طریقے ہیں۔''

''مروا دیں گے؟'' امینہ نے سہم کر کہا۔

''غیور پھوٹے گا وہ مجھے اس عرب بندرگاہ سے جانتا ہے جہاں میں پہلے تھا۔ وہاں میرا نام دوسرا تھا اور وکیل نے مجھ سے کہاں کہاں غلط کام کرائے ہیں۔''

تلمیذ کے ماضی اور حال کی تفصیل پر امینہ چونکی نہیں — جیسے اُسی زندگی کی ہستی وہ بھی تھی۔

''حوالات میں پیغام ملا تھا: یہ سمجھنے کی کوشش کرو انصاف کو سچ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے تو پھر تم کیوں سچے بننے کی کوشش کرو۔''

''حرامی بچے۔'' امینہ نے کہا ''میں مُنہ نہیں لگاتی تھی اور سب مکھی کی طرح ٹوٹے پڑتے تھے۔''

رخصت ہونے سے پہلے امینہ نے کہا: ''میں کوشش کرتی ہوں۔ جیسے بھی ہو سکے۔''

اس نے سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس تلمیذ کو دکھائے۔

تلمیذ نے سنتری کو آواز دی: ''او بھائی۔ یہ ان سے لے لو۔''

(۳۶)

کاسو کے جانے کے بعد جیل میں کوئی ایسا قیدی نہیں رہا جس کی خدمت کو ہر گھڑی چار چار قیدی حاضر رہتے ہوں۔ وہ جگہ جہاں اینٹوں کے چولھے تھے ایک پر بریانی یا قورے کا پتیلا چڑھا رہتا تھا، دوسرے پر توا وہاں اب صرف جلی ہوئی زمین کے دو ٹکڑے رہ گئے تھے۔ نہ بیئر کے ٹن تھے نہ وائٹ ہورس کی بوتل اور گلاس، نہ پانچ سو پچپن کے ٹن۔ کئی دن تک لگتا رہا اس بڑے گھر میں کوئی موت ہوگئی ہے وہ بھی وحشیانہ جسمانی سزا سے نہیں جسے موٹی گردن والا ڈاکٹر سرٹیفائی کرنے آتا کہ موت ہارٹ اٹیک سے ہوئی ہے۔ کسی چہیتے کی موت جو سب کو افسردہ چھوڑ گئی ہے۔

تلمیذ سے ملنے کون آتا تھا الا امینہ کے، وہ بھی بس ہفتے میں دو بار آسکتی تھی۔

ایک قیدی نے جو ایم اے تھا اور ٹھیک طرح نہیں جانتا تھا وہ کس جرم کی سزا بھگتنے کو یہاں بھیجا گیا ہے اکثر تلمیذ کو ایسے گاتے سنا تھا جیسے خود سے باتیں کر رہا ہو۔ وہ قیدی خود جب بارک سے باہر ہو ایک پتھر سے ٹیک لگا کر گھاس پر، وہ جتنی بھی تھی، بیٹھا ناول یا رسالے پڑھا

کرتا تھا۔ ایک دن اٹھ کر وہ دبے قدموں تلمیذ کی پشت پر پہنچ گیا اور سننے لگا۔

تلمیذ گا رہا تھا:

مورکھ من ہووت کیوں حیران

سچ مچ تیری بات اندھیری　　　سنکٹ میں ہے جان

مورکھ من ہووت کیوں حیران

پھر جیسے بغیر کسی آہٹ کو سُنے تلمیذ نے پلٹ کر دیکھا۔ مختصر سی خاموشی کے بعد ناصر نے کہا:

''سنکٹ کیا؟''

''مشکل، مصیبت۔''

''O' I see'' ناصر نے کہا ''وہ تو میری بھی ہے۔ مگر میری آواز ایسی ہے کہ خود اپنا دل نہیں بہلا سکتا ہوں۔''

''مگر پڑھتے رہتے ہو، کہاں سے آتے ہیں تمہارے پاس رسالے کتابیں؟ یا بار بار پڑھے ہوؤں کو پھر پڑھنے بیٹھ جاتے ہو؟''

ناصر نے کہا ''یہاں ناولوں، رسالوں کی کیا کمی ہے۔ کوئی چاہے تو بلو (blue) رسالے بھی مل سکتے ہیں۔ مگر اس کے لیے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کو خوش رکھنا پڑتا ہے۔'' اور تلمیذ کے چہرے پر سوالیہ نشان دیکھ کر ہنس پڑا۔ ''اس کے بھی طریقے ہیں۔''

''یہاں کیسے آنا ہوا؟''

ناصر دوبارہ ہنسا لیکن اس بار ٹھٹھا مار کر ''بس دیرینہ تعلقات ہیں۔ ملک کی آزادی سے بھی پہلے کے۔ تب جو جلوس نکلتے تھے ان کی آمد کے نعرے سن کر جو کام بھی کر رہا ہوں اُسے چھوڑ کر باہر نکل آتا تھا اور جس طرح اور سب کرتے تھے، میرا مطلب ہے میری عمر والے، نعرے لگاتا ہوا جلوس کے ساتھ چل پڑتا تھا۔ بیچ بیچ میں نئے لڑکے اس جلوس میں شامل ہوتے جاتے تھے۔ اور راہ میں پڑنے والی ہر گلی میں کچھ غائب ہوتے جاتے تھے۔ کبھی کبھی مجھ سے تقریر بھی کرائی جاتی تھی۔ خیر آزادی آئی، ایک نہ ایک دن تو اسے آنا ہی تھا۔ لیکن نہ ملک بدلا تھا نہ ہم۔ تب یہ

بھید سب پر نہیں، ہم میں سے کچھ پر کھلا نعرے جو ہم لگاتے تھے صرف بدیشی راج سے آزادی کے نہیں تھے، حقیقت میں ان کی گٹھلی، core، اور بہت سی گلا گھونٹنے والی چیزوں سے خلاصی کی تھی۔ جو ہم پر حکومت کر رہی تھیں ہماری مرضی کے خلاف۔ میرے بارے میں بہت جلد سرکار نے جان لیا او ہو یہ اُن میں سے ہے جو نہ برطانوی حکومت سے خوش تھے نہ اپنی سے۔''

تلمیذ نے ایک بجھائی ہوئی سگریٹ جیب سے نکالی اور اس کی طرف بڑھائی۔ ناصر نے کہا: ''سلگا کر دو۔'' اور اطمینان کے دوسرے کش کے بعد جس میں اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں سگریٹ اسے تھماتے ہوئے کہا: ''تعلیم میں انہوں نے سو روڑے اٹکائے۔ ایم اے اکیس سال کی عمر میں کرنا چاہیے تھا ان کی توجہ سے اٹھائیس کی عمر میں کیا۔ بیچ بیچ میں آرام کے لیے یہاں اور کئی اور زندانوں میں بھیجا گیا۔ میرا خیال ہے مہربان تھے، نہیں چاہتے ہوں گے اعلیٰ سروس میں شامل ہو کر غلامی کروں۔ ہمیشہ کہا گیا 'تم کمیونسٹ ہو' اور ہمیشہ اسی بات پر بحث ہوتی تھی: وہ کہتے تھے 'ہو' میں کہتا تھا 'نہیں ہوں'۔ جب یہاں کمیونسٹ تحریک ہی نہیں تو کمیونسٹ پارٹی کیسی۔ اور جب وہ نہیں تو میں کیسا کمیونسٹ۔''

'آخر کومریڈ جو اسٹالن[1] کے کہے کو مان کیوں نہیں لیتے ہو؟ سب اسی طرح پارٹی میں آتے ہیں۔' ایک پبلک پروسیکیوٹر نے ایک دفعہ کہا

میں نے کہا 'لکھا ہوا دکھاؤ کہاں اور کب اس نے کہا تھا کہ آدمی بغیر پارٹی کے بھی کمیونسٹ ہو سکتا ہے؟' سب اس پر ہنس پڑے اور اُسے چپ ہونا پڑا۔

ایک دن عدالت میں پوچھے جانے پر ''کمیونسٹ ہو؟'' میں نے اونچی آواز میں کہا 'ہوں۔ کر و کیا کر سکتے ہو۔'

کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر تلمیذ نے پوچھا

''No communism in this country? not even a trace of it?''

''حقیقت میں کمیونزم اس ملک میں بھوسے میں کھوئی ہوئی سوئی ہے جسے ڈھونڈنے کے کام پر

---

[1] Joe Stalin

امریکا نے یہاں اور چھوٹے ملکوں کی حکومتوں کو لگا رکھا ہے۔
کمیونزم نہ قبائلیت کا ہم سفر ہوتا ہے، نہ جاگیرداریت اور بڑی زمینداری کا۔ خود کو الیکشن میں جتوانے کے لیے یہ تینوں یہاں کبھی کمیونزم، کبھی نیشنلزم کے پردے میں سے اپنا رخ دکھاتے ہیں، کبھی مزاروں کی ثقافت کی چلمن اٹھا کے۔''

''کہاں؟''

''یہاں، اس ملک میں اور کہاں۔''

تمیذ اس کی شکل کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا، بولا ''کس کو؟''

''تمہیں، مجھے، عام لوگوں کو۔''

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ پھر ناصر نے کہا ''تمہاری صورت سے بیابانی ٹپکتی ہے۔ تم جیل میں پورے وقت بور تو نہیں ہوتے رہتے ہو؟ اگر سوچو تو بڑی اچھی جگہ ہے یہ اپنے ہاتھ میں ہے خوش رہو یا روؤ۔ حقیقت یہ ہے جیل سے اچھی جگہ اس ملک میں دوسری نہیں ہے۔ اور شاید کسی ملک میں بھی نہیں۔ بشرطیکہ سزا ان کے ہاتھ میں نہ ہو — نور جہ۔
یہاں نہ روڈ ایکسی ڈینٹ ہوتے ہیں، نہ آٹے کے راشن ڈپوز سے غائب ہوجانے کا شور مچتا ہے۔ نہ جیب کٹتی ہے۔ ہاں حکومت کو ہر دم اس اُس کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔
بس زندگی جیل میں اسی طرح گزرے اور ایک دن ختم پر آ جائے۔ اس سے زیادہ بشر کو اور کیا چاہیے۔
''ویسے یہ جیل ملک بھر کی دوسری جیلوں سے بہتر ہے۔ مجھے ان سیاسی قیدیوں نے یہ بات بارہا بتائی ہے جنہیں سب میں جھٹکا یا گیا تھا۔ کبھی تم نے بلی پالی ہے؟''

''پالی ہے۔''

''جب بچے دیتی ہے تو ان کا کیا کرتی ہے؟''

''سات یا نو گھر جھنکاتی ہے۔''

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے اچانک کہا ''یہاں جس گھاس پر تم بیٹھے ہو مانتا

ہوں چھدری ہے جیسے زمین کو کوئی کھال کی بیماری ہو۔ پھر بھی ہے تو گھاس۔ دوسری جیلوں میں اتنی بھی نہیں، ہریالی دیکھنے کو ترس جاؤ گے۔ یہاں پانی صاف آتا ہے۔ دوسری جیلوں میں دو گھنٹے صبح، دو گھنٹے بیچ رات میں۔ یہ جیل ابھی تک برٹش ٹریڈیشنز پر چل رہی ہے، باقی جیلیں جیسے نیشنالائز ہوگئی ہیں۔ اس لیے ان میں گندگی ہے، ٹائلٹس، دیواروں پر دن میں بھی لال بیگ چلتے نظر آتے ہیں۔ رات میں کھٹمل تمہارے ساتھ سوتے ہیں۔

''آخری بات! مجھ سے میں کھوئی ہوئی کوئی سوئی تھی ہی نہیں۔''

اگلے دن تلمیذ کو ناصر اُسی جگہ بیٹھا پڑھتا نظر آیا۔

In Andmans: The Indian Bastille (انڈمان میں ہندوستانی قیدخانہ) تلمیذ نے ٹائٹل پڑھ کر ناواقفیت میں سر ہلایا۔

''تمہارا اس سے واقف ہونا ضروری بھی نہیں ہے اور میرے لیے یہ کتاب۔ ایسی ہے جیسے کوئی پسندیدہ رومان، یا جرم پر لکھا گیا ناول۔''

کتاب ایک طرف رکھ کر دیر تک، حالانکہ وہ تلمیذ ہی کا ہم عمر تھا، اس کی ذرگھنا سنتا رہا جو اُسے یہاں لے آئی تھی۔ آخر میں جب تلمیذ نے کہا: ''مجھ پر فورجری (جعلسازی) کا چارج ہے دیکھو کتنی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔''

ناصر نے کہا: ''آٹھ دس مہینے سے لے کر آٹھ دس سال تک کیونکہ وقت کے گزرتے جانے میں کیس اتنا ہی نہیں رہتا ہے، اس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے: تم نے یہ بھی کیا تھا وہ بھی کیا تھا۔ کوشش جلد نکلنے کی کرو۔ کچھ کوشش ہو رہی ہے؟''

''سگا کوئی نہیں ہے، دوست ایک لندن میں ہے، دوسرا فلم کیپیٹل سٹی میں، اور تیسرا اگر یہاں ہے اس نے پڑھا تو ہوگا اخبار میں سب کچھ، لیکن نہیں آیا۔ ہوسکتا ہے ملک سے باہر ہو یا اس ملک میں آیا ہی نہ ہو۔ ایک واقف عورت کوشش کر رہی ہے۔ مگر اس کا زور کسی پر نہیں ہے، خود بے بس ہے۔''

ناصر نے کہا: ''وہ کام کر دکھائے گی۔ محبوبہ ہے؟''

''ایک طرح سے بھروسہ کی ہے۔''

''اس سے شادی کا ارادہ ہے؟''

تملیذ کو جھرجھری آ گئی۔

ناصر نے کہا: ''پھر اُس سے کام بھی مت لو۔''

تھوڑی دیر بعد تملیذ نے سر اٹھا کر کہا: ''تم نے بتایا نہیں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کو کس طرح خوش رکھتے ہو کہ تمہیں کتابیں رسالے ملتے رہتے ہیں، اپنی پسند کے، اور وقت بے وقت چائے اور سگریٹ؟''

''چائے ہاں، سگریٹ کبھی کبھار۔ اس کی بیٹی کی تھیسس تیار کرنے میں مدد کر رہا ہوں۔ ایم اے میں ہے۔''

''کیسا تھیسس؟''

''جس موضوع پر تحقیقی کام کر رہی ہے اس کے لیے مشورے دیتا ہوں کیا پڑھو۔ پھر جب وہ اس کے کچھ صفحے تیار کر لیتی ہے ان کی اصلاح کرتا ہوں۔ اور جب باب مکمل ہو جائے اُسے سپرنٹنڈنٹ آفس میں بیٹھ کر ٹائپ کر دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے اچھی لڑکی ہے۔ شادی کی ہوتی تو سوچتا ہوں بیٹی ہوتی تو وہ ایسی ہوتی۔''

''اب کر لو۔''

''نزین جا چکی ہے، ہاں تم کیس ختم کرانے کی کوشش کرو ورنہ اکثر جتنی طویل سزا عدالت سناتی ہے اس سے زیادہ مدت ملزم جیل میں گزار چکا ہوتا ہے۔ تلافی میں عدالت اور جو چاہے ملزم کو دے اس کے وہ گُم کیے ہوئے سال نہیں دے سکتی ہے۔''

اگلی ملاقات پر امینہ نے کہا: ''ضمانت کا انتظام ہو گیا سمجھو۔'' اور ہاتھ میں جو کچھ تھا دکھانے لگی۔

تلمیذ نے کٹھور لہجے میں کہا "پہلے ضمانت کا بتاؤ۔ ہوگیا ہے یا فنٹی مار رہی ہو۔"

"کبھی فنٹی ماری ہے۔ میری چھوٹی بہن کے جیٹھ کا گھر ہے، ساتھ میں بوتلیں کارٹن، بنانے کا کارخانہ ہے۔ دونوں ہوں گے کئی لاکھ کی مالیت کے۔ بیرسٹر احمد عبدالرحمٰن سے ملنے روز جاتی رہی ہوں۔ انہوں نے یقین دلایا ہے اتنے میں ضمانت ہوجائے گی۔"

بیچ میں تلمیذ کے سوال کا جواب کہ "وہ جو میرے ساتھ ڈوکٹر حنفی کے ہسپتال میں تھے؟" اس نے سر ہلا کر نفی میں دیا۔

"اور اُن کی فیس؟"

"وہ تمہارے دوست فتی بھائی نے دی۔"

"تمہیں وہ کہاں ملا؟" تلمیذ نے تعجب سے کہا۔ پھر بولا "اچھا انسان ہے، بہت اچھا انسان۔"

"تم ہی نے ایک دفعہ ملوایا تھا۔ پرنسس این اسٹریٹ پر اس کے سیلون کے سامنے۔ مگر میں نے مُنھ نہیں کھولا تھا اور وہ سمجھتا رہا تھا۔

"تم اس کی بھابھی ہو۔"

"ہاں۔ مگر میرے یہ نصیب کہاں۔"

اس کے موڈ کو بدلنے کے لیے تلمیذ نے کہا "وہاں نئی راجدھانی میں فوج گنج میں اس کا سیلون تھا۔ وہاں انگریز بھی آتے تھے اور دیسی انگریز بھی۔ ایک بار میرا شیو کیا تھا اور سر کا مساج، بے وجہ گرویدہ ہوگیا اور تم تو جانتی ہو مجھ میں کوئی گُن نہیں ہے۔ وہیں پرنسس این اسٹریٹ پر ملنے گئی تھیں؟"

"او ما! اور کہاں جاتی! مجھے اس کے گھر کا کیا پتہ! بس سمجھ میں آ گیا جب ایسی جگہ اس کا سیلون ہے تو جیب میں پیسے بھی ہوں گے۔ کہہ رہا تھا: "ایک دن بھابھی سے ملنے جاؤں گا۔"

"تمہیں بھابھی نہیں سمجھا؟"

"سمجھنا چھوڑ دیا۔" امینہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "اب بوجھو میرے ہاتھ میں کیا ہے؟"

"سگریٹ؟ پان؟ آلو قیمہ اور پراٹھا؟"

''سگریٹ ہاں، لیکن باقی نہیں۔ سموسے ترکاری کے ہیں: آج گوشت کا دن نہیں ہے۔''

اس شام تمیز نے ناصر کو ڈبیا سے سگریٹ پیش کرتے ہوئے بتایا:
''میرا یہاں سے جانے کا وقت آرہا ہے۔ تم نے بتایا نہیں اس جیل میں کیوں ہو اور کب تک ہو؟ جو اسٹالن والی بات کو میں نہیں مانتا۔ اگر اس میں کچھ بھی سچائی ہوتی تو وہ تمہیں موسکو نہ بلا لیتے!''
ناصر دیر تک ہنستا رہا۔ ''میں جیل میں کیوں ہوں یہ مجھے بھی نہیں معلوم۔ بس ہوں۔ حقیقت میں میرا کوئی قصور ایسا نہیں ہے جو انہیں معلوم ہو۔ سوائے اس کے کہ میں اُن میں سے ہوں جن کی عادت grumble (بڑبڑانے) کرنے کی ہے۔ اور یہ بہت بڑا جرم ہے۔ برٹش گورمنٹ کے خلاف عملی حصہ لیتا تھا۔ وہ اپنے جانشینوں کو کہتے گئے: ان جیسوں پر نظر رکھنا۔ اور جب انہوں نے پیش بندی کے طور پر پہلی دفعہ بند کیا تو آگے کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔''
''تم کمیونسٹ ہو؟'' تمیز نے اس سے لگ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''بتا تو چکا ہوں یہ حکومت کی غلط فہمی ہے کہ اس ملک میں کوئی کمیونسٹ پارٹی ہے۔ اور جب نہیں ہے تو میں کیسے کمیونسٹ ہو سکتا ہوں!''
تمیز نے کہا: ''نہیں یار میں خود دو کمیونسٹ لیڈروں کو دیکھ چکا ہوں — اس جیل میں۔ جب یہاں نیا نیا آیا تھا۔''
ناصر کی آنکھوں میں دلچسپی کی روشنی آگئی۔
''جب یہاں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے دو قیدی نظر آتے تھے۔ شکل سے سقراط اور افلاطون۔ دونوں کی عینکیں موٹے شیشوں کی تھیں اور ان کے فریم بھی بھاری تھے۔ ایک دن سپرنٹنڈنٹ اوفس کے باہر دھوپ کھا رہے تھے حالانکہ سردی اتنی نہیں تھی۔ ایک پلنگ پر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا، دوسرا برابر میں آرام کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جو کچھ فاصلے پر کھڑا ایک قیدی اور سنتری کے درمیان کسی بات کا تصفیہ کرا رہا تھا آواز دیئے جانے پر اخبار پڑھنے والے قیدی کے پاس آیا اور بولا:

'جی کوئی شکایت؟'

'سگریٹ کے لیے کسی سے کہا؟ اسٹیٹ ایکسپریس۔ کل کسی نامعلوم بغلول نے کریون اے بھیج دیا تھا۔ گلا خراب ہوگیا۔'

'شام تک ٹن آجائے گا۔'

'لیٹے ہوئے قیدی نے آنکھیں کھولیں اور بند کیں مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو۔'

'جی فرمائیے۔'

'جو نوجوان جیل ڈوکٹر کا فرزند، کل اپنے دوستوں کو جیل دکھانے لایا تھا– مجھے اس کی صورت پسند نہیں ہے۔' مخروطی چھوٹی داڑھی والے نے کہا۔

(دوسرے قیدی نے دبے لفظوں میں کہا: 'شاید اُسے بھی آپ کی صورت پسند نہیں ہے۔')

'آپ کو بے وجہ فکر ہوجاتی ہے۔ لڑکے ہیں، اوٹ پٹانگ سوال کرتے ہیں۔' ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔

'پہلے دن خود اس نے پوچھا تھا ?Do you believe in God۔ کل اس کے دوست یہی سوال کررہے تھے۔'

آرام کرسی والے نے کہا 'ایک عام سا سوال تھا۔ بس تجسس۔'

'تجسس بے جا۔ ان میں سے کوئی روزے نماز والا مسلمان نہیں ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات انہیں بڑی دلچسپ لگتی ہے: کوئی خدا کو نہ ماننے والا بھی ہوسکتا ہے۔'

'جو انہوں نے بس سنا ہی سنا ہوتا ہے۔'

'اور اُسے ہماری شناخت بنا رکھا ہے۔'

'آرام کرسی پر جو بیٹھا تھا مجھے ٹھنڈے دماغ کا نظر آیا۔ اپنے ساتھی سے بولا: 'وہ جواب کیوں نہیں دیتے ہو جو میں نے دیا تھا اس دن کافی لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ آئے تھے۔ شاید پبلک ہیلتھ کی کلاس تھی اور جیل کی ہائیجین دکھانے کے لیے لائے گئے تھے۔ مجھے ان کی بات چیت

دلچسپ لگی۔ قیدیوں سے ڈر بھی رہے تھے اور اُن میں دلچسپی بھی رکھتے تھے۔ جیسے دماغی امراض کے ہسپتال لے جائے جانے والے۔'

'یا چڑیا گھر' اُس چڑ چڑے داڑھی والے نے کہا۔

'مجھ سے پوچھنے کے بعد یہاں کا پینے کا پانی کیسا ہوتا ہے؟ مچھر پسو وغیرہ ہیں؟ کوئی ٹی بی کے مریض بھی عام قیدیوں کے ساتھ رکھے جاتے ہیں؟ یہ سوال جواب ہو رہے تھے کہ ایک طالب علم ایک دم بول پڑا: Do you believe in God? جو آپ سے پوچھا تھا۔ میں نے کہا: The question does not arise۔ پھر میں نے شفقت سے کہا: Satisfied?۔ وہ طالب علم سٹ پٹا کر باہر چلا گیا اور اس کے پیچھے باقی کلاس کھسیانی ہنسی ہنستی ہوئی۔'

اخبار والے نے جیب سے کریون اے کا پیکٹ نکال کر سگریٹ ہونٹوں میں دبایا اور پولیس اوفیسر لائٹر سے اسے سلگا کر بولا: 'آپ لوگ اندر جا کر آرام کریں، دھوپ تیز ہے، میں جا کر ان دو کا جھگڑا چکا آؤں۔'

لیٹے ہوئے قیدی نے کہا: مجھے قینچی چاہیے ہے۔

اب آپ قینچی سگریٹ پئیں گے۔ اخبار پڑھنے والے قیدی نے کہا۔

یا باربر آ کر داڑھی ٹھیک کر جائے۔ جیل سے ملا بن کر نہ نکلوں۔'

ناصر ساری بات سُن کر بولا ''نمبر ایک کومریڈ - تھے، ادبی آدمی ہیں۔ نمبر دو کومریڈ - وہ فلمی مکالمے لکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں ان سے زیادہ فلم ٹیکنیک کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ نہ چارلی چیپلن، نہ سہراب مودی۔ ان کی فلمیں ایک دن لگتی ہیں، دوسرے دن اتر جاتی ہیں، یعنی بس اُتر جانے کے لیے لگتی ہیں اور وہ چاہتے ہیں ان کی ہر فلم ملک کی نمائندہ فلم کی حیثیت سے عالمی مقابلوں میں بھیجی جائے۔ اب بس فلموں کے مکالمے لکھنے کے کام پر بسر اوقات ہے۔ پارٹ ٹائم رائٹر ہیں، پارٹ ٹائم کومریڈ۔''

تلمیذ نے پوچھا ''آگے چل کر ان دو میں سے کسی کے پارٹی چیئرمین بننے کا امکان ہے؟''

''یعنی؟''

''آگے چل کر ان میں سے کوئی جوزف اسٹالن یا موزے ڈنگ بنے گا؟''

''نہیں۔ کیونکہ لوگ اب سرخ انقلاب کی نہیں مہدی سوڈانی کی بات تک رہے ہیں۔ کیمونزم کو آنے میں دیر لگ رہی تھی اس لیے لوگ عرب کے عبدالوہاب اور سوڈان کے مہدی کے ظہور کا انتظار کررہے ہیں کہ آئیں اور مالداروں کو سکھائیں اپنی دولت میں غریبوں کو ساجھی بناؤ، سادگی اختیار کرو....''

تمکید نے کہا ''میرا سوال سنجیدہ تھا، تم نے اس پر لطیفہ کھڑا کردیا۔''

''تم کون سے کم لطیفہ گو ہو۔ مجھ سے کہہ رہے تھے اگر میری بات میں کوئی سچائی ہوتی تو انکل جو مجھے موسکو نہ بلا لیتے! میاں بھائی دنیا میری طرح کی disgruntled (نامطمئن) روحوں سے بھری پڑی ہے جنہیں اُن کے ملکوں میں حکومت کی انگلیاں مَسل رہی ہیں۔ اگر اُن سب سے انسانی ہمدردی میں موسکو کہتا پھرے 'آ، آ میرے کان میں گھس' تو وہاں کی اپنی آبادی کہاں جائے گی۔''

کچھ دیر ایک سگریٹ دونوں کے ہونٹوں کے بیچ گردش کرتی رہی۔ شاید دونوں سمجھ نہیں پارہے تھے بات ختم ہوچکی ہے یا جاری رکھنی ہے۔

پھر ناصر نے سوچ سوچ کر بولنا شروع کیا: ''جب کسی سوسائٹی سے قبائلی نظام، جاگیرداری نظام رخصت ہولیں تب وہ اس لائق بنتی ہے کہ سب انسانوں کے لیے یکساں حقوق اور مواقع کی بات کرے۔ کیونکہ وہ دونوں نظام تو ہیں ہی اس حقیقت پر قائم کہ ہر قسم کی دولت اور طاقت گنتی کے چند لوگوں کے ہاتھوں میں ہو۔ باقی سب کھیت جوتیں، مزدوری کریں اور پیٹ بھرنے کے لیے ان گنتی کے چند کا منہ تکا کریں۔ ان دو کو راستے سے ہٹائے بغیر سوسائٹی جمہوریت کے آنے کا انتظار کرتی ہوئی اچھی نہیں لگتی ہے۔ یہ ملک جب وجود میں آیا تھا اور اس میں جان پڑنے لگی تھی، جیتی انڈے میں خون کی پھٹکی تو اپنے اندر جمہوریت کی خوشبو رکھتا تھا— ہونہار تھا۔ پھر ہوا کیا کہ اس کے ارتقا کا پہیہ الٹا چل پڑا۔ چنانچہ ملک reverse gear میں ہے اور جو خود کو کیمونسٹ کہتے تھے اب جاگیرداروں اور قبیلوں کے سرداروں کے مفاد کی حفاظت کررہے

ہیں۔ ان کی ساری مارکسی تعلیم، مارکسی بولی اور نعرے اُس مصرف میں آ رہے ہیں۔ ہمہ گیر مساوات اب دینیات کی کتابوں میں رہ گئی ہے اور اُن کتابوں میں جو مسکو سے آتی ہیں۔

Satisfied?''

ایک بار پھر خاموشی ہوگئی۔

تمیذ کو یہ شخص جب اس کی ڈھارس بندھاتا تھا اچھا لگتا تھا، جب سماج، مذہب اور کمیونزم کی بات کرنے لگتا تھا سمجھ میں نہیں آتا تھا کون ہے۔ آگے چل کر لیڈر بنے گا یا پھانسی کا تختہ اس کا مقدر ہوگا کہا نہیں جا سکتا تھا۔ ممکن ہے صرف جیل ہی اس کی منزل تھی اور وہاں وہ پہنچ چکا تھا۔ جیلر کی بیٹی کا تھیسس لکھنے میں مدد کر رہا تھا، جیل میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اور اُسے کیا چاہیے ہو سکتا ہے؟

بغیر کسی تمہید کے ناصر نے ایک بار پھر بولنا شروع کیا:

''علمائے دین بغیر پڑھے مارکسزم کے خلاف ہیں، اس لیے کہ کارل مارکس مغرب کا تھا۔ ان کے نزدیک اسلام مشرق ہے اور کرسچینیٹی مغرب۔ بھلا بتاؤ پھر اسلام کا پودا مغرب میں لگانے کی کیا حاجت ہے؟''

تمیذ نے جلبلا کے کہا ''میں نہ وہاں کا پودا یہاں لگانے کے حق میں ہوں نہ یہاں کا وہاں۔ اور دونوں ہی کے حق میں بھی ہوں۔ کوئی اگر یہاں سے وہاں جانے والا سفید عورت سے شادی کر لیتا ہے تو اس میں کیا حرج ہے!''

''اور وہاں والا یہاں کی عورت سے۔'' تمیذ خاموش رہا۔ ناصر نے ہنس کر کہا ''تب سخت دین است۔ بے تکی بات!''

''مغرب لوگوں کی ذاتی زندگی میں بے اعتدالی کی بنا پر ڈوب رہا ہے، وہاں گھر۔ home کچھ نہیں ہے، بس شہر اور قریوں کو صاف ستھرا رکھو، لین دین کے کھرے رہو۔ گھر میں رات کو سونے کے لیے لوٹو نہ لوٹو تمہاری مرضی، عصمت عفت تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ مشرق اپنی کرپشن، مذہبی تنگ نظری، اخلاقی انتہا پسندی میں — جسے مذہب کہتا ہے — ڈوب رہا ہے۔ شادی کے بعد کی

جنسی بے اعتدالی کی اُسے برداشت نہیں، نہ عورت کے معاملے میں اس کی شادی سے پہلے کی۔ ہاں در پردہ جو بھی ہو— حرج نہیں۔ دونوں ڈوب رہے ہیں، مغرب سود کھانے سے نہیں۔ مشرق مغرب کی تقلید سے نہیں۔''

''پھر؟''

''ڈوبنے دو دونوں کو— ہوسکتا ہے ان کے ڈوبنے پر خدا نئی دنیا بنائے۔''

ناصر سے دوسری ملاقات پر جب وہ پتھر سے ٹیک لگائے بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا، تلمیذ نے کہا تھا:

''بھائی ناصر سنتا یہی آیا ہوں ہر بڑے پولیٹکل لیڈر نے جب اُسے جیل کی آزادی نصیب ہوئی یعنی اُسے ہر فکر سے آزاد کر دیا گیا، کوئی نہ کوئی کتاب ضرور لکھی تھی، اور کچھ نہ سہی تو اپنی سرگزشت۔ کیا آپ بھی کچھ ویسی ہی چیز لکھ رہے ہیں؟''

اس پر ناصر نے کہا تھا: ''اگر حکومت مجھے سیاسی قیدی کا status (مرتبہ) دے دے تو میں بھی ایسا ہی کروں گا۔ فی الحال تو لَو لیٹرز [1] لکھا کرتا ہوں۔''

تلمیذ نے خوش ہو کر کہا ''ہے کوئی ایسی؟''

''ہے کوئی ایسی نہیں، کئی ایک ہیں۔''

''کوئی ملنے آتی ہے؟''

''خیالی ہستیاں ملنے نہیں آتی ہیں۔ ہر وقت موجود رہتی ہیں۔''

بات آگے بڑھی نہیں۔

اس دن کے بعد جب بھی دونوں کا ساتھ ہوتا نہ چاہتے ہوئے بھی بات ملک کی سیاست پر چلی جاتی جس سے زیادہ محبوب موضوع گفتگو اُن ملکوں کے پڑھے لکھے لوگوں کا نہیں ہوتا ہے جہاں پانی، گیہوں، چاول کا توڑا ہو اور بچے اسکول کی جگہ صبح کے وقت سڑک کے کنارے کی

---

[1] Love Letters

ورک شوپس میں نظر آتے ہیں۔
کبھی جب بات طول پکڑ جاتی اور تمکینہ کو خاموشی اختیار کرنا پڑتی تو وہ کئی دن اس طرف نہیں جاتا تھا جدھر وہ پتھر تھا جس سے ٹیک لگے ـ ناصر پڑھ لکھ رہا ہوتا تھا۔ کیونکہ سیاست میں ناصر کو دلچسپی تھی، تمکینہ کے لیے سیاست بس ناصر سے گفتگو کا ذریعہ تھی۔ دونوں کو مریدوں میں اُسے دلچسپی نہیں تھی اور جیل میں اور کوئی اسے اپنی مرضی کا نظر نہیں آتا تھا۔

ایک دن پھر تمکینہ کمیونزم کا قصہ چھیڑ بیٹھا: ''میرا خیال ہے آپ کمیونسٹ ہیں۔''
وہ ہنس پڑا ''یہ خیال آج پھر تمہیں ستا رہا ہے۔''
''اس لیے کہ کمیونزم سے اس ملک کو خطرہ ہے، کمیونسٹ میں نے سنا ہے سخت ظالم ہوتے ہیں، اور اگر آپ کمیونسٹ ہیں......''
''تو تمہیں مجھ سے ڈرنا چاہیے ورنہ حکومت میری طرح تمہاری بھی تاعمر میزبان بنی رہے گی۔''
تمکینہ نے کہا ''نہیں آپ کو مجھ سے ڈرنا چاہیے کہیں ملک کا دشمن سمجھ کر کسی دن حملہ نہ کر بیٹھوں۔''
دونوں دیر تک ہنستے رہے۔
''اپنا ڈر نکال دو، کمیونزم سے اس ملک کو خطرہ نہیں ہے۔ کمیونسٹ یہاں ہیں کب! ہاں کمیونسٹ پارٹی ہے کبھی بالائے زمین، کبھی زیرِ زمین۔ وہ اپنا پروگرام بدلتی رہتی ہے۔ جاگیرداروں، سرمایہ داروں کو اس نے اپنا ٹارگٹ سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ ڈراوا امریکا نے پیدا کیا ہے کہ اس ملک کو کمیونزم کا خطرہ ہے، ایک دن یہاں کے کمیونسٹ مزدوروں اور کسانوں کی فوج لے کر چل کھڑے ہوں گے، پہلے ملک بھر میں حکومت کا تختہ الٹیں گے، پھر عوام میں تعلیم اور شعور لے آئیں گے۔ یہ ہوئے پارٹ وَن اور پارٹ ٹو۔ اب پارٹ تھری سنو: سوویت یونین اور چین کو اپنی جدوجہد سے ملنے والی نہ آزادی عزیز ہے نہ اس سے پیدا ہونے والی سماج کی کایا پلٹ اور ساری ترقی۔ وہ یہاں کے کمیونسٹوں کا اشارہ پاتے ہی اپنی مسلح فوجیں اس ملک میں اس طرح اتار دیں گے جیسے چائے کی پیالی میں دودھ انڈیل دیں۔'' تمکینہ ہنسنے لگا۔ ''اور امریکا سے کہیں

گے بند کرو اپنے سفارت خانے اور فوجی اڈے اور اس ملک سے نکل جاؤ۔''

تمکینؔ نے تالی بجائی۔ ایک قیدی جو پاس سے گزر رہا تھا اُسے سن کر رک گیا اور اپنے ساتھ والے سے جو آگے نکل گیا تھا بولا: ''ٹھیرو یہاں کچھ ہو رہا ہے۔''

ناصر کہہ رہا تھا: ''یہاں کے لیڈروں نے صرف دو چیزیں اس صدی کی تاریخ کی سیکھی ہیں اور وہی طوطے کی طرح اپنے عوام کو سکھاتے رہتے ہیں۔''

ایک قیدی نے پوچھا ''کون سی؟''

''چرچل سے دو انگلیوں کی وکٹری۔'' اس نے انگلیوں کو وی کی شکل میں سننے والوں کے سامنے کیا۔ ''اور ماؤ سے لونگ مارچ۔''

کئی ایک نے کہا ''وہ کیا؟''

''جلوس کے آگے چلنے والا اگر جلوس سے کہے 'لونگ مارچ ٹو انارکنگ' تو ان کا بھی نعرہ ہوگا: 'ٹو انارکنگ۔' اور اگر اپنی دو انگلیوں کو وی کی شکل میں بلند کر کے کہے 'وکٹری اگینسٹ اوفوالکیل والمیزان' تو وہ بھی یہی کہیں گے۔''

جس وقت تمکین پوچھ رہا تھا ''وہ کیا'' ناصر کے سامعین وہاں سے جا رہے تھے۔

''پوری تول، پوری ناپ۔ عربی نہیں جانتے!''

تمکینؔ نے کہا ''تم یار اندر سے مسلمان ہو، باہر سے کمیونسٹ۔ یا اندر سے کمیونسٹ ہو باہر سے مسلمان سمجھ میں نہیں آتا۔ میرا خیال ہے تم سوویت رشیا کے خلاف ہو اور گورمنٹ احمق ہے کہ پھر بھی تمہیں جیل میں رکھنے کا خرچہ اٹھا رہی ہے۔''

''میں سوویت رشیا کے خلاف ہوں!'' ناصر نے بجھائے ہوئے سگریٹ کے ٹونٹے کو سلگایا اور اس کی بات پر دیر تک رہ رہ کر ہنستا رہا۔ ہنسنے کے بیچ میں اس نے کہا ''مگر گورمنٹ مانے تب نا!'' پھر اس نے سنجیدگی سے کہا ''میں سوویت رشیا کو اس ملک پر چڑھائی کرتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا ہوں، نہ کسی اور کمزور ملک پر۔ حقیقت میں کسی بھی طاقت ور ملک کو کسی بھی

---

۱ مجمد بہ اعظم جنوبی

کمزور ملک پر۔

(''تم گاندھی کے چیلے ہو۔'')

''پر جو کارنامہ اس کا ہے اُسے ماننے میں کیا عذر ہو سکتا ہے! بڑا کام جو سوویت رشیا نے کیا وہ فاشسٹ جرمنی کو شکست دینا تھا۔ تمام قوموں سے بڑھ کر اپنی جان اور مال کی قیمت پر اُس جنگ کو جھیل جانا، غلاموں اور کنیزوں کے دور کا خاتمہ۔ گو اس کا قانون زار کے زمانے میں پاس ہو چکا تھا، اور ایک جاہل قوم کو تعلیم یافتہ بنانا اور چونکہ ترقی پذیر ہے اس لیے امید ہے آئندہ چھے ہزار سال تک اپنے اُس شاندار ماضی کا راگ نہیں الاپے گا۔ مگر جو ہمارے لوگوں اور پسماندہ ملکوں کی آبادی کو پسند آیا وہ اس کا ۱۹۶۰ء میں اسّی ہزار فٹ کی بلندی پر امریکا کے اسپائی پلین کو زمین پر بیٹھے مار گرانا تھا۔ اسپوتنک اور لیونک جو کم از کم اس وقت وہاں کے عوام کے کام کے نہیں تھے وہ ہمارے اور ہم جیسے لوگوں کو بہت پسند آئے، حالانکہ اس وقت روسی عوام کی جو بنیادی ضرورتیں تھیں ان کی طرف نہ خروشیف کی نظر گئی تھی نہ وہاں کی پولٹ بیورو کے کسی فرد کی۔ اب بتاؤ میں کس کے حق میں ہوں اور کس کے خلاف؟''

تمیز نے اپنا ہاتھ پھیلا کر آسمان کی طرف اٹھا دیا۔ وہاں بادل گھر آئے تھے۔ اس کے چپ رہنے پر ناصر نے کہا۔

''مسز سنگٹ کیا آسمان سے کچھ مانگ رہی ہو؟'' اور ساتھ ہی میں کہا ''سوچنے والے آج کل روس سے زیادہ امریکا کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔''

تمیز بوندوں کا مزہ لے رہا تھا۔ بولا ''وہ کیوں؟''

''امریکا کے عوام کے پاس اگر فہم ہے تو سمجھیں اُن کا ملک اگر خود کو دنیا کی سب سے بڑی یعنی سپر پاور کہتا ہے تو وہ اس کی مور کھتا ہے۔ بڑے سے بڑا سوموریسلر اور ہیوی ویٹ بوکسر ایک دن گوشت کا ملبہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر بڑے ہونے کا پیمانہ ماضی ہے تو بتائیں وہاں سے کس مذہب نے جنم لیا، یا نئے فلسفۂ حیات نے؟ سوائے اس کے کہ ایک محاورہ ہے جو دوسری جنگ عظیم تک متروک ہوتا جا رہا تھا، اس میں امریکا نے نئی جان ڈال دی: جس کی لاٹھی ''

''اس کی بجنس۔'' تمیذ نے قمیص اتارتے ہوئے کہا۔

لگتا تھا اس کا بارش میں نہانے کا ارادہ ہے 'جیسے نینی پور کے دن آ گئے '۔

سپرنٹنڈنٹ آفس سے قیدیوں کے واپس بیرکس میں جانے کی گھنٹی بجنے لگی۔ وارڈر بھی چلارہے تھے مگر ان کا چلانا اور گھنٹی کی آواز ان کے قدم تیز نہیں کر سکتے تھے۔

ہر بار ناصر کے ساتھ آدھ پون گھنٹہ گزار کر تلمیذ کو لگتا تھا کسی وعظ سے اٹھ کر آ رہا ہے جس میں وہ اپنی مرضی سے شریک نہیں ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا، دونوں ایک ہی عمر کے ہیں، پاس بیٹھ کر عشق و محبت کا ذکر نہ سہی زندگی کی دوسری باتوں کا ذکر ہوتا کہ کچھ تو جیل کا بدمزہ وقت کٹے۔ میرا اپنے گھرانے سے ناتا ٹوٹ چکا ہے، اس کا تو ہوگا۔ کبھی تو زبان پر لائے باپ کو اس سے کیا توقعات تھیں؟ کتنی پوری ہوئیں، کتنوں کے لیے وہ روتے ہیں۔ ماں بھی ہوں گی، بہنیں بھی۔ اس کے جیل میں عمر بسر کرنے سے اُن کا کیا حشر ہوا۔ آج تک بس اتنا ہی سنا ہے 'سب دور ہیں، روز روز آ نہیں سکتے ہیں۔' کوئی محبوبہ بھی نہیں، نہ کوئی رقیب۔ یہ کوئی زندگی ہے۔'

لیکن مشکل یہ تھی کوئی دوسرا ایسا زندانی بھی نہیں تھا جس کے پاس بیٹھ کر غم غلط کیا جا سکتا۔

ایک صاحب تھے جن کا تعلق کسی کٹر مذہبی فرقے سے تھا۔ کبھی کبھی کوئی قیدی یا کوئی اسٹاف میں سے اُن سے مسئلے مسائل پوچھنے جاتا اور وہ اس کے سوال کا جواب چند لفظوں میں دے کر جو کتاب ہاتھ میں ہو اُسے پھر پڑھنے لگتے تھے۔ ایک دو مختصر ملاقاتوں میں تلمیذ نے فیصلہ کر لیا ان کا تعلق تایا ابا کے فرقے سے ہے۔

پہلی ملاقات میں سلام علیک کے بعد انہوں نے چھوٹتے ہی پوچھا 'شیو نہیں کیا ہے یا داڑھی رکھ رہے ہو؟''

تلمیذ نے انہی کے لہجے میں کہا'' شیو کرنے میں تساہل سے کام لیا ہے۔''

بات کو سمجھتے ہوئے انہوں نے سر کی جنبش کے ساتھ ''ہوں'' کیا اور نظریں کتاب پر گاڑ دیں۔

ساتھ ہی تلمیذ اٹھ کھڑا ہوا۔

کبھی کبھی وہ ناصر کو اس پتھر پر بیٹھے دیکھ کر جو اس کی تعلیم گاہ تھی یا لائبریری، دور ہی سے دوسری طرف کا رخ کر لیتا تھا۔ ناصر اُسے جاتے دیکھ کر مسکراتا یا آواز دے کر بلا لیتا۔

ایک دن تلمیذ پوچھ بیٹھا: ''بھائی ناصر مجھ سے پہلے اس جیل کے قیدیوں میں کون آپ کے سامعین تھے؟''

ناصر ہنس پڑا۔ بولا'' یار واقعی تمہارے آنے سے پہلے میں بات کرنے کو ترس گیا تھا۔ تم میری

باتوں کا بُرا تو نہیں مانتے ہو؟ یا صرف بور ہوتے تھے؟ چاہو تو تم مجھے بزنس کے رموز سکھاؤ۔ امپورٹ کیسے کی جاتی ہے، ایکسپورٹ کیسے؟ کیا امپورٹ کرنا چاہیے، کیا ایکسپورٹ؟ تاکہ اس بار جب چھٹی پر گھر جاؤں تو سیدھا تم سے آ کر ملوں۔ کچھ دن تمہارا understudy رہوں، شاگرد، ایسا نہ کیا تو سونا سعودی عرب ایکسپورٹ کرنے لگوں گا اور وہاں سے گیہوں اور چاول یہاں۔ اگر میرا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار جم گیا تو گھر والوں کے آنسو پُنچھ جائیں گے۔ مگر ایک بات ہے تم روٹھ کر...''

اب تلمیذ ہنس رہا تھا۔

پھر ناصر نے کہا'' آؤ ایک پیکٹ پر سائن کرو: روزانہ تم مجھے ایک گانا سنایا کرو، پھر جب میں اپنا دماغ ہلکا کر چکا ہوں تو ایک فلم کی کہانی۔'' اس کے بعد معنی خیز مسکراہٹ سے اس نے کہا'' مولانا مصباح الدین سے تم مل چکے ہو۔ جب یہ یہاں نئے نئے آئے تھے، یا میں نیا نیا آیا تھا — دونوں ہی کا جیل میں آنا جانا لگا ہے، ہم ایک دوسرے کو پڑھنے لکھنے لگے۔ ان پر فساد کرانے کا الزام ہے۔ آسانی سے چھوٹ جائیں گے اور گھر پہلے سے زیادہ وزن لے کر جائیں گے۔ انہوں نے وارد ہونے کے دوسرے ہی دن میرے دماغ میں سوراخ کرنے کی کوشش کی۔ میرے دماغ میں ایک خوبی یہ ہے جب چاہے اردگرد سے بےتعلق ہو جاتا ہے۔ میں خالی دماغ بیٹھا رہا اور وہ بے تکان بولتے رہے۔ قسم لے لو جو ان کی ایک بھی بات کا بُرا مانا ہو میں سُن ہی نہیں رہا تھا تو بُرا کیا مانتا۔ انہوں نے سمجھا ہر تیر نشانے پر بیٹھ رہا ہے۔

''اگلے دن گھر سے آیا ہوا حلوہ انہوں نے پیش کیا جس میں مجھے دلچسپی نہیں تھی لیکن اس دن جب انہوں نے لیکچر شروع کیا تو میں نے پوچھا 'یا مولینا اسلام میں کتنی بیویوں کی اجازت ہے؟' بولے 'چار کی۔' میں نے کہا 'یہ حلوہ آپ کی کون سی بیوی نے بنایا ہے؟' ان کے چہرے سے شفقت رخصت ہوگئی اور مجھے خفگی سے دیکھنے لگے۔ میں نے پوچھا 'جواب دینے میں قباحت ہو یا حلوہ پانچویں بیوی نے......؟' اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ جاتے جاتے کہہ گئے 'تم جیسوں پر بخشش حرام ہے۔'

''وہ دن ہے اور یہ دن پاس سے گزر جاتے ہیں مجال ہے جو نظروں سے نظریں ملنے دیں۔ یہ واقعہ اب کا نہیں ہے سال بھر پہلے کا ہے جب یہ یہاں دو ہفتے کے لیے مہمان ہوئے تھے اور میں چھٹی سے لوٹا تھا۔

''جیل کی دنیا دلچسپ دنیا ہے بشرطیکہ بشر اس میں موت کا پروانہ ہاتھ میں دے کر نہ بھیجا جائے اور قید ہو، قید بامشقت نہ ہو۔''

تلمیذ نے کہا ''اور اُسے آپ کی طرح پڑھنے پڑھانے کا موقع ملے۔''

ناصر نے اپنی بات پوری کی ''یہاں اتنے قسم کا آدمی ملتا ہے کہ تمھیں بزنس کی دنیا میں نہیں ملے گا۔''

''تب ہی آپ یہاں لوٹ لوٹ کر آتے ہیں۔''

جن دنوں وہ دونوں سیاسی ہستیاں جیل میں سکون کے دن گزار رہی تھیں ایک اور خبر گشت میں آ گئی: ایک نوجوان کو مریڈ کی کسی دوسری جیل میں جو سیاسی قیدیوں اور صحافیوں کے لیے پہچانی جاتی ہے ٹورچر سے موت ہوئی۔

اخباروں میں شور مچا، باہر کے پریس میں بھی آیا۔ بالآخر محکمے کو قبول کرنا پڑا اس کی موت ہو چکی ہے اور غسل اور نماز جنازہ کے بعد اسے دفنا دیا گیا ہے کیونکہ اس کا کوئی رشتے دار پولیس کے علم میں نہیں تھا۔ بلکہ پولیس کا کہنا تھا اس کا کوئی رشتے دار تھا ہی نہیں اور وہ دوسرے ملک سے یہاں حکومت کے خلاف مہم چلانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔

شور جاری رہا۔ کیس عدالت میں گیا اور exhumation کا اورڈر دیا گیا۔ قبر کھود کر مدفون کو باہر نکالنے کے وقت سول سرجن، میڈیکل جورس پروڈینس[1] کے پروفیسر وغیرہ موجود تھے۔ لاش کی شکل تھوڑی بہت پہچان میں آتی تھی۔ مرنے والا کرتا پجامہ پہنا کرتا تھا، جیل میں جیل کے کپڑے، اس کی رنگت گیہواں تھی مگر مدفون کے جسم پر ایک سفید چادر کی جگہ ہرے رنگ کی قمیص اور نیلا پتلون تھا اور اس کی رنگت گہری سانولی تھی۔ لگتا تھا گرفتاری کے بعد تھانے ہی میں

---

[1] Medical Jurisprudence

مار پیٹ کے ہاتھوں چل بسا تھا۔

جنہوں نے عدالت سے مدد طلب کی تھی انہوں نے لاش کو دیکھ کر کہا: ''یہ وہ نوجوان نہیں ہے۔ وہ دبلا اور چھ فٹ کا تھا یہ تو کوئی دودھ، دہی اور گاجر کا حلوہ بیچنے والا ناٹے قد کا پہلوان ہے۔''

جیل کے حکام نے کہا'' یہ لوگ پٹی پڑھا کر بھیجے گئے ہیں کہ قبر سے جو بھی نکلے کہنا یہ ہمارا آدمی نہیں ہے۔''

لاش دوبارہ دفنا دی گئی۔ سب نے کہا: ''خدا جانے کون بیچارہ تھا!''

ناصر نے کہا: ''ان ٹورچرز سے خدا بچائے۔''

''تو تم خدا کو مانتے ہو!''

''میں جانتا ہوں جو ان زندانوں میں ہوتا ہے۔ انسان جب غاروں میں رہتا تھا تب بھی ایسے کام نہیں کر سکتا تھا جو یہاں ہوتے ہیں۔'' اس سے آگے وہ نہیں بول سکا۔

تمکیذ کو خجالت ہوئی میں ایسی بات کیوں کہہ بیٹھا۔ تھوڑی دیر بعد جب ناصر کے چہرے پر امنڈ آنے والے خوف کے بادل چھٹ چکے تھے تمکیذ نے زندہ دلی سے کہا: ''بس یہی ایک عقلمندی کا کام میں نے زندگی بھر میں کیا ہے - سیاست میں نہیں گیا۔ اُن کی زبان کا میں گواہ ہوں جس سے خیر وہ ملزموں سے تو بات کرتے ہی ہیں آپس میں بھی ان کی وہی زبان ہوتی ہے۔''

''ماں، بہن، بیٹی کی توقیر کے کلمات۔'' ناصر نے کہا۔

ایک دن ناصر بینچ پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ تمکیذ نے دور سے پوچھا: ''پڑھائی میں خلل نہ ہو تو کچھ دیر آپ کی صحبت سے لطف لے لوں۔''

''میری صحت بے لطف ہے اسی لیے گھر والے نہیں آتے ہیں۔ سناؤ اب بھی رات کو رونے میں گزارتے ہو یا آئندہ کے لیے کوئی پروگرام بنانے میں؟''

تمکیذ نے ہنس کر کہا: ''فرار ہونے کا پروگرام بنانے میں۔''

ناصر نے جیب سے اُدھ جلی سگریٹ نکالی، سلگائی اور دو کش لے کر تلمیذ کے حوالے کر دی۔
ناصر کے ہاتھ سے کتاب لے کر تلمیذ نے اسے ورق پلٹ کر یہاں وہاں سے دیکھا اور بولا:
''یہاں اتنی غربت ہے لوگوں کے تن کو لتا نہیں پھر بھی لیڈر اتنے ویل ڈریسڈ لوگوں کو کیوں چنتے ہیں، جن کے سوٹ لندن اور ہونگ کانگ کے ٹیلرز ہوتے ہیں۔''
ناصر نے اس کے ہاتھ سے کتاب لے کر ایک طرف رکھی اور کہا: ''اول تو انہیں لوگ نہیں چنتے ہیں، دوسرے یہ ملک ویل ڈریسڈ لیڈروں کو پسند کرتا ہے، ویل ڈریسڈ، انگلش ایکسینٹ میں انگلش بولنے والے لیڈروں کو جو اپنے گھر میں بھی انگریزی میں بات کرتے ہیں، اور جن کے بچے تک انگریزی میں خواب دیکھتے ہیں۔ ۱۹۱۷ء کے انقلاب سے پہلے روس کی بھی یہی حالت تھی اور اس سے بھی بہت پہلے اعلیٰ سوسائٹی میں رشین میں بات کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔''
تلمیذ نے پلٹ کر ناصر پر وہ وار نہیں کیا جو ہر گفتگو کے خاتمے پر کرتا آیا تھا: تم کمیونسٹ ہو۔ لیکن لیڈروں کے ویل ڈریسڈ ہونے کی بات خود اس نے چھیڑی تھی اس لیے تلمیذ بجز کا نہیں صرف خاموش ہو گیا۔ بیرک میں جا کر بند ہونے کا وقت نزدیک تھا، سورج سر پر آ گیا تھا۔ جیل کے پیڑ بھی چڑیوں سے خالی نظر آ رہے تھے۔ بے مزہ خاموشی کو توڑنے کے لیے ناصر نے پتھر پر سے اٹھتے ہوئے کہا، جیسے اسے اپنی ادھوری بات کا سرا مل گیا ہو:
''پھر یہ بھی ہے کہ اس ملک کے عوام بادشاہ پسند ہیں۔''
''شاہ پسند؟''
''وہ آم ہوتا ہے۔ سو بات عوام کی ہو رہی تھی، وہ چاہتے ہیں حکومت میراث میں چلے اور ویسے وارث تو اب یہاں پیدا ہونے بند ہو گئے ہیں اس لیے جنہیں بادشاہ بننے کی تمنا ہو انہیں ٹریننگ کے لیے برطانیہ بھیجا جاتا ہے۔ سمجھے مسٹر تلمیذ۔''
تلمیذ نے کہا: ''آپ کو یہاں بے جا نہیں رکھا گیا ہے۔'' اور اٹھ کھڑا ہوا۔ سنجیدہ گفتگو میں وہ تم سے آپ پر آ جاتا تھا۔
ناصر نے کہا: ''جاتے ہوئے ایک بات اور سنتے جاؤ۔ جب حاکم وقت کی تین دروازوں والی

ائیر کنڈیشنڈ کار بھیڑ میں سے گزر رہی ہو اور لوگ انہیں پہچان کر زندہ باد کے نعرے لگانے لگیں تو اندر بیٹھے ہوئے شاہی خاندان کے افراد سر اور ہاتھ کے اشارے سے اُن کا جواب دیتے جاتے ہیں– اس کی انہیں ٹریننگ دی جاتی ہے– منہ سے ان کے اُس گھڑی اس اُجڈ مخلوق کے لیے انگلش ایکسینٹ میں گالیاں نکل رہی ہوتی ہیں غیر مہذب نہیں، نفیس قسم کی۔

''اور پرجا انہیں اپنا دوست سمجھتی ہے، کہتی ہے: اس ملک میں ہے کیا گرمی اور دھول، ہماری خاطر یہاں پڑے ہیں۔''

آخری ملاقات پر ناصر نے تلمیذ سے کہا: ''اہمیت صرف اس لمحے کی ہے – نہ تمام ماضی کی، نہ مستقبل کی وہ جتنا بھی نظر آتا ہے۔ یہاں سے اس لمحے کی حفاظت کرتے ہوئے نکلو۔ آنے والی زندگی سدھرتی چلی جائے گی — وہ جتنی بھی ہو۔

''آخری بات: خدا نے انسان پر سب سے بڑا ظلم اُسے choice (اختیار) کی صلاحیت دے کر کیا ہے۔ یہ یاد رکھو گے تو اندوہ اور افسردگی کا شکار نہیں ہو گے۔''

جس دن تلمیذ کی رہائی تھی، عارضی، ایک ساتھی نے جو اس کا سگریٹ دوست بن چکا تھا کہا: ''گھر جا رہے ہو؟'' اور پھر خود ہی کہا ''مگر کس حال میں؟ ان ہی کپڑوں میں جن میں گھر سے آئے تھے؟''

تلمیذ نے اس کی پیش کی ہوئی سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا ''اور کون سے، گھر سے وارڈ روب تو لے کر نہیں آیا تھا۔''

بشیر نے کہا ''وہ میں جانتا ہوں، مگر گھر والے تو کپڑے جوتے لے کر آئیں گے نا؟''

تلمیذ اس کے برابر سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ آنکھیں بند کر کے بولا: ''گھر والے نہیں ہیں۔''

بشیر مرنجاں مرنج آدمی تھا۔ کوئی ملاقاتی تمباکو کا ڈبا اور چاول کے کاغذ (rice paper) کا پیکٹ دے جائے تو اس سے زیادہ زندگی سے مطمئن شخص جیل میں دوسرا کسی کو نظر نہ آتا۔ ایک پرانی

ڈائری کے ورق کو جو ہمیشہ اس کی پہنچ میں رہتی تھی کسی ہموار سطح پر رکھ کر پیار سے اس کی شکنیں دور کرتا۔ تمباکو کو ہتھیلی میں مسل کر اس پر بچھاتا، رزلا کا کاغذ احتیاط سے اس سے ملحق رکھتا۔ پھر جب پنسل کی مدد سے آہستہ آہستہ رول کرنے پر بنی بنائی سگریٹ ڈائری کے کاغذ میں سے برآمد ہوتی تو فاتحانہ نظر اپنے اردگرد پر ڈالتا۔ ایسا سگریٹ وہ جیل سپرنٹنڈنٹ کو بھی پلا چکا تھا اور کئی بار دوسرے ساتھیوں کو جن سے یاری ہوجائے۔ جب ٹن کا تمباکو نہ ملے تو کچے (raw) سکھائے ہوئے تمباکو اور مہوے کے پتے سے اپنے سگریٹ رول کرنے لگتا۔ مہوے کے پیڑ کو وہ اپنا سنگی کہتا تھا۔ کچا تمباکو بھی کہیں سے آ ہی جاتا تھا۔ وہ پنسل ہمیشہ اتنی کی اتنی ہی رہی۔

بشیر بار بار جیل آنے والوں میں سے تھا اور جس طرح ہسپتال میں کچھ وقت گزارنے والے کے اسٹاف اور دوسرے مریض دوست بن جاتے ہیں جیل میں بار بار لوٹ کر آنے والا بھی اگر مردم بیزار نہ ہو تو جیل کے عملے اور دوسرے قیدیوں میں مقبول ہوجاتا ہے۔

وہ کہتا تھا: ''مجھ پر سونے کی اسمگلنگ کا الزام فضول، احمقانہ اور لغو ہے۔ پہلی دفعہ مجھ پر الزام تھا تم دس بسکٹ لے جارہے تھے۔ یعنی سو تولے۔ استغفراللہ! میں نے عدالت میں کہا تھا اگر ڈھائی تولہ بھی میرے پاس ہوتا یعنی تین سو پچیس روپے تو شادی کر کے گھر نہیں بیٹھتا! دوسری بات دس بسکٹ اسمگل کرنے کے لیے دس بسکٹ خریدنے پڑتے، وہ پیسے مجھے کون دیتا عرب میں؟ وہاں نہ میرے ماں باپ ہیں، نہ ساس سسر۔ کسٹم والوں کو ہدایت کی جائے آئندہ احمقانہ الزام مجھ پر نہ لگائیں!''

تلمیذ کی بات کے جواب میں بشیر نے کہا: ''گھر والے نہیں ہیں! اگر نہیں ہیں تو پھر ضمانت کے جھنجٹ میں کیوں پڑے۔ آرام سے یہیں پڑے رہتے۔ تمہارا کیس ایسا ہے کہ پھانسی تو ہو نہیں سکتی، نہ کالے پانی بھیجے جاؤ گے۔ خیر تو میری سنو: انہی کپڑوں میں گھر مت جانا بدشگونی ہوتی ہے۔ پہلی بار جب میں رہا ہوا تھا، اسی جیل سے، تو بیوی اور سالے لینے آئے تھے اور گھر سے صاف کپڑے اور جوتے لے کر آئے تھے۔ راستے میں ایک جگہ جہاں بھنگیوں کا قبرستان ہے اور اجاڑ میدان پڑتا ہے، اندھیرا ہو چلا تھا، سالے نے ایک جگہ کار رکوائی اور کہا:

'بھائی جان کپڑے جوتے بدل لیں۔' اور جب میں نے بدل لیے تو اس نے کپڑے اور جوتے جنہیں پہنے ہوئے گرفتار ہوا تھا اور جو جیل میں اسی شام مجھے لوٹائے گئے تھے چلتی کار کی ونڈو سے ہاتھ نکال کر ایک اور سنسان جگہ پھینک دیئے کہ منحوس ہیں۔ تم بھی ایسا ہی کرنا۔''
تملیذ پوچھتے پوچھتے رہ گیا: پھر جب ان منحوس چیزوں کو پھینک چکے تھے تو دوبارہ یہاں آنا کیسے ہوا؟
''گھر پہنچ کر بیوی نے کہا: پہلے نہالو، پھر دو رکعت شکرانے کی پڑھ کر کوئی اور کام کرنا۔''
تملیذ نے کہا'' مگر یار بشیر تم نے تو کہا تھا پہلی بار جب پکڑے گئے تھے تم نے صفائی میں کہا تھا 'اگر ڈھائی تولے کے بھی پیسے ہوتے تو شادی کرلیتا۔' پھر جیل سے نکلنے پر......''
بشیر نے خندہ پیشانی سے کہا:'' میرا مطلب دوسری اپنی پسند کی شادی سے تھا۔''

تملیذ کی ضمانت امینہ نے کرائی تھی۔ کئی بار وہ کہتے کہتے رہ گیا کیسے بہن کا جیٹھ تمہارے کہنے میں آ گیا کہ ایک ایسے شخص کی ضمانت دینے پر رضامند ہو گیا جس کی اس نے ایک جھلک بھی نہیں دیکھی ہے۔ وہ بہن کا جیٹھ ہی ہے یا کوئی اور؟ اور جس کا وہ جیٹھ ہے وہ تمہاری بہن ہی ہے یا کچھ اور؟ مگر یہ سارے سوال غیر ضروری اور بے محل تھے۔
امینہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر اس کے برابر میں بیٹھی تھی، اس کالے برقعے میں جس میں تملیذ اسے ہمیشہ سے دیکھتا آیا تھا۔ جہاں آبادی نہ تھی، راستوں پر اندھیرا اتر آیا تھا تملیذ کو خیال آتا رہا: اگر اس سے کہا ہوتا تو یہ ہوٹل جا کر دوسرے کپڑے جوتے لے آتی۔
ایک جگہ پہنچنے پر امینہ نے ڈرائیور سے کار روکنے کے لیے کہا اور تملیذ کے ہاتھ میں کچھ نوٹ اور ریزگاری پکڑاتے ہوئے کار سے اترنے لگی۔
تملیذ نے کہا'' ساتھ نہیں چل رہی ہو؟''
''نہیں اس وقت میرا گھر پہنچنا ضروری ہے۔'' اس کے چہرے پر بے چینی تھی۔
تملیذ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

میور اسٹریٹ پر چہل پہل تھی۔ فٹ پاتھ پر رکشا ئیں کھڑی تھیں لیکن گانا بجانا ہونے

میں ابھی دیر تھی۔ مانڈلے ریستوران آنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے سب سے نظریں چرا کر کاؤنٹر سے اپنے کمرے کی چابی لی۔ تھکے ہوئے قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر تیسری منزل پر پہنچ کر اپنے کمرے کا تالا کھولا۔ اسے اپنے کمرے میں پہلی بار وہ عافیت محسوس نہیں ہوئی جو پہلے کچھ بھی کر کے لوٹنے پر محسوس ہوتی تھی۔'ایک سنگل بیڈ ہوٹل کا کمرہ ہے۔ آج میرا ہے کل کسی اور کا ہوگا۔ اپنی مرضی کے خلاف بھی یہاں سے دوبارہ لے جایا جاسکتا ہوں۔ یا جیسے کہ سننے میں آرہا ہے بری دلپسند ہوٹل بھی آس پاس کی بلڈنگوں کی طرح توڑا جانے والا ہے، کل یہ کمرہ سیمنٹ کے پلاسٹر اور ریت کے بلوکس کے ٹکڑوں کی صورت میں زمین پر پڑا ہوگا۔'

اندر چیزیں اُدھنی پڑی تھیں۔ بیڈ شیٹ زمین پر پڑے تھے، فوم میٹرس اور تکیوں کو چیرا گیا تھا، پرائیویٹ خط لفافوں سے باہر قالین پر پڑے تھے، ایک طرف کا قالین کا کونا بھی اٹھایا ہوا تھا۔ اس کمرے میں اور برابر کے دوسرے کمرے میں جو اس نے چند مہینے پہلے ہی لیا تھا، وقت بے وقت آنے والے مہمانوں کے لیے، ایش ٹریز سگریٹ کے ٹوٹوں اور ماچس کی تیلیوں سے بھری ہوئی تھیں۔

نہادھو کر اس نے چائے اور کھانے کے لیے گھنٹی بجائی۔ اور جب بجائے بیرے کے منیجر آیا تو اس نے کہا'' کیوں مجھے کمرہ خالی کرنے کے لیے کہنے آئے ہیں!''

منیجر نے بغیر چیزوں پر نظر ڈالے کہا: '' کیا بات کرتے ہو سیٹھ۔ اگر آدمی ہوٹل کو خانقاہ کی طرح چلائے تو کاروبار کر چکا۔ ان سالوں کی ہستی کیا ہے۔ میرا ہوٹل ہے، کمرہ میں نے تمہیں دے رکھا ہے۔ اگر شکایت ہے تو ان ماں ...... سے جو سامان کو تہہ و بالا کر گئے ہیں۔ تم رہو، جب تک جی چاہے رہو۔ میں جا کر بیروں کو بھیجتا ہوں کمرہ ٹھیک کر کے جائیں۔''

'ایک اور کرم فرما؟' تلمیذ کو منیجر کی بات کھٹکی۔ 'ان ذات شریف کو تو مجھ سے کوئی کام نہیں لینا ہے!'

مگر اس کے پاس جانے کو دوسری جگہ نہیں تھی۔

جیل سے رہائی سے لے کر ہوٹل پہنچنے تک تلمیذ کی نظریں جس مہربان ہستی کو ڈھونڈ رہی تھیں اس کا

کہیں پتہ نہیں تھا: 'ہوسکتا ہے امینہ نے اُسے نہ بتایا ہو، یا ہوسکتا ہے جان بوجھ کر نہ آیا ہو کہ میں اس کا شکریہ ادا کرنے بیٹھ جاؤں گا۔ احسان جتانے والا آدمی نہیں ہے، اس سے آگے وہ نہیں سوچ سکا۔

(۳۷)

امینہ کہاں رہ رہی تھی حقیقت میں اس کا صحیح علم تلمیذ کو نہیں تھا۔ یا تھا تو ادھورا۔ بس علاقہ دیکھا ہوا تھا۔ وہ گلی اور مکان نہیں جس میں وہ رہتی تھی۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا ضرورت پڑنے پر وہ اسے نہ ملی ہو۔ بس اُسے اُس اسٹریٹ پر تھوڑی دیر ٹہلنا ہوتا تھا اور ایک جلد ساز کی دکان پر کھڑے ہو کر خیر خیریت معلوم کرنے کے دو ایک جملے کہنے ہوتے تھے۔ اور واپس۔ وہ آفس میں یا ہوٹل پہنچ جاتی تھی۔ تلمیذ نے بارہا پوچھا: ''کیا تم کھڑی دیکھ رہی ہوتی ہو کہیں سے یا اور کوئی تمہارا سگا؟ وہ بھی صحیح وقت پر؟''

اس کا جواب وہ نہیں دیتی تھی، نہ کبھی جلد ساز سے اپنا رشتہ بتایا جو شکل سے ایک سیدھا سادا انسان تھا، لنگی پجامے اور داڑھی والا۔

وہ اپنے سسرال کے رشتے داروں کے ساتھ اُس علاقہ میں رہتی تھی۔ شادی شدہ تھی، بچہ نہیں تھا، ہوا ہی نہیں تھا۔ شوہر کہاں تھا یہ سب سے بڑا سوال تھا جس کا جواب وہ نہیں دینا چاہتی تھی۔

جیٹھ جنہوں نے تلمیذ کی ضمانت دی تھی وہ اس علاقے کے باشندے نہیں تھے۔ بیوی کے بار بار کہنے پر اور امینہ پر ترس کھا کے انہوں نے ضمانت دے تو دی تھی لیکن تلمیذ کے جیل سے رہا ہونے کے بعد جب کیس کا چلنا ٹلتا جا رہا تھا انہوں نے بیوی سے کہنا شروع کیا ''میرے سر پر بوجھ ہے، لگتا ہے جکڑ گیا ہے۔ رات کو تم سو جاتی ہو میں جاگتا رہتا ہوں اور ایک ہی خیال

ستاتا رہتا ہے کچھ ہونے والا ہے۔''

دو، تین مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ انھوں نے امینہ سے کہنا شروع کر دیا: ''مجھے نیند نہیں آتی ہے، تیرا صاحب آزاد آدمی ہے۔ ایک دم اگر ملک سے بنا کچھ کہے سنے، بغیر اپنا پتہ دیے بھاگ لے تو میرے تو بیوی بچے رُل جائیں گے۔ میں اپنی ضمانت واپس لے رہا ہوں۔''

وہ انہیں سمجھاتی: ''آپ فکر مت کرو میرا صاحب، ایمان دار آدمی ہے، کبھی نہ اپنے چپراسی کی تنخواہ دینے میں دیر کرتا ہے نہ میری۔ دوستوں کے بہکائے میں آ گیا۔ وہ فراڈ کا کام اس نے نہیں کیا تھا۔ اس کے بس اس میں پیسے لگے تھے۔''

تمیذ کو بہن کے جیٹھ کی بات بتاتے ہوئے وہ ہنس رہی ہوتی تھی۔ ''وہ اچھا آدمی ہے۔ کہتا ہے، ایسا کرے گا نہیں۔''

جیل سے باہر وہ دن تمیذ کے شدید پریشانی کے دن تھے۔ چند چھوٹے سودے ہوئے لیکن نئی پالیسی کے آنے میں ابھی وقت تھا۔ خرچ کی تنگی تھی، چپراسی کے لیے بھی، ہوٹل کا بل وقت پر نہیں چکا سکتا تھا لیکن مالک مطمئن تھا۔ تمیذ کو دل پسند میں رہتے ہوئے چھے سال ہو چکے تھے، مینیجر اس کے کاروبار کی نوعیت کو جانتا تھا۔ نئی پالیسی آئے گی، تمیذ جن آئیٹمز (items) کو امپورٹ کرنے کا حق رکھتا تھا امپورٹ کرے گا، وہ مال بکے گا اور اُس کا بل چکا دے گا۔

شاید امینہ کے کہنے سے سلیم نے آنا چھوڑ دیا تھا۔ خود امینہ نے اس سے ایک بار بھی اپنی کسی ضرورت کا ذکر نہیں کیا تھا۔ تمیذ کے پوچھنے پر ''گزارا کیسے ہو رہا ہے؟'' وہ کہہ چکی تھی ''جیسے تم حکومت کے داماد ہو میں بھی اس کی کچھ لگتی ہوں۔''

تمیذ نے اس بات کو اہمیت نہیں دی۔ 'آخر مجھ سے ملنے سے پہلے بھی کہیں سے گزر کر رہی تھی، اب بھی کر رہی ہوگی۔'

ضمانت پر رہائی کے بعد دوستوں میں سے ایک بھی آ کر نہیں جھانکا۔ ان کا خیال آنے پر وہ خود کو تیار کرتا: 'جیل میں نے کاٹ لی، اس کا ڈر نکل چکا ہے، کیس شروع ہو تو صاف کہوں گا کس کا کیا رول تھا اس سازش میں۔ اب میرا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کیس بگاڑا جائے گا کہ جو بیان حلف لینے کے بعد دیا تھا وہ غلط تھا یا جو اب کہہ رہا ہے وہ غلط ہے۔ ٹھیک ہے اس کی سزا بھی دے لیں۔ لیکن مجھے ان سے اپنا حساب چکتا کرنا ہے۔ یوں بھی کاروبار ٹھپ ہو چکا ہے۔ خرچہ ہی خرچہ ہے۔ آخر کو ایک دن اسے بند کرنا ہی ہے۔'

ایک سوال اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا: 'وہ آدمی جس کا رہائی کے بعد شکریہ ادا کرنے گیا تھا آخر کس کا جیٹھ تھا؟ امینہ کا یا اس کی چھوٹی بہن کا؟'

'بڑی بہن کا بھی جیٹھ تھا، چھوٹی کا بھی ہے، اس کا اپنا کوئی جیٹھ نہیں ہے! شوہر بھی کبھی تھا یا نہیں؟'

انہی دنوں ایک دن تیسرے پہر جب وہ اوفس میں اکیلا بیٹھا تھا ایک اجنبی چق اٹھا کر داخل ہوا۔ تملیذ ڈر گیا۔ لیکن آنے والا اس سے بھی بڑھ کر زندگی سے مار کھایا ہوا نظر آتا تھا۔

اپنا تعارف کرا کے کہ سیلر ہے (ملاح) اس نے ایک خط تملیذ کے سامنے رکھ دیا۔ خط نہ کسی کے نام تھا نہ لکھنے والے کا نام نیچے درج تھا لیکن وہ تملیذ کے سوا کسی اور کے نام ہو بھی نہیں سکتا تھا، نہ ہی کوئی شیخ باسط کے علاوہ اُسے لکھ سکتا تھا۔ برٹش پروٹیکٹوریٹ کی عرب بندرگاہ کے شیخ باسط، گجراتی دوست۔ خط کا پہلا حصہ حوالوں سے پُر تھا بہت معمولی انگلش میں کیونکہ شیخ صاحب لکھنا پڑھنا صرف گجراتی میں جانتے تھے، یا کام چلاؤ انگریزی اور عربی میں۔

خط میں تھا: یہ صاحب سیلر ہیں، بتاتے ہیں ایک جرمن کارگو شپ پر سارنگ [1] تھے۔ بیوی مر چکی ہے، ایک بیٹی ہے اس کی شادی کی فکر میں ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے جو دوسرے ملاحوں کے کہنے میں آ کر اسمگلنگ کے دھندے میں لگ گئے۔ پکڑے گئے اور یہاں لا کر جیل میں بند

---

[1] جہاز میں کام کرنے والوں کا سپروائزر

کر دیئے گئے۔ اسمگلنگ بیٹی کے زیورات اور شادی کے خرچے کے لیے کی تھی۔ ان کا ملاحوں کا پاسپورٹ CDC[1] بے کار کر دیا گیا ہے۔ تم اس میں اپنی بندرگاہ کے شپنگ ماسٹر سے کسی طرح منظوری Clearance دلا دو۔ یا نیا CDC بن جائے۔ بے چارے کی زندگی بن جائے گی۔ نیا CDC بننے پر اسے نیا جہاز مل جائے گا اور سال بھر میں بیٹی کے لیے زیور کپڑے بنوا لے گا۔ اسمگلنگ اور جیل ان کے یہاں برا نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اسمگلنگ اور جیل جانے کی وجہ سے شادی نہیں رکی ہے، رکی اس وجہ سے ہے کہ ان کے پاس نہ بیٹی کو کچھ دینے کے لیے ہے نہ داماد کو۔ شپنگ اوفس میں سارے کام پیسے سے چلتے ہیں— یہ کام کرو اور ثواب کمالو۔

خط نے خاتمے تک پہنچتے پہنچتے تمکید کے دماغ میں جہاں اندھیرا تھا، روشنی کر دی۔ 'اگر اس کا ساتھ ہو جائے تو مقدمے کا خرچہ نکل آئے گا اور میرا بھی۔'

'میرا پتہ باسط بھائی کو کیسے معلوم ہوا؟'

عتاب میں آئے ہوئے ملاح نے کہا ''یہ تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ میں نے اُن سے مدد مانگی۔ انہوں نے پوچھا؟ 'یہ کام کون کر سکتا ہے؟' میں نے کہا 'شپنگ ماسٹر' پھر پورٹ معلوم کر کے وہ سوچ میں پڑ گئے کہ یہاں اُن کا کون واقف ہے۔ یہ انہوں نے خط میں نہیں لکھا ہے اب وہ ایک شپنگ کمپنی میں ہیں۔ آنے جانے والوں سے پتہ لگا لیا ہوگا۔''

تمکید نے پوچھا ''کیا پئیں گے؟''

اس نے کہا ''جو مل جائے۔''

پہلے پیگ سے زندگی سے مار کھائے ہوئے آدمی کے چہرے سے افسردگی دھل گئی۔

تمکید نے کریدا: ''اگر نیا سیلرز پاسپورٹ بن جائے تو نیا جہاز مل جائے گا؟''

''ہاں جی۔ وہ تو میں پوچھ کر آ رہا ہوں۔ میں انجن ڈپاٹ کا سارنگ[2] ہوں جسے لینے کو ہر کمپنی تیار رہتی ہے۔ آج پاسپورٹ ملے کل بوئلر سوٹ پہن میں انجن روم میں ڈیوٹی پر ہوں گا۔''

---

[1] Continuous Discharge Certificate

[2] انجن ڈپارٹمنٹ میں کام کرنے والوں کا ہیڈ مین

''لیکن پرانے سی ڈی سی پر جو لکھا ہے؟''

''وہ تو سمجھو غائب ہوگیا۔ سامان کے ساتھ۔''

''اور ساتھ میں دوسرا کام بھی چلے گا؟''

''ہاں جی۔''

''پکڑے جانے کا کتنا خطرہ ہے؟ کیونکہ اگر پکڑے گئے تو فائدے کی جگہ کاروبار میں لگا یا ہوا پیسہ بھی گیا۔''

سیرنگ نے باچھوں سے شراب کو پونچھا اور ہاتھ کو سر کے بالوں پر پھیر کر صاف کیا، ڈبیا سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں رکھی اور جب تمیز اُسے روشن کر چکا تو بولا: ''نہیں جی خطرہ بالکل نہیں ہے — جو ہوا میری غلطی سے ہوا۔ جسے کنسائنمنٹ پہنچانا تھا—''

''گولڈ۔''

''اس کے آنے میں کچھ دیر ہوئی۔ میں خود مال لے کر چل پڑا کہ پیسے لوں اور جان چھوٹے۔ یہ نہیں دیکھا ابھی کسٹم والے وہیں ہیں یا جا چکے ہیں۔ پکڑا گیا۔'' پھر اس نے کھل کر مسکراتے ہوئے کہا: ''آپ فکر مت کرو۔ آپ کا پیسہ نہیں ڈوبے گا، میرا بھی نہیں ڈوبے گا۔'' دونوں نے ہاتھ ملائے جیسے ایک عہد نامے پر دستخط کیے ہیں۔

اگلی صبح سیرنگ کو تمیز کے دفتر آنا تھا جہاں سے دونوں شپنگ آفس جاتے۔ شپنگ ماسٹر کے ہاتھ میں سب کچھ تھا: بیویریا جرمنی کے ایک ٹی سیٹ کے تحفے کے بدلے میں وہ ملاح کو اگلا جہاز دے سکتا تھا، جو سال ختم ہونے پر جہاز سے سائن آف کرتے وقت اس کے لیے گرم سوٹ کا کپڑا یا اس کی بیوی کے لیے ڈریس کا جاپانی کپڑا لے کر لوٹے گا۔

سیرنگ کے تھیلے میں ایک کارٹن بینسن اینڈ ہیجز سگریٹ کا تھا اور ایک بوتل جرمن برانڈی کی جو وہ معافی کے ساتھ شپنگ ماسٹر کو پیش کرتا کہ صاحب جہاز چھن گیا۔ بس یہ لا سکا ہوں۔ اور وہ تھیلا میز کے نیچے رکھ کر کہتا: 'سناؤ، آگے کیا پروگرام ہے؟' اور وہ کہتا: 'صاحب پروگرام تو آپ

کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے بعد پروگرام کے گھوڑے کی لگام تلمیذ کے ہاتھ میں ہوتی۔

لیکن قسمت سیرنگ پر مہربان نہیں تھی۔ اوفس کو تالہ لگا تھا۔ باہر نہ دفتر کا پیون تھا نہ وہ کرسی جس پر پیون بیٹھتا ہے۔ چق بھی دروازے پر نہیں تھی جس سے پتہ چلتا جب دفتر کھلے گا وہ گرادی جائے گی۔

حالات نے تلمیذ کو زندگی میں پہلی بار ہار مان لینے کی حقیقت سے روشناس کرایا تھا اور اس نے بغیر خود سے جرح کیے تسلیم کرلیا کہ ضمانت ختم ہو چکی تھی۔

اس سے پہلے کہ ضامن یہ قدم اٹھائے کہ عدالت سے درخواست کرے کہ اسے بھروسہ نہیں رہا ہے کہ ملزم تلمیذ ہر بار وقت پر حاضر عدالت ہوگا اس لیے اس مقصد کے لیے جو بونڈ اس نے بھرا تھا اسے مکمل طور سے ختم کر دیا جائے اور قبل اس کے کہ اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کیے جائیں، اُسے سڑکوں پر راہ چلتوں کے بیچ ہتھکڑی لگا کر تھانے لے جایا جائے جہاں اس کا مقدر یہ ہوگا کہ اسٹیشن ہاؤس اوفیسر سے لے کر معمولی سپاہی تک اس سے گالیوں اور تھپڑوں سے بات کرے اور اُسے دن رات کھٹملوں، مچھروں اور کوک روچیز سے بھرے سیل میں بند رکھا جائے اس نے عدالت کے نام درخواست لکھی:

> میں یہ سمجھتا ہوں میری تا حال ضمانت ختم ہونے کو ہے اور نئی ضمانت کے لیے نہ میرے پاس کافی زر ضمانت ہے، نہ کسی اور قسم کی ضمانت از قسم جائیداد (مکان، دفتر یا زمین) نہ میں دوسرے ضامن کا انتظام کرسکتا ہوں میں بالارادہ خود کو قید کے لیے پیش کر رہا ہوں۔

مختصر سی آزادی کے بعد تلمیذ دوبارہ جیل میں تھا۔ لیکن یہ وہ جیل نہیں تھی جس میں تلمیذ کو پہلی بار رکھا گیا تھا۔ یہ جگہ شہر سے دور تھی۔ پشت پر کچھ فاصلے پر نہر تھی اور کھیت، سامنے کے رخ، کچھ دور، ملوں سے گاڑھا دھواں اٹھتا نظر آتا تھا۔

پہلی ملاقات پر امینہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ اُسے ''چھوٹی بہن کے جیٹھ سے یہ امید نہیں تھی کہ چپکے سے یہ کام کر ڈالے گا، اپنی بیوی سے بھی چھپا کر۔ میں نے اس کے کتنے کام کیے ہیں وہ یہ بھول گیا۔ بہن سے کہا۔ اس نے کہا: آپا بتاؤ میں کیا کر سکتی ہوں۔ گھر میں میرا راج ہے یا اس کا!''

تلمیذ نے اپنی باتوں سے جیسے اس کا سر ہاتھوں سے اٹھا کر اوپر کیا اور جیب سے رومال نکال کر آنسو پونچھے۔ ''ایک دن تھا کہ باپ نے گھر سے نکالا تھا۔ پھر وہ دن آیا جب بہن بہنوئی نے گھر سے نکالا۔ اُن سے تو یہ لوگ اچھے ہیں کہ رہنے کو جگہ دی ہے۔ نہ کھانے کی فکر، نہ کپڑوں بستر ے کی۔ اور جتنے دن چاہوں بغیر بھاڑا دیے رہوں۔''

امینہ سر اٹھائے اتنی دیر سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی۔ آخری بات سن کر بے ساختہ ہنس پڑی۔

(۳۸)

اُس بڑے ہول میں جہاں ملاقاتی آتے تھے جیل وارڈن کی میز داخل ہونے پر بائیں ہاتھ کو تھی۔ جسے خاموشی سے تحفے لانے کی مراعات ملی ہو اُسے میز کے پیچھے والی کرسی پر جا کر بیٹھنا ہوتا تھا اور اس کی ایک دراز کھول کر جو لایا ہو وہاں رکھ دینا۔ وہاں سگریٹ کی ڈبیاں بھی ہوتی تھیں۔ مختلف رنگوں کی نسوار کے ٹن بھی پڑے ہوتے تھے — اور چرس کا ٹکڑا بھی کبھی کبھی، جو تمیز کے لیے نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی نوٹ بلکہ صرف ریزگاری پڑی ہوتی تھی۔ چند منٹ لاتعلقی سے کرسی پر بیٹھے رہنے کے بعد جیسے ملاقاتی کھڑے کھڑے یا انتظار میں ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا ہو جیل کے عملے میں سے کسی کو آتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔

قیدیوں میں چند افریقی بھی تھے اور ایک نیوزی لینڈر جو جوموکینیاٹا کے زمانے میں برطانوی فوج کی اس کمپنی میں تھا جو ماؤ تحریک کو ختم کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ وہ فخریہ کہتا تھا میں نے اکیس ماؤ ماؤ خود شوٹ کیے۔ افریقی قیدی اس کے ساتھ اتنی نیکی کرتے تھے کہ اُسے مارتے پیٹتے نہیں تھے، بس اس سے بات نہیں کرتے تھے: اُس سابقہ افریقی کولونی کی آزادی کی تحریک اس سابقہ برطانوی کولونی کی جیل میں بھی جاری تھی۔ افریقی قیدیوں سے ملنے افریقی آتے تھے۔ نیوزی لینڈر سے ملنے کوئی نہیں آتا تھا۔ اُن دنوں وہ جیل کے ورک شاپ میں ایک تاروں کا ساز بنا رہا تھا — شاید وایولن۔

تحفے منگوانے یا لینے کی سہولت تلمیذ کو اس بنا پر ملی تھی کہ اس کا عربی کا خط بہت اچھا تھا، اتنا اچھا کہ وارڈن نے اپنے بیٹوں کی نئے کورس کی کتابوں کا پیوں پر اُن کے نام تلمیذ ہی سے لکھوائے تھے۔ وارڈن عبادت گزار آدمی تھا جس کا اعتقاد تھا' عربی اتنی پاکیزہ زبان ہے کہ اس میں بیہودہ لفظ ہی نہیں ہیں خدا کا سارا کلام اسی میں ہے، اردو یا ہندی میں کیوں نہیں اُترا! پھر یہ بھی کہ حج کے موقعے پر جو بھی اس نے عربوں کے منھ سے سنا تھا اُس پہ کہاں گمان ہوتا تھا کہ اس میں کوئی ملاوٹ ہوگی۔'

یہ وہ دن تھے جب تلمیذ کو اپنے مرحوم باپ سے پیار محسوس ہوا تھا جس کی فرصت پچھلی پورے وقت مصروف زندگی میں نہیں ملی تھی۔ عربی کا خط انہوں نے سکھوایا تھا اور چاہتے تھے وہ آگے چل کر دین دار تو خیر بنے ہی، عربی اسکولر بھی بنے۔ بادشاہوں والا قرآن ہاتھ سے لکھنے اور نماز کی ٹوپیاں بنانے کا کام چاہے نہ کرے، نہ امام مسجد، یا مؤذن بنے، لیکن دین دار عالم ہو اور خود کفیل، نمازیوں کے گھر سے بہتر کھانا آنے کا سدا امیدوار نہیں۔

زندگی میں صرف ایک بار انہوں نے تلمیذ کی پٹائی کی تھی وہ بھی بے دردی سے نہیں۔ بہنوئی نے قرآن، نماز، روزے پر ڈنڈے سے زور دیا — حقیقت میں اپنی ٹہلنے کی چھڑی سے، اتنا کہ اس نے وقت پر غائب ہونا شروع کر دیا اور ساتھ ہی عربی تعلیم بھی جتنی ہوئی تھی، بھول گیا۔

یہاں سے تلمیذ پھر اُن دنوں میں رہنے لگتا تھا:' اتنے برے تو نہیں تھے وہ دن، بارہ آنے کی چھ آؤنس کی کچے کانچ کی شیشی کی دیسی شراب تب دوستوں کے ساتھ وہ لطف دیتی تھی جو نہ کبھی وائٹ ہورس نے دیا نہ جون ہیگ نے، بلا سے اس کے نشے کا توڑ کتنا ہی گراں ہوتا تھا۔'

فلم کیپیٹل سٹی میں اوفس میں کام کے لیے سیکھی ہوئی ٹائپنگ بھی جیل میں اس کے بڑے کام آئی۔ اس کی کاروباری خط و کتابت کی انگلش ان تمام گورمنٹ افسروں سے بہتر تھی جن کے ہاتھوں سے گزر کر وہ سینٹرل جیل میں پہنچا تھا۔ اُن کا کام بھی کرتا تھا اور دوسرے جیل کے ہم سفروں کا بھی۔ اسٹاف والے یہ کام اسے دفتر میں لے جا کر کراتے تھے – ایک سگریٹ اور چائے کی پیالی کے

عیوض۔ وہ کہتا ''چائے سے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے، مجھے زبردستی کیوں پلاتے ہو۔''
ایک دن اسٹاف کا ایک آدمی کہہ بیٹھا ''جب دل کی نزاکت کا یہ عالم ہے تو فورجری کے لیے ہمت کیا کسی سے ادھار لی تھی!''

اس نے ٹائپ رائٹر کو پرے دھکیلا اور اٹھ کھڑا ہو۔ جس کا کام اس وقت کر رہا تھا اس نے پلیز پلیز کہہ کر اُسے دوبارہ بٹھا دیا۔

کبھی کبھی کوئی پچھلی جیل کا ساتھی جب ملنے آتا تو کیسی بھی شیشی میں ایک دو پیگ وسکی کے جیل کے کسی جاروب کش کے حوالے کر جاتا کہ فلاں قیدی کو دے دینا۔ ساتھ میں ایک دو روپے جاروب کش کے لیے ہوتے تھے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا تھا وہ ساتھی جیل سے باہر اب سکھ کی بنسی بجا رہا ہے۔ ایک دن ایک کرم فرما نے جو شیشی تکمیذ کے لیے میز کی دراز میں چھوڑی اس پر دوا کی خوراکوں کا لیبل چسپاں تھا۔ جیل وارڈن کو اس چیز میں دلچسپی نہیں تھی جو شیشی کے اندر تھی۔ خود ان کے ماتھے پر سجدے کا نشان تھا اور تکمیذ کے عربی خط کے وجہ سے انہیں یقین تھا یہ بے گناہ پکڑا گیا ہے۔ لیکن شیشی کو دراز میں سگریٹ کی ڈبیا اور کرنسی نوٹوں کے ساتھ رکھا دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گئے: اگر تکمیذ بیمار ہے تو اسے سِک بے (sickbay) میں ہونا چاہیے۔ یہ رعایت حاصل کرنے کی جگہ۔ باہر سے دوا منگوانے کا مطلب؟ جب ملاقاتی چلے گئے اور تکمیذ جیل کے اندر کی دنیا میں گم ہو گیا تو انہوں نے شیشی کی ڈاٹ اٹھا کر سونگھا، وہ انگریزی دواؤں کے خلاف تھے، شیشی کی بو کے لیے اُن کے منھ سے نکلا ''ٹنکچر ہے۔'' اور ناک چڑھا کر عجلت میں شیشی واپس دراز میں رکھ کر ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ ان کا ارادہ پوچھ گچھ کا ہوا — لیکن دبی آواز میں۔ کچھ دیر بعد جب انہوں نے تکمیذ کو بلا کر پوچھا ''تم بیمار ہو؟ دوا کی شیشی تم نے منگوائی ہے؟''

تکمیذ نے مسخرے پن سے کہا ''نو سر میں پہاڑی بکرے کی طرح چست ہوں، دوا کیوں منگواتا!''

بات بڑھائی نہیں جا سکتی تھی کیونکہ تھا یہ خاموشی کا لین دین۔ ڈیوٹی ختم ہونے پر جب

انہوں نے میز کی درازیں اپنا سامان نکالنے کو کھولیں تو تکمید کی بات سچ نکلی: ایسی کوئی شیشی وہاں نہیں تھی۔

اس بار جب جب امینہ تکمید سے ملنے آئی وہ اُسے بجھی بجھی سی نظر آئی لیکن تکمید کے لیے وہ کہہ چکی تھی ''شکر ہے اس دفعہ تم اتنے پریشان نظر نہیں آتے ہو جتنے پچھلی دفعہ۔''
اس پر تکمید نے کہا تھا ''اگر مسلسل یہاں آتا رہا تو اتنا پریشان بھی نظر نہیں آؤں گا۔ اور اگر مستقل یہیں قیام ہو جائے اور تم بھی ساتھ ہو تو جنت کا خیال بھی دماغ سے نکل جائے گا۔ ہر طرح کا آرام ہے۔ بس یہ کہ بستر سخت ہے اور رات کو بھی لائٹ اوف نہیں کی جاتی ہے۔''
ہر بار وقت ختم ہونے پر وہ کہتی تھی ''تمہارے ساتھی تمہیں چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں یا نہیں مگر میں تو کر رہی ہوں اور میری بات اللہ ضرور سُن لے گا کیوں کہ بڑی دکھیا ہوں۔''
ایک بار وہ اس سے ملنے اپنے بھائی کے ساتھ آئی۔ ہول میں ملاقاتیوں کی وجہ سے چہل پہل تھی۔ کچھ اپنے ساتھ بچوں کو بھی لائے تھے اور چھوٹے بچے کو بازوؤں میں اٹھا کر اس کا ہاتھ ہلاتے تھے جیسے ٹاٹا کرا رہے ہوں۔ بعض بڑے بچے رو پڑتے تھے۔ ایک لڑکی اپنے باپ سے رہ رہ کر ایک ہی سوال کر رہی تھی: ''آپ کب گھر آئیں گے؟'' اور جب رخصت ہونے کا وقت ہوا، بولی ''کیا آپ امی سے ناراض ہیں؟ اب وہ آپ سے نہیں لڑیں گی۔'' اس کے ساتھ والے اس روتی کا ہاتھ پکڑے اُسے باہر لے گئے۔
اُن کے جانے کے بعد ایک حسرت تکمید کے دل دماغ میں پیدا ہوئی۔ 'میں بھی ان جیسا انسان ہوتا، جو مل رہا ہے اس پر راضی، شاید شروع اسکول کے زمانے سے۔ اور اگر کسی وجہ سے یہ دن بھی آتے تو جانتا گھر کہاں ہے، وہاں بیوی اور بیٹی اور دوسرے میرا انتظار کر رہے ہیں۔'
'لیکن اگر ایسا آدمی ہوتا تو یہاں آتا ہی کیوں۔'
'اور یہ جو دو انسان تمہارے سامنے کھڑے ہیں، اتنی دور سے تم سے ملنے آئے ہیں، جانتے ہیں تم انہیں ایک پیالی چائے بھی نہیں پلاؤ گے انہیں تم کس گنتی میں رکھتے ہو؟'

'ملنے والے۔ آج یہ مجھے اپنا سمجھتے ہیں، کل کسی اور کو اپنا سمجھنے لگیں گے۔'

'اور تم؟'

'میں بھی جب تک اپنے گھر بار والا نہیں ہوں انہیں اپنا سمجھوں گا۔'

ایک بار پھر اُسے خیال آیا: 'زندگی میں اگر میں نے کوئی نیکی کی ہے تو وہ اس نوجوان سے جس میں اتنی جسارت نہیں ہے کہ مجھ سے خود کچھ مانگ سکے، اس کی تعلیم کا آدھا پونا خرچہ اٹھا کر۔'

ایک موقع پر سلیم کو ایک پرائیویٹ امتحان دینے ساڑھے سات سو میل دور فلم سینٹر سٹی جانا تھا اور پریشان تھا وہاں کوئی تھا ہی نہیں جس کے گھر ٹھہرتا اور ہوٹل کے قیام کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

امینہ سے ساری بات سُن کر تملیذ کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا تھا، پھر اُسے خیال آیا کیوں نہ روشن آرا آپا کے نام خط دے دے؟ تہذیب بھائی کا انتقال ہو چکا تھا اور آپا اپنے بچوں کے ساتھ ایک بنگلے کے نصف میں رہ رہی تھیں۔ وہاں سروینٹ کوارٹر ضرور ہوں گے اور آپا وہ ہستی نہیں تھیں کہ خط نہ لکھنے کی وجہ سے اس سے ناراض ہوں۔

وہ بغیر امینہ کے سوال کا جواب دیئے روشن آپا کے نام خط لکھنے لگا: میرے ایک مرحوم دوست کا لڑکا ہے۔ میری مدد سے تعلیم جاری رکھ پایا ہے۔ اب اسے امتحان دینا ہے آپ کے شہر میں۔ پریشان ہے وہاں کہاں ٹھہرے گا۔ آپ اگر اسے ٹھہرنے کی جگہ دے دیں، یہی پانچ سات دن کے لیے تو میں اسے ایک بار پھر خود پر آپ کا احسان سمجھوں گا۔ آنے جانے کا اور دوسرا خرچہ میں دے چکا ہوں۔

سلیم کو خط دیتے ہوئے اس نے کہا: ''میری بڑی بہن ہیں، خالہ زاد بہن۔ مجھے یقین ہے وہ تمہارے ٹھہرنے کا انتظام کرلیں گی، اپنے گھر میں۔''

اور واقعی وہی ہوا تھا جس کی تملیذ کو توقع تھی۔ بڑی بہن نے یہ کام بڑی خوشی سے کیا۔ آخر کو مسافر کے قیام اور خورش کا کام تھا اور وہ دین دار تھیں۔ لیکن جب سلیم پہلے کھانے کے

بعد دوبارہ وقت پر نہ پلٹا تو انہوں نے سمجھ لیا: پڑھ رہا ہے، جہاں جاتا ہے وہاں اور لڑکوں کے ساتھ کھالیتا ہوگا۔

آخری دن وہ کوارٹر کی چابی کسی نوکر کو دے کر خاموشی سے وہاں سے چلا آیا تھا۔

یہی نہیں ناکامی پر تلمیذ نے ہمیشہ اس کی ہمت بندھائی تھی جو اسے اپنی تعلیم کے زمانے میں نصیب نہیں ہوئی تھی۔ راجد ھانی میں رہتے ہوئے وہ پاس فیل کی اہمیت کو بھی بھلا چکا تھا۔

اس وقت امینہ اور اس کا بھائی سلاخوں اور جالی سے گز بھر کے فاصلے پر کھڑے تھے اس چمکدار پائپ کے دوسری طرف جو ہول کی چوڑائی میں یہاں سے وہاں تک چلا گیا تھا اور سدا کی طرح آنے والوں کو بتا رہا تھا۔ اس سے آگے نہیں بڑھنا ہے۔ یا یہ کہ اس سے آگے بڑھنا بے کار ہے تم اپنے قیدی سے نہ ہاتھ ملا سکو گے نہ چھڑا کر اُسے یہاں سے لے جا سکو گے۔

تمیذ نے اشارے سے پوچھا: گزارہ؟ امینہ نے آنسو روکتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی سگریٹ کی ڈبیا دکھائی۔

وقت پورا ہوجانے پر بھائی بہن کو باہر جاتے دیکھ کر تلمیذ کے دل نے ایک بار پھر کہا: 'وفادار لڑکی ہے۔'

اگلی ملاقات پر امینہ نے کہا ''فتی بھائی نے تمہارے لیے ایک جج کو وکیل کیا ہے۔''

تمیذ ہنس پڑا ''جج ہی کو وکیل کرلیا!''

''ہاں۔ جس وقت تم نے اللہ سے اپنے ایمان لانے کو کہا تھا شاید اس وقت فتی بھائی ان جج صاحب سے تمہارے کیس کو ختم کرانے کی بات کر رہے تھے۔ اب میرے ایمان کو دیکھنا تم بری ہوجاؤ گے۔''

تلمیذ نے آہستہ سے سر کو ہلایا اور شرمندگی سے اس کی آنکھیں نیچے جھک گئیں۔

''اور اُس وقت کو زندگی بھر مت بھولنا جب تم اتنے اداس تھے کہ زندگی بھر نہیں ہوئے تھے اور جدھر سورج ڈوبنے کی روشنی نظر آرہی تھی تم نے آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر جو کہا تھا۔ یاد

ہے؟''

تلمیذ نے پھر آہستہ سے سر ہلایا اور کہا ''یاد ہے۔''

''میرے سامنے پھر سے کہو'' امینہ نے کہا۔

''اے اللہ میں تجھے مانتا ہوں۔'' پھر سر جھکائے جھکائے بولا ''اب تم جاؤ۔''

(۳۹)

ریٹائرڈ سیشن جج عبدالقدیر بھی جانداروں کی اس قسم میں سے تھے جو انسانوں کی ہے یعنی ہوموسپینز، اور اُن میں سے بھی اُس (rare) غائب ہوتی ہوئی (Subspecies) ذیلی نوع کی جس کے افراد کا گزارہ اپنی محنت کی کمائی پر ہوتا ہے دوسرے کے دوڑا کر مارے ہوئے شکار پر نہیں۔ اور چونکہ زیست کا یہ طریقہ غلط ہے۔ ہر قسم کی چراگاہیں انسان کے دوسرے جانداروں کی قیمت پر ضرورت سے زیادہ پھولتے پھلتے رہنے سے تنگ ہوتی گئی ہیں، اور قناعت سے زندگی بسر کرنے والے کے لیے ناکافی ہیں۔ انہوں نے ریٹائر ہونے پر جب اپنے اثاثے کا جائزہ لیا تو پتہ چلا نہ دو لڑکیوں کی شادی کے لیے کافی ہے، نہ لڑکوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اور نہ ہی بیوی کے ساتھ حج کرنے کے لیے۔ بیوی کا کہنا تھا یہ سب کام بہت پہلے کر لینے کے تھے۔ اس پر وہ بیوی سے کتنی ہی بار کہہ چکے تھے ''یعنی آپ سے شادی تعلیم ختم کرنے سے پہلے کر لینی چاہیے تھی! جب آپ تیرہ کی تھیں اور میں ۱۹ کا۔''

شروع شروع میں جب جب خیر خواہوں نے مشورہ دیا۔ اُن میں بیوی کے سگے اور کزن بھائی پیش پیش تھے۔ سرکار لاء کی پریکٹس شروع کیجئے: آپ کا سا قانون کا علم کتنوں کو نصیب ہے، ابھی پبلک کے ذہن میں آپ کے فیصلے زندہ ہیں، آسانی سے آپ کی پریکٹس عروج کو پہنچے گی، اور آپ ہیں کہ اس علم اور شہرت کو گنوا رہے ہیں!

اس پر انہوں نے ہر بار کہا ''میں اُن کے سامنے مؤدب کھڑا ہوں جو کل میرے سامنے کورٹ میں کھڑے ہو کر اپنے مؤکل سے جھوٹ بلواتے تھے، میں ان کا کچا چٹھا جانتا ہوں۔ اُن کو یور اُونر your honour کہہ کر مخاطب نہیں کر سکتا ہوں۔''

لیکن جج صاحب کی پنشن ناکافی تھی اور ان کی پریکٹس نہ کرنے کی قسم کو خود ان کی وضع داری نے توڑ دیا۔ فتی کو وہ بیٹا کہہ کر بات کرتے تھے کیونکہ اس کے باپ جب وہ انگریزوں کی آزادی سے پہلے کی نئی راجدھانی میں تھے اُن کے گھرانے کے سب بڑے چھوٹوں کے بال گھر آ کر کاٹتے تھے۔ صرف مردوں کے۔ اُن کے انتقال کے بعد یہی کام فتی کرنے لگا تھا اور

جب اس کا فوج گنج میں ایک باعزت لوگوں کا سیلون ہوگیا، جہاں وہ جانتے تھے انگریز عورتیں بھی بال کٹوانے آتی ہیں تو بھی وہ ان کے بال کاٹنے گھر آتا تھا۔ یہی کام وہ نئے ملک کے کھازی کے دارالحکومت میں بھی پچھلے دس سال سے کر رہا تھا۔

ایک دن فق تمیذ کو لے کر جج صاحب کے گھر پہنچا اور بولا: ''قبلہ ان کا کام آپ کو نمٹانا ہے۔ اگر اس کا کیس آپ نے اپنے ہاتھ میں نہیں لیا تو یہ رل جائے گا، بلکہ دس سال سے رل رہا ہے۔ اس لیے کہ اس منحوس شہر میں اس کا کوئی اپنا نہ کسی بڑے عہدے پر ہے نہ بڑا کاروباری کہ یہ کسی بڑے وکیل کو لے کر عدالت میں حاضر ہو۔''

عبدالقدیر صاحب نے اس وقت تک صرف وہ کیس ہاتھ میں لیے تھے اور انہیں ہاتھ میں لیتے ہوئے بھی ان کی فطرت ان کی ضرورت پر کافی حد تک غالب آ گئی۔ دونوں ہی ان کی دانست میں لٹی کٹی انسانیت کے نمونے تھے۔

فق نے تمیذ کی پیروی ایسے کی جیسے وہ جج عبدالقدیر کے اجلاس میں تھا اور تمیذ اس کا موکل۔ سارا کیس سنا کر، جس کے دوران تمیذ پورے وقت کرسی پر پہلو بدلتا رہا، اس نے کہا: ''صاحب یہ بے قصور نہیں ہے، بے عقل ضرور ہے۔ جنہوں نے سازش کی وہ غائب ہیں، یہ جس کے کندھے پر رکھ کر انہوں نے بندوق چلائی تھی اڑا رہا۔ بلکہ جب پتہ تھا پولس آ رہی ہے تو بھی فرار نہیں ہوا۔ فرار ہوتا تو کہاں جاتا یہاں اس کا کوئی ہے ہی نہیں۔''

جج صاحب نے کہا: ''تم نے یہ ایک غیر ضروری پوائنٹ بیچ میں لاکر ان کے کیس کو خراب کر دیا۔''

فق نے کہا: ''وہ کیسے؟''

''عدالت یہ نہیں کہے گی: یعنی اگر کوئی ان کا کہیں ہوتا تو یہ فرار ہوکر وہاں پہنچ جاتے۔''

اس کے بعد فق نے انگلی اٹھا کر صرف ایک اور بات کہنے کی اجازت لی اور بولا: ''پچھلی بار ان کی ضمانت جن صاحب نے دی تھی وہ بہت جلد پھر گئے۔ پتہ نہیں اصل مجرموں کے اکسانے پر یا کیسے۔''

''نہیں وہ بات نہیں۔'' تمکید نے بیچ میں کہا۔

فتی نے اس کی بات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور اپنی پیروی جاری رکھی: ''اس بار میری ضمانت پر رہا ہوئے ہیں، چاہتے تو پہلے بھی ایسا کر سکتے تھے، اور سالوں سے کیس گھسٹ رہا ہے۔ آج یہ نہیں ہے، کل وہ نہیں ہے، عدالت والے اور وکیل پیسے کھا رہے ہیں۔ بزنس چوپٹ ہوگئی چچا۔ آگے میں کچھ نہیں کہوں گا۔''

''اچھا، اچھا تم اپنی پیروی ختم کرو اور کام پر جاؤ۔'' جج صاحب نے فتی کو باہر جانے کا دروازہ دکھاتے ہوئے کہا۔

اور جب فتی چلا گیا تو تمکید سے بولے ''اب ذرا اپنا کیس سمجھاؤ۔ بالکل جس طرح ہے۔''

تمکید نے کیس اس وقت سے سنانا شروع کیا جب ایک دوپہر غیور فری لانس جرنلسٹ اس کے دفتر میں ایک تجویز لے کر آیا تھا جس کا تعلق باہر سے مال امپورٹ کرنے کا تھا'' اور میں امپورٹر ایکسپورٹر ہوں۔''

عبدالقدیر آنکھیں بند کرے پورا کیس توجہ سے سنتے رہے۔ ایک جگہ انہوں نے بیچ میں پوچھا: ''آپ نے عدالت میں غیور کا نام کیوں نہیں لیا؟ یا اس کا نام کورٹ ڈوکیومینٹس میں موجود ہے؟''

اس ایک لمحے نے تمکید کو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا۔

اس نے ہمت کر کے کہہ ڈالا'' کیونکہ وہ مجھے بلیک میل کرتا رہا ہے۔''

جج صاحب نے میچی ہوئی آنکھیں کھول کر پوچھا'' کس بات کا بلیک میل؟''

تمکید رو پڑا۔ بڑے میاں اُسے ہمدردی سے دیکھتے رہے۔ یہ وہ رونا نہیں تھا جو بناوٹی پاک باز ان کے اجلاس میں روتے آئے تھے۔

انہوں نے کہا'' ذرومت جو بھی کہو گے تمہارے خلاف نہیں جائے گا۔''

تمکید نے نئے ملک میں وارد ہونے سے لے کر اُس شہر میں جا کر رمضان میں برف بلیک مارکیٹ ریٹ پر فروخت کرنے تک جہاں کے لوگ پشتو، ہندکو، دری،، ازبک میں بات کرتے

ہیں، یہاں سے پکڑے جانے پر وہ پولیس کے سپاہی کو ایک بائیسکل سوار پر دھکا دے کر فرار ہوا تھا اور نام بدل کر عرب بندرگاہ ع جو برٹش پروٹیکٹوریٹ ہے پہنچا تھا

جج صاحب نے بیچ میں کہا: ''میرا خیال ہے اب نہیں رہا۔''

''کیا؟''

''وہ جگہ، برٹش پروٹیکٹوریٹ۔ میرا خیال ہے، وہاں آزادی آ چکی ہے۔''

''او'' تلمیذ نے کہا ''وہاں کے لیے لوگ لیے جا رہے تھے۔ اوفس پوسٹ تھی۔ میں نے کچھ عرصہ اس میں کام کیا، پھر ایک پرائیویٹ فرم کی نوکری کر لی۔ وہاں غیور سے ملاقات ہوئی تھی۔''

بات کے ختم ہونے تک اس کی ایمانداری لوٹ آئی تھی اور وہ سکون سے بات کر رہا تھا۔

آخر میں اس نے کہا: ''وہ دھمکی دے کر کئی دفعہ کہہ چکا ہے، 'وہاں تمہارا بدلا ہوا نام تبریز تھا، پھر تم معیز بن گئے۔ نجانے اور تمہارے کتنے نام ہوں گے' حالانکہ یہ نیا نام مرتضیٰ قریشی نے دیا تھا۔ وہ برابر کہتا رہا ہے' اگر کیس میں میرا نام آیا تو مجھے تمہاری پول کھولنی پڑے گی۔ پھر تمہیں پھانسی ہوگی جو نند کشور کو ہوئی تھی۔ جعل سازی (forgery) کا کیس جو تم خود اپنے خلاف بناؤ گے۔''

جج صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ اٹھے اور اٹھ کر اندر کھلنے والے دروازے میں کھڑے ہو کر انہوں نے شاید اپنی بیوی سے کہا ''دو گلاس وِمٹو یا دو پیالی چائے جو بھی ہو جائے۔'' اور واپس آ کر دوبارہ تلمیذ کی کتھا سننے لگے۔

پھر انہوں نے بغیر آنکھیں کھولے پوچھا ''شان الٰہی کون ہے؟ وہ کبھی عدالت میں پیش ہوا؟''

''نہیں۔''

''سمنز سے بلایا جا سکتا ہے؟''

''ملک سے باہر جا چکا ہے۔''

''اور وکیل صاحب؟''

''وہ کہہ چکے ہیں 'میرے دستخط کسی کاغذ پر نہیں ہیں، نہ میرے ہاتھ کا لکھا ایک بھی لفظ۔ میرا نام

آنے سے کیس تمہارے خلاف جائے گا کہ ایک قانون کے آدمی پر الزام لگا رہے ہو۔''

جج صاحب نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔

''غیور کہاں ہے؟''

''چھے مہینے سے اس کا پتہ نہیں ہے۔ شاید باہر چلا گیا ہو۔''

''مسرور بیگ؟''

''اس کے خلاف کیس شروع ہی میں ختم ہو گیا تھا۔ بس فائن ہوا تھا، معمولی سا۔ اس نے '' وہ بات کہتے کہتے رک گیا۔

''کیا؟''

''شروع ہی سے، میں نے سنا ہے، تفتیش کرنے والوں کا ساتھ دیا تھا۔''

شربت کے ختم ہونے تک تلمیذ کا کیس ختم ہو چکا تھا۔

اس رات تلمیذ بغیر ایک پیگ وہسکی کے سویا۔ نیند کی گولی لیتے ہوئے وہ ہمیشہ سے ڈرتا تھا۔ کہتا تھا: ''بری ہوتی ہے۔ اس کی عادت پڑ جاتی ہے۔''

فیصلے کے دن کے لیے تلمیذ نے امینہ سے کہہ دیا تھا ''تم مت آنا۔''

فتی اس کے ساتھ تھا۔ فتی کے فیصلے کی پیشین گوئی دو مُنھی تھی اور اس نے تلمیذ کو بوکھلا دیا تھا: ''چچا سے زیادہ اس ملک میں قانون کوئی نہیں جانتا ہے: تم باعزت رہائی پاؤ گے۔'' کبھی وہ کہہ اٹھتا ''انہوں نے کبھی پیروی کی نہیں ہے، قانون چھوڑے دو سال ہوئے۔ آوٹ آف پریکٹس ہیں۔''

کل کیس پر روشنی ڈالتے ہوئے مرتضیٰ قریشی اور جرنلسٹ غیور کے بارے میں جج کے الفاظ سخت تھے:

''شان الٰہی جس کی نظر میں جرم کا امکان تھا اور جو جانتا تھا جرم چھپا رہے گا وہ غائب ہے۔ غیور جس نے اس جرم پر ملزم تلمیذ الرحمٰن کو اُکسایا، اور جسے عدالت میں کسی اسٹیج پر طلب

نہیں کیا گیا اس کا پتہ نہیں۔

مرتضیٰ قریشی جن کی قانون سے واقفیت نے ارتکاب جرم کے تار و پود بنے یعنی شانِ الٰہی کے پروگرام کو ممکن سے فول پروف (ناقابلِ خطا) بنا دیا ان کی ذہانت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ انہوں نے بظاہر ایک بھی قدم ایسا نہیں اٹھایا جو قانون کی گرفت میں آتا ہو۔

ایک اور مجرم معمولی سزا کے بعد چھوڑ دیا گیا: اس کے ماضی کو عدالت سے چھپایا گیا کہ وہ جعلی ڈگریوں کے لیے بلینک اسناد، جعلی لیٹر ہیڈ، اور لفافے بھی چھاپتا رہا ہے جو نااہلوں کو اہل بنانے کے مصرف میں آتے ہیں اور خفیہ سیاسی پمفلیٹ، رسالے اور اشتعال انگیز پوسٹرز بھی۔

اس مقدمے میں سارا جرم ملزم تمیز الرحمٰن کے حصے میں آیا ہے جو ایک پڑھا لکھا شخص ہے جس کا تعلق ایک شریف پڑھے لکھوں کے خاندان سے ہے، جو آزادی کے بعد اس ملک میں اس طرح وارد ہوا کہ اس کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہاں اُس کی کفالت اس کا اپنا کاروبار کرتا رہا ہے جس کی نوعیت امپورٹس ایکسپورٹ کی ہے۔ کاروبار کی نوعیت ہی کی بنا پر اس کا اس جرم کے پلان میں شرکت کے لیے اُن دو اشخاص نے انتخاب کیا تھا: ایک اس نے جو جانتا تھا گورمنٹ کے کس محکمے میں ایسی رقم موجود ہے جسے خورد برد کیا جا سکتا ہے اور دوسرا وہ جو جانتا تھا ذہن کو عمل میں لانے کے لیے کس تیسرے شخص سے کام لیا جا سکتا ہے۔ نئے ملک میں ایک تنہا شخص جس کے نہ رشتے دار وہاں ہوں نہ اپنا گھر بار کس حد تک ملنے والوں اور دوستوں پر بھروسہ کرنے لگتا ہے اس کا اندازہ بغیر تخیل کی وسیع پرواز کے کیا جا سکتا ہے۔ اپنی سادہ لوحی کی بنا پر اس تیسرے شخص نے اس مشکوک بزنس پلان کا حصہ بننا منظور کیا جس کا اسے اعتراف ہے۔ اس میں اس کی مالی پریشانی نے بھی حصہ لیا ہوگا، لیکن اُسے پورے طور سے اس پلان کی پیچیدگی سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا کیونکہ اس تمثیل کے باقی تمام افراد ایسے کام کا تجربہ رکھتے تھے۔ اُس کا ایک معمولی کردار ہے اس کا اُسے یقین دلایا گیا تھا اور اُس کا ان تجربہ کار افراد پر اعتماد تھا — بلکہ اعتماد کا نہ ہونا تعجب کا باعث ہوتا۔

ان ڈراماٹس پرسونی (dramatis personae) میں سرفہرست نام اس ذہن کے

مالک کا ہونا چاہیے جسے علم تھا کہاں سے گورمنٹ کی ایک بڑی رقم کا جسے صرفے میں نہیں لایا جارہا ہے خاموشی سے سرقہ کیا جاسکتا ہے، جس نے پلان تیار کیا تھا یہ کا خیر کیسے انجام دیا جاسکتا ہے۔ اس ڈرامے میں اس کی اہمیت بیک وقت ڈراما نگار، ڈائریکٹر اور مرکزی کردار کی ہے۔ باقی ٹیم اس نے جمع کی۔

دوسرا کردار بظاہر پورے جرم سے بے تعلق ایک فری لانس جرنلسٹ کا ہے جو نہ صرف جرم کی رپورٹنگ کرتا ہے، خود بھی جرائم میں حصّہ لیتا ہے۔ اس نے اپنے پیشے سے دُہرا استفادہ کیا ہے: جرم کا کہاں امکان ہے یہ اس کی پیشہ ورانہ مصروفیت کا حصّہ تھا۔ خود پر آنچ آتے دیکھ کر وہ پریس میں رپورٹنگ کرسکتا تھا کہ متعلقہ گورمنٹ کے شعبے میں نااہلیت کی بنا پر ایک بڑی رقم جو کام میں لائی جانے کے لیے تھی وقت ختم ہونے سے پہلے مصرف میں نہیں لائی گئی اور افسروں کی غفلت کی وجہ سے مسلسل ایک سازش کے تحت بڑے پیمانے پر خورد برد ہوتی رہی، اور ہورہی ہے۔ اس رقم سے مستفید ہونے والا خود اسی متعلقہ گورمنٹ کے شعبے کا عملہ ہے۔

تیسرا اہم کردار ایک قانون داں کا ہے جس پر ملزم کو مکمل اعتماد تھا کیونکہ وہ اس کی فرم کا بھی وکیل تھا۔ اسی نے ملزم کو یقین دلایا کہ کام لیت ولعل کا نہیں ہے، کر گزرنے کا ہے کیونکہ ایسے موقعے بار بار زندگی میں نہیں آتے ہیں اور اس کیس کے کبھی عدالت میں پہنچنے کا خطرہ نہیں ہے۔ وہ جرنلسٹ اور ملزم کا مشترکہ دوست تھا۔ ملزم کو یقین دلایا گیا تھا کیس اگر کبھی کھلا تو وہ اس کا قانونی دفاع کرنے کو تیار ہوگا۔

جرم کے پلان کا ایک اہم کردار ضابطہ پرنٹنگ پریس کا پروپرائٹر ہے جس کا کام ضابطے کے سوا سب کچھ ہے۔ بلینک اسناد کا چھاپنا جن پر نام ٹائپ کر کے جو چاہے خود کو اُس اعلیٰ سند کا حامل دکھا سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر اپنی پسند کی ملازمت، اسکولر شپ، بیرون ملک مزید اعلیٰ تعلیم اور ٹریننگ جو چاہے حاصل کرسکتا ہے۔ اس کے اس عمل سے حق دار محروم ہوں گے یہ کانٹا نہ اس کے ضمیر میں چبھتا ہے نہ اسناد چھاپنے والے کے۔ یہ پریس، اخذ کیا جاسکتا ہے، جعلی لیٹر پیڈ، اور لفافے بھی مخفی اغراض کے لیے چھاپتا رہا ہوگا جیسا کہ اس کیس میں ہوا۔ ایسے افراد

اور ان کے پرنٹنگ پریس کرنسی نوٹ بھی اور ڈر پر چھاپ سکتے ہیں۔ ضابطہ پریس کے پروپرائٹر مسرور بیگ کو ملزم تکمیلۃ الرحمٰن سے متعارف وکیل مرتضیٰ قریشی نے کرایا تھا جس کے لیے وہ ملزم سے کہہ چکے تھے اُن کے بھروسے کا آدمی ہے اور اس کے چھاپے ہوئے لیٹر ہیڈز، مختلف نوعیت کے فورمز، رسید بکس اور لفافوں کو دیکھ کر ان کے باہر کے نہ چھپے ہونے کا کسی کو شک نہیں ہوسکتا ہے۔

باقی افراد بینک مینیجر، بینک کلرک، کیشیئر اور پوسٹ مین اس کیس کے لیے غیر اہم ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا ان کی ملازمت کے زمرے میں آتا ہے اور انہیں عدالت میں پیش کیا جاچکا ہے۔ اُن میں سے کسی کا بیان اگر ملزم کے کردار پر روشنی ڈالتا ہے تو وہ پوسٹ مین محب علی ہے جس نے ملزم کو ایک ہمدرد انسان پایا۔

لیکن جب کیس پر سے پردہ اٹھا تو جو سامنے آیا وہ یہ تھا کہ جرم کا اصل مرتکب جس کے حصے میں جرم کی رقم کا سب سے بڑا حصّہ آیا تھا کہیں غائب ہو چکا تھا اور اغلب یہ ہے ملک سے باہر جا چکا ہے۔

جرم کے دوسرے اور تیسرے شریک جرنلسٹ عبدالغفور اور ملزم کی فرم کے قانونی مشیر اس وجہ سے قانون کی گرفت سے بچے رہے کہ ملزم اُن کی قابل یقین دھمکیوں کی بنا پر اُن کے خلاف زبان نہیں کھول سکا اور یہ دھمکیاں اتنی شدید تھیں کہ سابقہ عدالت کا فیصلہ سُن کر بھی اُسے خاموش رہنا پڑا۔ اُن دھمکیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مُنھ کھولنے پر اسے ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا جائے گا۔

رہا پریس کا مالک وہ حکومت کے خلاف پوسٹرز اور کتابچے چھاپنے کے ماضی کے باوجود ہمیشہ سے آزاد رہا ہے اور گمان کیا جاسکتا ہے صاحب وثوق ہے۔ بلینک جعلی اسناد، تعلیمی کنڈکٹ کے سرٹیفکیٹس، بیرونی فرموں اور ملکی سرکاری محکموں کی اسٹیشنری چھاپنا اس کے لیے کتنا آسان ہے اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے۔ تعجب ہے وہ اس سے بڑھ کر کارہائے نمایاں انجام نہیں دے سکا ہے جن میں اعلیٰ کارکردگی کے تمغے زندوں اور مردوں کے لیے مضروب کرنا شامل ہوتا۔ لیکن یہ محاورہ اگر وہ ذہن میں رکھے تو اس کے نہ سہی سوسائٹی کے حق میں اچھا ہوگا: بڑے

سے بڑا تاش کا جواری بھی ایک دن پتوں ہی سے مُنھ کی کھاتا ہے۔

جب تک وہ فرد عدالت کے سامنے پیش نہ کیا جائے جس کے ذہن میں غبن کی اس سازش کا اولین خیال آیا تھا، جس نے اُسے منصوبے کی شکل دی اور بالآخر کارآمد افراد کے مجرمانہ تعاون سے حکومت کو ایک کثیر رقم سے محروم کیا گیا جس تک صرف اس کی رسائی تھی تب تک عدالت مقدمے کو اس کے حتمی اختتام تک پہنچانے سے قاصر ہے۔ اس مفرور فرد کا جرم ہر ہر قدم پر forgery (جعلسازی) کے ذیل میں آتا ہے۔ ایسی جعلسازی جس کا مقصد دھوکا دینا تھا۔ اس عمل کے لیے گورمنٹ کی seal (مہر) استعمال کی گئی۔ یا یہ کہ اس نے جعلی seal (مہر) بنوائی جو اس کی تحویل میں تھی اور اس سے اس نے دھوکا دہی کی۔

فورجری، جعلسازی برائے دھوکا دہی، جعلی دستاویز (document) کا تیار کرنا، اُن پر دھوکا دہی کے لیے جھوٹے دستخط کرنا ان جرائم کے لیے عدالت مفرور ملزم کو سات سال تک کی قید اور جرمانے کی سزا دینے کی مجاز تھی۔ جس فرد کی گورمنٹ seal (مہر) تک رسائی تھی، جسے اس نے دھوکا دہی کے لیے استعمال کیا، جس کے لیے اُسے عمر قید کی سزا ہو سکتی تھی وہ قانون کی نظروں سے اوجھل ہے۔ اس کا رول اس کیس میں اپنے بھروسہ کرنے والے ایک سینئر گورمنٹ افسر پر جو دیانت دار بھی تھا، عبادت گزار بھی اور رٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ رہا تھا اُس وزیر سے کم نہیں جو تخت پر قبضہ کرنے کے لیے اپنے رحمدل، منصف اور خود اس پر احسان کرنے والے بادشاہ کو زہر دے دیتا ہے۔ یہ امر افسوسناک ہے کہ اس سازش کی بنا پر مرحوم سید نور الدین کو رٹائرمنٹ کے بعد عدالت میں گھسیٹا گیا۔ جب تک اصل مجرم عدالت کے سامنے نہ آئے ملزم تملید الرحمٰن پر جرم کی تمام یا بڑی ذمے داری عائد نہیں کی جا سکتی ہے۔

جج کے آخری الفاظ تھے "The appellant is acquitted"

تملید جو ہمیشہ سے خوف اور گہرے جذبات سے دوچار ہونے پر دل کے تیز دھڑک اٹھنے سے ڈرتا آیا تھا اور اسی وجہ سے چائے پینے تک سے انکار کر دیتا تھا فیصلے کے ایک ایک لفظ کو تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل سے سنتا رہا تھا۔ فیصلے کے آخیر تک پہنچتے پہنچتے اسے لگا ٹانگیں

پگھلے موم کی طرح اُسے سنبھالے رکھنے کا کام چھوڑتی جا رہی ہیں۔ جج کے آخری الفاظ اس نے ڈوبتے ہوئے دل، ڈوبتی ہوئی سماعت، بجھتی ہوئی آنکھوں کی روشنی سے سنے۔ اس کا سر کٹہرے کی ریلنگ پر خود بخود جھک گیا اور ہاتھ اس کے ڈنڈوں پر سے پھسلتے ہوئے نیچے جا پہنچے۔

جب فتی نے اُسے سنبھالا تو وہ جانتا تھا وہ بے ہوش نہیں ہے صرف سر سے بہہ کر آنکھوں تک آ جانے والے پسینے نے اس کی بصارت دھندلا دی ہے۔

ہوا س درست ہونے پر اس نے فتی سے کہا: ''فتی بھائی کبھی میں تمہاری، جج عبدالقدیر صاحب کی اور ان ایمان کے پتلے جج صاحب کے احسان کو بھول سکوں گا!''

اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا وہ ایک اور ہستی کا نام نہیں لے رہا ہے جس نے اس کے لیے اتنے سالوں دوڑ بھاگ کی ہے۔

(۴۰)

اس موقعے پر خدا سے توبہ تلا کے بعد تمیز بمشکل چھوٹا تھا کہ ایک اور پارٹی نے اُسے ڈھونڈ نکالا۔ حقیقت میں بغیر جانے وہ ان کی تلاش میں تھا اور وہ اس کی۔

اُن کا کام افیون اور چرس کی سپلائی تھا — معدن سے ملک کے مخرج تک۔ یعنی ایک سرحد سے دوسری سرحد کو اور وہاں سے یہ ملکی پیداوار دساور کھیجی جاتی۔

پہلے ہی ٹرین کے ٹرپ کے بعد تمیز نے اُن سے کہہ دیا: ''اس کام میں خطرہ زیادہ ہے اور آمدنی کم۔''

انہوں نے کہا ''ہائی اسپیڈ سے آنے والی زیادہ آمدنی کے لیے۔ یہی مال عرب لے جاؤ، یا سنگاپور۔ بہت جلد تمہارا ایکسپورٹ امپورٹ کا اوفس ہوگا، ویسا نہیں جیسا اب ہے: ایک کھٹارا ٹائپ رائٹر، اولڈ ڈیزائن کا ٹیلی فون اور ایک آدمی کا اسٹاف جو دفتر کھولتا ہے، میز کرسی جھاڑتا ہے، جھاڑو دیتا ہے، تمہاری غیر حاضری میں ٹیلی فون کرنے والے کا نمبر نوٹ کرتا ہے اور ہوٹل سے چائے کے چار چکر دن میں لگاتا ہے۔ بس! ہم سب دیکھ چکے ہیں۔ سعودی عرب کے چار چکروں کے بعد کسی کمرشل بلڈنگ میں تمہارا شاندار ائرکنڈیشنڈ اوفس ہوگا۔ الیکٹرونک ٹائپ رائٹر، انٹرکوم، انگریزی میں بات کرنے والی اسمارٹ سی ٹائپسٹ، کلرک، فائلنگ کیبینیٹ، چپراسی اور یہ اور وہ کرنے والا دوسرا اسٹاف۔ اور — سمندر کے کنارے اپنی ہٹ۔ چاہے اس میں اپنی

سیکریٹری کو لے جاؤ چاہے اگر زیادہ پرانی نہیں ہوئی ہے تو بیوی کو۔"

تلمیذ نے ان کا پیش کیا ہوا اسٹیٹ ایکسپریس سگریٹ جس کے اس نے بس دو کش لیے تھے ایش ٹرے میں ٹھونسا اور اسکاچ اور سوڈا کے تین چوتھائی گلاس کو پرے کر کے کہا: "اور جب میرا سر لکڑی کے کندے پر رکھا جائے گا اور تیغا ہاتھ میں لیے جلاد میرے سر پر کھڑا ہوگا تو وہ دفتر اور گھر خون کے ساتھ بہہ جائیں گے۔ نہیں صاحب۔ میری زندگی بے کار گئی ہے لیکن اتنی بے کار بھی نہیں ہے جتنی آپ سمجھتے ہیں۔ میں اصولوں کا آدمی ہوں۔"

حقیقت میں کسی کی اتھورٹی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ کہتا تھا: اگر جنت میں بھی جاتا ہوا تو یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا کہ سنوں یہاں سے قدم باہر مت نکالنا، اور کوئی حور بھی مجھ سے بدتمیزی سے بات کرے۔ جب ماں، باپ، بڑی بہن اور جلے دل بہنوئی کے حکم کو نہیں مانا تو—

شراب اور سونے کی اسمگلنگ کے لیے وہ ناموزوں شخص سمجھا گیا کیونکہ جو اس سے کام لینے جانتے تھے وہ آزاد شخصیت کا آدمی تھا: جیسا آدمی اُن میں سے ایک نے کہا تھا 'سیاست کے لیے بھی موزوں نہیں ہوتا ہے۔' جعلی دوائیں بنانے والے نہ اس کی سمجھ میں آئے نہ یہ ان کی۔ جعلی نوٹ چھاپنے اور سپلائی کرنے والوں میں بھی اسے دلچسپی نہیں ہوئی۔ خطرہ بہت تھا۔ پھر یہ سب ٹیم ورک تھے اور تلمیذ تنہا کام کرنے والا آدمی تھا۔ اپنے لیے وہ کہتا تھا: میں رونل بنگال ٹائیگر۔ ہوں، افریقہ کا شیر ببر نہیں جو مل کر شکار مارتے ہیں۔ میں اکیلے ہر کام کرنے کا بوتا رکھتا ہوں۔

معمولی کام وہ ہاتھ میں نہیں لیتا تھا اور بڑے کام خطرے سے بھرے تھے۔ پھر وہ چاہتا کیا تھا؟ دن بھر تھک کر شام کو آرام سے گھر بیٹھنا۔ اس کا پرانا بار بار آنے والا خواب: مکمل گھر: بیوی بچوں والا گھر، ایک بی کلاس ہوٹل کا تیسری منزل پر کمرہ نہیں جس کا خرچہ بہت تھا اور اس سے ملنے والا سکھ بہت کم۔ اپنا علیحدہ ٹوئلیٹ بھی نہیں۔ ایسی جگہوں میں وہ جنہیں امپورٹ ایکسپورٹ کی دنیا میں او۔ جی۔ ایل کہا جاتا ہے جو چاہے امپورٹ کرے، بلائی جاسکتی ہیں، کسی

کو بیوی بنا کر اس میں نہیں رہا جا سکتا ہے۔ آرزو رومانٹک لفظ ہے، جو چیز اس میں تھی وہ تھی خواہش۔ پوچھا جاتا: جیسا گھر تم سے چھڑوا کر تمہیں نئی برطانوی راجدھانی بھیجا گیا تھا، تو باوجود بات کے حقیقت کے نزدیک ہونے کے، وہ 'نہ' کہہ دیتا۔

باپ کے اُسے بڑی بہن کے گھر جلا وطن کر دینے نے اُس گھر کو ڈھا دیا تھا۔ آج وہ جہاں تھا وہاں آزادی ہی آزادی تھی۔ ایسی آزادی جو نہایت سردی کے دن جسم کو ٹھنڈی ہوا کی طرح لگتی تھی۔

ان سب باتوں میں بڑا الجھاؤ تھا جنہیں دماغ میں گھومتے پھرنے کی آزادی دینے سے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔ اس کے منھ سے کئی دفعہ نکلا تھا: میں بس آرام کی زندگی چاہتا ہوں، اچھی آمدنی، اچھا مکان، اچھی بیوی اور اچھے بچے جو تنگ نہ کریں اور جن کے جائز مطالبات کو وہ پورا کر سکے۔

اُن دنوں وہ کسی حد تک قناعت پسند تھا: یہی ایک کمرے کا اوفس کسی مرکنٹائل بلڈنگ میں ہو، پڑھا لکھا کلرک جو خط ڈرافٹ کر سکتا ہو، ٹائپ جانتا ہو اور خط وکتابت سنبھال لے، ایک چپڑاسی۔ گھر، باقاعدہ گھر لیکن اس طرح کہ کسی عدالت میں اس کا کیس نہ چل رہا ہو اور گزارہ واقعی اپنی کی ہوئی امپورٹ پر ہو، ایکسپورٹ ہو نہ ہو۔ یہ نہیں کہ مال کی جگہ لائسینس بیچ لیا، بھاگ دوڑ اور سرمغزی سے بچ گئے۔ اس رقم پر جینے کی کوشش کرتے رہے، مع گھٹیا قسم کی عیاشی کے، اور جب وہ رقم کم پڑنے لگی تو کوئی دھرم ایمان کا کام کرنے لگے مثلاً کسی کا مال بلیک میں نکالنے کا۔ اور وہاں سے وہ دنیا شروع ہوجاتی ہے جو نیچے کی دنیا کہلاتی ہے The Under world۔ وہ جانتی ہے اس کے مختلف شعبوں کے لیے کون موزوں شخص ہے اور تلمیذ کی زندگی کی تلخ حقیقت یہ تھی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس دنیا میں پہچانا ہوا شخص تھا۔ جیسے انہیں پتہ چل جاتا ہے، وہ خود سے کہتا تھا 'توبہ کرنے والے کے پاس پیسے ختم ہوگئے ہوں گے۔ اس وقت اُسے آسانی سے توبہ کے قعر سے نکالا جا سکتا ہے۔'

کیس ختم ہونے کے بعد جب جب امینہ تلمیذ سے ملنے گئی اُسے وہ بجھا ہوا نظر آیا۔ ایسا شخص جس سے اس کی پہلے واقفیت ہی نہیں تھی۔ اپنی میز پر خاموش بیٹھا رہتا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر، اگر اکیلا ہو اور کسی کے اچانک آ جانے کا امکان نہ ہو اس کے دونوں بازوؤں کو پکڑ کر اس کی آنکھوں میں دیر تک دیکھتا رہتا۔ وہ پوچھتی: ''کیا تک رہے ہو؟ میں بدل تو نہیں گئی۔''

''جانتا ہوں اگر ایک بار نہیں، دس بار بھی مجھے جیل میں ڈالا جائے تم نہیں بدلو گی۔''

امینہ برقع پہنے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتی۔ وہ چائے اور کھانے کو پوچھتا۔ وہ اگر اس کی خواہاں بھی ہوتی تو بھی نفی میں سر ہلا دیتی۔ پھر بھی وہ دونوں میں سے ایک منگوا لیتا۔ لیکن اس کی خاموشی نہیں ٹوٹتی تھی۔ وہ جانتی تھی سمندر کنارے کی پارٹیوں اور کشتی کی سیر کا وقت گزر چکا ہے۔ ریستورانوں اور بوکس میں بیٹھ کر فلم دیکھنے کا بھی۔ وہ جب آتی اپنے کپڑوں کا جائزہ لے کر آتی کہ ان میں کوئی ایسا تو نہیں جسے دیکھ کر تلمیذ کو احساس ہو عرصہ سے سوٹ کا کپڑا انہیں نے کر دیا ہے۔ سلیم بھی کبھی ساتھ نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن باوجود ضبط کرنے کے وہ پوچھ ہی بیٹھی: ''تم اتنے پریشان کیوں نظر آتے ہو؟''

تلمیذ خاموش رہا۔ اس کا سگریٹ جلتے جلتے پوروں تک پہنچ چکا تھا جو پہلے ہی گہرے پیلے رنگ کے تھے۔ امینہ نے اٹھ کر ٹوٹے کو انگلیوں سے لیا اور چٹکا لگنے پر اوما، کہتے ہوئے اُسے ایش بول میں ڈال دیا۔

بولی: ''تمہاری انگلیاں جل جاتیں۔ اتنے کھوئے کھوئے کیوں رہتے ہو؟''

تلمیذ نے گہری سوچ سے نکلتے ہوئے کہا: ''زبردستی عبادت کرانے والوں کے بیر میں مذہب ہی چھوڑ بیٹھا۔ میں نے عہد کر لیا ہے اب گناہ کی زندگی چھوڑ دوں گا۔''

چونک کر امینہ نے کہا: ''یعنی میرے کو؟''

''میں اب اپنی زندگی درست کرنے کے پھیر میں ہوں۔''

''مجھ سے بھی نہیں ملو گے! میں تمہارا گناہ ہوں؟'' اس کی آنکھوں میں آنسو پھوٹ آئے لیکن بہے نہیں۔

''میں اس دوڑ بھاگ کی زندگی سے تھک چکا ہوں۔''

''مجھ سے ملتے رہو گے؟''

''نہیں شادی کر رہا ہوں۔ ہو سکے تم بھی شادی کر لو۔''

اچانک مرضی کے خلاف اُسے ناصر کی بات یاد آ گئی: 'اس سے شادی کا ارادہ ہے؟' اور اس کے چپ رہنے پر اس کا کہنا 'پھر اس سے کام بھی مت لو۔' آج بھی تملید کو اس دن کی طرح جھرجھری آ گئی۔ دونوں گم صم ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جب باہر نکل رہی تھی تملید کے دماغ میں ایک ہی خیال تھا: وفادار ہے۔ اور یہ خیال آنے والے دنوں میں 'وفادار تھی' میں بدل جاتا تھا۔ پھر: 'پتہ نہیں اب کہاں ہے؟' 'میں۔ مر مرا گئی ہوگی۔ کمزور تو تھی ہی۔ ایسی عورتیں کہاں بوڑھی ہوتی ہیں! کوئی بیماری لگ گئی ہوگی۔ نہ علاج کے لیے پیسے ہوں گے نہ خوراک کے۔ شاید بہنوں کے علاوہ اس کا اپنا کوئی رئیس جیتا نہیں تھا۔ شوہر تو شک ہی ہے تھا بھی یا نہیں۔ صحیح پتہ ہی نہیں چلا تھی کون! وفادار تھی۔ اپنی عزت پر کاربند۔ میں دے دیتا تھا وہ مانگتی نہیں تھی۔ اگر میں اس سے شادی کر لیتا تو دونوں کی کسی اور طرح کی زندگی ہوتی۔'

'پتہ نہیں زو ونیک کے کس مہینے کی پیدائش تھی۔ کبھی پوچھا ہی نہیں۔ اس کے دو ہاتھ ہزار بار ہاتھوں میں لیے لیکن لکیریں دیکھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔'

اندر کی آواز نے لتاڑا: 'غلط۔ ساتھ زندگی گزارنے کا کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ پھر کیا ریکھائیں دیکھتے۔'

(۴۱)

جب تکمید نے اپنی روشن آرا آپا کو شادی کی خواہش کا خط لکھا کہ ہوٹل میں زندگی گزارنے سے تنگ آ گیا ہوں، اب گھر بنا کے رہنا چاہتا ہوں تو انہوں نے خوشی سے بھرا خط لکھا جس کے آخر میں تھا: لڑکی کا ستارہ تو دیکھنے نہیں بیٹھ جاؤ گے؟

اس نے خط ملنے کے آدھ گھنٹے کے اندر اندر اس کا جواب لکھ ڈالا: جو بھی لڑکی آپ میرے لیے چنیں گی اس کے لیے ابھی سے ہاں ہے۔ نہ اس کا ستارہ دیکھوں گا نہ ہاتھ۔ جانتا ہوں جسے آپ میرے لیے لائیں گی اس میں تھوڑی بہت آپ کی جھلک ضرور ہوگی۔ اس وقت میں زندگی میں پہلی بار کسی کے لیے یہ کہہ رہا ہوں: آسمان پر پاک ذات خدا کی ہے۔ اُس کی زمین پر آپ کی۔

میمونہ کے باپ ریٹائرڈ جج تھے لیکن ان کے روشن آرا آپا کے مرحوم شوہر تہذیب بھائی سے مراسم نہیں تھے، تھے تو ان کے دونوں بیٹوں کے۔ دونوں نے اُن سے کہہ رکھا تھا بہن کی شادی اگر آپ یا بھابھی کرا سکیں تو ہوگی۔ ہمارے رشتے دار یہاں آئے ہی نہیں جو یہ کام وہ کرواتے یا خود اُن میں سے کسی کے گھر اس کے لیے لڑکا نکل آتا۔

تہذیب بھائی دنیا سے جاتے جاتے اپنی تمام ذمے داریاں روشن آرا آپ کو سونپ

گئے تھے اور جب انہیں تملیذ کا دوسرا خط ملا کہ نہ وہ شادی سے پہلے دلہن کا ستارہ دیکھے گا نہ شادی کے بعد اس کا ہاتھ تو انہوں نے جو لڑکی ان کی نظر میں تھی اس کے بھائیوں کو بلا کر پوچھا: ''میمونہ کی شادی کا کیا پروگرام ہے؟''

انہوں نے کہا ''ابھی تک تو پتہ نہیں ہے۔ اس کے پروگرام میں البتہ اگلا کام ہے ایم۔ اے پارٹ ٹو کرنا۔ پھر نوکری۔ جس کے لیے وہ کہتی ہے اگر آپ نے اجازت دی تو۔''

انہوں نے سراہنے والے لہجے میں کہا ''پڑھنے کی شوقین ہے۔'' پھر تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد بولیں ''انگریزی میں پارٹ ون کیا ہے، سائنس کے کسی سبجیکٹ میں نہیں۔ گھر بیٹھے بیٹھے پارٹ ٹو تو شادی کے بعد بھی کر سکتی ہے۔''

وہ ان کی بات توجہ سے سن رہے تھے اور اگلی بات سننے کے منتظر تھے۔

''میری نظر میں اس کے لیے بر ہے۔ میرا رشتے کا دیور ہے۔ مگر وہ صرف بی اے ہے۔''

دونوں ہنس پڑے۔ جو بڑا تھا اس نے کہا ''آپ کی نظر میں جو بر ہے وہی اس کے لیے درست ہے۔ ہم ان معاملوں میں آپ سے بہتر نہیں سوچ سکتے ہیں۔''

وہ جانتی تھیں لڑکی سے زیادہ دونوں بھائیوں میں سے جو بڑا تھا اس کی شادی کی عمر نکلی جا رہی تھی لیکن جب تک بہن کی شادی نہ ہو جائے اُن دونوں کا ارادہ کنوارے رہنے کا تھا۔

جج صاحب اسی کوٹھی میں رہتے تھے جس میں ان کی اپاہج بیوی۔ دونوں بیٹے اور بیٹی، لیکن اس طرح کہ کمروں اور لون کی آدھوں آدھ تقسیم ہوئی تھی۔ بیچ کے دروازے سدا بند رہتے تھے اور درمیان کی لون کی باڑ اتنی اونچی رکھی گئی تھی کہ اگر جاڑوں میں اپاہج بیوی کا پلنگ دھوپ میں بچھایا جاتا تو وہ انہیں نظر نہ آتیں۔ اپنے حصے میں وہ دوسری جوان بیوی کے ساتھ رہتے تھے۔

لڑکوں نے بہن کی شادی کی ہر منزل پر باپ کو آگاہ رکھا: ایک پیغام آیا ہے، اپنے شہر کا ہے، سُنی — لیکن کٹر نہیں ہے، اردو بولنے والا، بزنس ہے، آمدنی معقول ہے۔ ماں باپ نہیں ہیں، بہن بھائی یہاں نہیں آئے۔

ہر مرتبہ انہوں نے سر ہلانے پر اکتفا کیا اور اگر لون میں بیٹھے تھے تو اٹھ کر اندر چلے گئے۔ اگر

بات کمرے میں ہوتی تو ہوں کر کے بیٹوں کو ہاتھ سے چلے جانے کا اشارہ کرتے۔

آخری مرحلے پر مکان کے اس حصے میں اندھیرا تھا۔ ایک دو دن کے لیے کہیں اور چلے گئے ہوں گے۔

شادی کی پہلی رات کے لیے تکمید کے ذہن میں وہ مکالمہ تازہ تھا جو حسن وارد نے اپنی اس فلم کے لیے لکھا تھا جو اس کی فلمی زندگی کا آغاز کرتی۔ مکالمہ ہیرو کے لیے تھا، سارا سین یوں تھا: دلہن مسہری پر سر جھکائے بیٹھی ہے۔ دولہا جس کا دل دکھا ہوا ہے کہ گھونگھٹ میں وہ چہرہ نہیں ہے جو کہ لے جاتے ہوئے کہیں اوپر کی ایک کھڑکی میں نظر آتا تھا۔ وہ چہرہ جس کی قسمت کا تھا اس کا ہو چکا ہے۔ اس وقت اس کے برابر میں جو مسہری پر ہے اس کا فوٹو تک اُسے نہیں دکھایا گیا تھا۔ نہ اس نے مانگا تھا کیونکہ کسی اور چہرے کا اس پر جادو نہ چلتا۔

گھونگھٹ اٹھانے سے پہلے وہ کہتا ہے: تم جو بھی ہو میں نے تمہیں سویکار کیا۔

اور جب گھونگھٹ اٹھانے پر بھی لڑکی یا عورت نے آنکھیں نہیں کھولیں تو اس نے اپنا جملہ مکمل کیا: تم چاہو تو میں جو بھی ہوں، مجھے سویکار کر لو۔

گھونگھٹ اٹھانے پر تکمید نے فیصلہ کیا: خوبصورت نہ سہی پیاری شکل کی ہے، معصومیت کی تصویر۔ لیکن چومنے کے لیے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہونٹوں سے نزدیک لاتے ہوئے اسے دھکا لگا — ناخن بجائے باہر کی طرف ننھے چاند کی طرح خمیدہ ہونے کے اندر کی طرف نصف دائرے میں چلے گئے تھے، جیسے زندگی میں صرف ایک ہی کام کرتی رہی ہے — برتن مانجھنے کا۔

تھوڑی ہی دیر میں اسے اندازہ ہو گیا ایڑیاں ملائم نہیں تھیں۔ کھردری اور پھٹی ہوئی تھیں اور پیر کے ناخنوں میں تھوڑی سیاہی بھی تھی جسے مہندی چھپا نہیں پائی تھی۔

جس کمائی نے تمیز کو جیل میں پہنچایا تھا، جیسا کہ بارہا اس کے دماغ میں آیا، اس کے
کام نہ آئی۔ خاص طور سے زندگی کے اس دور میں جو گھر بنا کے رہنے کا تھا۔
روشن آرا آپا کا خط آنے پر کہ لڑکی میں نے دیکھ لی ہے اور اس کے لیے ہاں بھی کر دی ہے اس
کا پہلا ردِعمل تھا: یہ میں کیا کر بیٹھا! اب بیوی کو کیا سر پر بٹھاؤں گا یا اسی ہوٹل کے کمرے میں
سہاگ رات ہوگی! شادی کا تمام خرچ، وہاں سے یہاں لانے کا خرچ کہاں سے آئے گا! بیوی
ہوگی یا محبوبہ کہ کہیں چائے پلا دی، کبھی سمندر کے کنارے لے جا کر ناریل کا پانی یا ملک شیک پلا
کر ٹرخا دیا! ان دنوں واقعی اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔" اس سے بھی کہیں زیادہ، وہ
سوچتا' جب پتہ چلا تھا پولس جعلی امپورٹ کا تو۔ پا گئی ہے۔ کسی دم میں نازل ہونے والی ہے۔"
لیکن جب روشن آرا آپا سے دو تین بار شادی کی تاریخ بڑھوا لینے کے بعد وہ میمونہ کو
اپنے شہر کے ریلوے پلیٹ فورم پر سیکنڈ کلاس کے ڈبے سے لے کر اترا تو وہ دوسرا ہی تمیز تھا۔
ایسا شوہر جس کے چہرے پر نئی دلہن نے پریشانی کی جگہ خود پر اعتماد دیکھا۔
دونوں کو ٹرین سے اتارنے کے لیے نہ رشتے دار آئے تھے، نہ دوست۔ لیکن ان باتوں
کی اسے کب پرواہ تھی۔

روشن آرا آپا کے شہر سے بیاہ کر لانے کے بعد جو چھوٹی سی تقریب تمیز نے خود سے
زیادہ میمونہ کا دل رکھنے کو کی تھی، ان میں اس کے نئے دوست تھے اور بزنس کی دنیا کے ملنے
والے، لیکن نہ رشتے دار تھے نہ پرانے دوست سوائے انکم ٹیکس پلیڈر ماہر علی کے۔ وہ سنہری کاغذ
میں لپٹے ہوئے دو تحفے لے کر آیا تھا۔ ایک کارڈ بورڈ کے ڈبے میں تھا، دوسرا املا تم تھا۔
"ایک تمہارے لیے ہے، دوسرا بھابھی کے لیے۔" اس نے دونوں کو تحفے تھماتے ہوئے کہا۔ پھر
بغیر میمونہ کی طرف دیکھے بولا: "مجھے بھی اب شادی کر لینی چاہیے۔ بھابھی سے سفارش کر دو
میرے لیے بھی کوئی ڈھونڈیں — اللہ میاں کی گائے۔ میرے لیے بھی لڑکی ڈھونڈنے والا کوئی

نہیں ہے۔"

دعوت کے بعد جانے والوں میں سے وہ آخری تھا۔ "بھلا آدمی ہے۔" تلمیذ کے منھ سے نکلا۔
میمونہ نے ہنس کر کہا "سفارش کر رہے ہیں؟ خیال رکھوں گی۔"

اندر جانے پر دونوں تحفے دیکھنے میں لگ گئے۔ کس نے کیا دیا ہے۔ میمونہ پوچھتی جارہی تھی "یہ کون ہیں؟" اور تلمیذ کے بتانے پر "اچھا وہ" کہہ کر تحفہ رکھ دیتی تھی۔ یا "وہ کون؟" پھر ایک تحفہ اس نے اٹھایا "یہ کون ہیں؟"

تلمیذ نے کارڈ پر نظر ڈالتے ہوئے حیرت سے کہا "یہ یہاں کب آئے تھے؟ میں نے نہیں دیکھا۔"

میمونہ نے کئی بار پوچھا "کون؟" لیکن تحفے کو ہاتھ میں تھامے تلمیذ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
"تم نہیں سمجھوگی۔ ایسا آدمی جو تعلیم کے زمانے سے آج تک مجھ پر مہربانیاں کرتا آرہا ہے۔"
"فقتی! بس اتنا سا نام!"

"جانتا ہوں۔ باہر سے تحفہ دے کر چلا گیا۔ کبھی ملا دوں گا۔"
"مگر بس اتنا سا نام؟"

"اس سے زیادہ میں نے کبھی پوچھا نہیں۔ زیادہ بڑا نام چھوٹے آدمیوں کا ہوتا ہے۔"
میمونہ اس کے چہرے کو جذبات سے پُر نظروں سے دیکھتی رہی۔"

میمونہ جس گھر میں وارد ہوئی اس کی ہر چیز نئی تھی اور اس کے ہر کمرے میں وہ خوشبو بسی ہوئی تھی جو نئے فرنیچر اور اس سے بڑھ کر نئے ریڈیو وغیرہ سے اٹھتی ہے جسے اسی دن پیکنگ سے نکالا گیا ہو۔ تین اور چیزوں سے یہی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ہیئر ڈرائر، کیونکہ اس نے سُن رکھا تھا لڑکی کے بال لمبے ہیں، بجلی کی استری اور ٹوسٹر سے۔

مکان چھوٹا سا تھا، نیا بنا ہوا، تلمیذ شاید اس کا پہلا کرائے دار تھا۔ اس میں وہ سب سامان موجود تھا جس پر تلمیذ سے زیادہ اس کا دفتر کا چپڑاسی جانتا تھا نئی گرہستن کی نگاہیں آتے ہی پڑیں

گی۔ ایک چوڑی مسہری اور وہ سب کچھ جو اس کے اوپر ہوتا ہے، کھانا پکانے کے برتن، آٹے کا کنستر، مسالوں اور نمک کے لیے چھوٹے بڑے ڈبے، بالٹی، ڈونگا، گھڑے، صراحی، مٹکے۔ شادی کے لیے روانہ ہونے سے پہلے جب وہ نیا گھر دیکھنے گیا ان سب چیزوں کو اس نے موجود پا کر تمیز چونک پڑا تھا کہ اگر یہ سب یہاں نہ ہوتا تو نئی زندگی کا کام کیسے چلتا!

چپڑاسی نے کنستر اور بڑے ڈبوں کی طرف اشارہ کر کے کہا: "ان میں تھوڑا آٹا اور چاول بھی ہیں۔ بیگم صاحب آ کر ان چیزوں کو کھولیں گی۔ دالیں بھی ہیں — تھوڑی تھوڑی، اور چائے کی پتی اور شکر۔"

تمیز نے خفیف ہو کر کہا "بہت عقلمند ہو۔"

اس نے کہا "صاحب بیوی بچوں والا ہوں۔"

تمیز خود صرف ڈنر سیٹ، کانٹے چھری اور چائے کے برتن لایا تھا، ڈرائنگ روم کا مختصر سا فرنیچر اور لکھنے پڑھنے کی میز اور دو کرسیاں۔

جب وہ پورا مکان میمونہ کو دکھا چکا تو آخری کمرے میں پہنچ کر میمونہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا: "بغیر سامان کے کتنا خالی خالی لگتا ہے۔" پھر گھبرا کر بولی: "اصل میں بھائی جان اور بھائی صاحب —"

تمیز نے اس کی بات کاٹ کر کہا: "یہی کیا کم ہے کہ ایک بے گھرے کو انھوں نے اپنی بہن دے دی۔"

گھر میں تھوڑی دیر ادھر ادھر پھرنے کے بعد اس نے میمونہ سے کہا: "گھر میں سامان کی قلت کو دیکھ کر گھبراؤ مت۔ مجھے اس سے پہلے گھرداری کا تجربہ نہیں ہے۔ تم آ گئی ہو — گھر کی اصل مالک۔ — آہستہ آہستہ سب کچھ اپنی پسند کا لے لینا۔ یہ پردے بھی شاید بعد میں تمھیں —"

"نہیں خوبصورت ہیں۔ سب چیزیں اچھی ہیں۔" میمونہ نے کہا۔

''سب چیزیں؟ جو کچن میں ہیں وہ بھی؟''

''وہ سب سے بڑھ کر۔''

''وہ سب شریف کا جوڑا ہوا سامان ہے — میرا نہیں۔ میرا لایا ہوا نہیں۔'' اس نے میمونہ کی ناک پکڑ کر کہا۔ میمونہ جھینپ گئی۔

طویل سفر میں ریل کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے دو تنہا مسافروں کی طرح جو چپ بیٹھے بیٹھے اکتا کر ایک دوسرے سے بات کرنے لگتے ہیں، اکثر قطعاً ذاتی، جب میمونہ کے لیے تمکینہ کا چہرہ نامانوس نہیں رہا اور وہ جھاڑ پونچھ کر چیزوں کو صحیح جگہوں پر لگاتے ہوئے گنگنانے لگی تھی ایک بات اس نے ڈرتے ڈرتے ایک دم سے کہہ دیا ''آپ کا اپنا انٹروڈکشن بڑا عجیب تھا۔''

''پہلی دفعہ تھا نا۔ اس لیے جو سمجھ میں آیا کہہ دیا۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا تھا؟''

وہ بولی ''اتنی ہندی میں بھی جانتی ہوں، بلکہ تھوڑی بہت لکھ پڑھ بھی سکتی ہوں۔ میں تو آپ کو سویکار کر کے ہی اس گھر میں آئی تھی۔''

ایک دن بولی ''آپ شروع کے دنوں میں میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر خاموش ہو جاتے تھے۔ کیا پڑھتے تھے ان میں؟ سنا تھا آپ پامسٹ ہیں۔ لیکن آپ تو اس کی پشت دیکھتے تھے۔ اور پیروں پر پہلی رات کے بعد گال پھیرنے اور انہیں پیار کرنے سے جھجکنے لگے تھے — اتنی جلد! آپ کو افسوس تو ہوتا ہوگا کس سے شادی کر بیٹھا، ہوتے ہوئے بھی جس کے باپ شادی میں شریک نہیں ہوئے۔ بس سمجھ لیجیے اپنا ہی کام کرتی تھی اوروں کے گھر برتن مانجھنے نہیں جاتی تھی۔''

میمونہ نے تسلیم تھی، نہ بسم نہ بی رل آر۔ پھر بھی عورت کی جگہ جو تمکینہ کی زندگی میں خالی تھی اس نے آسانی سے لے لی۔ جتنی لڑکیوں عورتوں سے وہ نزدیک رہا تھا ان میں سب سے خوبصورت ہے اس میں اُسے شک نہیں تھا۔

تمکینہ نے کہا ''نہیں یہ خیال مجھے ایک لمحے کو بھی نہیں آیا تھا کہ تم دوسروں کے گھر برتن مانجھنے کو

جاتی ہو گی، جانتا تھا تم ایم اے کر رہی تھیں، انگلش میں۔ اب میری انگلش درست کیا کرو گی۔"

"اور کیا کروں گی؟"

"فرم کی خط و کتابت اور اگر سیکھ گئیں تو ٹائپ رائٹنگ کا کام بھی۔ تنخواہ دوں گا۔ مفت کام نہیں لوں گا۔"

"فرم کا پارٹنر نہیں بنائیں گے؟"

"وہ تو ابھی سے ہو۔ بلکہ پروپرائٹر۔"

"واہ اصل بات تو آپ ٹال ہی گئے۔"

"کون سی؟"

"ایڑیوں کے پھٹے ہونے کی۔"

"گھر میں ننگے پیر پھرنے پر کتنی دفعہ مار کھائی تھی؟"

"اور؟"

"ناخن چبانے پر؟"

"بالکل بھی نہیں۔" پھر اس نے شرارت بھرے انداز سے کہا "گھر میں ننگے پیر پھرنے کی عادت ابھی بھی ہے۔ جب آپ گھر پر نہیں ہوتے ہیں۔ ماریں گے تو نہیں؟"

ایک دن سونے سے پہلے حمید اپنی طالب علمی کی زندگی کی سیر میمونہ کو کرا رہا تھا کہ اس نے کہا "اور فتی صاحب۔ فتی بھائی اس کہانی میں کہاں آتے ہیں؟"

"ہا! کس حاتم طائی کا ذکر تم کر بیٹھیں۔ ویسے آدمی دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔" دیر تک وہ ان دنوں کا ذکر کرتا رہا۔ "مجھے ایک طرح کا فخر تھا میرے دوست فتی کے یہاں انگریز اور دیسی لوگ سب ہی آتے ہیں۔ سر گھٹوانے یا اُس پر پان بنوانے نہیں۔ انگریزوں سے وہ انگریزی میں بات کرتا تھا۔ اس کے سیلون کے بورڈ پر صرف Eurasian Haircutting Saloon لکھا تھا۔

وہاں سے میں نے دیسی عیسائی اور انگریز عورتوں کو بھی نکلتے دیکھا تھا۔
کئی دفعہ جی چاہا پوچھوں: فتی بھائی ان سفید عورتوں کے بال چھونے میں کیسے لگتے ہیں؟ میرا خیال تھا ملائم ریشم جیسے ہوتے ہوں گے۔

اس کا سیلون بہت صاف ستھرا رہتا تھا۔ وہ پورا علاقہ ہی صاف ستھرا تھا۔ یہ نہیں کہ فرش پر بال ہوا سے لوٹ رہے ہیں، بال کٹوانے والا بار بار سفید چادر کے نیچے سے ہاتھ نکال کر منھ اور کانوں پر بیٹھنے والی مکھیوں کو اڑا رہا ہے۔ حجام کو جب فرصت ملے گی فرش پر پھیلے ہوئے بالوں کی طرف توجہ دے گا۔ فتی کے سیلون میں ایک بوڑھا اسٹول پر بیٹھا نظر آتا تھا۔ گاہک کے جانے کے بعد وہ پھول جھاڑو سے بال سمیٹ کر اس کنستر میں ڈال دیتا تھا جو ایک چھوٹی میز کے نیچے چھپا رہتا تھا جس پر گلدان اور ایش ٹرے نظر آتی تھیں۔ مجال نہیں تھی ایک بھی مکھی اس کے سیلون میں داخل ہو کر آنے والے کے چہرے پر منڈلائے۔
ایک بار میں کہہ بیٹھا: 'فتی بھائی آپ کا حکم مکھیوں پر بھی چلتا ہے۔' وہ ہنس پڑے بولے 'صرف گھر میں نہیں چلتا ہے۔'
فتی دل کا بڑا آدمی ہے۔ مگر ابا اگر زندہ ہوتے تو ان کے سامنے فتی بھائی کہہ کر اس کا ذکر نہ کر پاتا۔ نہ بڑی آپا یا اُن کے شوہر کے سامنے۔
وہ کوٹھیوں بنگلوں سے دور کی دنیا میں رہتا ہے۔ میں اس سے لاکھ گنا باعزت زندگی گزاروں مصیبت میں مجھے امید رہے گی وہ میری مدد کو آجائے گا۔ صرف دعا کا تحفہ لیے نہیں، دھن کا بھی۔"

اندھیرے میں میمونہ کو احساس ہوا اس کی آنکھیں بھیگ گئی ہیں۔

آہستہ آہستہ دور دراز کے رشتے داروں نے آنا شروع کیا جن کی تعداد اتنے سالوں میں بڑھ گئی تھی۔ پچھلے چھوڑے ہوئے ملک سے آنے والے — کچھ وہاں زمینداری کا خاتمہ ہو جانے کی وجہ سے آتے گئے تھے کیونکہ نئے ملک میں اس کا امکان نظر نہیں آتا تھا کہ کبھی

زمینداری کا خاتمہ ہوگا، کچھ وہاں حاصل کی ہوئی اعلیٰ تعلیم کو نئے ملک میں کام میں لانے کے لیے جو وہاں کام میں نہیں آ رہی تھی۔

دوستوں کی تملید کی زندگی میں کبھی کمی نہیں رہی تھی۔ بڑی وجہ تھی اس کی حد سے بڑھی ہوئی خاطر مدارات کی عادت۔ نئے دوست، ملنے والے اپنی بیویوں کے ساتھ شام کو یا چھٹی کے دن صبح کو آ جاتے تھے۔ کچھ اپنی ماؤں کو بھی ساتھ لے کر آئے جو میمونہ کو منھ دکھائی دے کر جائیں، ساتھ ہی بہت سی دعائیں اور نصیحتیں بھی۔

شادی کی جلدی میں تملید نے جو آسانی سے مل سکا وہ مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ اور اتنی ہی جلدی میں جو سامان جمع کیا تھا وہ بس اتنا تھا کہ لیٹ لو، کھانا کھالو، بیٹھ کر اخبار پڑھ لو اور جو آئیں انہیں بٹھا سکو۔ ہوٹل کے کمرے میں جتنا سامان تھا وہاں کی گذران کا تھا۔ اس میں بھی فرنیچر اور پردے ہوٹل کے تھے۔ وہاں سے جو آیا اس میں تملید کے تن کے سوا جو چیزیں تھیں اُن میں پامسٹری، نمرولوجی، ایسٹرولوجی کی کتابیں اور کرسٹل گلاس، پھرت اور سلور کی ایش ٹریز تھیں۔

دونوں کے کچھ دن گھر کے لیے سامان خریدنے میں گزرے۔ میمونہ کو نیلا رنگ پسند تھا۔ اسی رنگ کا صوفہ سیٹ، پٹی اور پردے آئے۔ بعض چیزیں خریدنے میں تملید ہچکچایا اور میمونہ نے انہیں خریدنے پر اصرار نہیں کیا۔ جلد ہی بیٹھنے کے کمرے میں پینٹنگز کا اضافہ ہوگیا۔ تقریباً سب ہی السٹریٹیڈ رسالوں سے لی ہوئی تھیں جنہیں خریدنے کی نہ معلوم کب سے میمونہ کو چاہ تھی۔ ایک کتابوں کی الماری جسے بھرنے کے لیے تملید نے میمونہ سے رائے لی تھی - خود اس نے ان میں سے ایک کو بھی کبھی کھول کر نہیں دیکھا۔

اس کی دلچسپی کی چیز فش ایکوے رئیم تھا جو اس نے پہلی بار اندو رام رتنم کے بیٹھنے کے

کمرے میں دیکھا تھا اور تب سے اس کی چھپی ہوئی آرزو بنا رہا تھا۔ زندگی میں پہلا گھر اس کے بنا نامکمل رہتا۔ یہ بات اس نے میمونہ سے اس وقت کہی جب ایکوے رئیم والے اُسے ان کے بیٹھنے کے کمرے میں سیٹ کر رہے تھے۔ دونوں کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔ گلاس کا ٹینک اپنے پیڈسٹل پر جمایا گیا، پھر 'باتھ روم کدھر ہے؟' پوچھتے ہوئے وہ اس طرف چلے۔ میمونہ نے گھبرا کر کہا ''خسرو بھائی۔'' اور وہاں سے اُس کے نکل آنے پر وہ ربر کا پائپ اس میں لے گئے۔ ایک بار پھر دونوں کی دلچسپی ان کے کام میں تھی۔ آہستہ آہستہ ٹینک پانی سے تین چوتھائی بھر گیا۔ پھر اپنی لائی ہوئی چوڑی بوتل سے انہوں نے اس میں ننھی ننھی مچھلیاں چھوڑ دیں جو دونوں کو نئی جگہ میں خوش نظر آئیں۔

اُن لوگوں کے چلے جانے کے بعد دیر تک دونوں ٹینک کے سامنے ایک دوسرے سے جڑے کھڑے رہے۔

آنے والوں کو بھی یاد ہوتا گیا میمونہ نے ملنے جلنے کے کمرے میں کیا چیز جو اس دن لی تھی کہاں لگائی یا رکھی ہے۔ کئی ایک جان گئیں اس کی ڈریسنگ ٹیبل پر کیا کیا چیزیں کہاں کہاں کی ہیں۔ جو بے تکلف تھیں کہہ بھی بیٹھیں: بھئی کیوں نہ ہو امپورٹر کی بیوی ہے۔

ایک صبح، اتنی صبح بھی نہیں تھی، دروازے کی گھنٹی بجی، چھٹی کا دن تھا، تمیز گھر پر تھا۔ دروازے پر وہ شخص کھڑا تھا جسے تمیز بھک منگا، ناآسودہ مرد کہتا تھا اور جس کی عینک کے ہلکے سلیٹی لینس اُسے ناپسند تھے۔ پہلے وہ تمیز کے پہلو میں سے ہو کر گھر میں داخل ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے تمیز۔ میمونہ ناشتے کے برتن سمیٹ رہی تھی۔ نئے مہمان کو دیکھ کر جھجک کر کھڑی ہو گئی۔ ''تم نے شادی پر نہیں بلایا تو کیا ہوا۔ بھابھی کیوں تحفے سے محروم رہیں۔'' اس نے بڑھ کر میمونہ کے ہاتھوں میں اپنا ملائم بنڈل تھماتے ہوئے کہا۔

''مجھے معلوم ہے آپ ساڑی پہنتی ہیں۔ اسے پسند کریں گی۔''

تمیز نے میمونہ کے پاس آ کر کہا ''آپ مرتضیٰ قریشی ہیں — وکیل — کافی نامور۔'' لیکن نہ

مہمان سے پوچھا وہ کیا پینا پسند کرے گا نہ میمونہ سے کچھ کہا۔ کہا تو مرتضیٰ قریشی سے "کسے آنا ہوا؟"

"ارے بھئی مبارک باد دینے آیا ہوں۔" اس کا چہرہ تمکید کے سامنے تھا اور نظر میمونہ پر۔ تمکید کو اس کی یہ عادت ہمیشہ سے ناگوار رہی تھی بجائے سامنے سے نظر ترچھی کر کے کسی کو دیکھنا۔

ایک بے تکی خاموشی کے بعد جس میں میمونہ وہاں سے جا چکی تھی مرتضیٰ قریشی نے کہا "دوست، اب تم گھر والے بن گئے ہو، ہوٹل کے ایک کمرے میں رہنے والے نہیں رہے۔ اب تو دوستوں کے مزے رہیں گے۔"

تمکید نے چونک کر کہا "کیسے مزے؟"

"ہوٹل کی بریانی قورمہ نہیں، بھابھی کے ہاتھ کا کھانا کھایا کرو گے اور اُن کے ہاتھ کی چائے۔"

تمکید جیسے پوری توجہ سے چھت پر ایک جگہ رکی ہوئی چھپکلی کو دیکھ رہا تھا۔

مرتضیٰ قریشی کو اس کی خاموشی بری نہیں لگی۔ بولا "میں تمہارے گھر میں پیئنگ گیسٹ بن کر رہنا چاہتا ہوں۔" جیسے یہ بات مذاق میں کہی ہو۔ "کہو منظور ہے؟"

"وہ کیوں؟" تمکید نے بغیر چھپکلی پر سے نظر ہٹائے کہا۔

"بیوی ساتھ رکھنے کو تیار نہیں ہے" اس نے قہقہہ لگا کر دُکھ سے کہا۔

"یعنی تمہیں گھر سے نکال دیا؟"

مرتضیٰ قریشی نے کمروں کے بیچ کی گیلری میں دیکھتے ہوئے کہا "یونہی سمجھ لو۔" وہاں میمونہ ایک کمرے سے نکل کر کچن میں جاتی تمکید کو بھی نظر آ گئی۔

گھر میں فالتو کمرے تھے لیکن تمکید نے رکھائی سے کہا "یہاں اتنی جگہ کہاں ہے وکیل صاحب۔ آپ کے لیے وہی جرمن گڈے گڑیا والی زندگی ٹھیک ہے اور وہ قلابازی لگانے والا بیڈ کافی ہے۔"

جب میمونہ چائے بنا کر لائی تو تمکید اُسے پٹی پر مچھلیوں کے ٹینک کے سامنے بیٹھا نظر آیا۔ لگتا تھا اس وقت اُسے مچھلیوں کی حرکت سے زیادہ دنیا کی کسی چیز میں دلچسپی نہیں ہے۔"

میمونہ نے کہا "ارے میں چائے بنا کر لائی اور آپ کے مہمان پہلے ہی چلے گئے۔"

"تمہیں دیکھنے آئے تھے، دیکھ لیا۔ خود اپنی خاطر تواضع کر چکے تھے اب اور کیا ان کی خاطر تواضع ہوتی۔"

وہ بھی دوسری پٹی برابر میں رکھ کر اس پر بیٹھ گئی۔ دونوں چائے پیتے ہوئے مچھلیوں کو دیکھتے رہے۔ تکمیذ کی چائے زیادہ دودھ کی سفید تھی جس پر میمونہ ہنستی تھی۔

ایکا ایکی تکمیذ نے کہا "اگر یہ صاحب کبھی میری غیر موجودگی میں آئیں تو اندر مت بلانا۔ اور اگر آج کی طرح زبردستی داخل ہونے کی کوشش کریں تو......"

"بہت اچھی خاطر تواضع کر دوں گی۔"

کچھ ہی دن بعد تکمیذ میمونہ کو پہاڑ پر لے گیا۔

ریسٹ ہاؤس کی پشت پر دریا تھا، بظاہر پایاب۔ لیکن جگہ جگہ اتنا گہرا کہ اگر کوئی تیرنا نہ جانتا ہو اور پتھروں پتھروں پار جانے کی کوشش کرے اور غلطی سے ان کے بیچ میں پیر رکھ دے تو برف سے سرد پانی میں غوطہ کھا جائے۔

سامنے سڑک گزرتی تھی اور اس کے پار یہاں وہاں مکان تھے کچے پکے۔ ایک دو دو منزلہ بھی تھے۔ وہیں گورمنٹ جیل تھی — شہتیروں کی ایک کوٹھری جس کی چھت تختوں اور ٹین کی تھی۔ اسے پولیس کا بندی خانہ (لوک اپ) کہنا بھی جائز نہ ہوتا چہ جائیکہ جیل جو اس کے سامنے سڑک کے کنارے لگائے ہوئے بورڈ پر پڑھا جا سکتا تھا۔ برف باری اور اس سے پیوستہ بارش نے لوگوں کو گھروں میں رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کوٹھری میں دو پہاڑی آدمی ایک دوسرے سے تھوڑے ہی فاصلے پر سیمنٹ کی بنچ پر بیٹھے تھے۔ ایک سر اٹھائے لوہے کی سلاخوں کے دروازے کی باہر کی دنیا کو دیکھ رہا تھا، کبھی آسمان کو کبھی سڑک چلتوں کو۔ دوسرا ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا۔

جب ویٹر آیا تو تکمیذ نے پوچھا "اس سردی میں ان دو کو کیوں سرکار نے اس کوٹھری میں بند کر رکھا ہے۔ تمہارے نگر میں بس یہ دو ہی مجرم تھے؟"

ویٹر نے کہا "دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ یہ جو آپ کے الٹے ہاتھ پر بیٹھا ہے اس کا تعلق اس دوسرے کی بیوی سے ہوگیا تھا۔ دونوں میں مار پیٹ ہوئی۔ سرکار نے دونوں کو بند کر دیا۔"

"کسی نے گولی نہیں چلائی؟"

"ان کے پاس بندوق پستول کہاں سے آتی! یہ الٹے ہاتھ والا شنبہ ہے۔ اس کی بیوی چھ مہینے ہوئے مرگئی۔ پیسے نہیں تھے کہ گدھا کرائے پر لے کر بیوی کو میدان کے ہسپتال لے جاتا۔ وہاں فری علاج ہوتا۔"

"پھر اس نے دوسرے کی بیوی سے تعلقات کر لیئے، دوسری شادی کے لیے بھی پیسے نہیں ہوں گے۔" تکمید نے کہا۔

ویٹر اور میمونہ ہنس پڑے۔

ویٹر کھانے کی ٹرے رکھ کر چلا گیا۔

کھانے کے بعد دونوں پھر اُس کھڑکی پر آن کھڑے ہوئے۔ اب برف باری میں شدت آ گئی تھی۔ ہوا تیز تھی اور پانی کی ترچھی جھاڑیوں اور گھاس کو لٹائے دے رہی تھی۔ ابھی تک دونوں قیدی ایک دوسرے سے بات نہیں کر رہے تھے۔

تکمید نے میمونہ سے کہا "کیا گورمنٹ اپنا کام بڑھاتی ہے! دونوں کو ایک ایک پسٹل دے کر ہٹ سے باہر نکال کھڑا کرے۔ منٹوں میں فیصلہ ہو جائے گا۔"

میمونہ نے کہا "آپ 'duel' کا مشورہ دے رہے ہیں۔"[1]

"اور کیا عزت کا معاملہ ہے۔ ایک نے دوسرے کی ملکیت پر ہاتھ ڈال کر اسے للکارا ہے۔"

میمونہ نے کہا "ان کا کوئی رشتے دار آیا لگتا ہے۔"

واقعی ایک آدمی جس نے کنٹوپ پہن رکھا تھا اور سرتا پیر لوئی یا موٹی چادر میں لپٹا ہوا تھا جو بھیگ گئی تھی، جیل یا بندی خانے کے سامنے کھڑا سیدھے ہاتھ والے کو کچھ دے رہا تھا۔ کچھ دیر اُن

---

۱ مسلح فیصلہ کن مقابلہ۔

میں باتیں ہوئیں جن سے دوسرا آدمی لاتعلق بیٹھا رہا۔ جب وہ چلا گیا تو سیدھے ہاتھ والے آدمی نے کپڑے کی پوٹلی کو کھولا۔ اندر سے مکئی کی روٹی نکلی۔

اس کے اٹھانے پر اُسے دوسری روٹی پر جو رکھا نظر آیا ہوگا اور ان کے برابر میں کاغذ میں لپٹی ہوئی چند سگریٹیں اور ماچس ــــ وہ نہ تملید کو نظر آیا نہ میمونہ کو۔

الٹے ہاتھ والا قیدی خاموشی سے اپنے ساتھی پر نازل ہونے والی نعمتوں کو دیکھ رہا تھا۔

سیدھے ہاتھ والے نے ایک روٹی جیل کے ساتھی کو تھما کر اس پر جو چیز ساتھ میں تھی رکھ دی۔

میمونہ نے کہا ''ساگ ہے۔''

دونوں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔

میمونہ نے کہا ''جتنے شوق سے یہ دونوں روٹی ساگ کھا رہے ہیں اُسے دیکھ کر مجھے پھر بھوک لگنے لگی ہے۔''

اور جب مہمان نواز ملزم نے دو چار کش لے کر اپنی سگریٹ رنڈوے مجرم کو تھمائی تو تملید نے کہا ''اب کیا جی چاہ رہا ہے آپ کا؟''

میمونہ نے جھینپ کر کہا ''کچھ نہیں۔''

پہاڑ سے آئے کچھ دن ہوئے تھے کہ تملید نے میمونہ سے کہا ''چلو تمہیں اپنی دو واحد رشتے دار خاتونوں سے ملا لاؤں۔''

میمونہ اس کی بات پر دل کھول کر ہنسی: ''میں آپ کی انگریزی کیا درست کروں گی آپ میری اردو درست کر رہے ہیں۔ مجھے ان دو واحد خاتونوں سے مل کر بڑی خوشی ہوگی۔''

تملید نے کہا ''پہلے سے بتائے دیتا ہوں وے رہتی جھگی میں ہیں۔''

میمونہ نے خوش ہو کر کہا ''مٹھائی لے کر چلیں گے۔ انہیں آپ نے شادی میں کیوں نہیں بلایا

تھا؟"

تمیز نے کہا" جہاں دونوں رہتی ہیں میرا خیال ہے وہاں ڈاک نہیں پہنچتی ہے۔"

راستے میں وہ اُسے ان دونوں کا نمنی پور آ کر ٹھہرنا، اماں کا اُن سے سلوک اور خود اپنا ان کو نئے ملک میں ڈھونڈ نکالنا اور ملاقات کے قصے سناتا رہا۔

ٹیکسی مین روڈ پر چھوڑ کر تنگ گلیوں سے ہوتے ہوئے وہ وہاں تک پہنچے جہاں تمیز کا خیال تھا چنی خالہ اور ساجدہ رہتی ہیں۔ مگر وہاں اب پکی اینٹ کا شاید ایک کمرے کا گھر تھا۔

پڑوسیوں نے بتایا بڑی بی کے انتقال کو تو عرصہ ہوا اور ساجدہ بی بی یہاں خوش نہیں تھیں۔ ٹرانسفر کرا کے کہیں اندرون ملک چلی گئیں۔ شروع میں ان کے دو ایک خط آئے تھے اور اب کسی کو پتہ نہیں تھا کہاں ہیں۔ شادی نہیں ہوئی تھی۔

آنے والے دنوں میں تمیز اپنی Strait Trading Corporation کو جو ایس ٹی سی کہلانے لگی تھی دن کا بڑا حصہ دینے لگا تھا۔ آلسی میں بجائے منظور شدہ امپورٹ پرمٹ کو بیچ لینے کے خود منظور شدہ آئٹمز امپورٹ کرنے لگا تھا۔ ایل سی کی ترکیب جلد دونوں کی گفتگو کا حصہ بن گئی۔ انہیں 'نکالنے کے لیے'۔ ایک اور ترکیب جو روز ہی کھانے کی میز پر سنائی دیتی تھی۔ بھاگ دوڑ کرتا تھا۔ کچھ چیزیں ایکسپورٹ بھی کر رہا تھا: جیسے اپنے ملک میں بنے ہوئے لیڈیز پرس جرمنی اور اٹلی کو، جن پر ہاتھ کا سنہری روپہلی کام بنا ہوتا تھا۔ ہر آئٹم میں سے ایک وہ میمونہ کو تھماتے ہوئے کہتا:" باہر بھیجے جانے سے پہلے یہ پہلا دیوی کی بھینٹ ہے۔"

"گھر بیٹھے کی روزی میں نے چھوڑ دی ہے۔" وہ اُن دلالوں سے کہہ دیتا تھا جو بڑے امپورٹرز سے سودا کرانے کے لیے اس کے دفتر کا چھیرا مارا کرتے تھے۔

میمونہ نے جب اپنی ایک آدمی کی سسرال میں آنکھیں کھولیں تو اُسے تمیز ایک ذمے دار شخص نظر آیا، جیسا اس کے بھائیوں کو نظر آیا تھا، ہر لحاظ سے ذمے دار، قابل بھروسہ، دوسرے

کے دکھ درد کو محسوس کرنے والا۔ جو صبح سویرے اٹھ کر لون کو پانی دیتا تھا، گملوں اور کیاریوں میں سے سوکھی گھاس اور سوکھے پتے چنتا تھا۔ ڈبے کھول کر مچھلیوں کو مختلف قسم کا چارہ دیتا تھا اور پھر جتنی دیر میں میمونہ ناشتہ لا کر میز پر لگائے وہ بیٹھا انہیں دیکھتا رہتا تھا۔

لگتا تھا منی پور کا مچھلیوں اور سنگھاڑوں کا تال اس کے سامنے ہے۔ کہیں کہیں کمل کے پھول بھی کھلے ہیں، اس کے پاؤں پانی میں ہیں اور وہ چھپا چھپ کر رہا ہے۔ نوکر بلانے کو آیا: 'بھیا کھانا نکل آیا، گھر چلو۔' مگر وہ وہاں سے اٹھنے کو تیار نہیں ہے۔

ایک دن اس نے ہلکے نیلے کاغذ کے چند لہریئے دار crenated پتے تراشے اور انہیں سطح آب پر ڈال کر دیکھتا رہا۔

میمونہ نے جو پیچھے کھڑی تھی پوچھا "یہ کیا کر رہے ہیں؟"

"کمل کے پتوں کو تیرا رہا ہوں۔"

"اور کمل کہاں ہیں؟"

"وہ تم مجھے دو گی۔" اس نے اس کے پیٹ پر پہلو سے سر ٹیکتے ہوئے کہا۔

میمونہ نے کہا "آپ ابھی تک بچے ہیں۔"

"بس ساری زندگی ایسا ہی سمجھتی رہنا۔"

وہ اس کے چہرے کو دیکھتی رہی اور وہ ان تیرتے ہوئے پتوں کو جو مچھلیوں کے بیچ میں سے ہو کر گزرنے سے ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے تھے اور آخر کار ڈوبنے لگے۔

اس نے میمونہ کی بنے کی تیلی سے ایک ایک کر کے سارے کاغذ نکالے اور جا کر کرسی پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا۔ وہ اس سے خوش ہے یہ میمونہ کے چہرے پر پڑھا جا سکتا تھا۔

تملیذ کا وقت پر اوفس جانا، وقت پر لوٹنا، کبھی شام کو کسی دوست کے گھر لے جانا، کبھی سینما ہول سب کچھ اُسے بھاتا تھا۔ مہمانوں سے نہ وہ گھبراتی تھی نہ تملیذ۔

نجم اس ہسپتال میں دنیا میں آیا جس میں ایک بار تملیذ خود داخل ہوا تھا۔

''خاصا مہنگا پڑا۔'' اس نے پہلی بار بچے کو دکھائے جانے پر میمونہ سے کہا۔

اس کے اشارے پر نرس بچے کو پاس لے آئی اور بولی'' کچھ نام رکھا ہے یا سرٹیفکیٹ میں بے بی تمیذ ہی رہے گا؟''

اچانک فلمی دنیا کا وہ شخص اسے یاد آیا جس سے فلم کیپیٹل سٹی میں کچھ دن دوستی رہی تھی اور بعد میں ایک فلمی رسالے میں پڑھا تھا اب اسکرین پلے رائٹر ہے اور پہلی بار فلم ڈائریکٹ کر رہا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر نرس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا'' نجم الرحمن'' اور بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔

نرس نے کہا'' آپ اذان نہیں دیں گے؟'' پھر بولی'' آتی ہے؟''

تمیذ کو یاد تھا نرس کے گلے میں پڑی ہوئی چین سے متصل صلیب اس کے سینے کو چھو رہی تھی اور ایک خود کار کھلونے کی طرح جیسے یادداشت بھی دی گئی ہو اس نے بچے کو نرس کے بازوؤں سے لے کر اس کے سیدھے کان میں اذان دینی شروع کی، بیڈ پر سے میمونہ اُسے ایسا کرنے سے منع کر رہی تھی۔ بچہ غافل سو رہا تھا۔ تمیذ عرصہ بعد اپنی قرأۃ سن رہا تھا اور اس میں ڈوبا ہوا تھا۔

جب وہ دونوں طرف اذان ختم کر چکا اور نرس بچے کو لے کر چلی گئی اس نے میمونہ سے پوچھا ''تم مجھے منع کیوں کر رہی تھیں؟''

میمونہ نے کہا'' آپ گھر سے وضو کر کے آئے تھے؟''

تمیذ نے کہا''تمہیں یقین ہے جتنے لوگ اذان دیتے ہیں سب باوضو ہوتے ہیں؟''

میمونہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''وہ بھی جو خطرے کے وقت محلے کی مسجد سے بے وقت اذانیں دینے لگ جاتے ہیں؟''

اس نے پھر سر ہلایا۔''اُن کے پاس وضو کرنے کے لیے وقت ہوتا ہے تو۔''

''تو پھر خطرہ کس بات کا! آپ سمجھتی ہیں جو گوشت آپ کھاتی ہیں حلال ہوتا ہے؟ زیادہ تر بے وضو اللہ اکبر ہوتا ہے اور کبھی اتنا بھی اللہ اکبر کہنے والے کو بھول جاتا ہے۔''

''میں نہیں مانتی۔''

تلمیذ نے کہا" اور اگر کسی ملاّ کا ارادہ کسی نوجوان کو جس کی شادی نئی نئی ہوئی ہو بیچ رات میں تنگ کرنے کا ہو؟"

"تب بھی۔" میمونہ نے ڈھٹائی سے کہا اور اس کے لیے بازو کھول دیے۔

نجم کا گھر میں آنا تلمیذ میں نئی زندگی کا جاگ اٹھنا تھا۔ اگر کام کم ہوتا تو وہ وقت سے پہلے گھر لوٹ آتا۔ جو لایا ہوتا اس سے بچے کو رجھانے کی کوشش کرتا اور جب وہ اس کی آواز پر کا کاری مارتا تو وہ اُسے اپنی فتح محسوس ہوتی اور اس کا غوں غاں کرتے ہوئے ہاتھ پیر چلانا مکمل فتح۔ ایسی فتح جس سے وہ پہلے واقف نہ تھا۔ کئی دفعہ جب میمونہ اتنی دور ہوتی کہ اس کی آواز نہ سن سکے وہ نجم کے کان کے پاس منھ لے جا کر کہتا: "تمھیں کسی اور کے گھر رہنے کے لیے کبھی نہیں بھیجوں گا، نہ مولوی کی لگائی ہوئی تمہاری شکایت پر کان دھروں گا۔ چاہے تم اس پر "

میمونہ نے ایک بار ایسے موقع پر اچانک وہاں آ کر کہا "اچھا بیٹے کو میرے خلاف اکسا رہے ہیں!"

اُن ہی دنوں اس نے اپنے بڑے سالے کو خط میں لکھا: اب اس کی موت کی دھار دو فٹ تک جاتی ہے اب چار فٹ۔ مجھے کئی دفعہ بھگو دیکا ہے۔

انہوں نے لکھا: ہوشیار رہنا۔ کسی دن تمہارا سپوت گھر کو نہ ڈبو دے۔

نجم آٹھ ماہ کا تھا کہ ایک صبح تار ملا: اماں چل بسیں۔

دونوں ہوائی جہاز سے اتر کر وہاں پہنچے۔ چھوٹے بھائی نے بچے کو گود میں لے لیا، بڑے نے بہن کو چپٹا لیا اور چپٹائے چپٹائے ہی کار تک لے گئے۔

گھر پر باہر جو غم میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے ان میں تلمیذ بھی جا کر بیٹھ گیا۔

دونوں بھائی ایک ایک کر کے باہر کے گیٹ سے باپ کے پاس گئے اور اکیلے لوٹ آئے۔ پھر ایک بزرگ کے کہنے پر ایک ساتھ مل کر چند بڑی عمر والوں کے ساتھ وہاں گئے۔ تھوڑی دیر بعد جج صاحب نوکر کے ساتھ آتے نظر آئے۔ باہر کے گیٹ سے۔ سب ان کے استقبال کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر کے لیے خاموشی ہوگئی۔

تمیذ نے ایک شریک غم کو دوسرے سے دبی آواز میں کہتے سنا: ''طلاق تو نہیں دی تھی، جا کر مرنے والی کی شکل دیکھ لیں۔''

دوسرے نے قدرے اونچی آواز میں کہا ''قصور اگر کوئی تھا تو معاف کر دیں۔''

بڑے بیٹے نے نزدیک آ کر کہا ''ابا جان اندر چلیے۔''

جج صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور گیٹ کی طرف چل پڑے۔

کسی نے کہا ''نماز جنازہ ہونے کو ہے۔''

انہوں نے کہنے والے کی طرف گھوم کر بھی نہیں دیکھا۔

کسی نے کہا ''شوہر ہو تو ایسا۔ بیر دوسری دنیا تک ساتھ لے جائے گا۔''

اسی لمحے جنازہ اندر سے برآمد ہوا۔ اندر سے رونے کی جو آوازیں آ رہی تھیں ان میں تمیذ میمونہ کی آواز کو پہچان سکتا تھا۔ آگے بڑھ کر اس نے ایک ڈنڈے کو کندھے پر لے لیا۔

(۴۲)

ایک صبح، چھٹی کے دن کی تمیذ کی صبح، صبغت اللہ اپنی سفید بیوی گریس کارٹر کے ساتھ اچانک آیا۔

''دونوں سنڈنی جارہے تھے، رشتے داروں اور تم سے ملنے یہاں راستے میں اتر گئے۔''

''رشتے داروں سے صحیح ہے، مجھ سے ملنے غلط۔''

گریس نے کہا ''نہیں آپ کا پتہ اور فون نمبر نہ معلوم کتنوں سے معلوم کرتے رہے ہیں۔''

''یہاں پہنچ کر۔'' تمیذ نے کہا

''نہیں، وہاں کے ایک ٹریڈ جرنل میں صبغت نے آپ کا نام پڑھا تھا۔''

تمیذ نے پوربی میں صبغت اللہ سے کہا ''اُوکیل سے شادی کی ہے کا؟''

صبغت نے بیوی کی سوالیہ نظروں کے جواب میں کہا ''کہہ رہا ہے کیا lawyer سے شادی کی ہے؟''

صبغت اللہ جیسا کہ تمیذ نے سن رکھا تھا کومریڈ بن چکا تھا اور لندن میں پروفیسر تھا۔ ویسا خیالی پروفیسر نہیں جو لطیفوں، عشقیہ فلموں اور ناولوں کا ہوتا ہے۔ بقول بھلکو، صبغت ہمیشہ کی طرح حاضر دماغ تھا، برٹش کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں سے اس کے تعلقات تھے، دو کتابوں کا مصنف تھا، جن میں سے ایک کی گریس Co-author تھی (شریک مصنف)۔ گھر میں برتن دھوتا تھا، سالن پکاتا تھا اور کیکڑوں کا سوپ اس کی اختصاصی تھا۔

اتنے سالوں بعد ملنے کا جوش جب ٹھنڈا ہو گیا تو تلمیذ کا پہلا سوال تھا ''تم سے شادی کے بعد گریس صبغت اللہ کیوں نہیں ہے، گریس کارنر کیوں ہے؟''

صبغت اللہ نے کہا ''پہلے تم گریس سے پوچھو شادی کے بعد صبغت، صبغت کارنر کیوں نہیں ہے؟''

اتنی دیر میں گریس میمونہ کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔ پہلے گھر کا ایک ایک کونا دیکھتی پھری۔ اس کے لیے وہاں کی ہر چیز دلچسپی سے بھری تھی۔ بار بار کہتی ''تو حقیقت میں یہاں والوں کے گھر ایسے ہوتے ہیں!''

ایک بار میمونہ پوچھ بیٹھی: ''اور یہاں والوں کے گھر وہاں کیسے ہوتے ہیں؟''

''ہرا نچ برٹش'' گریس نے قہقہہ لگا کر کہا۔

صبغت اللہ نے کچن میں آ کر کہا ''کیا چینی کا کوئی برتن ٹوٹا ہے یا مٹی کا گھڑا؟''

جب میمونہ چٹنی پیس رہی تھی، گریس برابر پتیلی میں چمچہ گھمائے جا رہی تھی۔

میمونہ نے کہا ''ارے بھابھی اتنا چمچہ مت گھماؤ بڑیاں ٹوٹ جائیں گی۔''

گریس نے کہا ''یہ ہوئی بات۔ اب پتہ چلا! میں صبغت کے دوست کے گھر کی ایک فرد ہوں۔''

صبغت نے بتایا ''ارے یار شاعر اعظم یوسف اسی شہر میں ہے۔ وہاں یو کے میں بیٹھا میں جانتا ہوں اور تم اسی شہر میں رہتے ہوئے نہیں جانتے۔ اس کی بیوی دردانہ کو دیکھو گے تو اگر سیب کاٹ رہے ہو گے تو اپنی انگلیاں کاٹ لو گے۔''

یوسف کے ذکر پر اور وہ بھی اسی کے شہر میں ہوتے ہوئے تلمیذ کی سٹی گم تھی۔

''آج کل اپنے رشتے داروں سے ملنے اپنے آبائی شہر گیا ہوا ہے۔ میرے پاس اس کا پتہ بھی ہے اور فون نمبر بھی۔ ہفتے بھر بعد فون کر لینا۔''

گریس میمونہ اور نجم دونوں کے لیے تحفے لے کر آئی تھی۔ کھانے سے پہلے اس نے ساڑی باندھنا سیکھا اور میمونہ مصر ہوئی ''اسی کو پہنے پہنے اپنے گھر جاؤ۔''

"لندن؟" گریس نے مصنوعی تحیر سے کہا اور دونوں ہنستی ہوئی ایک دوسری سے لپٹ گئیں۔

یوسف عسکری مواج کے بارے میں تلمیذ کے اندیشے بے بنیاد تھے۔ اس کے پاس وقت بہت تھوڑا ہوتا تھا، آج ملک میں ہے، کل باہر گیا ہوا ہے۔ بعد میں اگر تلمیذ اس کے دفتر جاتا بھی تھا تو بات بہت کم ہو پاتی تھی سارا وقت آنے والی فون کالز لے لیتی تھیں۔ پھر بھی وہ اپنے چپراسی کو بتا چکا تھا "جب بھی صاحب آئیں اگر میں میٹنگ میں نہیں ہوں تو فوراً اندر بھیج دیا کرو۔"

کئی بار وہ تلمیذ کے گھر ذردانہ کے ساتھ آیا۔

دوسری بار صبغت اللہ، شاعر اعظم نواب یوسف عسکری اور ذردانہ کے ساتھ تلمیذ کے گھر آیا اور آتے ہی میمونہ سے بولا "سارے دروازے کھڑکیاں بند کر دو۔ آج یہاں بہت غل غپاڑا ہوگا۔"

جب میمونہ کچن میں تھی یوسف نے جھوٹی رازداری کی آواز اور لے میں تلمیذ سے کہا: "میری راجیشوری سے بلکہ سچ پوچھو تو مسز راجیشوری دیال سے خط و کتابت ہے۔ راجیشوری خط لکھنے کا چور ہے، مگر جب لکھتا ہے کمبخت تو ایسی اردو میں جو اس ملک میں بھی کسی کی نہیں ہوگی۔ شوبھنا انگریزی میں جواب دیتی ہے۔ راجیشوری کا خط پاکیزہ ہے۔"

"ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔" صبغت اللہ نے کہا "تختی پہ لکھنے سے شروع کیا تھا بعد میں مولوی صاحب کتابت سکھاتے تھے۔"

"پہلی دفعہ جب وہاں گیا تھا اور ایک رشتے دار کے گھر ٹھیرا تھا تو بدمعاش وہاں سے زبردستی اٹھا کر اپنے گھر لے گیا تھا۔ اب نئی راجدھانی میں رہتا ہے۔ وہ بھون اس کا گودام ہے۔"

"کسم بل اسٹیشن پر رہ رہی ہے پتی دیوتا کے سنگ۔ ایک بچے کی ماں ہے۔ کہو دل پہ کیسی گزری!"

میمونہ نے آخری جملہ کچن سے باہر نکلتے ہوئے سنا اور بولی "کس کے دل پہ؟"

''ایک لڑکی ہے جس نے میرے ساتھ ایل ایل بی کیا تھا اور وہاں سے لنکن ان گئی تھی اس کے۔''

پھر اس نے تمکینہ کی آنکھوں میں آنکھیں دھنساتے ہوئے کہا'' کہہ دوں کس کے دل پر؟''

تمکینہ نے جھینپتے ہوئے کہا'' کہہ کے چھٹی کرے'' اور خود ہی بات پوری کر دی'' تمہاری سوکن تھی اس کا ذکر ہے ایک بچے کی ماں ہے، اپنے پتی دیوتا کے ساتھ ہل اسٹیشن پر رہتی ہے۔ ایل ایل بی اور لنکن ان کے شاعرانہ تخیل کی بات ہے۔''

اس بار گریس ساتھ نہیں تھی۔ رہوڈیشیا گئی ہوئی تھی۔

کھانے کی میز پر جلد ہی میمونہ کو احساس ہوا صبغت اللہ اور یوسف ایسے موضوع پر بات کر رہے ہیں جس کا تعلق نہ امپورٹ ایکسپورٹ کی دنیا سے تھا، نہ فلمی رسالوں میں چھپنے والی مشہور ہستیوں کے اسکینڈلز سے۔

جب یوسف اکیلا آتا تھا وہ دوسرا ہی یوسف ہوتا تھا، خود ہنسنے اور دوسروں کو ہنسانے والی باتیں کرنے والا، جسے اَن گنت لطیفے یاد تھے۔

یونیورسٹی ٹاؤن اور انگریزوں کی نئی راجدھانی میں گزارے ہوئے دنوں کے چھوٹے چھوٹے واقعات۔ اور کھاڑی کی بندرگاہ کے بھی۔

ایک دفعہ پوچھ بیٹھا:''تمہیں راجیشوری دیال یاد ہے؟''

تمکینہ نے ہاں میں سر ہلایا۔

''اور اس کی بہن گُسم؟'' تمکینہ نے کھلے منہ کا قہقہہ لگایا اور ساتھ ہی میمونہ کی پیٹھ پر دھپ لگاتے ہوئے کہا:''لڑوانے آیا ہے۔ اُسی لڑکی کا ذکر ہے جس نے اس کے ساتھ ایل ایل بی کیا تھا۔''

میمونہ نے کہا'' کچھ دال میں کالا ہے ضرور۔''

جب صبغت اللہ بیوی کے ساتھ آیا تھا وہ بھی نوگزے کی قبر، رنڈی والے باغ اور وائس ریگل لوج کی باتیں کرتا رہا تھا۔'' وہ دن جب جنگ کے زمانے میں اچانک ریزگاری کا توڑا پڑ

گیا تھا۔ چاندی کی بڑی چونی پہلے غائب ہوئی، پھر چھوٹی چونی اور آخر میں خالص چاندی کا روپیہ۔ لوگ کچھ دن پوسٹیج اسٹامپس ریزگاری کی جگہ استعمال کرتے رہے، مگر وہ جلد ہی اتنے میلے اور بوسیدہ ہو گئے کہ کسی کام کے نہیں رہے۔

''ریزگاری کے اُن توڑے کے دنوں میں کلاس ٹیچر پہلی تاریخ کو فیس کے لیے پانچ اور دس کے نوٹ لیتے ہوئے لڑکوں پر چیخ پڑتا تھا 'اب تمہارے لیے ریزگاری کہاں سے لاؤں!' پھر ہمارا یار تمکید ایک پہلی تاریخ کو نہ معلوم کہاں سے پیسے ہی پیسے بٹور لایا۔''

''پورے اسی پیسے اور چونسٹھ دھیلے۔'' تمکید نے لقمہ دیا۔

''پھر وہ سین دیکھنے والا تھا جب بیچارہ ٹیچر ایک روپے بارہ آنے کے پیسے گن رہا تھا اور سارے لڑکے کھی کھی، کھی کھی ہنس رہے تھے۔ بھابھی تمہارا یہ شوہر، برا نہ ماننا بڑا حرامی لڑکا تھا۔''

گریس نے کہا ''Tell in English''

میمونہ نے کہا ''O, do not, please do not''

''کام کرنے میں بھی اگر اس کی کوئی بات یا حرکت یاد آ جائے تو ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔'' صبغت نے اپنی بات مکمل کی۔

''پھر جب تانبے کے پیسے دھیلے، حتیٰ کہ پائی غائب ہو گئے تو برٹش گورمنٹ نے نئے پیسے جاری کیے جن کے بیچ میں چھید ہوتا تھا۔ ان نئے پیسوں سے اگر کوئی خوش تھا تو بائیسکل والے جنہوں نے اُسے دیکھتے ہی سمجھ لیا ان کے کام کی چیز ہے: ہوا بھرنے کے پمپ میں وہ واشر کا کام دینے لگا۔''

''اور جب آپ کی حکومت اس ملک سے اپنا بوریا بستر سنبھالنے کا سوچ رہی تھی'' صبغت نے گریس سے کہا ''تو اس نے چاندی کے روپے کے بدلے میں ایک روپے کا نوٹ چلایا۔''

''Then'' گریس نے پوچھا۔

''لوگوں نے فیصلہ کر لیا، حکومت دیوالیہ ہو گئی ہے قرضہ چکائے بنا اس ملک سے بھاگ لے گی۔''

اور وہ دن جب میمونہ ہمت کر کے صبغت اللہ سے پوچھ بیٹھی تھی "لندن میں آپ کے ملنے والوں کا حلقہ اتنا وسیع ہے کبھی ٹی۔ایس۔ایلیٹ سے ملاقات ہوئی؟"

اُس نے مسکرا کر کہا "وہ میرے ملنے والوں کے حلقے میں شامل نہیں ہیں۔ ہاں اُن سے ملا ضرور ہوں۔ ایک بار نہیں کئی بار، A remarkable person, not a snob"

"کچھ اُن کے بارے میں بتایئے۔"

گریس اور صبغت اُن ملاقاتوں کا ذکر کرنے لگے اور وہاں سے بات انگلش لٹریچر پر چلی گئی۔

تمیذ کو یوسف عسکری اور صبغت اللہ کسی دوسری ہی دنیا کے بسنے والے لگ رہے تھے۔ جلد ہی دونوں ملٹری ڈکٹیٹر شپ اور عوام کے تعلیمی لیول کی بات کرنے لگے۔

ایک موقعے پر صبغت اللہ نے کہا: "ارتقا کیسا! یہ سوسائٹی اس حد تک جامد ہے frozen – کہ یہاں کسی قسم کے انقلاب کے آنے کا امکان تک نہیں ہے۔ جاگیرداری نظام کو عوام نے تسلیم کرلیا ہے – اکثر مسلم ممالک کی طرح کہ ہمایوں کے بعد اکبر بیٹھے گا، اکبر کے بعد جہانگیر۔ رہی پرجا؟ یہاں کی پرجا اس سے متفق ہے۔ اسی کے لیے انہیں بیدار کرنے والی تعلیم سے دور رکھا گیا ہے اور یقین مانو اس جہالت کو برقرار رکھنے کے لیے ہر نئی حکومت نے پیسہ بے دریغ صرف کیا ہے۔"

میمونہ پچھتا رہی تھی' جب میں دیکھ رہی تھی تمیذ اس گفتگو سے کٹ کر رہ گیا ہے کیا ضروری تھا میں انگلش لٹریچر کا ذکر چھیڑتی'

جب یوسف عسکری نے کہا "تمہیں یہاں democracy at work نظر نہیں آتی ہے؟"

"Rubbish۔ خوردبین سے دیکھنے پر بھی نہیں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر صبغت نے کہا: "غلط کہہ گیا۔ یہاں امریکا سے ڈیموکریسی امپورٹ ہوگی۔ امریکا اپنی ایمپائر کے ملکوں پر وہاں گورنر جنرل اور وائس رائے بھیج کر حکومت نہیں کر رہا ہے، یہ کام ان ملکوں کے ملٹری اور سیویلین حاکموں سے لیتا ہے......"

"یہ سستا پڑتا ہوگا۔" بیچ میں یوسف نے کہا۔

"اور جب وہ ایمپائر مکمل ہو جائے گی ساری دنیا پر سرخ اور سفید پٹیاں لپٹی ہوں گی اور نیلے آسمان میں سفید تارے چمک رہے ہوں گے، further یہ کہ قطب شمالی پر ایک عقاب بیٹھا نظر آئے گا، جس کی چونچ سرخ ہوگی"

میمونہ بات کے اس رُخ کو بڑی دلچسپی سے سُن رہی تھی، ایک دم بول اٹھی "اور صبغت بھیا اس وقت اللہ تعالیٰ اعلان کرے گا: "یہ ہے دنیا کا آخیر۔"

یوسف نے ہاتھوں کی پشت سے تالی بجا کر کہا: "اور کہے گا مت ڈرو میرے بے وقوف بندو، اس کے بعد کوئی قیامت نہیں ہے۔"

گریس میمونہ کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی: "تم کچن میں جا کر ننگیر اور چیچے گھماؤ میں جا کر تھوڑی دیر روز سے دل بہلاؤں گی، ٹجم سے کھیلوں گی۔ جب کھانا نکالنے کا وقت آئے مجھے بلا لینا۔"

صبغت اور یوسف باتیں کرتے ہوئے کھانے کی میز پر آئے۔ کھانا ابھی چند لقموں تک ہی پہنچا تھا کہ صبغت نے کہا "وہاں کئی دن اخباروں میں ایک اسکینڈل کا چرچا رہا۔ تمہارے ایک انگلش جرنلسٹ کو اس کی پولش مسٹریس نے۔" مچھلی کھانے کے فورک کو اس نے سامنے ہوا میں دھنساتے ہوئے کہا "اس کے سینے میں۔"

"مار دیا؟" میمونہ نے خوف زدہ ہو کر کہا۔

ہونٹوں کو ڈوری کے بٹوے کی طرح سمیٹ کر اس نے سر کی معمولی جنبش سے بتایا ایسا ہی ہوا تھا۔

پھر بولا: "اس کی آمدنی پر پل رہا تھا He was a bloody souteneur'"

"Please,Please" گریس نے کہا: "میں نہ سہی یہاں ایک معزز خاتون بھی موجود ہے۔"

تمیذ نے گہری دلچسپی سے پوچھا "نام یاد ہے؟"

"فیور۔ تم جانتے تھے؟"

تمیذ گڑ بڑا گیا، جیسے کھانے کی میز پر منھ کے بل گرنے کو ہو۔ پھر اُسے چھنکارے کا احساس ہوا

' جو مرد ایک عورت کے ساتھ بنا نکاح کے رہتا ہے اور اس کی گناہ کی کمائی پر پلتا ہے

اور گہری سانس لے کر بولا "جانتا تھا۔ He deserved the end"

کھانے کی میز سے اٹھ کر سب صوفوں پر آ بیٹھے۔ صبغت اللہ نے ہوانا سگار سلگایا۔ یوسف نے سگار لینے سے انکار کرتے ہوئے میمونہ سے کہا "بھابھی پاندان رکھتی ہو تو پان کھلاؤ۔ صبغت معاف کرنا یار۔ مجھے angina ہو چکا ہے ورنہ میں اور سگار کو چھوڑتا۔"

صبغت اللہ کے اصرار پر یوسف عسکری مواج نے ہمیشہ کی طرح نظم سنائی۔ گریس سوتی ہوئی روز کو سینے سے لگائے لگتا تھا خود نیند میں ڈوبتی جا رہی ہے۔ اس کے برابر میں اس سے چپکا ہوا نجم بیٹھا تھا۔

ہمیشہ کی طرح صبغت اللہ نے کہا "غزل کیوں نہیں کہتے ہو؟"

"اس میں تخلص بٹھانا دشوار ہوتا ہے۔ نظم میں تخلص برتنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ پھر شعر اگر غالب کا نہ ہو اور جاندار ہو تو بھی سننے والوں کو کسی دوسرے جاندار شاعر کا لگ سکتا ہے۔ غزل کے اشعار ہرجائی ہوتے ہیں۔ نظم کے شعر اپنے خاوند کو پہچانتے ہیں۔ نظم پاکیزہ چیز ہے۔ بغیر تخلص کی رسی گلے میں بندھائے اپنے مالک کی چیز۔"

صبغت نے کہا "غزل بالغوں کی چیز ہے۔"

"لیکن اس پر ہاتھ صاف کرتے ہیں adolescents۔ اور پھر ساری عمر وہ adolescence میں گزار دیتے ہیں۔" یوسف نے کہا۔

کچھ دیر تھر ون، راجیشوری دیال، اس کی خوبصورت بہن گُسم، جگ موہن اور حسن وارد ایمن کا ذکر رہا۔

"پتہ نہیں حسن وارد کی ابھی بھی وہی ہندو بیوی ہے یا بدل کر دوسری لے چکا ہے۔"

"اس سے شادی کر کے مرتے مرتے تو بچا تھا۔ اس نے بھی کمال کیا تھا فلم سٹی کیپٹل میں بیٹھ کر ایک ہندو لڑکی سے محبت کی اور اس سے شادی کے عزم پر قائم رہا۔"

"واحد کام جو اس نے کسی عزم سے کیا۔" تلمیذ نے بہت دیر بعد منہ کھولا۔

"ارے یہاں تلمیذ بھی ہے، یہ تو ہم بھول ہی گئے تھے۔" صبغت اور یوسف نے ایک ساتھ کہا۔

وہاں سے اٹھتے اٹھتے چاروں مہمان exhanst ہو چکے تھے۔ گریس روز کو بانہوں میں سنبھالے بچوں کے کمرے میں گئی، میمونہ نجم کو اٹھائے۔
تلمیذ خاموش رہا اور مہمانوں کے جانے کے بعد جا کر سو رہا۔

شادی کے شروع کے سالوں میں جب تلمیذ سو جاتا تھا میمونہ اپنی لائبریری سے کوئی کتاب لا کر دیر تک پڑھتی رہتی تھی۔ بعد کے دنوں میں نجم اور روز کے جاگنے پر انہیں ٹھیک کرتی تھی۔ پڑھتی اور پڑھتے پڑھتے سو جاتی۔
صبغت اللہ، گریس اور یوسف کی گفتگو میں ایک دن ڈرتے ڈرتے اس نے اپنی رائے دی تھی: ''میں سمجھتی ہوں آرٹ میں کسی قسم کی شعبدہ بازی نہیں ہے۔ نہ شعبدہ بازی آرٹ ہے۔''
اس پر گریس نے کہا تھا'' ہے، تلمیذ تم نے گھر میں ایک لٹریچر کے کریٹک کو چھپا رکھا ہے۔''
میمونہ جھینپ گئی۔

اس ملاقات کے بعد کافی عرصہ گریس سے میمونہ کی خط و کتابت رہی۔ گریس نے دو مرتبہ شادی کی سالگرہ پر اسے کتابوں کا تحفہ بھی بھیجا اور اپنی تاریخ پیدائش کے سوال کو ہر بار گول کر گئی۔

(۴۳)

شادی کے بعد تمام خطرے سے بھرے کام تلمیذ کے لیے ختم ہو چکے تھے، اور ناپسندیدہ کام بھی۔ دوسری عورتیں خود بخود دور ہو گئیں۔ شراب کا ساتھ بھی چھوٹ گیا لیکن جو وقت اس کی صحبت میں گزرا تھا وہ تلمیذ کو بھولا نہیں تھا– اور اس کا ساتھ پیسہ مانگتا ہے۔ شراب بیوی نہیں ہے کہ خالی پیٹ پر بھی گلے سے لگی رہے۔ جو پریشانیوں سے نبرد آزما ہونے کی جگہ اپنا حلیف شراب کو بنا لے اس کی وہ تا زندگی وفادار رہتی ہے، اپنی گری سے گری شکل میں اُسے اپنی یاد دلاتی رہتی ہے۔ تیاگ کے ان دنوں میں یاد آنے پر اسے وہ لمحے بھی اچھے لگتے تھے جب وہ آئندہ کے لیے شراب سے توبہ کر رہا ہوتا تھا اور جانتا تھا توبہ ایک دن ٹوٹ جائے گی۔

پوش[1] علاقے میں کرائے کے گھر میں رہائش، موٹر کار– گو وہ سیکنڈ ہینڈ تھی– اور اس کے لیے ڈرائیور، مالی، بچے کی کھلائی، بھاگ دوڑ کرنے والا لڑکا، کھانا پکانے والی بوا اور اوفس اور وہاں کا اسٹاف۔ شروع میں جب خرچ کی تنگی تلمیذ پر آشکارہ ہونے لگی بے جانے بوجھے، بے سوچے سمجھے اس نے اوفس سے اٹھ کر مے خانے جانا شروع کر دیا۔ وہی پیر جی کے آستانے۔ ایک بات اُسے ستا رہی تھی دیکھوں وہاں اب کون کون آتا ہے؟ وہاں سے واپس اوفس جا کر اتنا وقت وہاں گزارتا کہ سانس سے الکحل کی بو جاتی رہے۔ اس کے بعد جب وہ گھر پہنچتا تو میمونہ

---

[1] اونچے طبقے سے منسوب علاقہ

اُسے دیکھ کر کھل اٹھتی۔ لیکن تلمیذ کو شاما میں پھر ایک بار بے مزہ لگنے لگی تھیں۔

تین جھوٹ تلمیذ کی جان کو اس طرح لگے ہوئے تھے جیسے کسی نے خون کا دباؤ کم کرنے کے لیے جونک خود لگائی ہو اور وہ ضرورت ختم ہو جانے پر بھی اس کی پنڈلی سے چپکی رہے۔ جیسے پورے جسم کا خون چوسے بغیر نہیں ہٹے گی۔

میمونہ جانتی تھی اس کا شوہر بی۔ اے ہے۔ یہ بھی جانتی تھی پہلے جس ملک میں تھا اس کے سب سے بڑے فلم سازی کے سینٹر میں ایک فلم میں سائیڈ ہیرو کا رول کر رہا تھا جو ترقی مورتی فلم کمپنی بنا رہی تھی۔ انگریزوں کے خلاف (بغیر لڑے جنگ کی کہانی۔ نام تھا نہتے سپاہی)

اس میں اندو رام رتنم۔ اسٹیج اور اسکرین کی مانی ہوئی ایکٹریس۔ ہیروئن تھی۔

''اور جب میں اور حسن وارد ایمن اس کے فلیٹ میں وقت بے وقت یونہی پہنچ جاتے تھے تو۔

''وہ کیلے، چیکو اور سنگتروں سے مدارات کرتی تھی، خود کاٹ اور چھیل کر سامنے پلیٹ میں رکھتی تھی۔'' تلمیذ جھینپ جاتا۔

''بڑی اچھی عورت تھی۔ وہ فلم اگر ریلیز ہو جاتی تو دونوں کا مقدر بدل جاتا، لیکن گورمنٹ نے بیچ میں آ کر روک دیا۔''

''اتنی اچھی عورت تھی کہ اسٹوڈیو جانے سے پہلے دیوی کی مورتی اور پتی کی تصویر کے سامنے سر نما کر جاتی تھی۔ میری سوت۔''

پہلی بار جب میمونہ نے اندو رام رتنم کے لیے سوت کا لفظ استعمال کیا تو وہ خود تو کچن میں پکانے، ریندھنے چلی گئی لیکن تلمیذ کو کیپیٹل سٹی کے دنوں کی یاد میں چھوڑ گئی۔ تب اُسے پہلی بار احساس ہوا واقعی مجھے اُس سے پریم ہو گیا تھا۔ ذرا ہوا سا۔''

اس نے بے قرار ہو کر آواز دی: ''میمو۔ میمو ادھر آؤ۔'' اور جب وہ کچن سے گھبرائی ہوئی نکل کر اس کے پاس پہنچی تو تلمیذ نے اسے اپنے پاس کھینچتے ہوئے کہا:

''تمہیں معلوم ہے اب تک میں سمجھتا تھا مجھے صرف تین عورتوں سے محبت ہوئی تھی۔''

''پھر کتنیوں سے؟'' اس نے کندھا اچکا کر ایک گال پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''چوتھی آج تم نے اُن میں شامل کردی۔ تسنیم، کسم، دلآرا یعنی ادیبہ اور اندو۔

''اور میں؟''

اگر تم سے محبت کی ہوتی تو تم بھی مجھے نہیں ملتیں۔''

''اور اگر 'نہتے سپاہی' ریلیز ہوجاتی تو آپ وہیں کے ہوکر رہ جاتے۔ لیکن وہاں نہ روشن آپا ہوتیں، نہ میرے بھائی جان ہوتے نہ بھائی صاحب۔''

''پھر؟''

''وہاں کسی اور کے ہوتے۔''

''ادھوری بات۔ اور تم بھی کسی اور کی ہوتیں۔''

''فلم سٹی مائنز میں پروڈیوسر ڈائریکٹر عابد سے لڑائی کے بعد میں انگریزوں کی پرانی راجدھانی چلا گیا تھا۔ وہاں فوج میں بھرتی ہوا اور کیپٹن تھا کہ ائربیس میں روئل برٹش ائرفورس والوں نے بغاوت کردی۔ اور وہاں سے چھپ کر جو بھاگا، as deserter، تو آج یہاں ہوں تمہارے پاس۔''

''نہ میں فلم سٹی مائنز پہنچ پاتی، نہ انگریزوں کی پرانی راجدھانی کے ائربیس میں میری رسائی ہوتی۔ اور وہاں آپ کسی گوری لڑکی کے حصے میں آتے۔''

جو فورم پُر کرنے ہوتے تھے ان میں وہ تعلیم کے خانے میں ہمیشہ بی۔اے درج کرتا تھا اور یہی میمونہ اس کے بارے میں دوسروں کو بتاتی اور لکھتی تھی۔

خود اپنے لیے اس نے ہمیشہ بتایا: باپ بچپن میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ایم۔اے پری ویس انگلش میں کیا تھا، فائنل کرنا چاہتی تھی لیکن عمر نکلی جاتی تھی۔ بھائی نوکری کر کے پڑھا رہے تھے، ہم لوگ معمولی حیثیت کے لوگ ہیں۔ فائنل کی فیس میں ہمیشہ کی طرح وقت پیش آرہی تھی۔ روشن آرا آپا نے مالی مدد کرنی چاہی، بھائی اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ روشن آرا آپا نے اپنے رشتے کے دیور سے شادی کرادی۔ میں ہر طرح سے خوش ہوں۔

جلد ہی تمکید نے اعتراف کرلیا اگر زندگی اسی نہج پر چلانی ہے تو اتنی آمدنی کافی نہیں ہے۔ 'اسکولوں کالجوں کو فرضی سامان مہیا کرنے والی پونجی اگر چھپا کر رکھی ہوتی تو وہی کام دیتی۔'
لیکن اندر کے انسان نے فوراً ہی سوال کردیا: 'کتنے دن؟'
ہاں یہ ممکن ہے اگر ویسا سودا پھر ہوجائے۔ ہمیشہ کے لیے نہیں، بس چند ماہ کے لیے۔'
لیکن اندر کے انسان نے ڈپٹ دیا: 'اپنی تو بہ تلا یاد ہے؟'

سیکنڈ ہینڈ کار کا خریدنا اُسے اتنا نہیں کھلا تھا جتنا اس کے لیے ڈرائیور رکھنا۔ خود اس شہر کی گھنی اور مستقل بڑھتی ہوئی آبادی میں ڈرائیو کرنے کی ہمت وہ خود میں پیدا نہ کرسکا ___ جس طرح تیرنے اور سمندر میں نہانے کی۔ میمونہ نے کہا ''میں ڈرائیونگ سیکھ لوں۔''
اس نے منع کیا ''ہرگز نہیں۔ میں رنڈوا نہیں ہونا چاہتا۔''
اس کا کہنا تھا ''جس دن میں نے پہلی بار کار چلائی تھی اس رات میں نے خود کو املی کے پیڑ پر چڑھ کر املی کے کتارے توڑتے دیکھا جس ٹہنی کو میں نے بیلنس کرنے کے لیے ہاتھ بڑھا کر پکڑا تھا اس پر سرخ اور نیلے رنگ کا بہت بڑا گرگٹ بیٹھا مجھے دیکھ رہا تھا جیسے مجھ پر زہر کی گولی پھینکنے والا ہو۔ پھر جب شاخ سے گرا تو آنکھ کھل گئی۔ پسینے پسینے تھا اور تم سو رہی تھیں۔''
میمونہ نے کہا ''مجھے جگا دیتے میں اُسے مار کر بھگا دیتی۔''
تمکید ناراض ہوگیا: ''تمھیں میری بات کا یقین نہیں ہے۔ گرگٹ کا زہر بہت برا ہوتا ہے۔ بڑا کینہ رکھنے والا جانور ہے۔''
میمونہ ہاں میں سر ہلاتی رہی۔
''ہم اسکول کے زمانے میں گرگٹ کو مار کر اس پر پیشاب کیا کرتے تھے - مارنے والے سارے لڑکے باری باری سے۔''
میمونہ نے اثبات میں سر ہلایا۔
''ورنہ وہ زندہ ہوکر بدلہ لیتا ہے۔''

میمونہ نے پھر سر ہلایا کہ وہ متفق ہے۔

میمونہ بچے کو نرسری بھیجنا چاہتی تھی اور اس سے آگے آئرش مشنری اسکول میں۔ ''کار اور ڈرائیور اُسے لانے لے جانے کے لیے بھی چاہیے ہوں گے اور آپ کو آفس لے جانے وہاں سے لانے کے لیے۔''

مالی حالت سدھارنے کے پلان جب تمیز نے بنانے شروع کیے تو وہ سب کے سب وہی تھے جن سے وہ آشنا تھا اور اس کے آزمائے ہوئے تھے۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا کب ایک بار پھر وہ وہی تمیز تھا برٹش زیرِ حکومت عرب بندرگاہ (protectorate) اور وہاں سے جان بچا کر کھاڑی کے شہر بھاگ کر آنے والا تمیز! عرصہ بعد ریٹائرڈ جج عبدالقدیر کے الفاظ اُسے سنائی دیئے: ''اب نہیں ہے۔'' اور اس کا کہنا: ''کیا؟'' - ''میرا خیال ہے کہ اب برٹش پروٹیکٹوریٹ نہیں ہے۔ آزاد ہو چکا ہے۔''

تمیز نے ایک دن کہا ''کار ہمیں بیچنی پڑے گی۔''
میمونہ نے کہا ''کوئی حرج نہیں ہے۔''
اور جب کار بک گئی - جس کے چلے جانے پر نجم بلک بلک کر رو یا ''اب میں اسکول کیسے جاؤں گا۔ ہم سمندر کیسے جایا کریں گے۔'' تو پہلے تو تمیز نے پیار محبت سے سمجھایا پھر چیخ کر بولا ''سب کے پاس کار نہیں ہوتی ہے، نہ تمہاری ماں اپنے ساتھ -''
میمونہ نے اس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ نجم خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ گیا۔

میمونہ گھر بدلنے کو تیار تھی کسی کم کرائے کے مکانوں کے علاقے میں، لیکن تمیز اپنے معیار کو نہیں گرا سکتا تھا۔ بس کار اور ڈرائیور سے گلو خلاصی اس کے نزدیک گھر کی گرتی ہوئی عمارت کو استحکام دینے کے لیے کافی تھا۔

کار کے چلے جانے کے بعد میمونہ خوش تھی تمیز شام کو اس وقت گھر لوٹنے لگا تھا جو دفتر کے بند ہونے کا ہوگا اور اس کے منھ سے وہ عجیب بُو بھی آنی بند ہوگئی تھی جس سے شادی سے پہلے وہ ناواقف تھی لیکن جسے ہر عورت پہلی ہی بار بوجھ لیتی ہے کہ کیا ہے۔

وہ خود ایک بار بھی تمیز کے دفتر نہیں گئی تھی، نہ اس نے وہ چیزیں دیکھی تھیں جن کا ذکر شادی کے شروع کے دنوں میں تمیز جبار بھائی کے ذکر کے ساتھ محبت میں ڈوب کر کرتا تھا۔ وہ جانتی تھی ٹائپ رائٹر کتنا بڑا ہے، کس میز پر رکھا ہے۔ اوفس ٹیبل کہاں رکھی ہے، اس کی پشت پر جو کھڑکی ہے وہاں سے کیا نظر آتا ہے، اور وہ گھر کا قالین جو مرحومہ نصرت بھابھی نے دیا تھا کیسا ہے۔

سب کچھ ٹھیک ہوگیا تھا، لیکن تمیز کی ضرورتیں نہیں سمٹی تھیں۔ کچھ درست، زیادہ نادرست۔ بلکہ بڑھ گئیں۔ شراب ضرورت کی ساتھی تھی، جو اچھوتی بے وجہ مانی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ۔ اور دونوں ہی کام گھر پر ہورہے تھے۔ ایک طرح سے اس کا گھر حسن وارد ایمن کی رشتے کی خالہ کا گھر بنتا جارہا تھا گو اس حقیقت کو ماننے کے لیے وہ تیار نہ ہوتا۔ A casino'۔

میمونہ نے یہ نہیں کہا یہ کام کہیں اور کرو کیونکہ جانتی تھی اس کا نتیجہ اور بہت سی رعایتوں کا دینا ہوگا۔

تمیز نے کئی بار ان نئے دوستوں کے چلے جانے کے بعد کہا ''مجھے تمہارے سوا کسی اور عورت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لوگ بگڑے ہوئے ہیں، سامنے پلیٹ بھر کھانا ہے لیکن برابر والے کی پلیٹ سے نظر چوکتے پر بوٹی اڑا لینا ان کا شیوہ ہے۔'' اور یہی بات اس نے اکثر صبح سو

' قمار خانہ

کر اٹھنے پر کہی۔

اس معاملے میں میمونہ کو تکمید کی بات کا اعتبار تھا۔لیکن جب وہ یہاں نہیں ہوگی تکمید کے مہمان اس کے بیڈروم کو کس مصرف میں لائیں گے اس کا اُسے کھٹکا تھا۔ کتنی ہی چھٹیاں نجم کی آئیں وہ میکے نہیں گئی، کئی عید، بقرعید آئیں وہ بھائیوں کے بلاوے کو گول کر گئی۔ کچھ بھانپ کر ہی دونوں بھائی اس کے گھر بار بار نہیں آتے تھے۔ بغیر بتائے آدھمکنا انہوں نے کسی وجہ سے مناسب نہ جانا۔

ایک بار تکمید نے پوچھا "تمہارے بھائی پہلے آتے تھے اب کیوں نہیں آتے؟" اور جب میمونہ چپ رہی تو ڈرتے ڈرتے کہا "انہیں شک ہو گیا ہے؟"

میمونہ نے کہا "مجھ سے اس گھر کا حال نہ کبھی کسی کو معلوم ہوا تھا، نہ ہوگا۔"

جس وقت بیٹھنے کے کمرے میں جوا ہو رہا ہوتا، بچے اگر سو نہ رہے ہوں میمونہ انہیں ہوم ورک میں لگا دیتی تھی یا خود پڑھانے بیٹھ جاتی۔ اُدھر سے اونچی آواز میں کئی ایک جواریوں کا ایک ساتھ بولنا سنائی دیتا جس میں تہذیب سے گرے ہوئے الفاظ بھی ہوتے تھے۔ سب ایک دوسرے سے تم کہہ کر بات کر رہے ہوتے تھے اور اگر پتوں پر بحث ہونے لگے تو تو تو پر آجاتے تھے۔ قہقہے لگتے، لوگ بار بار اٹھ کر ٹوئلٹ میں پیشاب کرنے جاتے اور فلش کرنا بھول جاتے، دوبارہ آکر بیٹھتے اور کچھ دیر کے لیے اتنی خاموشی ہو جاتی کہ دھیمے سے کرسی کھسکانے کی آواز بھی سنائی دے جاتی۔ کچھ ہی دیر بعد پھر شور بلند ہوتا۔ خاموشی اور شور کی یہ الٹ پھیر سہ پہر سے رات بارہ بجے تک چلتی، اتوار کے دن گیارہ بجے سے جب تک بھی چلے۔

ایک دن میمونہ نے سنا تکمید نے کسی کو اونچی آواز میں کہا "تم چور ہو" اور یہی دوسرے آدمی نے کہا۔ تکمید کی آواز آئی "تو پشتینی چور ہے۔" دوسرے آدمی نے کہا "تیرے باوا دادا چور ہوں گے میں کیوں ......" اپنی بات وہ پوری نہ کر سکا۔

ایسی تکرار جب اندر سنائی دیتی تھی وہ نجم اور روز کو باتوں میں لگانے کی کوشش کرتی تھی۔ اس

وقت نجم ماں کی مدد سے میتھمس (حساب) کے سوال کر رہا تھا اور روز ججے یاد کر رہی تھی۔ دونوں بچوں کا چہرہ فق تھا۔ میمونہ نے انہیں باتوں میں لگانے کی کوشش کی۔ نجم اور روز نے ایک ساتھ کہا: ''میں تو میتھمس کے سم کر رہا ہوں آپ مجھے اسپیلنگز یاد کرانے لگیں ــــ مم میں نہیں سمجھ رہی آپ کیا کہہ رہی ہیں۔''

اس وقت وہ ہمیشہ کی طرح سر نیچے کیے چپکے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ دونوں بچوں نے بھی آنکھیں نیچی کر لیں۔ اس اثنا میں تمیز سب انسپکٹر پولس سے گتھ چکا تھا۔ انسپکٹر ان پینے والوں میں سے تھا جو پی کر روتے ہیں، فطرتاً ڈرپوک ہوتے ہیں اور زیادہ پی کر بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ تمیز ایسے پینے والوں کا الٹ تھا۔ پی کر اسے غصّے کو ضبط کرنا پڑتا تھا کہ جس پر غصہ آ رہا ہو اُسے مارنا نہ شروع کر دے۔ تھوڑی دیر میں انسپکٹر کی اوپر کی یونی فورم تمیز کے ہاتھ میں تھی۔

دوسروں کی آوازیں آئیں: ''تمیز کھیل کو کھیل کی طرح کھیلو۔ تم تو اُسے پلاسی کا میدان بنا دیتے ہو۔''

''بلکہ ڈائین بائن پھو۔'' [1] کسی نے بات کو مذاق میں اڑانا چاہا۔

تمیز نے چیخ کر کہا: ''جس میں ہزار بارہ سو ایک کی جیب سے نکل کر دوسرے کی جیب میں پہنچ جائیں اُسے تم کھیل کہتے ہو! یہ نہ کوئی کھیل ہے نہ میدان جنگ۔ یہ اسٹوک ایکسچینج ہے اور ایمانداری مانگتا ہے۔ اب یہ چور اگر باہر جا کر اپنے سر میں ایک گولی اپنے سروس پسٹل کی اتار دے تو سمجھو کھلاڑی ہے، ورنہ مونچھ منڈا ......''

تمیز اُسے مارتا پیٹتا گھر سے باہر لے جا رہا تھا۔ مین گیٹ کے نزدیک پہنچ کر انسپکٹر اپنی جگہ پر گڑ بڑ کر رہ گیا۔ اس سے زیادہ وہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ حد سے زیادہ پیے ہوئے تھا۔

جس کے ہاتھ میں اس کی یونیفورم تھی اس نے اُسے پہنائی۔ باقی سب نے اُسے ٹیکسی میں بٹھا کر رخصت کیا اور خود بھی وہیں سے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

---

[1] Dien Bien Phu، ویت منہ نے جہاں فرانسیسی سپاہ کو شکست دی تھی ۱۹۵۴ء

اگلی صبح انسپکٹر اس کے دروازے پر موجود تھا۔ جو سپاہی وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا گیٹ پر کھڑے رہے۔ تملیذ اندر سے سہا ہوا تھا لیکن صب انسپکٹر سے تپاک سے ملا اور اندر لے جا کر صوفے پر بٹھایا۔

''بھائی نہ تم ہوش میں تھے، نہ میں۔ کہاں کا جھگڑا۔ یاد رکھو سیاست کی طرح شراب اور جوئے میں کوئی مستقل دشمن نہیں ہوتے ہیں۔''

''نہ مستقل دوست۔'' انسپکٹر نے افسریت سے کہا۔ اندر سے وہ بھی ڈرا ہوا تھا اور نہیں چاہتا تھا بات ساری پولس فورس کے سامنے کھلے۔ تملیذ نے وہسکی کی بوتل اور دو گلاس وہیں کارڈ ٹیبل پر لا کر رکھے۔ اس کے لیے انڈیلی اور اپنے لیے۔ خود چیرز کیا اور انسپکٹر کو پینے پر مجبور کیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد میمونہ نے پوچھا ''آپ کو پچھتاوا نہیں ہوتا ان 'episodes' کے بعد؟''

تملیذ نے کھوکھلی ہنسی سے کہا: ''اُسے ابا اور بڑے بھائی جان نے میرے وجود سے خارج کر دیا تھا۔''

''اور کیا ساری زندگی خارج رہے گا؟''

''ہاں۔ شاید''

''آپ کی چیز تھی، اُسے واپس لائیے۔'' پھر اس نے ڈرتے ڈرتے کہا ''ایسا نہ ہو پچھتاوا آپ کے بچوں کے نفس سے بھی خارج ہو جائے۔''

بات نہ بننے پر اس نے دیوار کی طرف کروٹ لے لی اور جھوٹے خراٹے لینے لگا۔

تملیذ ہر پرانے جواری کی طرح یہ ماننے کو تیار نہیں تھا تقدیر اگر نئے قمار باز کا ساتھ دیتی ہے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی اسی روش پر نوسیکھیوں کو نوازتی جاتی ہے۔ یہ نہیں

---

[1] واقعات

کہ جسے ایک دفعہ نوازا ساری زندگی اسی کو نوازتی رہے۔
احتراز کے سنجیدہ لمحوں میں وہ کہہ چکا تھا "جانتا ہوں جوئے باز کی قسمت چکلے میں بیٹھنے والی ایسی عورت ہے جو ہمیشہ جوان، بلکہ نوجوان، مر مٹنے والے چاہتی ہے۔"

انسپکٹر والے معرکے کے بعد جواریوں نے آنا بند کر دیا۔ تمکینؔ خاموش رہنے لگا۔ قالین پر لیٹا ہوتا اور روز برابر میں اس کے بازو پر سر رکھ کر انگوٹھا چوسنے لگتی۔ وہ اگر پیٹ پر بھی چڑھ جاتی تو تمکینؔ کچھ نہ کہتا۔ نجم اب اس سے اتنا آزاد نہیں رہا تھا۔ دونوں ہی نے فرمائشیں کرنا چھوڑ دیا تھا۔ انسپکٹر کی شراب سے تواضع کے بعد تمکینؔ نے پینی چھوڑ دی تھی۔
پچھتاوے والی بات اس کے دماغ میں بھونرے کی طرح بھنبھنا رہی تھی۔ ایک دن جب میمونہ پاس سے گزری تمکینؔ نے کہا "نماز پڑھ کر دوپٹہ اس طرح فرش پر بچھا دو کہ تمہارا سر ڈھکا رہے۔"
میمونہ خاموش رہی۔ پھر وہ اس کے بتائے ہوئے طریقے سے وضو کر کے باتھ روم سے لوٹا۔ کھڑے ہو کر کانوں کو ہاتھ لگا کر منھ ہی منھ میں کئی دفعہ اللہ اکبر کہا اور دوپٹے پر سجدے میں چلا گیا اور کافی دیر اسی حالت میں رہا۔ میمونہ کے چہرے پر جو مسکراہٹ اس کے قیام سے سیدھے سجدے میں چلے جانے سے پیدا ہوئی تھی اگلے ہی لمحے حسرت میں بدل گئی۔

(۴۴)

ملک میں حکومتیں بغیر کچھ کہے سنے بدلتی رہتی تھیں اور اس ردوبدل میں لوگوں کی دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ ان ہی دنوں ملک میں حکومت نے پھر پلٹا کھایا تھا۔ سول، نیوی اور آرمی کی حکومتیں جا چکی تھیں اس دفعہ، گھانا کی طرح ائرفورس کے ایک سینئر افسر، ائر کموڈور، نے کو coup d'etat کیا تھا اور اس پر کسی کو تعجب نہیں تھا، اعتراض ضرور تھا، بے ضرر سا اعتراض۔ ایک خاموش معاہدے کے تحت لگتا تھا یہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ عوام اگر ان تبدیلیوں سے مطمئن نہ ہوتے تو کہاں جاتے!

نئی حکومت اپنی کارکردگیوں سے عوام کے جوش کو، اگر وہ برٹش حکومت کے جانے کے بعد سے تھوڑا بہت بچ رہا تھا، ٹھنڈا کرنا چاہتی تھی۔ بینکوں میں اکاؤنٹس چیک کیے جا رہے تھے، باہر کس کا کتنا اندوختہ تھا اور کیسے باہر پہنچا تھا جب قانون موجود تھا کہ کوئی ملک کا شہری، اگر اس کی سکونت عارضی طور سے باہر نہ ہو، ملک سے باہر اکاؤنٹ نہیں رکھ سکتا ہے۔ جو مال امپورٹ کیا گیا تھا ان کے کاغذات، اندراجات چیک کیے جا رہے تھے۔ دکانوں میں جو مال تھا رجسٹروں میں بھی موجود تھا یا نہیں؟ بزنس والے چھپا کر اپنے دفتروں سے کاغذات گھر لے جا رہے تھے جہاں جا کے وہ جلائے جاتے تھے اور راتوں رات نئے رجسٹر بنتے تھے۔ جو کلرک اکاؤنٹس کا کام جانتے تھے انہیں آمدنی کا نیا ذریعہ مل گیا تھا، جو سمجھ دار تھے اس سب کو

nuisance(وقتی زحمت) سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہے تھے۔ اکثر بزنس مین نمائی بیٹھے تھے۔ لوگ سڑک کے کنارے دیوار کی طرف منھ کر کے پیشاب کرنے پر پکڑے جا رہے تھے، اگر سڑکوں پر پیشاب گاہیں نہیں تھیں تو انہیں گھر سے حوائج ضروری سے فارغ ہو کر نکلنا چاہیے تھا۔ ٹیکسیوں کے میٹرز کی چیکنگ ہو رہی تھی، بسوں اور سینماؤں میں سگریٹ پینے پر جرمانہ تھا اور بعض گھروں پر چھاپے پڑ رہے تھے کہ یہاں چھپا ہوا سونا ہے۔

ایک رات تمیذ کے گھر پر چھاپا پڑا۔

گھنٹی بجا کر، پسٹل ہاتھ میں لیے، بغیر اجازت طلب کیے اندر گھس آنے والے ونگ کمانڈر نے کہا "گھر کے چاروں طرف فوج کے جوان اور پولس کے سپاہی ہیں، کوئی بھاگنے کی کوشش نہ کرے ورنہ فائرنگ کا شکار ہو جائے گا۔"

تمیذ نے بناوٹی اعتماد سے کہا "کوئی سے مراد ہے میری بیوی اور بیٹا، بیٹی جو اسکول جاتے ہیں؟"

ونگ کمانڈر نے کہا "نہیں آپ اور دوسرے مرد۔"

"دوسرا مرد میرا بیٹا ہے، وہ آپ کے سامنے سو رہا ہے۔"

وہ نہ ہنسنے کا عہد کر کے گھر میں داخل ہوا تھا۔ تمیذ نے سگریٹ کیس کھول کر اس کے سامنے کیا اور اس کی اس میں دلچسپی نہ دیکھ کر خود سگریٹ سلگائی۔ ان لوگوں نے ایک ایک چیز کو چیک کیا۔ ونگ کمانڈر کے کہنے سے ہر صوفے پر ایک وردی والا کود کر بیٹھا اور اچھلنے لگا۔ بکسوں کی تلاشی ہوئی۔ مچھلیوں کا ٹینک جس چاروں طرف سے بند اسٹینڈ پر رکھا تھا اس کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی، نہ پانی کے ٹینکوں کو جا کر چیک کرنے کی طرف۔ چلتے وقت ونگ کمانڈر نے تمیذ اور میمونہ سے کہا "سوری، ہمیں غلط اطلاع ملی تھی کہ یہاں اسمگلڈ گولڈ ہے۔"

تمیذ نے بے دھیانی سے کہا "نہیں، یہ میری لائن نہیں ہے۔"

"کیا؟" ونگ کمانڈر کے منھ سے حیرت میں نکلا۔

"سونے کی۔" کہنے وہ جا رہا تھا سونے کے اسمگلنگ کی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد جب تلمیذ ہنستا ہوا لیٹنے جا رہا تھا میمونہ نے کہا "سوال یہ ہے اس علاقے میں اتنے گھر ہیں ہم پہ ہی شبہ کیوں ہوا؟ کسی اور گھرانے پہ نہیں؟"

تلمیذ نے کہا "ہم پہ نہیں، مجھ پر۔ اس لیے کہ مجھ پر مجرم ہونے کی چھاپ لگ چکی ہے، جیسے تم عورتوں کے معاملے میں شک کرتی ہو۔"

"میں تو نہیں کرتی۔"

"تم نہیں، دوسری عورتیں جن کے شوہر ہرجائی ہوتے ہیں۔ ان پر۔"

تھوڑی دیر بعد ہی میمونہ کو احساس ہوا میں نے ناحق ایک دکھتی رگ کو چھیڑا۔ لیکن اس چھاپے نے اس کے اوسان خطا کر دیئے تھے۔ پاس جا کر اس نے کہا "معاف کر دیجئے، میں ان لوگوں کے آنے سے چڑ گئی تھی۔"

تلمیذ نے کہا "شادی کے بعد سے آہستہ آہستہ تمہارے لیے میں بدل گیا ہوں، لیکن میرے لیے تم نہیں بدلی ہو۔ آج جو تم کہہ بیٹھیں بہت پہلے کہہ دینا چاہیے تھا۔ مجھے ڈر ہے اب میں نہیں سنبھل سکوں گا۔ اس بڑے پتھر کی طرح ہوں جو ایک بار پہاڑ سے ٹوٹ جانے پر رُک نہیں سکتا ہے، گرتا ہی جاتا ہے، یہاں تک کہ جہاں اونچائی ختم ہوتی ہے وہاں جا کر پڑ رہتا ہے۔"

وہ غمزدہ تھا لیکن وہ رو رہی تھی۔

دن گزرتے جا رہے تھے اور مہینوں بعد بھی پرائیویٹ دفتروں، ہول سیل کی دکانوں میں کام نہیں تھا۔ اب لوگ موجودہ حکومت کے بدلنے اور پھر سے سویلین حکومت کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک دن تلمیذ دفتر میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ مرتضیٰ قریشی اسی بے تکلفی سے آ کر ملا جس سے شان الٰہی اور غیور والی سازش سے پہلے ملا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو دوست تھے۔ تھوڑی دیر ہنسی مذاق ہوا پھر مرتضیٰ قریشی نے کہا "بے کار بیٹھے بیٹھے تھک گئے ہیں، تاش ہمارے ساتھ ہیں تم منگواؤ۔"

تلمیذ نے کہا "نہیں یہ کام یہاں نہیں ہوسکتا ہے۔"

''گھر پر بھابھی ناراض ہوں گی۔''

تمیز نے کہا ''نہیں وہ ناراض نہیں ہوتی ہیں۔ نظروں کے سامنے رہتا ہوں اس لیے۔'' اور ہنس پڑا۔

مرتضیٰ قریشی نے اپنے ساتھیوں سے کہا ''خوش قسمت آدمی ہے کیا بیوی ملی ہے اسے۔ تمیز تم اس کے پیر دھو دھو کے پیا کرو۔''

''وہ کام تمہارے کرنے کا ہے۔'' تمیز نے کہا۔ ''اس لیے کہ تمہاری ماں ہے۔''

کچھ دیر بے وجہ کی ہنسی ہوئی۔ پھر مرتضیٰ قریشی نے اپنے دوستوں کی طرف دیکھ کر کہا ''کئی دفعہ کہہ چکا ہوں تمیز تمہاری چھوٹی سی تو فیملی ہے اس کے لیے دو بیڈ روم کافی ہیں، تیسرے میں مجھے paying guest کے طور پر رکھ لو۔ تمہارا ایگل ورک فری۔''

تمیز نے کہا ''جب تمہاری بیوی مع سامان کے تمہیں سڑک پر پھنکوا دے تب میرے پاس یہ درخواست لے کر آنا، اور میں اُسے رد کر دوں گا۔''

تمیز کو پتہ ہی نہیں چلا کیسے ایک بار پھر وکیل مرتضیٰ قریشی اور اُس جیسے دوست اس کی زندگی میں داخل ہوئے۔ جس طرح ایک دن اچانک خون کی الٹی کر بیٹھنے پر کسی کو پتہ چلتا ہے اس نے کیا مرض لگا لیا ہے۔ لیکن کیسے، کب اور کہاں لگایا تھا ایک ایسے ملک میں بسنے والا اس کا کیا اندازہ لگا سکتا ہے جہاں وہ مرض ہر تیسرے چوتھے آدمی کو ہو۔

اگلے دن تیسرے پہر مرتضیٰ قریشی انہی دو دوستوں کے ساتھ تمیز کے گھر آیا۔ انہیں گیٹ پر ٹھیرنے کے لیے کہہ کر تمیز نے بیٹھنے کے کمرے کے دروازے میں رک کر میمونہ کی طرف دیکھا۔ بے وقت گھنٹی کی آواز پر ہی اسے دل سینے میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا، تمیز کی نظروں نے اس سے قوت گویائی سلب کر لی۔ وہ بچوں کے ہوم ورک کی کاپیاں سمیٹتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی بچے اپنے سونے کے کمرے میں چلے گئے۔ اتنے دن بعد پھر وہی آفت آ گئی تھی جس کا اثر پچھلے چند مہینوں میں کم ہو گیا تھا، مٹا نہیں تھا۔

مرتضیٰ قریشی اسے بلیک میل کرنے والا اپنا ڈنک کھو چکا تھا۔ تکمید کے مقدمے میں وہ پورے وقت ڈرتا رہا تھا کوئی وقت جاتا ہے اُسے بھی ریٹائرڈ جج عبدالقدیر کی جرح کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس دفعہ وہ زیادہ مہذب انسان نظر آتا تھا۔ اور تکمید نے ایک بار پھر اُسے دوستی کے لیے قبول کرلیا۔

یہ لوگ آ کر سٹنگ روم میں بیٹھے، تاش اور شراب کی بوتل ساتھ لے کر آئے تھے اس لیے کھیل کے شروع ہونے میں وقت ضائع نہیں ہوا۔ نہ تکمید کو اندر جا کر کسی چیز کی فرمائش کرنی پڑی۔ جب وہ لوگ گیارہ بجے گئے تکمید کو سر ہلکا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اتنے دنوں سے اسی دن کا انتظار کر رہا تھا۔

جن لوگوں نے مرتضیٰ قریشی کے ساتھ آنا شروع کیا تھا انہیں میمونہ پسند نہیں کرتی تھی۔ جب یہ لوگ جاتے تھے رات کے بارہ ایک بجے ایش ٹریز اوپر تک سگریٹ کی باقیات سے بھری ہوتی تھیں۔ بعض سگریٹ کے آخری حصے کو چائے کی پیالیوں میں بچی ہوئی چائے میں ڈبو کر بجھاتے تھے، اور یہ صرف وہ عورت جانتی ہے جسے بعد میں پیالیاں دھونی ہوتی ہیں کہ ایسی تھپھت کو مجبوری درجے دیکھنا اور اس کی بُو کا نتھنوں میں جانا جی کر متلا کر رکھ دیتا ہے۔ یہی نہیں اُسے ٹوئلٹ میں جا کر کموڈ کو بدبو مارنے کا پاؤڈر ڈال کر کئی بار فلش کرنا پڑتا تھا کیونکہ ان میں سے ہر ایک کو شراب پی پی کر شاید کئی بار وہاں جانے کی حاجت ہوتی تھی اور فلش کرنا انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ خود بیٹھنے کے کمرے سے ملحق ٹوئلٹ کو استعمال نہیں کرتی تھی، بعد میں اس نے بچوں کو بھی اس میں جانے سے روک دیا:

پہلی دفعہ منع کرنے پر نجم نے پوچھا تھا: ''کیوں مما؟ اس لیے کہ اس میں پپا کے دوست جاتے ہیں؟''

''اس لیے کہ، اس لیے کہ وہ لوگ.... '' اس سے زیادہ اس کے مُنھ سے نکلنے نے انکار کر دیا۔

کھانے کی میز اب صرف ان لوگوں کے کام آتی تھی — پینے اور جوا کھیلنے کے۔

قالین پر سگریٹ سے جلنے کے داغ اور شراب کے دھبے اس سے اُس شوق اور مسرت کو چھینے لے رہے تھے جو بیاہتا زندگی اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ انہیں دیکھ کر پہلے چند دن وہ رو پڑی۔ پھر جب آنسوؤں نے ساتھ دینا بند کر دیا تو اس نے اونچی آواز میں تمکید کے سامنے کہا:
''گھر پر نیستی چھاتی جا رہی ہے۔''

نیستی تمکید کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ اُسے صرف خرچہ منہ پھاڑے نظر آتا تھا جو ہوش کے لوٹ آنے پر گھڑیال کی طرح منھ کھولے اس کی طرف بڑھتا تھا۔ میمونہ کی خفگی، روٹھنا، آنے والے دنوں کا اس کا خوف یک طرفہ ہو کر رہ گیا تھا۔

تمکید کے حکم سے میمونہ اور بچے بڑے کمرے میں نہیں آتے تھے۔ چھٹی کے دن دس بجے سے تین چار بجے تک، اور روزانہ شام کو اُدھر رہتے تھے جدھر آنے والوں کی نظر اُن تک نہیں پہنچتی تھی۔

مرتضیٰ قریشی ایک دن بے وقت اوفس میں آیا۔ تمکید اکیلا بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ تھوڑا بہت جتنا کام اوفس کا تھا ختم کر چکا تھا، اب وہ پھر ایل سی بیچنے والا سوداگر تھا، کام کرنے کا شوق (impetus) کب کا ختم ہو چکا تھا: نہ کاروبار کو آگے بڑھانے کی استطاعت اس میں تھی نہ ارادہ۔

مرتضیٰ قریشی نے کہا: ''آخر تم اتنے دکھی کیوں رہنے لگے ہو؟ خدا کا دیا سب کچھ تو ہے۔''
''خدا کا دیا سب کچھ نہیں ہے۔ بس یہی دکھ ہے۔''
''واہ استاد، بیوی ہے، بچے ہیں اور کیا چاہیے؟ ہمیں دیکھو بیوی ہوتے ہوئے بھی بیچلر ہیں۔ پھر بھی چہرے سے محرومی نہیں لگتے ہیں۔''
''بیوی بچوں کو ہوا پر تو زندہ نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ مہنگائی تمہیں نہیں ستاتی؟''
مرتضیٰ قریشی نے جھوٹے قہقہے کے ساتھ کہا ''بس اتنی سی بات! چلو اس کا بھی بندوبست ہوا جاتا ہے۔''

''کہاں اور کیسے؟'' تمیز نے سگریٹ بٹ کو ایش ٹرے میں رگڑتے ہوئے کہا۔

''تمہیں سردار اورنگ تاز سے ملواتا ہوں۔ وہ تمہیں کوئی کام دے گا۔''

''وہی جعلسازی کا؟'' تمیز نے اپنی رضا سے ڈوبتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار۔ مردوں کا سا۔ وہ اشراف میں سے ہے۔ اپنے قبیلے کا چیف ہے وہ ایسے کام کیوں کروانے لگا۔ جو بھی کروائے گا اس میں تمہیں اس کا تحفظ ہوگا۔''

''جیسے پچھلے کام میں تمہارا تھا'' تمیز نے ہلکے سے طنز سے کہا۔

مرتضیٰ قریشی نے بے حیاؤں والا قہقہہ لگایا: ''ہمارا اس سے کیا مقابلہ! اس کے ہاتھ میں طاقت ہے اپنی بھی اور قانون کی بھی۔''

''کرنا کیا ہوگا؟'' تمیز نے آلسی سے کہا۔

''اس کے مرید بنو گے۔''

''تم جانتے ہو میں دین تیاگا آدمی ہوں۔''

''مرشد مریدوں کو کب نماز روزے حج کا حکم سناتے ہیں۔ اگر ایسا کریں تو مرید ڈائرکٹ خدا سے لو لگا لیں۔ مرشد کا رول ختم ہو جائے۔'' اس نے دادطلب نظروں سے تمیز کو دیکھا ''اس کے مرید ہر مذہب والے ہیں۔ ہندو، عیسائی، مسلمان سب، پارسی بھی۔ اس کا علاقہ بڑے طول و عرض میں پھیلا ہے۔ سال میں دو بار اس کا دورہ کرتا ہے۔ اپنی رعیت کے فیصلے کرتا ہے۔ دیوانی، فوجداری دونوں۔''

''تب ہی تمہارا دوست ہے۔''

''ہاں۔'' مرتضیٰ قریشی نے بغیر طنز کو سمجھے کہا ''لیکن مجھ سے مشورے نہیں لیتا ہے۔ میں اس سے مشورہ لیتا ہوں۔ اس کے پاس کیس آتے ہیں دوسرے کی بیوی بھگانے کے، قتل، زمین مار لینے اور پانی توڑنے کے۔''

''وہ کیسے ٹوٹتا ہے؟''

مرتضیٰ قریشی نے تمسخر سے کہا ''ہتھوڑے سے۔'' پھر بولا ''پھاوڑے سے، جب ایک بل نیل

والا پچھاڑے سے دوسرے کے پانی کو نہر سے اپنی طرف کر لیتا ہے۔ وہ اُن کے فیصلے کرتا ہے، بیماروں کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا کرتا ہے، پھونکتا ہے، ان کے جن بھوت نکالتا ہے۔ مسلم غیر مسلم سب کو تعویذ لکھ کر دیتا ہے۔"

"اور وہ کام کرتے ہیں؟"

"عقیدت ہو تو کام کرتے ہیں۔ نہ ہو تو سنگ اسود پر کھڑے ہو کر مانگی ہوئی دعا بھی اکارت جاتی ہے۔"

"اور اُن سے اس کی کمائی ہے۔"

"جو آدمی مریدوں کے لیے گاؤں گاؤں، کچے راستوں میں اپنی BMW میں پھرتا ہے، شہروں میں مرسیڈس بینز میں گھومتا ہے، جس کے بنگلے اس کی ریاست میں تو ہیں ہی، اس کے باہر بھی ہیں، یہاں بھی سمندر کے کنارے عرب شیخوں کے بنگلوں کے درمیان، تمہارا خیال ہے وہ مریدوں سے تعویذ لکھنے کے پیسے لیتا ہوگا!"

تملیذ نے چپڑاسی سے کھانا لانے کے لیے کہا اور بئر کے چار ٹن۔

مرتضیٰ قریشی نے کہا: "چار سے کیا کام بنے گا۔ چھ منگواؤ۔"

چپڑاسی کچھ دیر کھڑا فرش کو دیکھتا رہا جیسے سوچ رہا ہو اس نے کیا سنا ہے۔

تملیذ نے قدرے سختی سے کہا "جاچکو کیا سوچ رہے ہو!"

چپڑاسی جیسے برق زدگی کی حالت میں تھا: تیرنا سیکھنے کے بعد وہ اُسے ڈوبتے دیکھ رہا تھا۔

مرتضیٰ قریشی نے ایک ٹن اس طرح کھول کر تملیذ کے سامنے رکھا جیسے اس کی ضیافت کر رہا ہو، اور اپنے لیے ٹن کھولتے ہوئے کہا: "اپنی رعیت سے وہ اس وقت ناراض ہوتا ہے جب ان میں سے کوئی کسی سنگین معاملے میں پولیس سے مدد لے۔ سنگین سے سنگین معاملے میں اس کا حکم ہے 'میرے پاس آؤ، مگر تم حرامزادو لڑتے ہو۔ پولیس کو بلاتے ہو اور اُسے پانچ سو ہزار روپے دے کر ایک دوسرے کو گرفتار کرا کے پولیس لوک اپ میں پہنچوا دیتے ہو......

تملیذ کو جھرجھری آ گئی۔

'پھر جب اُسے چھڑواتا ہو تو ہزار ڈیڑھ ہزار پولس کو دیتے ہوئے اور گالیاں کھاتے ہوئے اس کی رعیت اس وقت کہہ رہی ہوتی ہے: بھول ہوئی سرکار، بھول ہوئی۔ اس کے پیر چومتے ہیں، اس کے آگے سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ ایک دن تمہارے اس دوست نے اپنی گنہگار آنکھوں سے اُسے ایک سالٹ ورکس میں کام کرنے والے مزدور کے بیٹے کو شیلنے کی چھڑی سے پیٹتے دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا چھڑی اب ٹوٹی، اب ٹوٹی۔ لیکن وہ بھی سردار اور نگ تاز کی طرح ٹوٹنا نہیں جانتی تھی۔''

''کیوں مار رہا تھا؟''

''ایک اسکینڈل تھا ان کی زندگی کا۔ پی کر رات کو ماموں کے گھر میں گھس گیا تھا جب ماموں گھر پر نہیں تھا۔ سب چاروں طرف کھڑے دیکھ رہے تھے لیکن ایک میں ہمت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر کہے: سردار اب چھوڑیں آئندہ —''

''اپنی بیوی کی طرف بھی نہیں دیکھے گا۔'' تمکینہ نے کہا۔

مرتضیٰ قریشی کا چہرہ جگمگا گیا۔ نئے ٹن کھولتے ہوئے اس نے کہا ''ایک دن چل کر مل لو۔ وہ تمہارے لیے کوئی نہ کوئی کام زیادہ آمدنی والا نکال لے گا۔ بزنس کے ساتھ پارٹ ٹائم جوب سہی۔''

اس شام گھر جاتے ہوئے، جب نشہ اتر رہا تھا، اس نے فیصلہ کرلیا: 'اگر میں اس کے کہے میں آ گیا تو ایک بار پھر یہ مجھ پر حکم چلائے گا۔ اپنی مرضی کے کام لے گا۔ مقدمے کے بعد سے ابھی تو میرا پلّہ بھاری ہے۔ اسے بھاری ہی رہنا چاہیے۔'

مہینے ہو گئے تھے کہ میمونہ نے نہ روشن آرا آپا کو ڈھنگ کا خط لکھا تھا نہ بھائیوں کو۔ بھائیوں کو وہ کئی بار لکھ چکی تھی کہ سب ٹھیک ہے۔ آج کل کام زیادہ ہے بس اس لیے نہ آ سکی ہوں نہ خط لکھ پاتی ہوں۔ اور اس کا مطلب وہ سمجھ چکے تھے کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے لیکن شادی شدہ بہن کے معاملے میں جب تک وہ خود نہ کہے وہ دخل نہیں دینا چاہتے تھے۔

ایک شام مغرب کی نماز سے پہلے میمونہ نجم اور روز کو اپنے بیڈ روم میں پڑھا رہی تھی

اُجب مرتضیٰ قریشی کی آواز آئی: ''مجھے تمہارا گھر اتنا پسند ہے کہ اس میں پیئنگ گیسٹ بن کر رہنا چاہتا ہوں۔''

کسی نے کہا'' کیوں بھابھی پر نظر ہے؟''

'' بکواس بند کرو۔ کھیلنا ہے تو کھیلو، نہیں تو یہاں سے نکلو۔ اس حرامزادے کو اس کی بیوی نے گھر سے نکال دیا ہے تب ہی دوسروں کے گھروں پر اس کی نظر رہتی ہے۔'' یہ تمکید کی آواز تھی۔

''اس کی اپنی بیوی کیسی ہے جو یہ دوسروں کے گھروں میں مُنہ جھلاتا رہتا ہے؟'' کسی نے کہا۔

''ایسی ہے کہ ایک دفعہ اغوا کر لی گئی تھی، مگر جب ریپ کرنے والے نے اس کی شکل روشنی میں دیکھی تو لا کر اس کے دروازے پر پٹخ گیا۔'' کسی اور کی آواز تھی۔

اس سے پہلے کہ مرتضیٰ قریشی جوابی حملہ کرے غصے میں میمونہ اپنے کمرے سے ''شرم نہیں آتی'' کہتی ہوئی نکلی۔ ''اپنی زندگی کی گندگی میں گھر کی عورتوں کو بھی گھسیٹ رہے ہو! تم نالی کے کیڑوں تمہاری جگہ گٹر ہیں وہاں نہیں جہاں تمہارے بیوی بچے رہتے ہیں۔''

اس وقت مرتضیٰ قریشی اور وہ شخص دست و گریبان تھے جس نے ریپ کی بات کہی تھی۔ مرتضیٰ قریشی کا چشمہ زمین پر پڑا تھا، تمکید نے اسے جوتے سے کچلتے ہوئے دونوں کو دھکا دے کر راستے سے ہٹایا۔ ''اور تم کیسے باہر آئیں۔'' کہتا ہوا میمونہ کی طرف بڑھا۔ تھوڑی دیر کے لیے جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ میمونہ کو بیڈروم میں طاقت سے کھینچ کر لے جانے کے بعد تمکید مہمانوں کی طرف متوجہ ہوا: ''نکلو حرام زادوں یہاں سے۔''

کچھ دیر ہنگامہ رہا۔ بھاگنے والوں نے اپنی اپنی بوتل سنبھالی اور دروازے کی طرف چل پڑے۔ تمکید نے ان کے ہاتھ سے بوتلیں جھپٹ کر گیٹ کے اندر کے راستے پر پھوڑ دیں اور ان کے جانے کے بعد اس نے، پہلی بار بیوی پر ہاتھ اٹھایا۔ اس کے مُنہ سے شراب کے بھبکے آرہے تھے۔

نجم بھاگ کر غسل خانے میں چھپ گیا، روز بیڈ پر گھٹنوں اور ہاتھوں میں مُنہ گڑھوئے ''اللہ میاں،

میرے اللہ میاں امی کو بچایئے" کہے جا رہی تھی۔

اگلی صبح جب تمکینہ سو کر اٹھا درد سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے آواز دی "مے مُو، مے مُو" اور جب وہ آئی تو کہا "ذارلنگ پانی اور درد کی گولی۔"

پانی پیتے ہوئے اس نے ہاتھ کے اشارے سے میمونہ کو وہیں رکے رہنے کے لیے کہا۔ تھوڑی دیر میں وہ تمکینہ کے ہاتھوں میں تھی۔

"رات میں بہت پیے ہوئے تھا۔"

میمونہ نے کچھ نہیں کہا۔

"سوری۔" میمونہ پھر بھی چپ رہی۔ "لوتم مارلو۔ جتنا جی چاہے مارلو۔"

میمونہ نے کہا "مارا آپ نے کب تھا۔"

"پھر کس نے؟"

"ایک جوئے اور شراب میں مست انسان نے جسے طیش دلایا گیا تھا۔"

"تو کچھ نہیں کرو گی؟ بدلہ نہیں لو گی؟"

"لوں گی اُسی انسان سے۔"

"ایسا کبھی مت کرنا۔ اس وقت مجھ میں حضرت سلیمان کے اس جن کی روح آ جاتی ہے جو شہزادی صبا کو مع اس کے تخت کے اڑا لایا تھا۔ کبھی نہیں حقیقت میں میں بہت برا آدمی ہوں۔ انسان کا بدترین نمونہ۔ نہ معلوم تمہارے بھائیوں کو کیا ہوا تھا جو وہ تمہیں مجھ سے بیاہنے پر راضی ہو گئے۔"

دیر تک وہ اُسے چپٹائے روتا رہا۔

اور واقعی ایسے لمحے کے آنے سے میمونہ ڈرتی تھی۔ بچے بھی پھر کبھی اپنے باپ سے آزاد نہیں ہوئے۔ نجم بھول ہی گیا کیسے وہ ہائے پوپ کہہ کر اچک کر اپنے باپ کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا تھا۔ روز خاموشی سے کھانا کھا کر اٹھ جاتی تھی۔ کھاتے میں نہ دونوں کا منھ سنتا تھا نہ چاول بیچ میت

پر گرتے تھے۔

ایک دفعہ پٹنے کے بعد نجم نے نیلے صوفے پر کھڑے ہو کر کودنا بند کر دیا تھا۔ وہ صوفہ جگہ جگہ سے بدرنگ ہو گیا تھا اور ایک جگہ اس کا اندر چھپا ہوا اسپرنگ بھی ٹوٹ گیا تھا جو بے خیالی میں بیٹھنے پر چبھتا تھا۔

میمونہ کو احساس تھا تلمیذ اپنے کو رفورم کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اعتماد ہو چلا تھا ایسا کرلے گا۔ وہ ویسا نہیں نکلا تھا جیسا اُسے اس شہر کے ریلوے پلیٹ فورم پر لے کر اترتے وقت لگا تھا — سفلہ عادتوں سے بالا کوئی ہستی جس نے اس کے اس خوف کو دھو دیا تھا جو باپ کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد سے اس پر چھایا رہا تھا، اس پر اور اس کی مرحومہ ماں پر۔ بھائی تھے، لیکن کون لڑکی اُن کے زیر سایہ وہ تحفظ محسوس کرتی ہے جو باپ اس سے، اور اس کی ماں سے، چھین چکا ہو۔ تلمیذ نے ایک نیا تحفظ اس شہر میں لا کر دیا تھا۔ گھر، اس میں جو کچھ تھا اور خود شوہر کی ملکیت کا۔ ایسے شوہر کی ملکیت کا جو ماں باپ کی محبت سے ان کی زندگی ہی میں محروم کر دیا گیا تھا۔ جس کی شخصیت تب سے مستقل ٹوٹتی رہی تھی۔ شادی کی منزل تک پہنچتے پہنچتے وہ ایک نیا انسان بن چکا تھا جو خود پر ہونے والی زیادتیوں کو بھول چکا تھا، اور اُن سے پیدا ہونے والی اپنی کمزوریوں کو بھی۔ ایسے انسان سے اُسے محبت تھی، ہمدردی تھی، اس کا ساتھ وہ زندگی بھر دینے کو تیار تھی۔

اب جو تلمیذ کرنے کے بعد سنبھل رہا تھا اس کا ساتھ بھی وہ دینے کو تیار تھی، اس سے اُسے ہمدردی تھی لیکن تھوڑی زخم خوردہ ہمدردی۔ اُسے اس کا بُرا بھلا سمجھانے کے جتن وہ جان چکی تھی فرسودہ ہو گئے ہیں۔ وہ اس کے اندر چھپے ہوئی غصہ ور انسان کو جھنجھوڑ کر باہر لا سکتی تھی جو بچوں کے سامنے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اتنا بھی نہیں جانتا تھا کیا کر رہا ہے۔

آخری دفعہ کی مار پیٹ جو گھر کی عورتوں کے بارے میں گری سی گری باتیں کرنے پر ہوئی تھی اور اُن میں سے ایک مچھلیوں کے ٹینک سے جا ٹکرایا تھا جو پیڈسٹل سے دھکا کھا کر نیچے گرا تھا بعد میں جب تلمیذ ہانپتا ہوا جا کر بیڈ پر گرا تھا، نجم اور روز خوف زدہ ہو کر وقت سے پہلے سو

گئے تھے، جب وہ اٹھ کر گیٹ اور اندر کھلنے والا دروازہ بند کرنے گئی تھی اس نے ایکوے رئیم کے بڑے ٹکڑوں کو فرش پر پڑے دیکھا تھا، سارا فرش گیلا تھا اور مچھلیاں یہاں وہاں مری پڑی تھیں۔ ایسے شخص کو وہ شوہر کی عزت دے سکتی تھی اُسے اس کا اچھا بُرا نہیں سمجھا سکتی تھی۔
اُسے بدلتے ہوئے دیکھ کر وہ سراہتی تھی لیکن محبوبہ یا بیوی کی طرح نہیں، ایک محکوم کی طرح۔

چند دن بعد تمکید نے اوفس جانا شروع کیا۔ وہاں سے فائلیں اور خطوط لے کر گھر آ جاتا تھا اور میمونہ کے نہ پوچھنے پر بھی بتاتا تھا ''کام جمع ہو گیا تھا، گھر لے آیا۔ نئے کنسائن منٹ کو خود فروخت کروں گا۔''
میمونہ اس کے پاس کھانے کی کوئی چیز رکھ جاتی، پوچھتی 'کچھ پینے کو چاہیے؟' اور اس کے نہ کرنے پر ملک شیک کو۔
تمکید ملک شیک دونوں بچوں کے ساتھ بیٹھ کر پیتا۔ انہیں رام کرنے کی کوشش کرتا، کہانیاں سناتا اور جو نیا کھلونا لایا ہوتا اس سے روز کے ساتھ بیٹھ کر کھیلتا۔ ایک دن نیا چیس بورڈ اور سیٹ لیے گھر لوٹا۔ نجم کو پاس بلا کر کہا ''تمہیں آج وہ گیم سکھاؤں گا جو ان ڈور گیمز کا بادشاہ کہلاتا ہے۔''
روز نے کہا ''ہورس رائڈنگ۔''
چاروں ہنس پڑے۔ روز نے ہنسنے میں ماں باپ کا ساتھ دیا تھا۔
آہستہ آہستہ نجم پر سے اس کا خوف اٹھنے لگا۔ میمونہ اسکول سے واپسی پر نجم کو ہوم ورک کراتی کہ شام کو تم باپ بیٹے کی بازی لگے گی پہلے سے ہوم ورک ختم کر لو۔
کھیل کے دوران میمونہ بیٹھ کر کتاب پڑھتی، رسالے دیکھتی یا اخبار، اور تمکید کو ٹریڈ سے متعلق خبریں سناتی جاتی۔ روز وہیں قالین پر بیٹھی گھر بناتی یا ڈرائنگ بنا کر ماں کو دکھاتی۔
تھوڑے ہی عرصے میں نجم بڑے اعتماد سے شطرنج کھیلنے لگا اور جب کھیل شروع ہوتا تو میمونہ اور روز کو خاموش رہنا پڑتا۔

بعد کے دنوں میں تمکید سوچتا تھا 'میں نے نجم کو شطرنج کھیلنا سکھایا تھا اور تھوڑے ہی دنوں

میں وہ مجھ سے بہتر شطرنج کھیلنے لگا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکا تھا یہ child prodigy[1] ہے۔ مجھے اس کی قدر کرنی چاہیے تھی، لیکن جب میں کوئی چال سوچ رہا ہوں اسے زیر کرنے کی، یا اس کی خطرناک چال سے بچنے کی اس وقت میرا دماغ جیسے بارود سے بھری بیرل[2] ہوتا تھا۔ اس وقت اس کا گنگنانا، اٹھ کر پانی پینے کے لیے جانا اور اس سے بھی بدتر: کہہ کر جانا کہ 'پیاس لگی ہے'، یا ماں کو پکارنا 'ممی بھوک لگی ہے' چنگاری کا کام کرتا تھا۔ جل کر میں کہتا: ''اٹھ جاؤ، تمہیں کھیلنا نہیں آتا۔'' وہ ہنستا ہوا وہاں سے بھاگ جاتا تھا۔ میں اُسے ماں سے کہتے سنتا تھا:

''ڈیڈی ہار رہے ہیں۔''

میرا ڈرانا، دھمکانا ایک دم اس پر اپنا اثر کھو چکا تھا۔

جن گھروں میں میمونہ اور تمکید کا آنا جانا تھا وہاں جن جن کو شطرنج کا چسکا تھا ہر ایک نجم سے ہار چکا تھا۔

پھر ایک وقت آیا جب اس کی دلچسپی اس کھیل میں ختم ہوگئی اور تمکید کو اُسے آکر کھیلنے کا حکم دینا پڑتا تھا۔

ان ہی دنوں ملک کے بڑے شہروں میں پہلی دفعہ ٹیلی وژن آیا۔ شام کو دو تین گھنٹے کے لیے۔ کتنے ہی افس کی چھٹی کر کے ٹی وی کے شروع ہونے کے وقت سے پہلے گھر پہنچ جاتے تھے۔ ٹی وی والے گھروں میں پڑوس کے بچے جمع ہوجاتے تھے۔ تمکید ایک دن ٹیلی وژن سیٹ لے کر گھر میں داخل ہوا اور جیسے پہلے سے طے کر کے آیا تھا اُسے اس پیڈسٹل پر رکھ دیا گیا جس پر پہلے ایکوے رئیم تھا۔ صوفوں اور کرسیوں کا رُخ بھی بدل دیا گیا۔ وقت ہوتے ہی میمونہ، تمکید اور نجم سب کام چھوڑ کر ٹی وی سیٹ کے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔

اب تمکید کو ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا: پروگرام دیکھتے ہوئے نجم کا بولنا تمکید کو سخت کھلتا تھا،

---

[1] اپنی عمر سے کہیں بڑھ کر ذہین

[2] بارود سے بھرا پیپا

جیسے گھر میں نہیں سب سینما ہول میں بیٹھے ہیں۔ وہ اُسے ڈانٹتا تھا، ڈراتا تھا کمرے میں بند کردوں گا لیکن نہ اس کا بولنا رکتا تھا، نہ ہنسنا۔ روز سے تمیذ کو مطلق شکایت نہیں تھی: وہ کچھ دیر تک اسکرین کو تکتی اور جب وہاں اپنی پسند کا کچھ نہ پاتی تو قالین پر لیٹ کر چھت کو دیکھتے دیکھتے سو جاتی۔

تمیذ کہتا ''تم سے بہتر تمہاری چھوٹی بہن ہے۔ اس کی طرح تم چپ نہیں رہ سکتے ہو۔''

ایک سنگر ایکٹریس جسے تمیذ نے کھاڑی کے کنارے بنے ہوئے ہوٹلوں کی بار میں دیکھا تھا اس کے پروگرام کے وقت وہ ذرا سی آواز برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ تمیذ کو لگنے لگا نجم اس کی کمزوری کو بھانپ گیا ہے۔ جب وہ گا رہی ہو نجم گھر میں بھاگ دوڑ کرتا، اونچی آواز میں بولتا، اس کی آواز سے آواز ملا کر گانے گاتا۔ کبھی میمونہ اُسے چپ کرانے کے لیے کہتی: ''چپ کرو میری سوت گا رہی ہے'' یا ''تمہاری دوسری ماں کا پروگرام ہے زبان تالو سے لگا کر بیٹھو۔'' اس کا بھی اس نے کھیل بنا لیا: کہتا ''مم اب آپ کی سوت کا پروگرام آئے گا'' یا ''میری دوسری ماں گا رہی ہے۔''

تمیذ نے اُسے سزا دینی شروع کی، سمجھایا بجھایا نہیں۔ جسمانی سزا، پھر کمرے سے نکالنے لگا۔

تمیذ سوچتا 'آخر یہ کون ہے؟ ایک بھتنا جسے مجھے ستانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ یا اس بدسلوکی کا بدلہ لے رہا ہے جو میں نے اس کی ماں سے کی ہے؟ خود اس سے اور روز سے؟'

اس طرح سوچتے ہوئے اُسے نجم میں معصومیت نظر نہ آتی۔ لگتا تھا اس کے برابر کا ایک آدمی ہے جس سے اس کی راز ہے۔ 'پٹتے وقت میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہے۔ کیا میری روح اس میں آ گئی ہے!'

کچھ دن وہ برآمدے کی دیواروں کو سیاہ کرتا رہا — کوئلے سے تصویریں بناتا، انگریزی اردو نظمیں لکھتا پھر وہ وہیں گاتے گاتے سو کر پڑ جاتا۔ ٹیلی وژن پروگرام کے ختم ہو جانے کے بعد میمونہ اسے تھوڑا بہت جگا کر بڑی مشکل سے اندر لے جاتی اور سوتے میں نوالے اس کے منھ

میں دیتی رہتی، یہاں تک کہ وہ گہری نیند میں چلا جاتا۔

ایک صبح اوفس جانے کے لیے جب تمکینؔ کمرے سے نکلا اُسے دیوار پر کوئلے سے بنائی ہوئی گدھے کی تصویر نظر آئی جس کے پیٹ پر لکھا تھا: My Father'۔ بچے صبح سویرے اسکول جا چکے تھے۔ اوفس سے واپس آ کر جو پہلا کام تمکین نے کیا وہ ماں سے پڑھتے ہوئے نجم کو گھسیٹ کر برآمدے میں لے جانے کا تھا۔

''یہ کس نے ؟'' غصے میں وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا، سر سے پیر تک کانپ رہا تھا۔

نجم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ''میں نے'' اس وقت وہ شاید تیرہ سال کا تھا۔

تمکین نے وہیں کھڑے کھڑے اپنی چمڑے کی بیلٹ کو پتلون سے آزاد کیا اور کمرے میں لے جا کر اس سے اس کی پٹائی بیدردی سے کی۔ اور جب وہ نہیں رویا تو دھکا دے کر کمرے سے باہر نکال کر اندر کا دروازہ بند کر لیا۔

اس دن سے نجم کا برآمدے میں گانا، ناچنا، اونچی آواز میں بولنا ختم ہو گیا اور اس نے برآمدے کی جگہ شہر میں ادھر اُدھر پھر کر رات کاٹنی شروع کر دی۔

کبھی رات گئے جب وہ لوٹتا اور دھڑ دھڑانے پر تمکین دروازہ نہ کھولتا تو وہ گھر پر پتھر پھینک کر غائب ہو جاتا۔

کئی دفعہ ایسا ہوا جب تمکین گہری نیند میں تھا میمونہ نے خاموشی سے اٹھ کر دروازہ کھول کر اسے اندر بلا لیا اور وہ بغیر کھانا مانگے سو گیا۔

لیکن ایک دن آنکھ کھل جانے پر تمکین نے میمونہ کو بازوؤں سے پکڑ کر بری طرح جھنجھوڑا اور چیخ کر کہا ''تم اسے بگاڑو گی۔''

''بگاڑ آپ رہے ہیں۔'' میمونہ نے اپنی گم شدہ آواز کو پا کر کہا۔

تمکین نے گرج کر کہا ''اس کے ساتھ تم بھی گھر سے نکل جاؤ۔''

---

[1] میرا باپ

دونوں نے یہ نہیں دیکھا انجم اپنے کمرے سے نکل آیا ہے۔ اس نے باپ پر نظر ڈالے بغیر کہا
''مم میں جا رہا ہوں'' سونے کے کمرے کا دروازہ پکڑے روز کھڑی اس سین کو دیکھ رہی تھی۔
تمکینہ تیزی سے چل کر انجم تک گیا حالانکہ اُسے نہیں معلوم تھا وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ انجم نے اُسے
دھکا دیا اور اگلے لمحے وہ تمکینہ کی پہنچ سے دور تھا۔

کافی عرصہ اس کی سُن گُن دونوں کو نہیں ملی۔ پھر اس کے دوستوں سے پتہ چلا 'پولس
والوں نے اُسے نشے کا عادی بنا دیا ہے۔ اُسے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو پکڑنے کے لیے جو
پارکوں کی سنسان جگہوں میں بھیڑ چھٹ جانے کے بعد بینچوں پر بیٹھے نظر آتے ہیں چارے کی
طرح استعمال کرتے ہیں۔ وہ ان کے پاس جا کر چرس کا سگریٹ پینے پر انہیں اکساتا ہے یا اُن
کے ہاتھ میں سگریٹ دے رہا ہوتا ہے جب پولس والے وہاں جھپٹا مارتی ہوئی چیل کی طرح
آن پہنچتے ہیں اور کہتے ہیں ''اچھا تم چرس پی رہے ہو۔ چلو تھانے تمہارے پاس چرس نکلی ہے۔''
اُن میں سے کچھ اپنے بچاؤ کے لیے کہتے ہیں: 'ہمارے پاس چرس نہیں ہے۔ یہ دے رہا تھا' تو
وہ انجم کو تھپڑ مار کر بھگا دیتے ہیں۔ گھبراہٹ میں، پولس کے دام میں آ جانے والے جو کچھ جیب
میں ہو ان کو تھما کر وہاں سے چوروں کی طرح چل پڑتے ہیں۔'
'دوسرا بڑا الزام ان لڑکے لڑکیوں پر اتنی رات گئے پارک میں آنے کا ہوتا ہے: 'یہ تمہاری کون
ہے۔ اس لڑکے نے تمہیں لا کر دی ہے؟' اس پر لڑکی رو پڑتی ہے۔ لڑکا قسمیں کھاتا ہے میری منگیتر
ہے۔ اس لڑکے کو تو آج ہم نے پہلی بار دیکھا ہے' پولس والے کہتے ہیں 'تھانے چلو' نتیجہ وہی ہوتا
ہے لیکن چرس کے الزام سے زیادہ۔ لڑکی اپنی سونے کی چوڑیاں تک اتار کر دے دیتی ہے۔
'انجم اس ڈرامے پر خوش ہوتا ہے۔ ہم سے کہتا ہے: 'نہیں زور سے نہیں مارتے ہیں۔ جو
اُن سے پیسے ملتے ہیں اس میں میرا حصہ ہوتا ہے۔ کبھی چرس بھی دے دیتے ہیں۔ وہ میں بیچ لیتا
ہوں، ہیروئن بھی۔ اسی سے ہوٹلوں میں کھانا کھاتا ہوں۔ کپڑے، موزے، جوتے خریدتا
ہوں۔ کسی سے مانگتا نہیں ہوں۔ میری کمائی کے پیسے ہوتے ہیں۔ تم بھی چاہو تو جوائن کر لو۔

اچھی لائن ہے۔"

لڑکے مزے لے کر ساری باتیں تمیز کو بتاتے۔ میمونہ ان کی باتیں سننے سے انکار کر دیتی تھی۔
صرف پہلی بار اس نے اُن سے کہا تھا۔ "بیٹا تم ایک دفعہ اُسے میرے پاس لے آؤ۔"
"وہ ہمارے بس کا نہیں ہے آنٹی۔" کہہ کر لڑکے چلے گئے تھے۔

تمیز اس سین کے ذہن میں آنے کو ایک دن بھی نہیں روک سکا جب ایک شام گیٹ کی گھنٹی بجی تھی اور اس کے پوچھنے پر "کون ہے؟" گھنٹی بجانے والے نے کہا تھا:
"آپ کے لیے ایک اطلاع ہے۔"
میمونہ نے ایک دم کہا تھا "نجم کی اطلاع لائے ہوں گے۔" جیسے اور کوئی اطلاع ہو ہی نہیں سکتی تھی۔
گیٹ سے آنے والی آواز دھیمی تھی لیکن اتنی صاف کہ میمونہ کے دماغ میں جو تھوڑی بہت امید نجم کے لیے تھی، وہ جتنی بھی تھی سرتاپا پگھلی ہوئی موم بتی کی لو کی طرح تھرتھرائی اور اسی موم میں ڈوب کر بجھ گئی۔
"چل کر شناخت کر لیجیے" پر وہ کھلے سر باہر نکل آئی اور 'ہائے میرا نجم' کہہ کر برآمدے کی سیڑھی اترتے ہوئے گر پڑی۔
اُس صبح وہ ایک سوکھی ندی کی ریت پر مرا ہوا پایا گیا تھا۔ نیچے سے خون میں لت پت۔

اس دن کے بعد میمونہ کے منہ سے کتنی ہی بار نکلا! "نجم کی موت کے ذمے دار تم ہو۔ تمہارا غصہ۔" اور کسی بہتر بات کے دماغ میں نہ آنے کی وجہ سے اُس نے ہر بار کہا "جاؤ جا کر پولس میں رپورٹ لکھاؤ۔"
اس پر وہ کہتی: "میں تو رپورٹ نہیں لکھاؤں گی لیکن اس کا خون تمہیں چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔ میری پہلی اولاد، بیٹا اور اس کا یہ حشر تم نے کیا! دیکھ لینا زندگی بھر تمہیں دوسرا بیٹا نہیں ملے گا۔"
جب وہ اسے چپ کرانے کے لیے خود سے لپٹانے کی کوشش کرتا وہ اُسے دھکا دے کر خود سے

دور ہٹاتے ہوئے کہتی: ''ہٹو میرے پاس سے۔ تمھیں ذرہ برابر بیٹے کی موت کا غم نہیں ہے۔''

نجم کی موت کے دو ڈھائی مہینے بعد تک میمونہ کی یہ حالت رہی تھی، جیسے نکاح ٹوٹ گیا ہو۔ پھر جیسے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والے آدمی کا ہاتھ دیا سلائی پر پڑ جائے ازخود تمیز کے دماغ میں اس خیال نے اجالا کر دیا: 'واقعی میں بہت برا آدمی ہوں۔ میمونہ مجھے صحیح سزا دے رہی ہے۔'

لیکن باوجود اس کے تمیز کو پاس پھٹکنے نہ دینے کے ان دو ڈھائی مہینوں میں وہ کسی دوسری عورت کے پاس نہیں گیا۔ یہ دماغ میں اس اجالے کے ہونے کا کرشمہ تھا اور اس کیفیت کو وہ پہچان رہا تھا۔ ان دنوں بجائے ٹیلی وژن کے سامنے شام گزارنے کے کسی بار میں اکیلا بیٹھ کر تین چار پیگ پی کر گھر آ جاتا تھا اور پڑ کر سو رہتا تھا۔

پھر ایک دن میمونہ خود ہی تمیز کے پاس آئی اور جگاتے ہوئی بولی: ''کتنے دن خالی پیٹ سوؤ گے! میں تو پاگل ہو گئی تھی، برا بھلا جو منھ میں آیا کہہ دیا۔ جو ہوا قسمت میں لکھا تھا۔ اٹھو اور کھانا کھالو۔''

ان دنوں گھر میں نوکر کوئی نہیں تھا۔ صرف روز تھی، وہ سو رہی تھی۔

وہ سوچتا 'میرا خیال تھا تب ہی کھانا پکایا تھا۔ پھر دل رکھنے کو اس نے میرے ساتھ کھانا کھایا — تھوڑا بہت۔ مجھ سے بھی نہیں کھایا گیا۔ بعد میں وہ خود آ کر میرے پاس لیٹ گئی۔ اس شام کے تین پیگ اس رات ایسے ثابت ہوئے جیسے اُن کے بعد کسی نے زبردستی لڈو کھلا دیے ہوں، یا اونٹائی ہوئی میٹھی چائے پلا دی ہو۔ وہ تلافی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

'اس رات مجھے گمان ہوا تھا جیسے میرے اندر دیر سے سویا ہوا انسان جاگ اٹھا ہے۔

میں حقیقت میں اس کے پہلوٹی کے بچے، وہ بھی بیٹے کا قاتل تھا۔ گو اُس کے عدالت میں اس بیان پر مجھے سزائے موت نہ سنائی جاتی، میرے اقرار جرم پر بھی نہیں۔

OK it was not murder, but it *was* manslaughter

میری لاپرواہی، میرے ظلم سے اس کی موت ہوئی تھی یہ میں کیسے بھلا سکتا تھا۔

(۴۵)

تیسری ڈلیوری کے لیے میمونہ ایک معمولی سے پرائیویٹ میٹرنٹی ہوم میں داخل ہوئی، اپنی مرضی کے خلاف۔ اپنی ماں کی طرح اس کے لیے وہ گھر پر تیار تھی: ''بتول کو اپنی بہوؤں بیٹیوں کا تجربہ ہے، ضرورت پڑی تو اس سے مدد لے لوں گی، خرچہ بچ جائے گا۔''

تلمیذ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اُسے بھی اپنی ماں کا تجربہ تھا جب لڑکے اور چھوٹی لڑکیاں ایسی بن جاتی تھیں جیسے انہیں خبر نہیں ہے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ بعد کی چھیچا لیدر، خون کی بُو۔

وہ باہر کھڑا رہا۔ اُسے میمونہ کی درد کی آواز بھی نہیں آئی۔ آئی تو صرف اُس کی جس کے لیے نرس نے آ کر بتایا ''مبارک ہو لڑکی ہوئی ہے۔'' اس نے سر ہلایا، ایسے جیسے سُن لیا۔

اُسے امید تھی لڑکا ہوگا اور ہم پھر سے مکمل فیملی بن جائیں گے۔

ٹیکسی کر کے وہ تینوں کو گھر لے جا رہا تھا کہ روز نے پوچھا: ''پپا ہم بہن کو کیا کہیں گے؟''

اس کی ماں نے کہا ''گوندنی۔ تمہارے ڈیڈی نے رکھا ہے۔''

تلمیذ ہنس پڑا ''گوندنی کا جھاڑ تمہارے نانا کے گھر میں ہے۔ لیکن وہ اس کا پھل کسی کو کھانے نہیں دیتے ہیں۔ خود بھی نہیں کھاتے ہیں اور جو بچہ پھل توڑنے آئے اُسے مارتے ہیں۔''

''آسمان سے آ کر'' میمونہ نے کہا۔

روز نے ذرا کر ماں کا منہ اپنی طرف موڑ کر کہا " ہیں مم؟"
ماں نے سر کو اوپر نیچے جنبش دی۔

آنے والے دنوں میں بچی کا نام کئی بار بدلا۔ آخیر میں سب اُسے صنوبر کہنے لگے اور وہ جونیپر بن گیا۔ تلمیذ اُسے جونی کہتا تھا یا اگر زیادہ محبت دکھانی چاہے تو نین جوتی۔ جیسے روز بھی روزی بنا دی جاتی تھی کبھی نین سکھ۔ لگتا تھا وہ ایک بار پھر گھر بار والا آدمی بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اپنے بیوی بچوں کا خیال رکھنے والا آدمی، اُن سے محبت کرنے والا۔ لیکن اس ندی کو پار کرنے والے آدمی کی طرح جسے تیرنا نہ آتا ہو اور کنارے سے دور پہنچ کر اُسے پتہ چلے پیر زمین کو نہیں چھو پا رہے ہیں۔ وہ بھی کنارے پر لوٹ آنے کی کوشش کر رہا تھا اور غوطہ کھا جانے پر نہیں جانتا تھا کنارہ کس طرف ہے۔ اس کے پیر اپنے گھر سے اکھڑ گئے تھے۔

اکثر بیرجی کے یہاں دفتر سے اٹھ کر پہنچ جاتا، یا شام ہونے والی ہو تو ایکسیلسیئر بار میں۔ وہاں بیٹھ کر پیتے ہوئے اُسے خیال آتا 'میمونہ ایک دم بڑھیا گئی ہے۔ حالانکہ حد سے حد چھتیس کی ہوگی۔ ہمیشہ وہی سفید کپڑے، وارڈ روب کھول کر دیکھو تو بنارس اور بنگلور سلک سے بھرا پڑا ہے۔'

ایک دن جب وہ میمونہ کے سراپا کا جائزہ لے رہا تھا کیا پہنتی ہے، بالوں رخساروں ناخنوں پر کچھ لگاتی بھی ہے یا نہیں، کپڑوں سے پرفیوم کو تو سونگھے ہوئے ایک زمانہ ہوا، نہ کبھی کسی چیز کی فرمائش کرتی ہے تو اُسے خود اپنا خیال آیا۔ 'کیا میں ویسا ہی ہوں جیسا اس کی اب کی عمر میں تھا؟' گھر سے روانہ ہوتے وقت اس نے خود پر ایک نظر کپڑوں کی الماری میں لگے ہوئے آئینے میں ڈالی۔ 'نہیں میں بھی وہ نہیں ہوں۔ نہ کپڑے ویسے ہیں نہ جوتے اور سب سے بڑھ کر دکھ کی بات یہ ہے کہ بالوں کی ناقدری کچھ اور ہی رنگ لا رہی ہے – سفید تو جگہ جگہ پھوٹ ہی آئے ہیں، شاید سر کو تکیئے سے رگڑتا رہا ہوں کہ وہاں سے بالوں نے رخصت ہونا شروع کر دیا ہے۔'

اس شام دل گھبرانے پر تلمیذ اوفس سے اٹھ کر مرتضیٰ قریشی کے دفتر گیا۔ بعد میں وہ کہتا تھا: اس شام میری موت آئی تھی جو مرتضیٰ قریشی سے ملنے گیا۔ اور وہ جیسے میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ آگے بڑھ کر گلے ملا:

''اچھا ہوا تم آ گئے ورنہ میں خود آنے کا سوچ رہا تھا۔''

تلمیذ نے بیٹھتے ہوئے کہا ''ابھی اپنے گھر میں ہو یا مع سامان کے اوفس میں آ گئے ہو؟''

مرتضیٰ قریشی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا ''آئس کریم چلے گی یا کوئی سوفٹ ڈرنک۔''

''ہارڈ ڈرنک as hard as acid۔[1] جو معدے اور آنتوں کو جلا دے۔''

''وہ یہاں نہیں ہو سکتا۔''

تھوڑی دیر بعد دونوں ایکسیلسیئر بار میں بیٹھے تھے۔

جب دونوں ایک ایک پیگ ختم کر چکے تھے مرتضیٰ قریشی نے کہا ''مائی ڈیئر تلمیذ نہ تمہیں کار بیچنے کی ضرورت تھی نہ ڈرائیور اور مالی کو چھٹی دینے کی۔ جہاں رہ رہے تھے وہیں رہتے رہتے۔ اور اب بھی جہاں رہ رہے ہو وہیں رہتے رہو۔ کار پھر سے آ جائے گی اور نوکر چاکر بھی۔ بس آمدنی بڑھانے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے میں بتا چکا ہوں چل کر سردار اور رنگ ناز سے مل لو۔ وہ تمہارے لیے زیادہ آمدنی والے کام نکال لیں گے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا کام بھی جب تمہارے ہاتھ میں سرمایہ ہوگا دس گنا چمک جائے گا۔''

دوسرا پیگ لیتے ہوئے تلمیذ سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اُسے لگ رہا تھا اور کوئی صورت سنبھلنے کی نہیں ہے۔

''تم اس سے ملتے ہوئے ڈر کیوں رہے ہو۔ وہ تمہیں بنا دے گا، بگاڑے گا نہیں۔ کوئی اسمگلر یا لٹیرا نہیں ہے پڑھا لکھا آدمی ہے۔''

اگلے دن تلمیذ کو سردار اور رنگ ناز سے ملوانے کے لیے لے جاتے ہوئے مرتضیٰ قریشی وہی

---

[1] تیزاب جیسی کڑک

باتیں دہراتا رہا جو تلمیذ اُس دن سن چکا تھا جب اپنے دفتر میں کام نہ ہونے کی وجہ سے مرتضیٰ قریشی اس کے دفتر آیا تھا اور بئیر کے ٹن کے ٹن خالی کرتے ہوئے پورے وقت سردار اورنگ ناز کا قصیدہ پڑھتا رہا تھا۔ دونوں ملاقاتوں میں فرق اتنا تھا تب تک تلمیذ کی اپنے گھر میں کچھ ساکھ تھی، اس کی کڑوی باتوں کا جواب میمونہ نہیں دیتی تھی۔ اب وہ پلٹ کر کچھ کہہ بھی بیٹھتی تھی اور بڑی بات یہ تھی کہ اتنا ہاتھ تنگ تلمیذ کا شادی کے بعد سے اب تک کبھی نہیں ہوا تھا۔

وہ پورے راستے خاموشی سے مرتضیٰ قریشی کی باتیں سنتا رہا:

''سردار صاحب ایک ایسا انسان ہے جو اپنے لوگوں کو جہالت کے اندھیرے سے علم کی روشنی میں لے جا رہا ہے۔ منصفی اس کا مذہب اور ایمان ہے۔ وہ لوگ جو ان کی رعیت نہیں ہیں معمولی سے کیس کے لیے پولیس کی طرف دوڑتے ہیں اور کیس اس طرح ختم ہوتا ہے کہ جس کے خلاف دعویٰ ہوتا ہے اُسے تو پیسہ بھرنا ہی پڑتا ہے دوسری پارٹی اور پولس کو، دعویٰ کرنے والے کو کیس ختم کرانے کے لیے پولس کو خوش کرنا پڑتا ہے ورنہ مہینوں تھانے میں حاضری دیں۔ سردار صاحب کیس سُن کر کھڑے کھڑے فیصلہ کر دیتے ہیں۔ آخر کو بادشاہت ان کے خون میں ہے۔''

تلمیذ بیچ میں بول اٹھا ''شاید اس دن سے جب انسان نے پہلا قتل کیا تھا، یا پہلی بار دوسرے کو دھوکا دیا تھا۔''

''وہ مذہبی فرقے کے لیڈر بھی ہیں اور بڑے جاگیردار۔''

پہلی ملاقات پر کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہاں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے جو باتوں سے سردار کا مصاحب یا درباری لگتا تھا کہا ''صاحب فورجری کے کیس میں دو بار جیل جا چکا ہے۔''

تلمیذ کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔

''ریٹائرڈ جج مرحوم عبدالقدیر کی پیروی سے کیس ختم ہوا۔'' مرتضیٰ قریشی نے کہا۔

سردار نے کہا: ''اچھا آدمی تھا۔ اس کی موت کی خبر میں نے اخبار میں پڑھی تھی۔''

جب تلمیذ نے اٹھنے کی اجازت مانگی تو سردار نے کہا ''ہم سے بھی ملتے رہنا۔''

باہر نکل کر تلمیذ نے کہا ''یہ سب بتانے کی کیا ضرورت تھی۔''

''ہر ملازمت کے لیے Curriculum Vitae[1] چاہیے ہوتے ہیں۔ یہ تمہارا .C.V تھا اور اسی پر تمہیں یہ نوکری ملی ہے۔''

بعد کی ملاقاتوں میں تلمیذ پر یہ راز کھلا کہ سردار اورنگ ناز کی بڑی آرزو ایک دن وزیر اعظم نہ سہی، وزیر بن کر دکھانے کی ہے (کیسے یہ انہوں نے کبھی نہیں بتایا)۔ اس سے بڑھ کر کوئی اور آرزو ان کے ذہن میں نہیں تھی۔ خوبصورت سے خوبصورت عورت، بہترین کہن سال شراب، جگہ جگہ بنگلے، ریاست جیسی جاگیر اور اَن گنت وہ مخلوق جن کی مریدی ان کی انا کی عمارت کی بنیاد تھی۔ مگر یہ سب وزیر اعظم بننے کے متبادل نہیں ہو سکتے تھے۔ اپنی جاگیر میں رعب سارے ملک پر رعب کی برابری نہیں کر سکتا ہے۔

سردار کی یہ آرزو سن کر تلمیذ نے اس کی تاریخ پیدائش پوچھی تھی۔

''کیوں؟''

''زائچہ بناؤں گا۔'' اور انہیں مرعوب ہوتے دیکھ کر کہا ''دیکھتا ہوں یہ آرزو کب پوری ہوتی نظر آتی ہے۔''

تلمیذ میمونہ سے بات کرتے ہوئے سردار اورنگ ناز کو اورنگ اوتان کہنے لگا تھا۔ پہلی دفعہ یہ لفظ سن کر روز نے کہا ''پپا آپ نے اوفس میں کیا اورنگ اوتان کا بچہ پالا ہے؟ اُسے گھر لائیے نا۔''

میمونہ پھیکی ہنسی ہنسی۔

مرتضیٰ قریشی کے تلمیذ کو سردار اورنگ ناز سے ملا دینے کے بعد گھر کی مالی حالت سدھر گئی۔ اس رابطے کو وہ contact کہتا تھا اور اس کے لیے اُسے کبھی شہر سے باہر بلکہ کبھی دو ایک

---

[1] تعلیمی اسناد اور تجربے کی تفصیل

دن کے لیے ملک سے باہر جانا پڑتا تھا۔

میمونہ نے غلطی کی جو ایک بار پوچھ بیٹھی: ''وہ کون سا ملک ہے جہاں سے آپ دوسرے یا تیسرے دن لوٹ آتے ہیں؟''

''ہے'' تلمیذ نے غصے سے کہا۔

''اور وہاں جانے کے لیے پاسپورٹ نہیں چاہیے ہوتا ہے؟''

''نہیں۔'' تلمیذ نے چیخ کر کہا۔

میمونہ چپ ہو رہی۔ وہ دیکھ رہی تھی ان contacts سے تعلق ہو جانے کے بعد سے تلمیذ کی زندگی کی بادبانی کشتی جو ہوا نہ ہونے کی وجہ سے عرصے سے سمندر کے سینے پر ایک جگہ رکی کھڑی تھی، بادبانوں کے ہوا سے بھر جانے کے بعد تورپیڈو کی رفتار سے چل پڑی ہے۔ اور رکنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ وہ بتا چکا تھا سردار اورنگ ناز اس کا سب سے اہم کنٹیکٹ ہے۔ لیکن وہ تلمیذ کے گھر ایک بار بھی نہیں آیا۔ وہ اگر تاش کھیلتا ہوگا تو اپنے دولت خانے میں اپنے پائے کے لوگوں سے یا خلوت میں عورتوں سے جن کے بارے میں بغیر میمونہ کے پوچھے اس نے بتایا تھا کوئی کون سی زبان بولتی ہے، کوئی کون سی۔ وہ تلمیذ کی باتیں ایسی خاموشی سے سنتی جیسے کسی داستان گو کے سامنے بیٹھی ہے:

''کافی زیور اور ہیرے بٹور لینے کے بعد، کبھی پہلے کی بات ہے، ایک عورت سردار کی گڑھی سے بھاگ لینے میں کامیاب ہوگئی تھی لیکن اس کی قسمت کا جو فیصلہ سردار اورنگ ناز نے کرایا تھا دوسری عورتوں پر اس کی ہیبت بیٹھ گئی۔ اس لیے جو جہاں ہے خوش ہے۔''

میمونہ کباب بنا چکی تھی۔ اس نے بتول کو آواز دی ''بوا آ کے لے لو، بن گئے۔'' اور اٹھ کھڑی ہوئی تلمیذ تاؤ کھا کر رہ گیا۔

ایک شام جب حبس تھا اور ہوا میں نمی بھی بہت تھی لنڈا میمونہ سے ملنے آئی۔ اس کے شوہر ائرفورس میں ونگ کمانڈر تھے اور ایک زمانے میں دونوں کا تملیذ اور میمونہ سے تھوڑا بہت ملنا جلنا تھا۔ پھر والٹر شاہ کا ٹرانسفر کہیں اور کا ہوگیا اور اب ایک بار پھر دونوں دارالخلافہ میں تھے۔ دونوں ہی کے تقریباً تمام رشتے دار اس ملک سے آزادی ملنے کے بعد برطانیہ یا آوسٹریلیا جا چکے تھے۔

میمونہ نے لیموں اور شکر کا شربت لنڈا کو دیا اور پوچھنے لگی اتنے سال دونوں کہاں کہاں رہے۔ باتیں اچھی خاصی ہنسی مذاق میں چل رہی تھیں کہ نجانے لنڈا کو کیا ہوا کہ پوچھ بیٹھی:
''آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟''

میمونہ نے بے خیالی میں کہا ''جو پہلے کرتے تھے۔''
لنڈا نے ہنستے ہوئے کہا ''میرا مطلب ہے ان کا پروفیشن کیا ہے؟''
''امپورٹ ایکسپورٹ۔'' میمونہ نے تھوڑا چڑ کے کہا۔ صبح کی تملیذ سے جھوڑ کا اثر اس پر سے پوری طرح گیا نہیں تھا۔ اپنی بات اس نے دہرائی ''امپورٹ ایکسپورٹ کی فرم ہے۔''
لنڈا پھر ہنس پڑی اور میمونہ کے بار بار پوچھنے پر اس کے منھ سے نکلا ''وہ تو ان کے اوفس کے بورڈ پر بھی لکھا ہے۔''
میمونہ نے جیسے نیند سے ہوشیار ہوتے ہوئے پوچھا ''پھر؟''
لنڈا نے کہا ''اس کے علاوہ؟ درحقیقت؟''
میمونہ کٹ کے رہ گئی، جیسے گھر کی ساری چیزیں اس کی ہنسی اڑا رہی تھیں۔
''وہ آپ مجھے بتائیے گا۔'' اس نے جذبات کو گرفت میں رکھنے کی کوشش کے ساتھ کہا۔

رات کو یہی سوال اس نے تملیذ سے کیا: ''سچ بتائیے آپ کا صحیح پیشہ کیا ہے؟ پروفیشن؟'' اس سے پہلے وہ بتا چکی تھی ''شام مسز لنڈا والٹر شا آئی تھی۔ ساتھ والٹر نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی۔''

تملیذ کے چہرے پر خفگی امنڈ آئی۔ بولا: ''کیا کرتا ہوں یہ سوال شادی سے پہلے

تمہارے بھائیوں کو پوچھنا چاہیے تھا۔ یہ سوال تم سے والٹر شا کی بیوی نے کیا تھا؟''
اس سوال کا جواب میمونہ نے نہیں دیا۔

بیٹے کے غم کے بعد دوسرا بڑا غم اُسے بڑے بھائی کی اچانک موت کا سہنا پڑا تھا۔ وہاں سے آ کر اس نے بے وجہ شک کیا تھا اس کا بیڈ روم کس کام میں آیا تھا۔ پھر مطمئن ہوگئی تھی کیونکہ اس میں کوئی ایسی علامت نہیں تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ اس کی غیر حاضری میں اس کے شوہر کے علاوہ کسی نے وہاں رات بسر کی ہو۔

آج اُن غموں میں ایک اور غم بھی مل گیا۔ اُسے شدت سے احساس ہوا تلمیذ اس سے اتنی دور جاچکا ہے کہ دوبارہ دونوں نہ مل سکیں گے۔

کبھی وہ خرچہ دیتا تھا کبھی نہیں۔ ''میں کام کرنے لگوں؟'' کے سوال پر اس نے جھڑک دیا تھا۔ لڑائیاں روز کا معمول بن چکی تھیں۔ جنگ بندی اور صلح پہلے رات کو ساتھ لیٹنے پر ہوجاتی تھی، اب عرصہ سے اس نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

تلمیذ کے دوست آہستہ آہستہ اُسے چھوڑ چکے تھے۔

ایک گھرانے کے لیے وہ سخت دور ہوتا ہے جب اس کے کمانے والے مرد کے ہاتھوں سے اس کی باگ نکل جاتی ہے۔ تمام رشتے ڈھے جاتے ہیں۔ تب نہ وہ، نہ اس کی جیون ساتھی ان رشتوں کو دوبارہ قائم کر پاتے ہیں — باوجود ہزار جتن ہزار کوشش کے۔

کتنی ہی راتیں پیے ہوئے دیر سے گھر آنے کی اُس گھرانے پر آئیں۔ اس وقت وہ بستر پر گر کر سو جاتا تھا۔ میمونہ کے دل سے جیسے اس کا ڈر نکل گیا تھا، نہ بھوکی اس کے آنے کے انتظار میں بیٹھی ہوتی تھی نہ کھانے کو پوچھتی تھی۔

اگلی صبح وہ ناشتے کے لیے اُسے زوری سے جگاتی: ''دیر ہورہی ہے، روز اسکول کے لیے لیٹ ہوجائے گی۔'' پھر وہی دونوں طرف سے چلے گئے سوال جواب ناشتے کے دوران اور تلمیذ اس پر ہاتھ چھوڑ دیتا۔ روز بھاگ کر بیڈروم میں جاتی اور جا کر تکیے میں منہ چھپا کر لیٹ جاتی۔

تمیذ سنتا تو وہ کہہ رہی ہوتی تھی: ''جلّل جلال تو۔ آئی بلا کو ٹال تو۔ اللہ میاں میری امّی کو بچائیے۔ میری امّی کو بچائیے۔''

'جلّل جلال تو' کا وظیفہ اُسے بتول نے بتایا تھا: ''جب ابا غصّے میں ہوں یہ پڑھا کرو۔ غصّے میں آدمی پر جو بھوت چڑھا ہوتا ہے اس سے اتر جاتا ہے۔''

اس وظیفے سے باپ پر چڑھا ہوا بھوت تو خیر نہیں اترتا تھا لیکن اس انکشاف سے وہ باپ سے دونی ڈرنے لگی تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے میں کوٹھے پر گیا تھا؟''

کوٹھے کی بات روز کو اس جھگڑے میں بے ربط لگتی۔ میمونہ کی آنکھیں خشک رہتیں اور اس کے چہرے پر خوف کا پتہ تک نہ ہوتا۔ وہ جانتی تھی عورتیں اگر اس کی زندگی میں تھیں تو اُن سے ہمیشہ کے لیے دور ہوجانے کا ارادہ نکاح نامے پر دستخط کرنے سے پہلے کر چکا تھا۔ اور اُس پر قائم تھا۔ لیکن اور کر موں کو شادی سے پہلے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کا نہ اس نے ارادہ کیا تھا نہ کبھی میمونہ کے سامنے بات اٹھی۔

دو دفعہ اسکول سے خط آئے: پہلا روز کی کلاس ٹیچر کا، دوسرا ہیڈ مسٹریس کا Poor attendance۔ امتحان میں نہیں بیٹھنے دیا جائے گا۔ تمیذ نے دونوں دفعہ انہیں پڑھ کر کھانے کی میز پر ڈال دیا جو حشر ان تمام کاغذات کا ہوتا تھا جنہیں وہ غیر اہم سمجھتا تھا۔

بالآخر میمونہ دونوں بچیوں کو لے کر اپنے میکے چلی گئی۔ تمیذ کو ڈریسنگ ٹیبل پر ایک کھلا ہوا خط ملا جس کے چاروں کونوں پر پرفیوم اور لوشن کی شیشیاں رکھی تھیں:

میں اب یہاں نہیں رہنا چاہتی ہوں۔ مار کھانے میں مجھے عذر نہیں ہے کیونکہ یہ اُس عورت کا فرض ہوتا ہے جس کا شوہر پی کر گھر آتا ہو اور سمجھ نہ سکتا ہو جو ظلم وہ بیوی پر بچوں کے سامنے کر رہا ہے اس کا اثر اُن جانوں پر کیا ہوگا۔ میں نہیں چاہتی ان بچیوں کا مستقبل باپ کا سایہ پڑنے سے داغدار ہو۔ اچھا ہوا

بیٹا یہ دن دیکھنے سے پہلے اس دنیا سے اٹھا گیا۔

ایک ہفتے بعد رجسٹرڈ ڈاک سے ایک خط تمکید کے دفتر میں آیا، میمونہ کے چھوٹے بھائی کا لکھا ہوا تھا۔ پہلا جملہ تھا: آپ سے میری بہن خلع لے چکی ہیں۔

'کیا واقعی ایسا کچھ ہوا تھا؟' اُسے کچھ یاد نہیں تھا۔

اس سے جب جب کسی نے کہا: 'بیوی بچوں کو لے آؤ، اُن کا اصل گھر تمہارا گھر ہے، بچوں کے ماموں کا گھر نہیں۔' تو اس کے پاس ایک ہی جواب ہوتا تھا: 'اپنی مرضی سے گئی تھی۔ خود واپس آئے۔' اور اگر یہ کہا جاتا: 'تم نے اُسے مار کر نکالا تھا' تو وہ کہتا تھا: 'میں نشے میں تھا اور نشے میں تو دی ہوئی طلاق بھی طلاق نہیں ہوتی ہے۔ کیوں اس نے خلع مانگا تھا! اس نے مانگا تھا۔ میں نے دے دیا۔ میں کیا جانتا تھا اس کے معنی مانگے کی طلاق کے ہیں۔ پہلے بھی کتنی ہی بار مانگ چکی تھی۔ میں سمجھتا تھا کچھ مانگ رہی ہے مجھے ہمیشہ کے لیے دبانے کے لیے، کوئی اسٹیٹ مینٹ۔ میں نے کہا ایک بار نہیں ہزار بار۔ اس نے کہا '' کہو تین بار۔'' میں نے کہا: ''ایک بار، دو بار، تین بار۔ ماں میری معاف کر مجھے سونے دے۔''

''وہ تو طلاق تب ہی ہوگئی تھی جب تم نے اسے میری ماں کہا تھا۔'' ایک بوجھ بجھکوے نے کہا۔ دوسرے نے کہا: ''تم ظہار کے مرتکب ہو چکے ہو۔ رجوع کرنے کے لیے کسی بڑے مفتی کا مشورہ لو۔''

تمکید نے بغیر اُن دونوں کی بات سُنے اپنی بات جاری رکھی ''اس نے کہا بس ہوگئی۔'' میرا سر بھاری تھا۔ رم میں سوڈے کی جگہ اسناؤٹ یا بیئر ملا کر پی رکھی تھی۔ وہ بھی غصے میں تھی۔ آپے سے باہر۔ میرا خیال ہے غصے میں تو کہی ہوئی طلاق بھی طلاق نہیں ہوتی ہے۔ دونوں ہی غصے میں اندھے ہو گئے تھے۔ احمق عورت رات تو گزر جانے دیتی۔''

دونوں چکی داڑھی والے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تمکید سے جو مال گودی میں آ چکا تھا اس کا سودا کرنے آئے تھے۔ بے وجہ اس سے پوچھ بیٹھے تھے: ''سنا ہے تم نے بیوی بچوں کو گھر سے نکال دیا۔''

چلتے وقت نہ انھوں نے بات کو مکمل کیا کہ مال اٹھائیں گے یا نہیں، نہ تکمید نے پوچھا: پھر کیا فیصلہ ہے؟

دو دن بعد وہ یوسف سے ملنے گیا: شاید وہ اس کے کنسائمینٹ کو کسٹم سے چھڑانے میں مدد کر سکے جس پر demurrage (ہرجانہ) پڑ رہا تھا۔ رقم کی ادائیگی نہ کر سکنے کی وجہ سے یہ ہوا تھا۔

پہلے اسے دیکھ کر یوسف کا چپڑاسی ایک طرف کو ہو کر سر اور دھڑ جھکاتے ہوئے ایک ہاتھ سے دروازہ کھول دیتا تھا۔ اس وقت وہ سیدھا کھڑا رہا اور تکمید کے پوچھنے پر بولا: ''صاحب مصروف ہیں۔''

تکمید کا ماتھا ٹھنکا۔ لیکن وہ انتظار کرتا رہا۔ لوگ اندر سے نکلے اور اندر گئے بھی۔ چپراسی اسی طرح کھڑا تھا، تکمید سے بے تعلق۔

وہ جان چکا تھا دونوں کے تعلقات میں کوئی بڑی تبدیلی آ چکی ہے۔ پھر بھی اس نے کہا:

''اندر جا کر بولو تکمید صاحب آئے ہیں۔''

چپراسی نے اسی بے رخی سے کہا: ''اس کا صاحب کا حکم نہیں ہے۔''

تکمید نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر کہا: ''یوسف میں اتنی دیر سے باہر کھڑا ہوں۔''

یوسف نے کہا: ''میں ملنا نہیں چاہتا۔''

تکمید نے بے تابی سے کہا: ''یوسف یہ تم کہہ رہے ہو! اپنے اسٹوڈنٹ لائف کے دوست سے!''

یوسف نے سوکھے منھ سے کہا: ''بس اب میں تم سے ملنا نہیں چاہتا۔'' گھنٹی بجائی اور چپراسی کے نمودار ہونے پر کہا: ''دوسرے صاحب کو اندر بھیجو۔''

بغیر چپراسی کی نظروں سے نظریں ملائے وہ باہر آ گیا اور بہت افسردہ ٹوٹا ہوا دل لے کر گھر لوٹا۔

اس رات عہد کر کے تکمید نے شراب نہیں پی اور وہ بڑی بے چینی کی رات تھی۔ ٹوٹی ٹوٹی

نیند۔ اس کے اندر کا فرد برابر اُسے جگائے جا رہا تھا: یہ ساری تباہی میری اپنی لائی ہوئی ہے۔ میمونہ، روز اور خوبی مجھ سے دور ہیں، دوست نہیں رہے اور ان کی جگہ میری ایما پر بھیڑیوں نے لے لی۔ جب وہ میرا سارا گوشت کھا چکیں گے اور چبائی ہوئی ہڈیوں کو چھوڑ جائیں گے تو میرے لیے قیامت آ چکی ہوگی۔ باقی جہان کے لیے آئے نہ آئے۔ اگر زندگی اسی طرح پھر مجھے اپنے اوپر لانی تھی تو کیا ضروری تھا ایک دکھی شریف لڑکی کو اس میں شامل کرتا۔ برٹش ائز میں کی کوئی بھی لڑکی جیون ساتھی بننے کو تیار ہو جاتی، ساتھ پیتی، ساتھ رمی کھیلتی، خاموشی سے مار نہ کھاتی اور چھوڑ کر جاتی بھی نہیں۔

صبح کے قریب جب پہلی اذان کی دھیمی سی آواز آئی تمیذ نے دیکھا: چالیس جسم کفن میں لپٹے پڑے ہیں۔ تیس ان میں مردہ ہیں، دس زندہ۔ وہ خود ان دس میں سے ہے۔ یہ باتیں اُسے معلوم تھیں یا کوئی بتا رہا تھا۔

پھر ایک اعلان کرنے والا اعلان کرتا ہے: 'اٹھو اور نکل جاؤ۔ ورنہ تم بھی مردوں میں ہو گے۔'

اس کی آنکھ کھل گئی۔ صحن کی دیوار پر دن کی روشنی آ گئی تھی۔

گھر میں ٹھنڈا پانی نہیں تھا۔ جو ریفریجریٹر عرصے سے خراب ہونے کی بعد اندر کے برآمدے میں پڑا تھا اس میں میمونہ نے نجم کے کپڑے رکھ دیئے تھے۔ تمیذ نے اُسے بے وجہ کھول کر دیکھا۔ میمونہ اُن کپڑوں کو اپنے ساتھ نہیں لے گئی تھی۔ ایک دم خیالات کا سیلاب اُسے بہا کر لے چلا: 'مجھے جلانے کو ان کپڑوں کو چھوڑ گئی ہے؟ اُسے نجم سے پیار تھا یا نہیں؟ میں ان کا کیا کروں گا؟ جب کباڑ بکے گا اور یہ ریفریجریٹر بھی تو خریدنے والا انہیں نکال کر باہر ڈال جائے گا۔ پھر ہر وقت نظر آیا کریں گے۔ جلا تو نہیں ڈالوں گا؟ بہتر یہ ہوگا کباڑ خریدنے والے کو لے جانے دوں۔ خوش ہوگا مفت میں کپڑے ہاتھ آئے۔'

ایک بن اور دودھ کے ناشتے کے بعد جو وہ نزدیک کی دکان سے رات کے کپڑے پہنے پہنے لے آیا تھا تمیذ اندر کے برآمدے کے کھمبے سے سر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ دھوپ چڑھ آئی تھی۔

دُنیا کاموں میں مصروف ہوگی اور میں گھر میں بیٹھا ہوں جیسے کسی گورنر کا بیٹا ہوں۔

'وہ میں نہیں تھا جس نے تین طلاقیں دی ہوں گی۔ میرے اندر چھپا ہوا کوئی اور ہوگا۔ کتنی ہی بار ایسا ہوا ہے جو میرے منھ سے نکلا تھا وہ کسی اور کا کہا ہوا جملہ تھا جو میرے ذہن سے مٹنے سے رہ گیا تھا۔ کتنی ہی دفعہ وہ کیا جو کسی اور کو ملتے جلتے موقعے پر کرتے دیکھا تھا۔ یا سنا تھا۔ پتہ نہیں اس طلاق کے پیچھے کس کی طلاق چھپی تھی جس کا میں نے ذکر سنا ہوگا۔ ہوتے دیکھا تو نہیں تھا۔

'واقعات جن سے میں گزرا ہوں، بچپن سے بڑے ہونے تک، دوسروں پر ہو گزرنے والے مجھ سے وہ کرا لیتے ہیں جسے کرنے کا میرا ارادہ نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے دوسروں کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہو۔

'عجیب فطرت ہے میری اس میں کیا کچھ نہیں اُگ آیا ہے اس طویل زندگی میں! میری پسند کا کچھ بھی نہیں۔ کیا عمر تھی اس وقت جب وہ واقعہ میرے سننے میں آیا تھا کہ ایک رٹائرڈ کپتان نے اپنے سالوں کو جمعے کی نماز کے بعد گولی کا نشانہ بنایا تھا کیوں وہ اپنی بہن کو اس کی مرضی کے خلاف اپنے گھر لے گئے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا سالے کیا ہوتے ہیں بس اتنا سمجھ سکا تھا اس نے بدلہ لیا ہے اور میرے دماغ میں آیا تھا بہادر آدمی تھا۔ میں ہوتا تو میں بھی ایسا کرتا۔ کیا جب سے غصہ ور آدمی ہوں؟'

اتنے دن گزر جانے پر بھی زندگی میں تبدیلی نہیں آ رہی تھی اور وہ چاہ رہا تھا کوئی ایسی تبدیلی اس کے دماغ کو آلے کہ جو مردنی اس پر چڑھی ہوئی تھی، دن رات ایک جیسی، اس سے چھٹکارا ہو۔ صبح شام کا پتہ چلے، پینے کو جی چاہے، فلم دیکھنے کو، کہیں گھومنے کو۔ یہ کام کوئی اچانک آ پڑنے والی مصروفیت کرسکتی تھی، حادثہ یا بڑی خوش خبری۔' اور بڑی کیا کوئی معمولی سی خوش خبری بھی میرے نصیب میں نہیں ہے۔ روشن آرا آپا بھی دنیا سے جا چکی ہیں ورنہ امید ہوتی وہ میری ساحل کی ریت میں پھنسی ہوئی نیا کو ایک بار پھر تیرا دیں گی۔'

میمونہ اور بچوں کی خیریت کی خبر بھی نہیں مل رہی تھی سوائے شروع کی ایک خبر کے کہ تینوں کو میمونہ کے چھوٹے بھائی نے ایک کمرہ دے دیا تھا اور میمونہ ٹیوشن پڑھا رہی تھی۔

اس کا ارادہ امینہ کو اطلاع دینے کا بھی نہیں بن پاتا تھا کہ واپس آ جائے۔ اس کے ساتھ کی شدت سے ضرورت تھی۔ مگر اُسے اس گھر میں لے جانے کو وہ تیار نہیں تھا جس میں سالوں میمونہ رہی تھی اور بچے۔

ایک دن دفتر سے اٹھ کر وہ بے ضرورت ایک امپورٹر حسین بھائی کی دکان پر گیا جو اس سے بھی مال خریدتا رہا تھا۔ ہول سیلر بھی تھا، ریٹیلر بھی اور سائن بورڈ پر امپورٹر ایکسپورٹر سب لکھے۔ ایسے لوگ اُسے ہمیشہ خوش، زندگی سے مطمئن نظر آئے تھے، ایک کمیونٹی کے لوگ، اچھی مستقل کمائی، سادہ زندگی، روزہ نماز والے جنہیں بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا خیال نہیں ستاتا ہے، نہ اُن کے بچوں کو سوچنا پڑتا ہے آگے چل کر کیا کریں گے۔

حسین بھائی نے گرم جوشی سے استقبال کیا، بیٹھنے کو کہا اور چائے کا آرڈر دے رہا تھا کہ تمکین نے روک دیا: ''نہیں موٹا بھائی'۔ چائے نہیں۔ دھڑکن ہو جاتی ہے۔ بس ملنے چلا آیا تھا۔''

حسین بھائی نے کہا ''سچ کہتے ہو تمکین بھائی۔ اپنے پر بھی ایسا ہی اثر ہوتا ہے۔'' اور دوسری پارٹی سے بات کرنے لگا۔

تمکین کے پاس نہ یہ خبر تھی کیا مال آ رہا ہے، کب آ رہا ہے نہ سودا کرنے کو کوئی آیا ہوا مال تھا، یہاں آ کر اُسے کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ اٹھ کر اپنے دفتر چلا آیا۔

چھوٹی میز جس پر ٹائپ رائٹر تھا اور آنے والی ڈاک رکھی جاتی تھی ویسی ہی غیر دل چسپ تھی جیسی اوفس سے اٹھ کر جانے سے پہلے۔ سر کو کرسی کی پشت پر سے پیچھے جھکا کر وہ دیر تک چھت کو دیکھتا رہا۔ نہ وہاں کوئی جالا کسی کونے میں تھا۔ سفید چھوٹا سا شامیانے جیسا جالا، نہ چھپکلی۔

'مجھ جیسا تنہا آدمی دنیا میں دوسرا نہیں ہوگا۔'

'اور بے وجہ جیے جانے والا۔'

' بڑے بھائی

ایک صبح جب کام کرنے والی گیارہ بجے تک نہیں آئی تلمید نے آخری بار گیٹ پر جا کر سڑک کے اس طرف دیکھا جدھر سے وہ آتی تھی۔ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر گیٹ کی چٹخنی کی سلاخ کو اس کے گھر میں داخل کیا جو صبح سے کھول رکھی تھی اور جا کر ناشتہ تیار کرنے لگا۔ مکھن لگا کر فرائنگ پین میں سینکے ہوئے روٹی کے دو سلائس اور کھولایا ہوا دودھ تا کہ منہ جل سکے۔

یہ عورت کتنی ہی بار وعدہ کر چکی تھی کل سے پابندی سے آؤں گی لیکن لگتا تھا اس انتظار میں ہے تنخواہ ملے اور گھر بیٹھ رہے۔ یا دوسرا گھرانا ڈھونڈے۔ وہ آتی تو چائے کے ساتھ ٹکیا ہوتی اور آلو کی قتلیاں۔ اس بھکاریوں کے سے ناشتے کے بعد وہ جا کر نیلے صوفے پر بیٹھ رہا جو میمونہ کی پسند سے خریدا گیا تھا، جس پر نجم کے کودنے پر۔

سگریٹ سلگا کر وہ دیر تک چھت کو دیکھتا رہا۔ جن تکلیف دہ یادوں سے وہ بچنا چاہتا تھا وہ ان سیاہ بادلوں کی طرح چلی آ رہی تھیں جنہیں دیکھ کر وہ سب ڈرتے ہیں جن کے گھر کی چھتیں اور دیواریں پچھلے سال کی بارشوں نے گرا دی ہوتی ہیں۔ ان یادوں سے بچنے کے لیے وہ بچپن اور لڑکپن کی یادوں میں دیکھتا پھر رہا تھا جو اپنے ساتھ پچھتاوا نہیں لاتی تھیں۔ اُسے چند گھڑی کے لیے بہلا جاتی تھیں۔

'تعجب ہے اتنے سالوں سے میں تسنیم کو بھولا ہوا تھا۔' اس دن اور اس کے بعد کے کتنے ہی دن اس نے خود سے کہا۔ ایک بار نہیں، دن میں کئی کئی بار۔ لیکن نہ تسنیم کا چہرہ تصور کی آنکھیں دکھا سکیں نہ اس کی آواز سنائی دی۔ اُس کی جگہ بہت سے چہرے آئے جنہیں وہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور اُن سے وابستہ جملے سنائی دیئے۔ اُن آوازوں اور چہروں کا سامنا کرتے ہوئے وہ ڈر جاتا۔ تب اس کی حالت اس راسخ عقیدہ دیندار شخص کی ہو جاتی جس کے ذہن میں اچانک ایسا خیال ابھرتا ہے جسے وہ شیطان کی کارستانی سمجھتا ہے اور دل میں کہتا ہے 'اب میری بخشش نہیں ہوگی۔' ہر بار اس خیال کے ابھرنے پر دعائیں پڑھتا ہے۔ دماغ کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگانے کی کوشش کرتا ہے اور ناکام رہتا ہے۔

'ان گنت گناہوں کے بعد، نہیں ایک بے مقصد زندگی کے بعد مجھے جنت ارضی ملی تھی اور وہ میں

نے گنوا دی۔ یہ میں نے سمجھا ہی نہیں میمونہ اور بچے مجھے اس جنت ارضی میں رکھتے۔ ایک کو کھو دیا دو ماں کے ساتھ چلے گئے۔ اب میں ہوں اور وہی بے مقصد زندگی، اور یہ خیالات ان کا کیا کروں؟'

جو بات وہ نہیں سمجھ پا رہا تھا اتنی تھی کہ اعتراض کو سہنا اس نے نہیں سیکھا تھا اور جن خیالات سے وہ وحشت زدہ ہو جاتا تھا اس کے دماغ کے اُس حصے سے اٹھ رہے تھے جس تک اس کی پہنچ نہیں تھی۔

اوفس جانے کی اس کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ اگر جاتا بھی تھا تو تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا آتا۔ نہ بازار کا چکر نہ باہر کی فرموں کو خط لکھنا، اور کتنے ہی کام تھے جو وہ نہیں کر رہا تھا۔

'تعجب ہے اُسے میں بھولا ہوا تھا جس کے لیے زندگی کے ایک دور میں کہتا تھا اس جیسی کوئی اور لڑکی نہیں' پھر اس نے بچپن کا جملہ مکمل کیا: 'سارے جہان میں'

دل ہی دل میں نہیں زبان اور ہونٹوں سے اس نے کئی بار کہا ''کہاں ہو تم تسنیم؟ کبھی میں تمھیں یاد آتا ہوں؟'

ایک خالی گھر کے کمرے میں جس میں نہ کوئی چھپ کر آ سکتا ہو، نہ اچانک، بند پڑے رہنے کے کتنے ہی فائدے ہیں: آدمی اونچی آواز میں خود سے باتیں کر سکتا ہے۔

اس فائدے کو بھانپ لینے کے بعد تمکید کے بس میں مایوسی سے لڑنے کا ایک ایسا ہتھیار آ گیا جس سے جب چاہے وہ کام لے سکے گا۔

کم سے کم شروع میں ایسا ہی تھا۔

(۴۶)

میمونہ کے گھر چھوڑ کر چلے جانے کے بعد جب تمیز الدین آفس پوری طرح سنبھال نہیں پا رہا تھا وہ زیادہ باقاعدگی سے سردار اورنگ تاز سے ملنے جانے لگا۔ کچھ نہیں تو کچھ دیر اُن کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چلا آتا، اور وہ اُسے موقعے دیتا رہا چھوٹے موٹے کام جن کا انعام وہ فیاضی سے دیتا تھا۔

پھر ایک دن تمیز الدین نے اُسے اپنے گیٹ پر پایا۔ ڈرائیور نے آ کر گھنٹی بجائی تھی اور تمیز الدین کے نمودار ہونے پر کہا تھا ''سردار صاحب تم سے بات کرے گا۔''

تمیز الدین حیران رہ گیا۔ واقعی سردار اورنگ تاز جس کے باپ، دادا، پردادا برطانوی خطاب یافتہ تھے آج اس کے دروازے پر کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ نظر ملنے پر سردار نے اُسے نزدیک آنے کا اشارہ ایک انگلی اٹھا کر کیا ــ یعنی نیچے اترنے کا اس کا ارادہ نہیں تھا اور یہ اچھا ہی تھا کیونکہ وہ گھر میں اکیلا تھا خاطر مدارات کیا کرتا۔ نوکر تھا نہیں، مالی، باورچی، صفائی والی سب تنخواہ نہ ملنے سے بھاگ گئے تھے۔ کبھی کبھی تنخواہ کی آس میں آتے تھے اور تھوڑا بہت کام کر جاتے تھے۔ تمیز الدین کی بخشش کو وہ بھولے نہیں تھے اور جانتے تھے جب پیسے ہوں گے ان کی تنخواہ دے دے گا۔ گھاس بڑھی ہوئی تھی اور درختوں کے سوکھے پتے بھاگتے میں اس میں جگہ جگہ پھنس کر رہ گئے تھے۔ یہی حال گھر کے اندر کا تھا۔ 'اُسے اب میں اپنے سر پر بٹھاؤں گا، یا کیا کروں گا!'

وہ اندر بھاگا اور پل بھر میں ڈریسنگ گاؤن پہن کر جب کار تک پہنچا تو کھلی ہوئی کھڑکی میں سے قبیلے کے سردار نے کہا: ''Be near۔ اپنا سر ادھر لاؤ۔''

تمیز کے کان میں اس نے کہا:

''Come tomorrow morning. There is some important work you alone can do.''

(کل صبح آ جاؤ۔ ایک ضروری کام ہے جو صرف تم کر سکتے ہو)

تمیز نے مان لینے کے بھاؤ سے سر ہلایا۔ اگلے لمحے وہ لمبی سیاہ کار اتنی دور جا چکی تھی کہ اس کے اندازے میں اگر وہ اُس کا نشانہ غلیل سے لیتا تو غلا اس تک نہ پہنچتا۔ تمیز نے کار کو سراہنے والے لہجے میں کہا:

''What an acceleration!''

''اگلا دن میری زندگی کا منحوس ترین دن تھا۔'' یہ بات تمیز دوسروں سے اور خود سے اتنی بار کہہ چکا تھا کہ بیزار ہو گیا تھا۔ جس طرح غیور سے بار میں اچانک ملنے کے لیے پہلے کہا کرتا تھا۔

''کام بہت معمولی ہے'' پچھلے ہر کام کی طرح جو سردار نے تمیز کو سونپا تھا یہی اس کام کی تمہید کا جملہ تھا۔ آنے والے الیکشن میں کھڑے ہونے کا سردار اورنگ ناز کا ارادہ تھا اور ایک شخص اس میں اڑچن ڈال رہا تھا۔ اُسے راستے سے ہٹانا تھا: ''اس کے پاس ہمارے ایسے راز ہیں .... ''ہوں گے'' تمیز نے دل میں کہا۔

''دو ایک، زیادہ نہیں جو الیکشن کیمپین کو تباہ کر سکتے ہیں۔'' سفید، بچھو کے ڈنک جیسی مونچھوں والے سردار اورنگ ناز نے تمیز کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر کہا۔ ''اس آدمی کا دنیا میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔'' اور زور زور سے تمیز کا ہاتھ ہلایا جیسے عہدنامے پر اس سے دستخط کرا رہا ہو۔ کمرے میں

کوئی تیسرا آدمی نہیں تھا۔

سامنے رکھے ہوئے وسکی کے گلاس کو تمکین نے ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ اسٹیٹ ایکسپریس سگریٹ جو عرصہ بعد اُسے پینے کو ملا تھا ادھ جلا ایش ٹرے میں رکھا تھا۔ دو ایک بار اس نے سردار کی آنکھوں میں دیکھا اور نظریں اس کے اوپر کی دیوار میں پیوست کر دیں۔

''اسے راستے سے ہٹانا ہے۔'' سردار نے اپنی بات پوری کی۔

''راستے سے ہٹانے کا کیا مطلب ہے؟'' اس نے انجان بنتے ہوئے کہا: ''ملک سے باہر لے جانا ہے؟''

سردار نے خشمگیں آواز میں کہا: ''نہیں ہل اسٹیشن! کیا ایک ہی sip میں عقل کھو بیٹھے ہو!''

تمکین نے کہا: ''جی میں نے تو ابھی چکھی بھی نہیں۔''

''تو چکھ لو اور دوسرا پیگ لو۔ کام کر کے دکھاؤ تو شیمپین پینا، بوتلیں گھر لے جا کر۔ اپنے دوستوں کو ڈنر دینا۔''

''یہیں یا جیل میں؟'' اس وقت تمکین زندگی کا سرگرم چشیدہ تمکین نہیں تھا۔

سردار نے بغیر طیش میں آئے کہا: ''سوچ لو۔ اس کام کا تمہیں ایک لاکھ ملے گا۔''

''میرا کوئی وارث بھی نہیں ہے جس کے کام آپ کا وہ ایک لاکھ روپیہ آئے۔''

کچھ دیر خاموشی رہی۔ سردار اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ جیسے تمکین کے ذہن پر جو پردہ پڑا تھا وہ اٹھ گیا۔ وہ بولا: ''سردار تمہارا ستارہ گردش میں ہے۔ میں حساب لگا چکا ہوں تمہیں زندگی میں جو کچھ ملنا تھا مل چکا ہے۔ اب کوئی وزارت یا اسمبلی کی سیٹ نہیں ملے گی۔ خاموشی سے گھر بیٹھو۔ ہر مقابلے میں آئندہ تمہاری ہار ہے۔''

سردار اورنگ ناز اس طرح اٹھ کھڑا ہوا جیسے پائچے میں چھپکلی گھس آئی ہو۔ گرج کر بولا:

''یہ کام تمہیں کرنا ہے۔''

تمکین بھی گلاس کو خود سے دور سرکا کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا: ''سرکار اگر کام اتنا ہی ضروری ہے تو خود کر ڈالیے۔ آپ سے بہتر یہ کام کون کر سکتا ہے۔ آپ تجربے کار ہیں۔''

راستے بھر اُسے ایک خیال ستاتا رہا: 'یہ لوگ بڑے کینہ پرور ہوتے ہیں۔ یہ تم کیا کر بیٹھے!'

اگلا دن اتوار تھا۔ مرتضیٰ قریشی کا دفتر بند تھا۔ دو راتیں اور ایک دن بڑی بے چینی میں گزار کے وہ مرتضیٰ قریشی کے دفتر میں تھا اس دن کے بعد پہلی مرتبہ جب دونوں میں مار پیٹ ہوگئی تھی اور وہاں بیٹھے ہوئے دو آدمیوں نے دونوں کو ایک دوسرے سے کھینچ کر دور کیا تھا۔

''ہیلو ڈیئر کیسے آنا ہوا؟'' مرتضیٰ قریشی نے اُسے دیکھ کر تھوڑی اکتاہٹ سے کہا۔

''تمہیں معلوم ہے سردار اورنگ ناز کچھ دن سے

[''جس دن سے میں نے تمہیں ان سے انٹرویوز کیا ہے''

''مجھ پر مہربان تھا۔ جب بھی ملنے جاتا تھا اٹھ کر ہاتھ ملاتا تھا۔ اپنا سگریٹ کیس کھول کر میری طرف بڑھاتا تھا۔ اسکوچ کا آدمی ہے اسی سے میری خاطر کرتا تھا

[''میری خاطر شیمپین سے بھی کر چکے ہیں رات کے کھانے کے ساتھ''

''خیر'' تمکینہ نے چڑ کر کہا ''ان کے لیے میں نے کئی خطرناک کام کیے ہیں۔ لیکن اب سردار انہیں چھوٹے کام گننے لگا ہے۔ پرسوں یعنی سنیچر کو اس کے بلانے پر میں اس کے بنگلے گیا تھا۔ لیکن اب وہ مجھ سے ایک ایسا غلط کام لینا چاہتا ہے جیسا کام میں نے ساری زندگی میں نہیں کیا

[''کر لیتے تو اس کا بھی تجربہ ہو جاتا''

''اس کام میں ایک خون ہوتا تھا اور میں منع کر کے چلا آیا ہوں۔'' اتنا کہنے میں اس کا سانس پھولنے لگا اور سگریٹ اُسے ایش ٹرے میں رکھ دینی پڑی۔

مرتضیٰ قریشی نے پوری بات غور سے سُن کر کہا ''ڈیئر یہ تم نے برا کیا۔''

''اور بعد میں لٹکایا جاتا!''

مرتضیٰ قریشی نے کہا ''اگر قتل تم سے سردار اورنگ ناز کرا رہا تھا تو کوئی مائی کا لعل تم پر شک نہ کرتا، قیامت تک۔ انگلینڈ کی سب سے پرانی یونی ورسٹی کا پڑھا ہوا ہے، اس ملک کی کل آبادی کے

اُن خوش قسمتوں میں سے ہیں جن کے کام میں آنے کے لیے قانون بنے ہیں، جو خود قانون کے ہاتھوں زک اٹھانے کے لیے نہیں بنے ہیں۔ یہ تم کیا کر بیٹھے! جاؤ اب بھی کہہ دو سرکار میں حاضر ہوں کام بتائیے۔"

تمیذ کا سینہ اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے کہا "اس وقت تو میں اپنی جان بھی نہیں لے سکتا، کسی اور کی کیا لوں گا۔"

مرتضیٰ قریشی بولتا رہا: "تمہیں میں نے اتنی اہم شخصیت سے ملایا اور تم زندگی کا سب سے بڑا چانس گنوا کر آ گئے! تمہیں پتہ ہے ان کے باپ دادا تمن دار تھے برطانیہ کے بنائے ہوئے۔ ان کے نام کے ساتھ سر کا خطاب لگتا تھا اور سردار اور رنگ تاز کو اگر کوئی دکھ ہے، خود مجھ سے کہہ چکے ہیں، تو اس بات کا کہ کاش ملک کو انگریز اپنی عملداری سے خارج نہ کرتے تو آج کو وہ بھی سر اور رنگ ہوتے۔"

تمیذ مرتضیٰ قریشی کو مردنی چھائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔

"ان کی رنگت دیکھو، انگلستان کی کون کی سی نہیں ہے؟ گلابی سفید۔ اُن کا اپنی رعایا پر وہ رعب ہے جو شاہ سعود کا بھی نہیں ہے۔ اگر اُن سے کہا جائے 'تمہارے باپ پر قبر میں عذاب ہو رہا ہے' تو وہ کہیں گے فلاں عبادت گزار کی قبر سے اس کی ہڈیاں نکال کر باہر پھینکو اور میرے باپ کی ہڈیاں وہاں دفن کر دو اور کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ چوں کر جائے۔

"جس پارٹی کی اس وقت حکومت ہے وہ ان کی سپر ہے۔ اور جب اس کی پارٹی پاور میں نہ ہو دوسری پارٹی جس کی حکومت بنتی ہے اس کے اجزا، یعنی اعضائے رئیسہ، اُن کے عتاب سے ڈرتے ہیں کہ نجانے کیا کرا بیٹھیں۔ باقاعدہ سودے بازی ہوتی ہے۔ تمام مزاروں کے گدی نشین ان کے دوست ہیں — ہم پیالہ دوست۔ یہ کاروبار سیاست ہیں میاں تمیذ الرحمٰن۔ کیا جان کو روگ لگا بیٹھے! جاؤ سردار صاحب کے پیر پکڑو اور کہو میں حاضر ہوں۔"

تمیذ اٹھ کھڑا ہوا۔

ایک ہفتے بعد جب تمیز کا خوف بڑی حد تک ختم ہو چکا تھا کہ وہ ضروری کام اورنگ اونان نے کسی اور سے کرا لیا ہوگا، صبح ختم پر تھی اور وہ اوفس میں بیٹھا تھا کہ تین پولس کے آدمی ایک ساتھ چپ اٹھا کر کمرے میں داخل ہوئے۔ تمیز گڑ بڑا گیا۔ اس کے منھ سے نکلا ''کوئی تلاشی لینی ہے؟''

پولیس انسپکٹر نے کہا: ''تمہیں گرفتار کرنا ہے؟''

''کیوں؟ میں نے کون سا ایسا کام کیا ہے!''

''رجب علی نام کے ایک شخص کو تم نے قتل کیا ہے۔''

تمیز چکرا کر بیٹھ گیا۔

آنے والے دنوں میں اُسے پتہ چلتا گیا تمام شواہد اس کے خلاف ہیں۔ اُسے رجب علی کے گھر سے نکلتے دیکھا گیا تھا۔ وہ ہتھیار بھی مل گیا تھا جس سے قتل کیا گیا تھا۔ خنجر جو تمیز کے گھر کی زیر زمین پانی کی ٹنکی سے نکالا گیا تھا۔ خون جو خنجر کے پھل پر ملا رجب علی کا تھا۔ تمیز کی یہ بات نہیں سُنی گئی کہ اس کے گھر کی پانی کی ٹنکی کو تو کسی نے آ کر دیکھا بھی نہیں ہے۔ نہ اس کے سوال کا جواب کسی نے دیا: کہ پانی میں ڈوبے رہنے کے بعد خون خنجر پر کیسے لگا رہ گیا تھا۔ قتل گیارہ اکتوبر کی شام کو چھ بجے ہوا تھا مگر اس وقت تو وہ شہر میں بھی نہیں تھا۔ ایک غیر اہم دفاعی نکتہ تھا۔ عینی گواہ بھی تھے مگر خود اس کی زندگی کے کوائف اُن سے بڑھ کر مستغیث بن گئے تھے۔ پکے دشمن۔ کیا وہ پرانا مجرم نہیں تھا؟ جواری، شرابی، بیوی کو کھو بیٹھنے والا آدمی جس کے غیظ وغضب نے اس کے بیٹے کی جان لی تھی۔

[''کیا یہ لوگ میمونہ سے ملے ہیں یا اس نے بدلہ لینے کے لیے یہاں آ کر میرے خلاف بیان دیا ہے؟'']

کچھ دن پہلے اس کا رجب علی سے جوئے پر جھگڑا ہوا تھا۔ قتل کی شام اُسے اس علاقے میں دیکھا گیا تھا جہاں رجب علی رہتا تھا۔

اپنے بیان میں اس نے کہا تھا: ''اس علاقے میں نہ میرا کوئی رشتے دار رہتا ہے نہ دوست یا واقف۔''

اس پر تحقیر یکل انداز میں استغاثے کے وکیل نے کہا تھا: ''!Thats it۔ پھر وہاں کیا کرنے گئے تھے؟''

اس سے پہلے تمیز کو اس شہر میں اپنی تنہائی کا اتنا احساس نہیں ہوا تھا۔ ایک غیر ملک کا، غیروں کا شہر جہاں اپنا کوئی نہیں تھا۔ پرانی راجدھانی سے جب فسادات شروع ہونے پر بھاگا تھا اور منی پور پہنچا تھا کیا یہ اچھا نہ ہوتا وہیں دم لیتا ہمیشہ کے لیے۔

'یہ بڑا شہر میرے نہ سہی میمونہ کے رشتے داروں، دوستوں اور ملنے والوں سے بھرا پڑا ہے۔ شاعر بھی اسی شہر میں ہے۔ گرفتاری کی خبر اس نے بھی پڑھی ہوگی مگر اس شہر کی فضا میں بے وفائی ہے۔ اس تمام عرصہ میں کومریڈ صبغت اللہ بھی یقیناً کئی بار آیا ہوگا مع اپنی سفید بیوی کے۔ اُسے کون میرا نیا پتہ بتاتا! ایمن وہیں فم کیپٹل سٹی میں ہوگا۔ ہوسکتا ہے پروڈیوسر بن گیا ہو یا شراب نے اُسے مار ڈالا ہو۔ وہ ایک تھا یار وفادار۔ میرے جیل جانے سے اس کی دوستی میں فرق نہیں آتا۔ پتہ نہیں جنگ ختم ہونے پر اس کے باپ گھر لوٹے یا وہیں مانڈلے میں دفن ہوئے!

ملنے والے میں سمجھتا تھا میرے دم سے ہیں، میمونہ گئی تو وہ بھی غائب ہو گئے!

'طلاق یا خلع سے شوہر اور بیوی کی محبت تو ختم نہیں ہوجاتی ہے۔ خوشی کے ساتھ گزارے ہوئے دن یکسر تو غائب نہیں ہوجاتے ہیں۔ اگر مجھ سے ملنے آجاتی یا عدالت میں حاضر ہوکر استغاثے کو جھٹلا دیتی کہ تمیز مغلوب الغضب آدمی نہیں ہے۔ چھپکلی اور کوک روچ تو مار نہیں سکتا ہے ایک انسان کو کیا مارتا۔' تو کیا اس کا دوسرا نکاح اگر اس نے کسی سے کیا ہے، ٹوٹ جاتا!'

مرتضیٰ قریشی وغیرہ کو اس نے پیغام بھیجے تو تھے کہ' کچھ کرو۔ میں بے گناہ پھانسی پر لٹکایا جانے والا ہوں۔' مگر اس زمانے کے ساتھیوں میں سے کسی نے ایک بار بھی شکل نہیں دکھائی ۔ نہ مفت کی ساتھ پینے والوں، جوا کھیلنے والوں اور عورتوں میں حصہ لینے والوں نے، نہ اسمگلنگ اور دوسرے جرائم میں شریک ہونے والوں نے۔

اگر کسی کے آنے کی امید ختم نہیں ہوئی تھی تو وہ امینہ تھی۔ پہلی بار اُسے احساس ہونے لگا میں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ ہمیشہ اپنے دو عشقوں کو گنا۔ تسنیم اور کسم۔ کیوں نہیں امینہ۔ اس لیے کہ میرے نزدیک وہ عورت کے معیار سے گری ہوئی عورت تھی۔ میں خود کیا معیار سے گرا ہوا آدمی نہیں تھا؟ کاش میں نے بہت پہلے تسلیم کرلیا ہوتا کہ میں بھی، جیسے بھی حسب نسب سے پڑے تھے، گرے ہوئے طبقے کا ایک فرد ہوں۔ تھا نہیں تو، بن گیا ہوں۔ یہ تسلیم کرلیتا تو اس کے ساتھ بغیر ضمیر پر کسی بوجھ کے رہنے لگتا۔ اور جب دونوں ایک ہی معیار کے ہوتے نہ وہ مجھ سے کچھ چھپاتی نہ میں اس سے۔ نکاح ہوتا نہ ہوتا آرام سے گزرتی۔ اور مجھ جیسے انسان کو اس کے سوا کیا چاہیے ہوتا ہے!

جیل کے دن اس دفعہ پہلے دو بار جیل جانے سے مختلف تھے۔ دروں ردِّعمل پہلی بار کچھ اور تھا، اس بار کچھ اور۔ پہلے پورے وقت پلان بناتا رہا تھا کس طرح ان سے بدلہ لوں گا جنہوں نے جیل دیا تھا۔ وکیل سے، جرنلسٹ سے۔ تب زندگی کا جائزہ لینے کی صلاحیت اس میں بیدار نہیں ہوئی تھی۔ اس بار جیسے پہلی بار خود کو دیکھ رہا تھا۔ زندگی کی فلم کا شاید پچاس فٹ بھی ایسا نہیں ہے جس پہ بے شرمی کی چھاپ نہ ہو۔

کیس چلا۔ دونوں طرف سے دلائل پیش ہوئے۔ صفائی کے سرکاری وکیل نے مقدمے کی پیروی اس طرح کی جیسے گھر میں نوکر یا بھنگی کے نہ ہونے کی وجہ سے اُسے مرا ہوا چوہا خود اٹھا کر باہر نالی میں پھینکنا پڑ رہا ہے۔

کچھ کا خیال تھا سردار اور رنگ ناز کا عتاب اس وجہ سے تلمیذ پر نازل ہوا ہے کہ وہ اس کی مہربانیوں کو بھول گیا تھا، دوسروں کا خیال تھا نہیں تلمیذ کے انکار کو اس نے اپنی بے عزتی سمجھا: کیوں میرے حکم کو ٹالا! جس کی اس کی شریعت میں بخشش نہیں ہے۔

قتل کے وقت تلمیذ مسقط میں تھا، جیسا کہ صفائی کے وکیل نے کہا۔ لیکن یہ سمندری سفر بھی تلمیذ کے خلاف گیا۔ اس کے پاسپورٹ میں مسقط کا اندراج نہیں تھا۔ نہ کوئی دوسرے travel

documents تھے۔ عرب ڈھاؤ' سے جانے والی بات صفائی کے وکیل نے دبا دی کہ ویسے اسمگلرز جاتے ہیں۔ وہاں عینی گواہ موجود تھے جنہوں نے اسے رجب علی کو قتل کرتے دیکھا تھا۔ رجب علی کے گھر والوں نے خون بہا لینے سے انکار کر دیا اور دوسرے ذریعے سے ان کا پیغام بھی اسے مل گیا کہ ہم بے بس ہیں، کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم خون معاف کر دیں تو ہمارے بچے مار دیئے جائیں گے، اور ہماری لڑکیوں، بہوؤں کا جو حشر ہوگا وہ ہم جانتے ہیں۔

فیصلے کو بہت دن روک کے رکھا گیا۔ کیوں؟ یہ کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ جب سنایا گیا تو تمیذ سر سے پیر کی انگلیوں تک سُن ہو کر رہ گیا۔

سرکاری وکیل نے ہمدردی کی "بعد میں شاید عمر قید میں تبدیل ہو جائے۔"

"یعنی؟"

"پچیس سال۔"

وہ چلایا "مجھے عمر قید نہیں چاہیے۔" جج نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "بڑھاپے میں جیل سے نکل کر کیا بھیک مانگوں گا؟ خود اپنی جان لے لوں گا۔ سو وہ اب لے لیں۔"

آخری بات جو اس نے اجلاس برخواست ہونے سے پہلے کہی یہ تھی: "مجھے اس عدالت سے کوئی توقع نہیں۔ اس ملک کی کسی عدالت سے کوئی توقع نہیں۔ اس ملک میں بیسویں صدی کے آنے میں ابھی بہت دیر ہے۔"

'سو یہ کہانی یہاں ختم ہوتی ہے! اور اس کے لیے میں نے پہلی جیل میں ایک بار پھر ایمان اختیار کیا تھا!

دماغ نے کہا 'اپنے پہلے تجربے یاد کر جب کہتا تھا: ناپاکی کی حالت میں کام بن جاتا ہے۔ خدا سے مدد کی دعا کرتے ہوئے جاؤ تو کام بگڑ جاتا ہے۔ ناجائز میں برکت ہے۔ وہ سب کام

---

[1] ڈاؤ: بادبانی، عرب کشتی Arab dhow

آئے؟

'اور ایمان کس کام آیا؟ تو یہ کس کام آ رہی ہے؟ رحم کی درخواست اور خوں بہا کی پیش کش کام آئے؟ اچھا ہوا رجب علی والے اس پر راضی نہیں ہوئے ورنہ کہاں سے دیتا! مکان بک گیا، کیا دیتا وہ نصرت بھابھی کا دیا ہوا قالین، بے بی ہرمیز کا ٹائپ رائٹر، ایش ٹریز!
جو دنیا میں اہمیت رکھتے ہیں اُن کا نامۂ اعمال کوئی پڑھتا ہے؟ لکھا ہی نہیں جاتا ہے۔'

جس دن فیصلہ سنایا گیا اس رات سالوں بعد اُسے سکون کی نیند بغیر کسی کوشش کے آئی۔ اس رات اس نے دیکھا وہ سردار اورنگ ناز کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہے۔ اورنگ ناز کہہ رہا ہے: ''ایک چکر لگوانا ہے، کسی کو تو لگانا ہی پڑے گا۔''
وہ خاموش رہتا ہے۔ سردار دوبارہ پوچھتا ہے، اپنی زبان یا اردو میں نہیں، انگریزی میں۔ اس کی رعیت اپنی زبان بھی لکھ پڑھ نہیں سکتی ہے، وہ خود انگلستان کی سب سے پرانی یونیورسٹی کا پڑھا ہوا ہے، جہاں کے اکثر پسماندہ ممالک کے لیڈر تعلیم یافتہ ہیں، جہاں اب اس کے دو لڑکے پڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے وہاں کسی کو نہیں بتایا ہے وہ باپ سے اپنی رعیت کے لیے تعویذ لکھنا سیکھ چکے ہیں۔ یہ سب باتیں اس کے ذہن میں ہیں جس وقت سردار اس کا جواب سننے کا منتظر ہے۔
''کیا سوچ رہے ہو؟''
تمیز (وہ خود وہاں اپنے کو بیٹھے دیکھ رہا ہے) کہتا ہے: ''سردار صاحب کوئی لوکل کام ہو جائے۔ لانچ کا سفر میں نہیں کر سکتا، الٹیاں ہونے لگتی ہیں۔''
سردار اورنگ ناز خفا نہیں ہے۔ ''ٹھیک ہے'' کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ ''جب ہوگا تمہیں بلا لوں گا'' اور ساتھ ہی پردہ اٹھا کر برابر کے کمرے میں چلا جاتا ہے جہاں سے عورتوں کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ تمیز نے میز پر رکھے ہوئے نوٹ اٹھا کر جیب میں رکھتے ہوئے جو تھینک یو کہا وہ اس نے نہیں سنا۔

زندگی کے آخری دن گزارنے کے لیے جو کوٹھری اُسے ملی تھی اس میں رہتے ہوئے زندگی کے بعض واقعات تفصیل میں اس کے ذہن میں آنے شروع ہوئے، دوسرے ٹکڑوں ٹکڑوں میں، جن کے بارے میں اگر پوچھا جاتا کون سا واقعہ پہلے کا ہے کون سا بعد کا تو وہ ذہن پر زور دینے کے باوجود نہ بتا پاتا۔

اسکول کے دور میں، شاید ہوش سنبھالتے ہی، جو بات اس نے اپنے بارے میں سُنی یہ تھی 'بگڑ گیا ہے' اور جب بھی اُسے سنتا حیران ہوتا تھا: وہ کیا ہوتا ہے؟ پھر اس میں یہ اضافہ ہو گیا 'لچھن ٹھیک نہیں ہیں۔' وہ سوچتا تھا: پتہ نہیں وہ کیا ہوتے ہیں؟ کیا اس سے مراد لچھمن ہے؟ رام کا چھوٹا بھائی؟ جو میری ہی کلاس میں ایک لڑکا تھا مٹین پور میں۔

اور جب بھی یہ دو خبریں بڑے بھوئی کے ہاتھوں مار کھاتے وقت اُسے سننا پڑتی تھیں اپنے پیچھے اس کے دماغ میں بغاوت کے خیالات چھوڑ جاتی تھیں۔ رات کو انہیں ہوتے ہوں گے پچھڑ کا جھٹکا دے کر وہ اُن سے رستگاری حاصل کرتا تھا اور گہری نیند میں چلا جاتا۔

اب اڑتالیس کی عمر میں جب وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا تھا اُسے تھوڑا تھوڑا اندازہ ہونے لگا تھا لچھن کیا ہوتے ہیں۔ خاص طور سے جس شب سزائے موت کے کنفرم ہو جانے کے بعد اس نے ایک بوڑھے کو خواب میں تین بار کہتے سنا تھا: 'یہ تھے تیرے لچھن۔' ہر بار صرف یہی چار لفظ۔ آنکھ کھل جانے پر اس نے بہت غور کیا: 'ایسے کس بوڑھے کو میں نے بچپن میں دیکھا تھا؟ لڑکپن میں؟ نوجوانی میں داخل ہوتے وقت؟'

لیکن کہیں اس کا پتہ نہیں تھا۔

اٹھ کر اس نے بالٹی سے پانی المونیم کے آبخورے میں لے کر پیا — جیسے کار ریڈی ایٹر سے لیا ہوا پانی ہو۔ اور سو گیا۔

تعجب کی بات یہ ہوئی کہ اس خواب سے پہلے جو تناؤ اس کے ذہن میں تھا، شاید ہمیشہ سے، اور اس سے پیدا ہونے والا جسمانی تناؤ صبح سو کر اٹھنے پر اُن دو سے اس نے خود کو آزاد پایا۔

''ہو گا کوئی'' اس نے خود کو سنایا اور گرل کے دروازے سے باہر کی دنیا کو دیکھنے لگا۔

•

سزائے موت بھی ایک خبر تھی۔ لیکن وہ امید کی موت نہیں تھی کیونکہ اس کے بعد اپیل کی راہ کھلی تھی۔ اُسے اپنے اطمینان پر تعجب تھا۔ اگر کمرے میں اکیلا ہوتا اور وہاں چوہیا فرش پر پھرتی نظر آ جاتی تو وہ سو نہ پاتا۔ لیکن یہ اطمینان کچھ ویسا تھا جیسے وہ ایسے گڑھے میں گر پڑا ہے جہاں سے نکلنا ناممکن ہے، نہ شور مچانے، پکارنے پر کوئی بچانے کو آئے گا اور سامنے ایک ناگ پھن پھیلائے زمین سے گز بھر اٹھا اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔

دوسرے ہی دن پیٹ خراب ہوا۔ وہ حیران تھا جیل میں کھانے کو دیا گیا جاتا تھا جو پیٹ خراب ہوا۔ ڈاکٹر دیکھنے آیا۔ چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ 'سال دو سال میں اگر یہاں کام کرتا رہا اتنا ہی فربہ ہو جائے گا جتنا پچھلی جیل کا ڈاکٹر تھا۔'

اُس سے تلمیذ کی سماعت کی پہنچ میں، جیلر کہہ رہا تھا ''اسے پھانسی کے دن تک زندہ رکھنا ہے۔''

''ورنہ؟'' اس سے آگے تلمیذ نہ سن سکا۔

اس رات نیم بے ہوشی میں اس نے ماں کو باپ سے کہتے سنا: ''آپ کو بڑی بیٹی سب سے بڑھ کر پیاری تھی۔ میرے بچ جانے والے بچوں میں وہ پہلا لڑکا تھا جسے نجانے کس بات کی سزا میں اس کے یہاں رہنے کو بھیج دیا۔ میری سوت کے گھر۔ وہاں سوکھتا رہا، اتنا کہ کوئی بھوکا بنگالی نہ ہوگا۔ کیا عیب تھا اس میں؟ کیا آپ کی طرح ''

''اور آپ نے یہ بھی تو کہا تھا۔'' وہ باپ کی قمیص کا دامن ہلاتے ہوئے کہہ رہا ہے ''اس کی ماں کی موت اس کی وجہ سے ہوئی۔''

لیکن وہ اس کی بات نہیں سن رہے تھے۔

(۴۷)

"تو خدا کی دنیا میں میرے لیے یہ آخری جگہ لکھی تھی!" ان تین سپاٹ دیواروں، چھت، فرش اور سامنے کے گرل کے دروازے پر تھکی ہوئی نظریں لے جاتے ہوئے تملید کے دماغ میں آیا۔ اس میں وہ چلا کر لایا گیا تھا اور جب دروازہ ابھی کھلا تھا تب بھی وہ بھاگ کر اپنی جان نہیں بچا سکتا تھا۔ یہ بے بسی اس کے دماغ میں خود بخود آن بسی تھی۔

"نہیں یہ آخری جگہ نہیں ہے۔ آخری جگہ وہ ہوگی جہاں یہ زندگی ختم ہوگی" دماغ نے جواب دیا۔

اس حقیقت کا کڑوا گھونٹ آسانی سے پی جانے کے بعد اس کا سر بغیر پٹھوں اور مسلز (muscles) کی مزاحمت کے ایک بوجھ کی طرح خود بخود گھٹنوں کے بیچ میں جا کر ٹک گیا، اور انہیں بازوؤں نے اپنے حلقے میں لے لیا۔ یہ وہ حالت تھی جو ماں کے رحم میں ہوتی ہے۔ سارا جسم، سر سے لے کر پیروں تک کام کر رہا تھا، صرف آنکھیں بند تھیں اور کان، اور سوچنے والا دماغ سو گیا تھا۔ اس کے بعد کے دن، وہ بھی گنتی کے، شاید اس کی زندگی کے بہترین دن تھے جن میں نہ کسی قسم کا ملال تھا، نہ دروازہ کھٹکھناتی ہوئی موت کا ہراس، نہ ان سب پر غصہ جنہوں نے اس کے خیال میں اُسے اس حالت کو پہنچایا تھا، جن پر اپنے احسانات کو وہ گنتا تھا۔

یہ سکون موت کا دھڑکا نکل جانے پر اُسے نصیب ہوا تھا، اور کتنے ہی دن اپنے آغوش میں لیے رہا۔

دوسرے مجرم بے وجہ اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کرتے، کھانے کو کہتے، بول کر

دل ہلکا کرنے کو کہتے۔ جیل کے عملے میں سے ایک دیندار سپاہی اور قیدیوں میں سے بھی ایک اُسے مرنے سے پہلے راہ راست پر لانے کی کوشش میں لگے تھے یا سمجھتے تھے قرآنی آیات اس کے اس سکتے کو ختم کر دیں گی۔ سکتے سے اگر نکل آیا تو مرنے کی تیاری کرلے گا، ورنہ حرام موت مرے گا — بغیر توبہ کئے اور مغفرت کی دعا مانگے۔ آیات کے پڑھتے جانے کے دوران وہ ان کی طرف دیکھتا رہتا، آیات کے معنی بھی سنتا، لیکن رہتا اسی بے حسی کے عالم میں۔

اس سکتے سے پہلے جب تک ایک بار پھر بچ جانے کی امید تھی اس کے دماغ کے پرزے پورے وقت کام کرتے رہتے تھے: 'اس دفعہ پھر رہا ہو کر دکھا دوں گا۔ نئے سرے سے زندگی شروع کروں گا، کوئی نیا گزارے لائق کاروبار، زیادہ کی طمع نہیں کروں گا، بیوی بچوں کو واپس لے آؤں گا۔

('کیسے معلوم ہوا اُس نے دوسری شادی نہیں کرلی ہے اور تمہاری یاد کو سینے سے لگائے بیٹھی ہے؟')

'چاہے اس میں بیوی کے آگے ہاتھ جوڑنے پڑیں یا اس کے پیروں پر سر رکھنا پڑے۔ اور اس میں برا کیا ہے: اس نے نہیں پچاس دفعہ بھی سب مجھے منانے کے لیے کیا ہے۔ عزت کی زندگی گزاروں گا، قول اور فعل میں اللہ سے ڈرنے والے انسان کی۔ ایک بار پھر مجھے آزاد ہو کر دکھانا ہے۔ ہار ماننے والا انسان میں نہیں ہوں۔'

جتنے دن مقدمہ چلا خیالات کے ریلے نے اُسے تھکا مارا، اُن کے آگے نہ دن کو چین تھا نہ رات کو آرام، انہیں روکنا کس کے بس میں ہوتا ہے جو وہ روک پاتا: 'ایسا کیا ہوتا تو الزام مجھ پر نہ آتا، فلاں سے اتنے سال پہلے راڑ مول نہ لی ہوتی تو وہ میرے خلاف گواہی نہ دیتا۔ میں کیوں اتنی جلد طیش میں آجاتا ہوں! سب کو اپنا دشمن بنا لیا۔ اپنے غصے پر فخر کرتا تھا۔ کہتا تھا: غصہ ہمارے خاندان میں ہے، کسی سے دب کر بات نہیں کرتا ہوں۔ اب سمجھ میں آیا ہے اپنے غصے کا بکھان کرنے والے اندر سے کمزور اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔ چاہیے تھا اس سے بچپن ہی

میں توبہ کرلی ہوتی۔ اگر توبہ کرلی ہوتی اور بیوی مجھے شراب کے نشے میں چھوڑ کر گھر سے نہ نکل جاتی — ایسا کتنی بار پہلے ہو چکا تھا آخر کو اس کی برداشت جواب دے گئی — تو آج وہ دن رات قرآن پڑھ پڑھ کر میرے بری ہونے کی دعا مانگتی ہوتی اور میں بچ جاتا۔ یہی کام بڑی بیٹی کرتی، اور ماں چھوٹی بیٹی کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دعا میں اٹھا دیتی اور اس سے کہلواتی ''اللہ میاں میرے ڈیڈی کی جان بچایئے۔ انہوں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ بہت اچھے آدمی ہیں۔ انہیں گندے آدمیوں سے بچایئے۔ اورنگ اونان سے بچایئے۔''

'اور بہن بھائیوں کو چھوڑ کر اگر اس غیر ملک میں نہ پڑا ہوتا تو یہی کام وہ کرتے۔ میں نے خود کو وہ بدنصیب انسان بنا لیا ہے جو سب کے ہوتے ہوئے بھی دنیا میں اکیلا ہے۔'

'میمونہ جانتی ہے ساتھ رہتے ہوئے مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی، صرف بیوی نہیں رہی تھی، اور میری ہوتے ہوئے وہ کسی اور کی نہیں ہوسکتی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل پر سجی ہوئی پرفیوم کی شیشیاں اُسے نہیں بھولی ہوں گی جنہیں وہ اپنے آخری خط پر پیپر ویٹ بنا کر رکھ گئی تھی نہ میک اپ بوکس پر میوزک کے ساتھ ناچتی ہوئی بیلے رینا — وہ میوزک اُسے پسند تھی، نہ بروکیڈ کے جوڑے۔ وہ کار اس کے لیے خریدی تھی، پیسے نہیں رہے بیچنی پڑی۔ میمونہ لوٹ آئے، کار دوبارہ آ جائے گی۔

'وہ ہوتی اور بیرسٹر احمد عبدالرحمٰن زندہ ہوتے — سب اُن کی منتیں کرتے'' پہلے آپ چھڑا چکے ہیں اس بار بھی چھڑا لیں گے۔ تمیذ کی زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے۔'' وہ مجھے بچا لیتے۔

('شرک کر رہے ہو')

یہ وکیل صرف اس وجہ سے مجھے ملا ہے کہ مفت کا ہے۔ کام اگر بن بھی سکتا تھا تو یہ اُسے بگاڑ رہا ہے۔ اورنگ ناز کے آدمیوں کا خریدا ہوا ہے۔

اتنا کمایا۔ اگر بچایا ہوتا تو آج کام آتا۔ کوئی بیرسٹر احمد عبدالرحمٰن کے پائے کا Criminal law expert[1] کیا جاتا۔ وہ پھانسی کے پھندے سے بھی اتار لاتا۔

'جوئے کے ہزاروں لاکھوں پتہ ہی نہیں چلا کب آئے کب میرے ہاتھوں سے نکل گئے۔ لوگ

---

[1] فوجداری مقدمات کا ماہر وکیل

سچ کہتے ہیں جوئے کا پیسہ نکلتا نہیں ہے۔

('لوگ تو اس پیسے سے حج تک کر آتے ہیں۔ ایک دفعہ نہیں کئی کئی بار')

'نہ دھوکا دھڑی کے دوسرے دھندوں کا۔ اس پر زکوۃ ہی دی ہوتی تو شاید...'

'جوئے کے پیسے پر زکوۃ!' مایوسی میں بھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔' یہ تو وہی بات ہوئی جو جرنلسٹ غیور کہتا تھا'' کھانے سے پہلے سؤر کے گوشت پر لیموں کا رس نچوڑ دو تو حلال ہو جاتا ہے۔'' پکا لفنگا تھا۔ نہ کافر، نہ مشرک۔ اخلاق سے پھرا ہوا مرتد۔ صحیح موت مرا۔'

'میری غلطی تھی۔ پہلی ہی پیشی پر مرتضیٰ قریشی کا کچا چٹھا بیان کر دیتا اور جو پہلے مقدمے میں اس کے بارے میں اُن ایمان کے پتلے جج صاحب نے اپنے وردکٹ[1] میں کہا تھا اور مجھے رہا کیا گیا تھا اسی نے جب مجھے ایک جرم میں پھنسایا تھا اور اس دفعہ جانتے بوجھتے کہ اورنگ ناز کس قماش کا آدمی ہے، مجھ سے کیا کام لے گا اس سے مجھے انٹرویو کرایا، اس کے حوالے کر دیا، جیسے مگرمچھوں کے تالاب میں ڈالے جانے والا منت کا بکری کا بچہ ہوں۔'

ان دنوں جب فیصلہ سنائے جانے میں ابھی وقت تھا اور خود کو برا کہتے کہتے دماغ تھک جاتا تو کہنے لگتا: 'اتنا برا تو تو نہیں ہے، کچھ اچھے کام بھی کیے ہیں۔ جب ہاتھ میں پیسے ہوتے تھے بڑھیوں ٹھڑیوں کی مدد بھی کر دیتا تھا۔ ان میں سے کچھ سے رشتے داری تھی تو بس اتنی کہ سنتا تھا رشتے دار ہیں۔ کیسی؟ اس کا پتہ نہیں چلا۔ وہ بھی مر چکی ہیں۔ زندہ ہوتیں تو کہلواتا: ''بے قصور ہوں۔ میرے بچنے کی دعا کرو۔'' اور وہ کرتیں مجھے یقین ہے، اور میں بچ جاتا۔

'وہ فلم کیپیٹل سٹی کا ایکٹر جو تجھے نہیں جانتا تھا اور جسے تو تعلیم کے زمانے سے فلموں میں دیکھتا آیا تھا جب اس کے ہاتھوں کو فالج مار گیا تھا، کتنی بار تو نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے، راہ چلتوں کی نظروں سے بچا کر اس کے ہاتھ میں نوٹ دے کر مٹھی بند کر دی تھی کہ وہ خود کو تیری نظروں میں حقیر نہ سمجھے۔

---

۱ فیصلے

'اُسے دیکھ کر مجھے اس کی فلموں کے پروڈیوسر ڈائریکٹر پر غصہ آتا تھا جو اس وقت تک بوکس آفس فلمیں بنا رہا تھا اور اُسے سال میں دو چار بار چند ہزار نہیں بھیج سکتا تھا! فلمی دنیا کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتی ہے۔

'امینہ کے بھائی کی تعلیم کا خرچہ۔ وہ میری کیا تھی؟ کچھ بھی نہیں۔

کیا اُن میں سے کسی نے مجھے دعا نہیں دی ہوگی جو اس وقت کام آئے گی؟'

('ضرور آئے گی')

کچھ دیر اس کا ساتھ دے کر پھر ستانے والے خیالات شروع ہو جاتے۔ 'کیس بگڑ رہا ہے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ قانون اپنی سب منزلیں طے کر چکا ہے۔ خوں بہا دینے کو میرے پاس کیا ہے؟ اور اُسے لینے والا کون ہے! مرنے والے کے گھر والوں سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ قتل میں نے نہیں کیا۔ اور جانتا ہوں میرے خوں بہا دینے کی اپیل کو ٹھکرانے کے پیچھے بھی وہ اس سے لے چکے ہیں جس نے اُن کے آدمی کا قتل کروایا تھا اور اپنے بیان کو بدلنے کا نتیجہ بھی جانتے ہیں۔ خوں بہا دینے کی اپیل بھی ایک قانونی تکلف تھا جو میرے وکیل نے کیا تھا۔ حقیقت جو بھی ہو مقتول کے آدمیوں کا بیان عدالت میں سب کچھ ہے: انہوں نے مجھے ان کے آدمی کے ایک ہاتھ کے فاصلے سے سینے میں خنجر اتارتے دیکھا تھا جب وہ مجھ سے گلے ملنے کو آگے بڑھ رہا تھا- ایک دو نے نہیں، گھرانے کے سارے آدمیوں نے۔ اور اُن میں سے ایک بھی ٹوٹنے کو تیار نہیں ہے کہ اس شخص کو تو ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ شہنشاہ جہانگیر کاش اس دور میں تم ہوتے اور فیصلے اپنی عقل سے کیا کرتے، گواہوں کے بیان سن کر اور circumstantial evidence' کی بنیاد پر نہیں۔ تم پہلی سے لے کر آخری پیشی تک بھانپ جاتے استغاثے نے کتنی بار اپنا بیان بدلا ہے اور تمہارا سوال ہوتا: ''اصل مجرم کہاں ہے جس کے حکم پر یہ قتل ہوا؟ اسے حاضر کرو۔''

'ربا ایڈ میرل پریزیڈنٹ، میں اس کے لیے کیا حقیقت رکھتا ہوں۔ پھانسی کے پھندے

' قرائنی شہادت

میں میرے لٹکائے جانے سے ایک دن پہلے چھپے گا: پریزیڈینٹ نے رحم کی درخواست مسترد کر دی، اور اسے اس کی مُنصفی سمجھا جائے گا کہ قانون توڑنے والوں اور قاتلوں پر مہربان نہیں ہے۔ اب کون نہیں جانتا اس سے بڑا قانون کو ٹھوکر میں اڑانے والا اس ملک میں دوسرا نہیں۔ اس کے تینوں بیٹے سونے کا کاروبار کرتے ہیں، دوسروں کو کیا کہیے۔ بہرحال یہ درخواست میں نے نہیں کی ہے۔ اس مفت کے وکیل نے کی ہے جو لٹکائے جاتے وقت شاید میرے آس پاس ہوگا اور جیل کا 'ڈوکٹر بھی جسے دستوں اور قبض کا فرق نہیں معلوم، پی پی کر اور چربی سے لدا گوشت کھا کھا کر پورا بھنگیوں کا پالا ہوا سور بن گیا ہے۔'

آخری گرفتاری کے وقت سے تمیز کو لگتا تھا ایک ہزار موسیقی کے آلات کا اورکیسٹرا ہے جسے اس کے دماغ میں رات دن کنڈکٹ کیا جا رہا ہے اور اس کا بار بار لوٹ کر آنے والا ٹکڑا[1] تھا: 'اب کیا ہوگا'، 'اب کیا ہوگا' اور جب مقدمہ بگڑنے لگا وہ 'پھانسی، پھانسی، پھانسی' بن گیا۔

کیا تکلیف کا دور تھا، نہ نیند نہ بھوک اور ان سب سے بڑھ کر پیٹ کا ہول۔ دماغ ہنسنا تو کیا رونا تک بھول گیا تھا۔ سر لگتا تھا پھٹ جائے گا، لیکن پھٹنے کا نام نہیں لیتا تھا۔

پچھلے مقدموں کی طرح اس دفعہ بھی دماغ پورے وقت کام کرتا رہا تھا: وکیل کو کیا بتانا ہے، کیا نہیں، جج کے سامنے کیا کہنا ہے کیا نہیں اور جب سوال جواب سب ختم ہو گئے اور فیصلہ آئندہ پر انحصار رکھا گیا تب بھی دماغ کی یہ جرح جاری رہی۔

جس دن فیصلہ سنایا جانے والا تھا وہ اکیلا وہاں لے جایا گیا، کوئی ساتھ نہیں تھا۔ اپنوں میں سے کوئی نہیں۔ وکیل کسی سے ہنس ہنس کر اس شام کا پروگرام طے کر رہا تھا پھر وقت آنے پر اس نے ادھ جلی سگریٹ کسی کو تھمائی اور اندر چلا آیا۔

موت کا فائنل حکم سن کر اُسے لگا اورکیسٹرا کنڈکٹ کرنے والے کی چھڑی (baton) کی

---

[1] leitmotiff

حرکت کے رک جانے پر دماغ کے میوزک ہول میں سناٹا ہوگیا ہے۔ چلتے چلتے وہ دن آ پہنچا تھا جب مزید زندگی کا امکان ختم کر دیا گیا تھا۔

عدالت کے برخواست ہونے کے کچھ ہی دیر بعد تلمیذ نے دیکھا اس کا وکیل جس آدمی سے پروگرام کی بات ادھوری چھوڑ کر اندر گیا تھا دوبارہ، نئی سگریٹ سلگا کر اسی گرمی سے اس سے باتوں میں مصروف تھا۔

اس کے بعد اُس کا دماغ سردیوں میں پتھروں کے نیچے جا چھپنے والے مینڈکوں اور کچھوؤں کی طرح سو گیا۔

اس کوٹھری میں دھکیلے جاتے وقت جب اپنی زندگی کی حفاظت کا خیال اس کے لیے بے معنی ہو گیا تھا اس کا دماغ اس طرح ماؤف تھا کہ اگر کوئی کہتا: 'اٹھو وہ سامنے پھانسی گھر ہے' تو بغیر مزاحمت اور ایک لمحہ ضائع کیے وہ ایک میسمیرائزڈ شخص کی طرح اٹھ کھڑا ہوتا اور بغیر کسی قسم کے جذبات کے اس کے پیچھے چل پڑتا۔ یا شاید کہتا 'چلو'۔ جیسے نشے میں ہو۔

(۴۸)

موت کے فیصلے نے جو سکتہ تمیز کو دیا تھا اُسے وہ اپنی آخری خوش نصیبی گنتا تھا اور ہمیشہ اُسے دوبارہ پانے کا آرزومند رہا۔ جب سکتہ نہ رہا تو اُسے ان خیالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جو کڑواہٹ سے بھرے تھے اور انہیں روکنے کا گُر اسے نہیں آتا تھا۔ کس کس کا دل دکھایا، کس کی خدمت کرنی چاہیے تھی نہیں کی، خود اپنے پر کیسے کیسے ظلم کئے، کب زندگی اچھی چل رہی تھی اور ذرا سی ترغیب نے اُسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ جب یہ حالت ہوتی تھی اس کا جی صرف ایک ہی چیز چاہتا تھا۔ موت، فوری موت جیسے فوری کوفی۔ (instant coffee[1])

اس شدید مایوسی کے خلاف جو حربہ وہ استعمال کر رہا تھا دو دھاری تھا، کبھی سکون لاتا تھا کبھی مزید مایوسی میں دھکیل دیتا تھا۔ ایک دن اُسی حربے نے کہا:

اس دن اپنی دور کی رشتے دار بڑی بی کو دیکھنے وہاں گئے تھے جہاں ساری آبادی جھونپڑیوں کی تھی جن میں وہ لوگ رہ رہے تھے، خاندان کے خاندان جن کے چھوڑے ہوئے ملک میں محل دو محلے نہ سہی پکے مکان ضرور تھے، صحن اور دالان والے۔ ان ہی جھونپڑیوں میں سے ایک میں چنی خالہ رہ رہی تھیں۔ اس دن اُن کی جوان بیٹی ساجدہ بخار میں جل رہی تھی۔ تمہارے پرس میں بس اتنا تھا کہ دو پیگ کو کافی ہوتا۔ تم وہ انہیں دے کر آ گئے تھے اور رات بھر سو نہیں سکے

---

[1] وہ کوفی جس کے بیج کے پاؤڈر کو دیر تک پکانا نہیں پڑتا ہے

تھے۔ وہ ہے یاد رکھنے والی بات۔

(’چھوڑو اس قصے کو کہ جوزف فیروز وکٹر کے پیسے سے جوا کھیلتے تھے کیونکہ تمہاری جیب میں ایک پیسہ نہیں تھا۔ وہ خود تیسرے پہر سے بیٹھا ہار رہا تھا اور جیت کے پیسوں میں سے تمہیں اُسے آدھے دینے تھے۔ مگر جب تم وہاں سے اٹھے اور وہ اپنا حصہ لینے پر اڑ گیا تو تم نے ہاتھ مروڑ کر اُسے گرایا تھا اور اس کے منہ میں ایک نوٹ ٹھونس کر باہر نکل آئے تھے۔ اس لیے کہ وہ کمزور آدمی تھا اور تم اگر چاہتے تو اُسے قتل بھی کر سکتے تھے۔‘)

’’ہرگز نہیں‘‘ اچانک تلمیذ کے منہ سے اونچی آواز میں نکلا۔

برابر کے سیل سے آواز آئی ’’کیا ہرگز نہیں؟ کسی کو معاف کرنے کے لیے کسی نے تم سے کہا؟ مت چھوڑنا پھنسانے والے ایک بھی سور کے بچے کو۔‘‘

تلمیذ ہنس پڑا ’’تمہارا مشورہ یاد رکھوں گا۔‘‘

تھوڑی دیر دماغ خاموش رہا۔ حقیقت میں اس نے اتنی دیر میں تکلیف دہ خیال کے سرے کو پھر ڈھونڈ نکالا تھا۔

(’وہ بہت پرانی بات ہے، شادی سے پہلے کی۔ اب کی بات کرو۔ بعد میں تم نے ان ماں بیٹی کی ایک بار بھی سدھ نہیں لی، دونوں کو شادی کے بعد کی پارٹی میں بھی نہیں بلایا۔ ساجدہ زندہ ہے؟ کہاں گئی؟ اُسے تم نے میمونہ سے ملایا تک نہیں۔‘)

’میں اُسے وہاں لے گیا تھا لیکن جنی خالہ کا انتقال ہو چکا تھا اور ساجدہ کا پتہ تو وہاں کے رہنے والوں تک کو معلوم نہیں تھا۔‘

شروع کے ان خیالات میں گناہ کا ذکر کہیں نہیں تھا نہ اس کا کہ ایک دن اسلامک یونیورسٹی ٹاؤن میں دوستوں کے درمیان اس نے بغیر ان کے پوچھے اعلان کیا تھا ’میں خدا کو

نہیں مانتا ہوں۔'

پھر ایک دن ذہن کے سوال پر کہ ایسا کیوں کیا تھا اس نے کہا: 'مجھے لگ رہا تھا ان کا ایک اندرونی سرکل بنتا جارہا تھا اور میں اس کے باہر تھا۔ اگر ان سے دور ہوجاتا تو تنہا رہ جاتا۔ میں سب کچھ برداشت کرسکتا تھا، بھوک تک، لیکن ذہنی تنہائی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ یہ ایک ذہنی تحریک تھی ان کے اندرونی سرکل میں رہنے کی۔'

پھر اس نے سوچ کر کہا 'لیکن خدا اُس کی سزا مجھے دے رہا ہے اسے میں ماننے کو تیار نہیں ہوں۔ کیا میں خوف کے عالم میں اُسے یاد نہیں کرتا رہا ہوں!'

تھوڑی دیر دماغ پھر چپ سادھے رہا۔

'ہاں تکلیف اس حقیقت کی ہے کہ انہوں نے مذہب مطالعہ کر کے چھوڑا ہوگا، مختلف مذاہب کی کتابیں، تفسیر...

('اور تم نے بغیر مطالعہ کیے')

'[1]I was a damn fool?

('[2]No, you have always been a suggestible fool')

('اس بار اگر نیا سربراہ سلطنت تمہاری جاں بخشی بھی کردے تو بھی رہو گے وہی: دوسروں کی رائے پر چل پڑنے والے احمق')

'پھر؟'

('تمہیں پوری طرح تباہ ہوجانا چاہیے۔must perish')

تمیزا اپنی بے بسی پر رونے لگا۔

---

[1] میں پورا احمق تھا۔

[2] نہیں تم ہمیشہ دوسروں کے پھسلائے میں آجانے والے احمق رہے ہو، آسانی سے دوسروں کی رائے کو مان لینے والے۔

'زندگی صرف اپنی امپورٹ میں فراغت سے بسر ہوجاتی کیوں میں اس لالچ میں آ گیا اور آتا رہا کہ وہ لائن زیادہ مالداری کی طرف لے جارہی ہے جو دوسرے دکھاتے تھے اور میں دیکھتا تھا۔ زیادہ قیمت پر مال نکالنا، contraband items[1] کو ادھر سے اُدھر لے جانا، اسمگلنگ، فورجری[2]، ذرا سی بات پر مارپیٹ پر اتر آنا ('نتیجہ؟' دماغ پکارا) غلط لوگوں کے رجسٹر میں ہمیشہ کے لیے ایک نام درج ہوگیا- تمنیذ الرحمٰن خلف عتیق الرحمٰن، جائے پیدائش نیئی پور۔ اور اسی روش نے یہاں پہنچا دیا۔'

کچھ دیر اس نے پرانے فلمی گانوں کی لے کو ذہن میں لانے کی کوشش کی۔ کبھی لگتا واقعی وہ اُن مدھر آوازوں کو سُن رہا ہے، بیچ کے وقفوں میں ساتھ دینے والے اورکیسٹرا کو بھی، لیکن بس تھوڑی دیر کو۔ تنگ آ کر اُسے سننا پڑا:

('لیکن کیا ترغیب ہی سب کچھ تھی؟ اپنے طوفانی غصے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ہمیشہ ایسا ہوا اگر غصے کی رو میں خود کو نہ بہہ جانے دیا ہوتا، ایک جگہ جم کر کام کرتے تو کامیابی بالآخر تمہارے قدم چومتی۔ کوئی بڑی کوالیفیکیشن نہ رکھنے پر بھی اچھی خاصی پوسٹس پر رہے اور ہر دفعہ اسے ہفتوں یا چند ماہ میں کھو دیا')

واقعی اُسے ان روزنوں کا شمار یاد نہیں تھا جو روزگار کی تلاش میں اس پر کھلتے گئے تھے اور پھٹ پڑنے والے غصے کے ابال کے ساتھ بند بھی ہوتے گئے۔

'میں تھا وہ جس پر سدا پیدا کرنے والے نے دھن برسایا۔ نوکریوں کی بھی کمی نہیں رہی، نہ کبھی فٹ پاتھ پر سویا- اور یہ سب بغیر نماز پڑھے، روزہ رکھے اور دعا مانگے۔'

اور جب بالٹی سے نکال کر پانی پی رہا تھا اُسے ہنسی آئی کہ 'زندگی کے آخری سین میں بھی کب پیدا کرنے والے نے ساتھ چھوڑا ہے! یہاں بھی سر پر چھت ہے، نیچے سیمنٹ کا فرش، دروازہ مضبوط ہے اور مقفل۔ چوری کا کھٹکا نہیں - پہرے دار ہیں، اور کھانے پینے کی بھی فکر

---

۱ ممنوعہ تجارت

۲ جعل سازی

نہیں۔ اس بالٹی کا پانی تاثیر میں سوڈا واٹر ہے۔ ہاضم۔'

پھر دروازے کے پاس اپنی پسندیدہ جگہ، پسندیدہ پوز میں بیٹھتے ہوئے اونچی آواز میں بولا: ''عیش ہیں دوست۔''

سیمنٹ کے فرش کے اتنے حصے پر اس کے مسلسل بیٹھنے سے ایک چکتا پڑ گیا تھا — چمک دار گول نشان، جس کے لیے وہ خود سے کہا کرتا تھا: ''اپنی نشانی چھوڑ کر جاؤں گا۔''

ایک دن جب بالٹی تازہ پانی سے بھری تھی تلمیذ لوہے کے مگ سے جو پانی پینے کا بھی برتن تھا اور نہانے کا بھی دیر سے ایک کھیل میں لگا تھا۔ بظاہر ایک کھیل میں۔ مگ کو پانی سے بھر کر اپنے کندھے کی اونچائی تک لے جاتا اور دھار باندھ کر پانی کو بالٹی میں گراتا۔ ایک سپاہی نے جو بار بر بھی تھا سیل کے سامنے سے گزرتے ہوئے کہا ''کیا دودھ ٹھنڈا کر رہے ہو؟''

تلمیذ نے رخ بغیر اس کی طرف کئے کہا: ''دودھ نہیں خیالات۔ خیالات کو ٹھنڈا کر رہا ہوں۔''

''کرتے رہو۔'' کہتا ہوا سپاہی آگے چلا گیا۔

تلمیذ کے خیالات ٹھیر گئے۔ بڑی مشکل سے دوبارہ ان تک اس کی رسائی ہوئی: 'پہلی دو جیلوں میں مجھے پورے وقت یہ خیالات کھائے جاتے تھے کس نے میرے ساتھ کیا کیا تھا، کس نے دھوکا دیا، کس نے کپٹ کی، کس نے بے وفائی — اور میں ہر وقت جوش میں رہتا تھا۔ اس جیل میں معاملہ الٹ ہے: زیادہ وقت خود کو دیکھتے رہنے میں جاتا ہے اور جو اس آئینے میں نظر آتا ہے جان کھینچ کر لے جاتا ہے، نہ کسی سے ملنے بات کرنے کی آرزو رہ جاتی ہے، نہ کھانے پینے کی، آرام کرنے اور سونے تک کی نہیں۔ یہی حالت رہے تو پھانسی کی بھی کیا حاجت رہ جائے گی!'

(۴۹)

انسان کے پاس ناپسندیدہ خیالات اور ستانے والے جذبات کو دماغ سے بھگانے کا ہمیشہ سے صرف ایک ہی ہتھیار رہا ہے، شراب اور نشہ آور اشیا نہیں، افیون تک نہیں — ان کی جگہ پسندیدہ کو لا بسانے کا۔ خواہ وہ کتنا ہی عارضی کیوں نہ ہو۔

تمیذ جانتا تھا زندگی کے کتنے ہی واقعات یادداشت میں ہمیشہ سے تلملاتے رہے ہیں لیکن ان کو گھیر گھار کر ذہن میں لانا اس کوشش سے کم نہیں تھا جو اُس گلے بان کو کرنی پڑتی ہے جس کے ڈھوروں کو باگھ نے تتر بتر کر دیا ہو۔ جیسا مینی پور کے دنوں میں اکثر سننے میں آیا تھا باگھ فلاں کے باڑے میں رات کو کودا اور بکری اٹھا کر لے گیا۔ کستوری جلانے کی لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے سورج ڈوبنے پر گھر آ رہی تھی، اوروں سے پیچھے رہ گئی تھی، راستے میں ندی پڑتی تھی۔ اتنی گہری تو نہیں تھی، اس میں سے گزر رہی تھی کہ ناکا لے گیا۔ سب حیران تھے یہاں آدمیوں کی بستی میں ناکا کیسے آ گیا۔

اتفاقاً تمیذ کو زندگی کی دوڑ کی اسٹارٹ لائن پر وہ نوکر کھڑا ملا جو ہاتھ پکڑ کر اُسے سنگھاڑا توڑنے کے لیے تالاب میں پیر رکھنے سے روک رہا تھا: ''بھیا ڈبکی کھا جاؤ گے'' اور وہ غصے سے چیخ رہا تھا۔ اُس سین نے اس کی آنکھوں پر سے سیاہ پردہ ہٹا دیا، جیسے اسٹریٹ فوٹوگرافر نے تصویر کھینچنے کے بعد کیمرے کے پیچھے بنے ہوئے کپڑے کے ڈارک روم سے اپنا سر باہر نکالا اور اردگرد کی،

مختلف رنگوں کی حرکت کرتی ہوئی اور بے حرکت دنیا اُسے اپنی جگہ ملی۔

اُس سین کے ذہن میں جاگ اٹھنے پر اُسے اپنا سر اتنا کسا ہوا نہیں لگا۔ وہ خیال، بچپن میں سنگھاڑے کے پیچھے پانی میں چل پڑنے کا، آیا اپنی مرضی سے تھا لیکن تمیذ اُسے خدا حافظ کہنے کو تیار نہیں تھا۔ آخر کو اس کا تعلق نمنی پور سے تھا جہاں اس نے بچپن سے لے کر لڑکپن تک گزارا تھا۔

کسی شہر سے کبھی ختم نہ ہونے والی محبت وہاں آنکھیں کھولنے، اور لڑکپن اور نوجوانی وہاں گزارنے کی دین ہوتی ہے، بہت حد تک پہلی محبت کی طرح۔ دونوں ہی کی خالی کی ہوئی جگہ کو بعد کی محبت پُر نہیں کر سکتی ہے۔ جن شہروں کو اکثر لوگ بڑے ہونے پر دیکھتے ہیں اور گزرتے میں پسند بھی کر بیٹھتے ہیں وہ تجربہ، عارضی فریفتگی سے زیادہ نہیں ہوتا ہے۔ یاد آ گیا تو خوش ہو لیے بچپن کے بچھڑے ہوئے شہر کی یاد دل میں چھپ کر رہ بستی ہے، جب باہر نکلتی ہے تو دیر تک بیک وقت مسرور بھی کر جاتی ہے اور ملول بھی۔

ایک بار نمنی پور کیا ذہن میں آیا دماغ پر زور دیے بنا وہاں کتنے ہی اور پرانے واقف نکل آئے — اماں، دادی، اسکول کے ساتھی، وہ رال بہتی ہوئی خوبصورت لڑکی جسے ریلوے کوارٹروں میں رہنے والا ایک شخص شاید خرید کر لایا تھا اور اُسے اور اپنی بکری کو ڈیوٹی پر جاتے وقت اپنے کوارٹر میں بند کر کے جاتا تھا، جنگل جلیبی، کمرکھ اور کیت کے درخت اور پہلی بار اس کے گھر میں اس لڑکی کا آنا جس کے بارے میں اس نے پہلی نظر پڑ جانے کے بعد دل میں کہا تھا اس سے خوبصورت لڑکی سارے جہان میں نہیں ہے۔ اس زمانے میں وہ 'سارے جہان میں' کے الفاظ کتنی ہی چیزوں اور جگہوں کے لیے اکثر استعمال کیا کرتا تھا۔

کچھ وقت گزرنے کے بعد تمیذ کو لگنے لگا پھانسی گھر سے دو قدم کے فاصلے پر دماغ نے اپنی راحت کا نیا سامان ڈھونڈ لیا ہے۔ اس سامان کی طرح جسے کام میں نہ آ سکنے کی وجہ سے گھر کے کباڑ خانے میں ڈال دیا گیا ہو اور گھر تبدیل کرتے وقت جب اس سامان کو نکالا جائے تو ہر

چیز ایسی نظر آئے جیسے نئی ہو۔ نہیں، بلکہ ایسی جیسے ارے، یہ تو ذہن ہی سے اتر گئی تھی کہ گھر میں ہے۔ لیکن نہ وہ چیزیں کسی ترتیب سے کباڑ خانے میں ڈالی گئی تھیں، نہ ترتیب سے نکالی جاسکتی ہیں۔ ایک پر ایک پڑی ہے، آپس میں گھتھی ہوئی۔ کبھی وہ پہلے نکلیں جو بعد میں آئی تھیں اور بہت تھوڑی استعمال کے بعد بے کار سمجھ کر انہیں سامنے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ کبھی وہ جو پہلے آئی تھیں دیر تک نظروں کے سامنے رہیں پھر بھی انہیں سب سے پہلے اس نہاں خانے سے نکلنا نصیب ہوا۔ کچھ ایسی بھی تھیں جنہیں باہر نکلنا نصیب نہیں ہوا اور گھر بدلنے والے وہیں چھوڑ گئے۔

ایک شام کھانے کے بعد وہ پھر پرانا تلمیذ تھا۔ مینی پور سے لے کر زندگی کے بے تالے ہو جانے تک جس جس پر اس کی آنکھیں رک کر رہ گئی تھیں وہ سب چہرے اس کے سامنے تھے: وہ لڑکی جس نے اُسے زندگی کی اس خوبصورتی سے روشناس کرایا تھا جس سے وہ پہلے ناآشنا تھا اور جو پھر نصیب نہ ہوئی۔ 'تعجب ہے مجھے اس کا چہرہ یاد نہیں ہے۔ اگر بہت سی اس کی عمر والیوں میں آج اُسے بیٹھے دیکھوں تو پہچان نہیں سکوں گا۔ پھر بھی وہ مجھے یاد ہے۔ میں بھی اسے یاد ہوں گا یا نہیں؟'

('مت بھول یہ خوشی عارضی ہے۔')

اس نے سر کو جھٹکا دے کر اس زبردستی در آنے والے خیال کو باہر کرنا چاہا 'ہو گی عارضی۔ جتنی بھی باقی ہے اس میں خوشی ڈھونڈنا میرا حق ہے۔'

اگلے ہی لمحے خیال نے دوسرا رخ اختیار کر لیا: بچپن میں دیکھے ہوئے چہروں سے ہوتے ہوئے، نوجوانی اور جوانی میں یاد رہ جانے والے چہرے۔ کچھ وہ جن کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا اور وہ جو یاد آ جانے پر آج بھی اپنے ساتھ مسرت لائے تھے۔ 'دماغ نے سب ہی کو تو یاد رکھا ہے، کاش دماغ میں فلٹر لگا ہوتا: کیا یاد رکھنا ہے، کیا نہیں۔ لیکن قدرت نے اپنی بے رحمی میں دماغ کو — کم از کم میرے دماغ کو — ایسی زرخیز زمین بنایا ہے جس پہ جو بیج بھی آن پڑے اگنے لگتا ہے اور اس کی جڑیں کتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ اکھاڑے نہ اکھڑیں۔ اب

کیا میں واقعی مرتضیٰ قریشی، شان الٰہی، غیور، بڑے بھائی جان، سردار اورنگ تاز اور ان جیسوں کے چہروں کو ذہن میں لانا چاہتا ہوں جو وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتے ہیں۔ میرا خیال ہے یہ بھی قدرت کی طرف سے ایک سزا ہے۔'

('اور بدلہ لینے کا خیال تم پر ابھی تک حاوی ہے!')

'یاد ہی آئے تو بربط قادری، مرتضیٰ قریشی کی جج بیوی جسے اپنی عزت کا پاس تھا جو اُسے دھتکارتی تھی۔ اور خواب ان کے چہرے دکھائے جنہیں لیے میں جاگوں تو موت کی سزا بے حقیقت لگے'

اس نے بن بلائے خیال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

(۵۰)

جب دل بہلانے والی یادیں لگتا تھا ختم ہو چکی ہیں یا ختم پر آرہی ہیں اس کے دماغ میں مچی ہوئی قیامت شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اُس افراتفری سے بچنے کے لیے اُسے اپنے خلاف اٹھنے والے ہر الزام کا جواب فوراً دینا پڑتا تھا ورنہ لگتا تھا کچھ ہو جائے گا۔ 'جیسے ابا کو دماغ کی رگ پھٹنے سے ہوا تھا اور کیا ہو سکتا ہے؟' یہ وہ نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اپنی بہتری اُسے نظر آتی تھی تو اس میں کہ اپنی خطاؤں، اپنے گناہوں کا جواز ڈھونڈے۔ اُن سے انکار ممکن نہیں تھا۔

'انسان کی گناہ سے دوری کیا جب دل کی دو دھڑکنوں یا دو سانسوں کے بیچ کے وقفے تک میں وہ اس سب کو دیکھنے پر مجبور ہے جو گناہ کی دعوت دیتا ہے۔ لبھانے والی صورتیں، جسم، آوازیں اور ان سب سے متعلق لوگوں کی آپس میں گفتگو، ویسے ہی لطیفے اور اُن سے پیدا ہونے والا اندرونی طوفان— اور اُسے کیا کہا جا سکتا ہے جو ضبط کے خیمے اڑا کر لے جاتا ہے!

پھر جن حالات سے انسان بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک گزرتا ہے۔ میں اس لڑکے کو بھول سکتا ہوں جو دماغی مریض تو نہیں تھا، بے عقل ضرور تھا! اس کے باپ کی آٹے کی چکی تھی جس پر بہت سے مزدور کام کرتے تھے۔ جب مالک موجود ہو سب خاموشی سے کام کرتے تھے۔ جب وہ دوپہر کا کھانا کھانے آرام کرنے گھر گیا ہو مسرور، لو مجھے اس کا نام تک یاد ہے، کمبخت میرا دماغ کچھ بھی تو نہیں بھلاتا ہے، باپ کی جگہ مزدوروں پر نظر رکھنے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ مزدور کسی

عورت کو سامنے سے گزرتے دیکھ کر اس کو چڑھاتے "اس کو چھو کر تو آ، دیکھیں تو کتنا بہادر ہے۔"
مسرور بھاگتا ہوا جاتا اس عورت کے سینے یا رانوں کے بیچ کی جگہ کو ہاتھ لگا کر اسی تیزی سے کسی گلی میں غائب ہو جاتا۔ وہ عورت رک کر گالیاں بکتی، اگر برقعے والی ہو تو برا بھلا کہتی اور اپنی راہ لیتی۔ مزدور سر نیچا کیے ہنستے رہتے۔ تھوڑی دیر بعد مسرور واپس آ جاتا۔
نہ معلوم آگے جا کر مسرور کا کیا حشر ہوا، خود اس نے ایسے ہی کھیل بڑے ہونے پر کس کس کو سکھائے!
'ہم سب بگڑے بعد میں ہیں، ہمیں بگاڑنے والے پہلے سے موجود تھے۔ اور یہ بگڑنا بعد میں ہوس کی نہ بجھنے والی پیاس بنی۔ پھر میں اپنے کو گنہگار کیوں سمجھوں اور سارا الزام اپنے آپ پر کیوں دھروں!' وہ تھوڑی دیر کو جیت جاتا۔
'اور یہ پیاس پھیل کر کیا کچھ نہیں بن جاتی ہے! عیاشی کا ہر روپ اسی پیاس کی پیداوار ہے۔'
آرام کی نیند کے بعد اُسے لگتا دماغ کا وہ طوفان تھم گیا ہے۔ 'پھانسی اپنی جگہ معین سہی، لیکن ایسا ہی رہے تو زندگی جتنی بھی بچی ہے کیا بری ہے!'
'میں اس وجہ سے گنہگار بنا کہ ساری برائیاں مجھے گھر کے ماحول سے ورثے میں ملیں۔
('چپ بھی ہو۔ پھر اسی بحث کا آغاز کر بیٹھا!')
'اسکول سے پہلے کے دنوں میں، اسکول کے دنوں میں، محلے میں، خاندان میں، شہر میں، کہاں نہیں؟ کیا وہ سب لڑکیاں، عورتیں اور لڑکے اور مرد برابر کے گنہگار ہیں جنہیں ہوش سنبھالتے ہی بتایا گیا تھا گناہ کیا ہے، فرض کیا۔ اور وہ جنہیں ان کے حال پر اس وقت تک چھوڑ رکھا گیا تھا جب تک ان میں قدرتی طور پر اپنے نفع نقصان کی سدھ پوری طرح جاگ گئی تھی۔
('ہوش سنبھالتے ہی؟ ارے مورکھ وہ تو گناہ کا پہلا سبق ہوتا')
'رہی دوسری بات تب اُن کے گناہ اور فرض کو پہچاننے کی ضرورت ہی کیا رہ گئی ہوتی۔'
"خوب خوب واقعات ہیں دنیا کے" اس نے پیروں پر پانی ڈالتے ہوئے آواز سے کہا۔
'وہ وکیل صاحب جن کی حویلی تھی، جس کا جھروکا سڑک کے رُخ پر تھا جدھر سے اسکول جانے والی کم عمر لڑکیاں صبح صبح گزرتی تھیں اور پردہ کرنے والی لڑکیاں اسکول کے بند ٹھیلوں

میں۔ اس وقت وکیل صاحب تازہ ہوا کے لیے جھروکے میں آن بیٹھتے تھے۔ وکیل صاحب کی بیوی نہیں تھیں۔ ہم سنتے تھے وہ اپنے ماں باپ کے گھر جا کر بیٹھ رہی ہیں۔ وکیل صاحب کی تحویل میں اُن کی پردہ کرنے والی بیٹی تھی اور اس سے تھوڑی کم عمر کا بیٹا۔ بیٹی ہائی اسکول کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ اسے گھر پر پڑھانے کے لیے ماسٹر صاحب آتے تھے۔ جتنی دیر وہ پڑھاتے تھے وکیل صاحب کی نوکرانی آبادی وہاں سے لمحے بھر کو نہیں ہٹتی تھی۔ اتنا وقت وکیل صاحب آبادی کے گھر میں گزارتے تھے۔ کوٹھے کا ایک کمرے اور صحن کا گھر، جس میں تین آدمی — آبادی، آبادی کی اٹھارا، بیس سال کی بیٹی اور آٹھ سال کا بیٹا رہ رہے تھے۔ اب وقت ملا ہے تو سوچتا ہوں کس مصلحت کے تحت آبادی کی بیٹی جمیلہ کو نہیں سمجھایا گیا تھا کہ تنہائی کو نامحرم کے ساتھ گزارنا گناہ ہے؟ میرا خیال ہے وہ تو وہ آبادی بھی گنہگار نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں ایسے گناہ کی جگہ کوئی اور ہی تصور تھا جس نے اُسے مطمئن کر رکھا تھا کیوں بٹیا کی حفاظت ضروری ہے اس کی اپنی بیٹی کی نہیں۔ شاید بچپن ہی سے میرے ذہن میں گناہ کا کوئی غیر معمولی تصور تھا۔ (سب ہی کے ذہن میں اچھائی برائی کا اپنا ہی تصور ہوتا ہے،، نئی بات کیا کہہ رہے ہو')

اس رات تلمیذ نے خواب میں اپنی ماں کو قرآن پڑھتے دیکھا۔

'گرمیوں کی صبح ہے۔ گھر کے سب لوگ ابھی نہیں جگے ہیں۔ صحن میں اُگے ہوئے امرود کے پیڑ میں چھپی چڑیاں بول رہی ہیں۔ وہ پلنگ پر بیٹھی ہیں۔ ان کے سامنے گاؤ تکیے پر قرآن مجید کھلا ہے۔ میں ان کے سامنے لیٹا ان کے چلتے ہوئے ہونٹوں کو دیکھ رہا ہوں۔ ہمیشہ کی طرح ان کی قرآن پڑھنے کی آواز مدہم اور مترنم ہے جس پر میں فدا تھا۔ قرآن کو بند کرتے ہوئے انہوں نے ایک ایسی بات کی جو پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ انہوں نے کہا:

''جو کوئی بھی رحمٰن [۱] کی یاد سے غافل ہوجاتا ہے ہم اس کے ساتھ
ایک شیطان کر دیتے ہیں اور وہ اس کا ہم نشین بن جاتا ہے۔''

---

۱ الزخرف ۴۳:۳۶

پھر انہوں نے کچھ منہ ہی منہ میں پڑھ کر مجھ پر دم کیا۔'

جاگ اٹھنے پر تلمیذ بہت دیر تک ماں کی سانس کو اپنے سر اور چہرے پر محسوس کرتا رہا۔

(۵۱)

ایسا بار ہا ہوا دل دماغ پہ دن رات مردنی چھائی ہوئی ہے، پھر دنوں بعد وہاں سے گزرے ہوئے لطف دینے والے واقعات کا گزر ہوا اور اُن تین دیواروں کی کوٹھری کی ہر چیز بدل گئی، پھانسی گھر اس کے قرب سے یکسر غائب ہو گیا، چھت اور دیواریں مونس لگنے لگیں، پھیکا سیٹھا کھانا مزہ دینے لگا، وہ کیفیت بھی کبھی لوٹ آتی جو یہاں آنے سے پہلے ہی ساتھ چھوڑ گئی تھی: پرانے فلمی گانے اور مکالمے کانوں میں گونجنے لگے، اور اُن میں کے بھی کتنوں ہی کی آوازیں جن سے کبھی زندگانی کا لطف تھا۔ نیند بھی سرِشام آ جاتی۔ کبھی بلا خوابوں کی، کبھی خوابوں سے بھری۔

اس دفعہ جب گزری ہوئی زندگی کے خوشگوار واقعات نے ساتھ دینا چھوڑ دیا تو تملیذ کا واسطہ پھر اپنے خالی دماغ سے پڑا جس میں نہ کوئی خواہش تھی، نہ پچھتاوا۔ دن کی روشنی اور رات کے اندھیرے میں مطلق فرق نہیں تھا۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ موسم سرد ہے یا گرم۔ نہ اُجڑے لون میں بھاگتے ہوئے سوکھے پتے اور اڑتی ہوئی سیمل کی روئی اپنے پیچھے مسرت چھوڑتے تھے نہ آسمان کی گھڑگھڑاہٹ خوف دلاتی تھی۔ اور وہ کہتا اس سے برا دور ساری زندگی میں نہیں آیا تھا۔ بغیر دکھ سکھ کے جذبات کی دنیا۔ نہ خود پر غصہ آتا ہے، نہ دنیا والوں پر۔

تلمیذ جانتا تھا موت اس کے اختیار میں نہیں ہے، یا یہ کہ اس کوٹھری میں بند کر کے جہاں شیو کرنے کا بلیڈ تک اس کے پاس نہیں ہے، اس کے اختیار سے لے گئی ہے۔ اور جب تک وہ محترمہ نہیں آ جاتی ہیں یہ بے کلی ساتھ نہیں چھوڑے گی۔ لگتا ہے یہاں آ کر تو ہر ایک کا ایک نئی قسم کی موت سے پالا پڑا ہے جسے وہ ماننے کو تیار نہیں ہوتا ہے۔ وہ نہیں جو ہوتی ہے لیکن جب انسان دکھ بیماری سے آزاد ہو وہ اسے دور دور تک نظر نہیں آتی ہے، اپنا بھیانک چہرہ صرف شدید بیماری کی حالت میں دکھاتی ہے۔ اور تب بھی ذرا صحت سدھری اور اس کا منڈلاتا ہوا چہرہ نظروں سے غائب ہو گیا۔

'آخر کو تو جیل سے باہر بھی ایک دن آنی تھی۔ کسی ہسپتال کے بیڈ پر، یا گھر میں چارپائی پر۔ پھر اگر یہاں آئے تو کیا برا ہے۔' ایسے خیالات جب آئیں، لگتا تھا مایوسی کو ختم کر گئے ہیں اور اب وقت اچھا گزرے گا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد ایک بار پھر وہی مایوسی کے خیالات دماغ میں پرا باندھ کر آنے لگتے ہیں: 'یہ غلط کیا تھا، وہ غلط کیا تھا۔ وہ سارے موقعے آئے اور نکل گئے جن میں خود کو بدل سکتے تھے، خدا سے دوری کی سزا ہے، بددعا ہے کسی کی۔ نمنی پور کی بڑھیاں نہیں کہتی تھیں کسی کی قبر پر پیر پڑا ہے یا غلط جگہ پیشاب کیا ہے۔ دنیا میں ہر جگہ کوئی نہ کوئی تو دفن ہے۔ کیا ہوگا۔ اور میں نے تو قبروں پر بیٹھ کر جوا کھیلا ہے۔' اُسے ہنسی آ جاتی۔

کبھی کبھی اٹھ کر وہ کوٹھری میں ٹہلنے لگتا: لوہے کی گرل کے جنگلے سے پیچھے تک، پیچھے سے جنگلے تک۔ اکتا کر فاصلہ بڑھانے کے لیے کونوں سے کونوں تک۔ لیکن اُس کو اُکتا جانا کہنا بھی غلط تھا—بس ایک بیٹری سے چلنے والے بچوں کے ٹرک کی طرح، جب تک اس کی بیٹری چلے۔

کبھی کبھی وہ سنتری سے پوچھنے کو ہوتا: پھانسی کی تاریخ کب بتائی جائے گی، یا اسی طرح جیتا رکھیں گے قیامت تک!

'خالی دماغ'، اُسے ڈر ہوتا تھا، مذہب کی طرف لے جائے گا، بلکہ مذہبیت کی طرف اور ایک بار اس کے خیالات آ کر دماغ میں ڈیرا جما لیں تو اُن کے قدموں پر چل کر خطاؤں، غیض و غضب اور بدکاری کے خیالات کا لشکر آئے گا جس سے اس سیل (cell) میں بیٹھے بیٹھے ٹکر لینا میرے

لیے ناممکن ہوگا، نہ کوئی تسلی دینے والا ہوگا، نہ کسی سے لڑسکوں گا، نہ بوتل مدد کو آئے گی۔

ایک رات تمکینہ کو احساس ہوا — اتنے دنوں میں پہلی بار، جب ساری دنیا سو رہی ہوتی ہے ایک سانپ اس کی کوٹھری کے سامنے، سیدھے ہاتھ سے نمودار ہوتا ہے اور اس طرف چلا جاتا ہے جدھر صحن میں پیپل کا پیڑ ہے۔ اپنے سفر میں وہ رک کر تمکینہ کی کوٹھری کی طرف بھی نہیں دیکھتا تھا:

'یہ بے رخی!'

اگلے دن تمکینہ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا: "آؤ پیارے، تمہارا ہی تو اتنے دن سے انتظار کر رہا تھا۔" سانپ ٹھہر گیا۔

تمکینہ نے کہا: "آؤ، اپنا زہر سارے کا سارا میرے جسم میں اتار دو۔ تمہیں بھی سکون مل جائے گا، مجھے بھی۔ قسم لے لو چیخنا تو کیا 'سی' تک میرے منھ سے نہیں نکلے گا۔"

سانپ نے سر اٹھا کر اور پھن پھیلا کر اُسے دیکھا، اب وہ تمکینہ کو بس ناگ نظر آیا، اور لاپرواہی سے اپنی راہ لی۔

'بے عزتی سی بے عزتی ہے۔ اس نے مجھے بے ضرر سمجھا۔' تمکینہ سر کر نیچا کر کے جنگلے سے ٹیک کر ادھر دیکھتا رہا جدھر سانپ گیا تھا لیکن وہ نظر نہ آیا۔

اگلے دن تمکینہ کا جی صبح سے کسی سے بات کرنے کو چاہ رہا تھا۔

(۵۲)

تسنیم سے خوبصورت لڑکی اگر سارے خاندان میں نہیں تھی تو کسم سے زیادہ دل آویز چہرہ کب اس نے دیکھا تھا۔ پہلی بار نظر آنے کے بعد اس کی کنول جیسی آنکھیں - شاید ایسی ہی آنکھوں کو کنول کہتے ہوں گے - اس کے دماغ میں رات بھر بسی رہیں، اور اگلے دن کلاس میں بھی۔

'تعجب ہے ایسی ہستی کو جسے ایک لمحے کو بھی بھلایا نہیں جا سکتا تھا، میں اتنے سال بھولا رہا! یہ نہیں میں واقعی اُسے بھول گیا تھا۔ اگر موت کی سزا سناتے وقت جج پوچھتا: راجد ھانی میں کسی لڑکی کے گھر تم جایا کرتے تھے؟ تو بغیر جھجکے کہتا: 'حضور جایا کرتا نہیں تھا، صرف تین بار گیا تھا۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو روز وہاں نظر آتا، صبح اور شام۔'

خیال کی اس نئی رو نے جیسے اردگرد کی اینٹ پتھر اور غم اور مایوسی کی عمارت ڈھا دی اور وہ دوبارہ تلمیذ تھا۔ راجدھانی بھیجے جانے سے پہلے کا تلمیذ الرحمٰن ۔فکروں اور خوف سے آزاد۔ خود اپنے الفاظ میں بچپن سے دل پھینک۔ اپنے سینے میں چند مسرت بھرے راز چھپائے جن میں مطلق کڑواہٹ نہیں تھی، نہ گناہ کا کوئی جذبہ اُن سے بندھا تھا جو یادداشت کے اس اُبال کو روکنے کی کوشش کرتا۔ اگر کوئی حقیقت تھی تو اتنی کہ کسم کے خیال نے آ کر موت کی لائی ہوئی دن رات کی افسردگی کو دھکا دے کر کہیں پیچھے کر دیا تھا، پھانسی گھر میں رہتے ہوئے بھی وہ آزاد تھا۔

'اور اس کے سوا انسان یا کوئی بھی جاندار ہوتا کیا ہے۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انسان اپنے آرام دہ گھر میں بھی زندگی کا ذائقہ گم کرسکتا ہے، اور وہاں بہت کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سکون کی زندگی بسر کرسکتا ہے۔'

اس کے بعد کے دنوں میں جب بھی پھانسی کا پھندا اس کے دماغ پر مسلط ہونا چاہتا وہ اُن دنوں کی مووی کے ایک ایک فریم کو اس طرح دیکھتا جیسے اُسے ایڈٹ کررہا ہے. کچھ ضائع نہ ہونے پائے اور جو فالتو تھا اسے نکال باہر کرتا۔ یادداشت کے وہ ٹکڑے جو غصہ، ہوائے نفس اور عیاشی کے سین اپنے اندر رکھتے تھے اٹھ کر موت کے خوف کو تازہ کردیتے تھے کیونکہ ہر جرم جو اس سے سرزد ہوا تھا انہی کے کہنے اور اُکسانے پر ہوا تھا۔

اُن دنوں جیل میں ایک نئی زندگی نے آکر اس کے دماغ میں بسنا شروع کیا تھا: 'زندگی اگر ویسی ہوتی تو اُس میں نفس اور عیاشی کی پکار کو سنا ان سنا بھی کیا جاسکتا تھا۔'

اس پر اس کا دماغ پوچھتا ('یا نہیں کیا جاسکتا تھا؟')

وہ اس سوال کو پھاند جاتا۔ 'آئیڈیل مسلم' آئیڈیل انسان، جسے بہت کم چاہیے ہوتا ہے۔ سادے کپڑے، ایک شیروانی سردیوں کے لیے، ایک گرمیوں کے لیے۔ یا وہ بھی نہ ہوں۔ نینی پور کے اکثر ماسٹر صرف قمیص پجامے میں اسکول آتے تھے۔ ان کے دل میں کسی بڑے شہر میں جاکر قسمت آزمانے کا خیال کبھی نہیں آتا تھا۔ وہیں کام کرتے تھے، وہیں ریٹائر ہوکر رہنے لگتے تھے — برائے نام پنشن پر۔

اس نے دیکھا تھا اسکول ختم ہونے پر کبھی کبھی گھر جاتے ہوئے اُن میں سے کوئی پھل خرید کر لے جاتا تھا۔ ایک ماسٹر صاحب اپنے رومال میں صرف تین قلمی آم باندھ کر لے جاسکتے تھے اور وہ تین ہی خریدتے تھے۔ پھر وہ اس رومال کی گٹھا کو دو انگلیوں اور انگوٹھے میں پکڑے دوسرے ماسٹروں سے باتیں کرتے گھر کی طرف چل پڑتے۔

'وہ کیا تھی؟'

'اُن کی قناعت۔'

(تمہیں کیا معلوم؟ یا اس سے زیادہ وہ خرید ہی نہیں سکتے تھے؟')

'مجھ کو وہ سیکھنا چاہیے تھا۔ نوکریاں بھر بھر کے پھل گھر لانے والا آدمی نہیں، جو ابا تھے۔'

'میں بھی پڑھ لکھ کر ماسٹر بن جاتا۔ کچھ وقت کھیتی کو دیتا۔'

'دروازے کے پاس کی کیاریوں میں جو بیلیں لگی ہیں اور انہیں میں نے ٹھاٹھروں پر چڑھایا ہے اُن سے بھنڈی، ترئی، کریلے، مرچیں لٹک رہی ہیں۔ اندر ایک کم عمر عورت جس کی ضرورتیں بھی میری طرح بہت کم ہیں گھر کا کام ختم کر کے لالٹین کی روشنی میں کوئی کتاب پڑھ رہی ہے۔ اُسے پہلے بچے کا انتظار ہے اور اسے میں زیادہ کام کرنے نہیں دیتا ہوں۔ لالٹین کی چمنی صاف کر کے، بتی کتر کے اور لالٹین میں تیل ڈال کر اس کے لیے کھونٹے سے ٹانگ آیا ہوں۔'

ذہن خود بخود گھر سے دور چلا گیا۔' بچوں کو لے کر میں سنگھاڑوں کے تالاب پر گیا ہوں۔ انہیں کنارے سے ہٹ کر کھڑے ہونے کا کہہ کر خود ہاتھ بڑھا کر سنگھاڑے توڑ رہا ہوں۔ تالاب سنگھاڑوں سے خالی ہو چکا ہے۔ میں بچوں سے کہتا ہوں باقی اگلے سال۔ اور وہ اس بات پر راضی ہو جاتے ہیں: اور کے لیے مچلتے نہیں ہیں۔

بچوں کے کھلونے کیا ہیں، معمولی قیمت کی مٹی کی پپ پپیا اور مٹی کی ڈگڈگی، جنہیں وہ سنبھال کر رکھتے ہیں چابی کا لٹو، بیٹری سے چلنے والے قیمتی کھلونے نہیں، جن میں سے ایک کی قیمت میں ایک دیہاتی عورت کی ساڑی آ سکتی ہے اور اس کے مرد کی تہمد۔

'کتابیں رکھنے کی بھی انہیں تمیز ہے۔

بوی اماں بی کے زیوروں میں سے جو اُسے ملے تھے خوش ہو کر عید، بقر عید پر پہنتی ہے، یا جب کسی شادی میں جاتا ہو۔ کچھ میں نے بھی پس انداز کر کے بنوا دیے ہیں۔ جانتا تھا یہ خود ان کے لیے نہیں کہے گی۔

'بیوی بچے، تنخواہ اور کھیت کی اپج — میں ان سے مطمئن ہوں۔ میرے اندر وہ جھوٹی پیاس نہیں ہے جسے بجھانے کے لیے اسکوچ چاہیے ہو بلکہ یہ نام تو میں جانتا بھی نہیں ہوں گا۔ ٹھرّا جو نینی پور میں بکتا ہے، اس کی پیاس بھی نہیں۔ نہ ریستوران کے کھانے اور سمندر کے ساحل پر لڑکیوں کے ساتھ جانے کو وہ انسان اکساتا ہے جس نے ہابیل کو قابیل سے مروایا تھا۔ اور جب یہ سب نہیں تو زیادہ پیسہ مجھے کب چاہیے ہے۔ بیوی نے اکثر کہا ہے 'اللہ نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔' اور وہاں رہتے ہوئے میں اس کی بات سمجھ سکتا تھا لیکن راجدھانی یا فلم ورلڈ کیپیٹل میں رہ کر نہیں، نہ اُس برطانوی عرب پروٹیکٹریٹ بندرگاہ میں رہ کر، نہ اس بڑے شہر میں رہ کر جہاں میری موت کھینچ کر لے آئی ہے۔

'یہ ممکن تھا نینی پور میں رہ کر، ضروری نہیں نینی پور ہی میں رہ کر، ویسی زندگی آدمی کسی بڑے شہر میں رہ کر بھی گزار سکتا ہے۔ اس کے لیے اسکول، ماسٹر ہونا بھی ضروری نہیں ہے — پروفیسر، تاجر، ہیڈ اوف اسٹیٹ کچھ بھی ہوا جا سکتا ہے جس کی بھی ضرورتیں محدود ہوں۔'

پھر دماغ کہیں اور پہنچ گیا: 'میں ریٹائر ہونے والا ہوں۔ نہ قرضہ ستا رہا ہے، نہ کوئی کیس سر پر منڈلا رہا ہے نہ جھوٹا نہ سچا۔ وہ میری بے جا ضرورتیں، میرے دشمن اس سیدھی سادی دنیا میں گھس پاتے! انہوں ہی نے عجیب مکڑی کا سا جالا میرے دل دماغ پر تن رکھا تھا۔'

وہ جانتا تھا خیال کا دھارا بغیر بتائے اُسے مذہب کی طرف لے جا رہا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی گناہ کا عفریت وہاں اس کے گناہوں کو اُگلنے کو تیار کھڑا ہوگا جو ظاہر ہوکر اس کی نیند اور بھوک ہفتوں کے لیے اڑا لے جائیں گے۔ یہاں نیند کی گولی سے بھی محروم رکھا جاتا ہے اور موت سے بھی۔'

'ان ماضی کو بہتر بنانے کے خیالات سے بھی ماضی کب بہتر ہو پاتا ہے! اس کا امکان بنانے والے نے رکھا ہی نہیں ہے۔ بس کچھ دیر کو دماغ ہلکا لگتا ہے اور اُس کے بعد مایوسی اور ضمیر کی گرفت اور شدید ہو جاتی ہے۔ کاش خودکشی کی سہولت دی جاتی۔'

(۵۳)

جب کیس میں ابھی جان باقی تھی اور وہ وقت بھی ابھی دور تھا جب اس کی رحم کی درخواست ملک کے پریزیڈنٹ کے سامنے پیش کی جاتی ایک کونسٹیبل جو پابندی سے نماز پڑھتا نظر آتا تھا، اور اپنی ایمان داری کے لیے پہچانا جاتا تھا، رات کو اکثر اس کے سیل کے پاس آ بیٹھتا تھا۔ اس نے یہ بات اکثر تلمیذ سے کہی تھی ''تمہارے لیے صرف ایک آس ہے جو لگاؤ تو پوری ہوگی۔''

پہلی دفعہ تلمیذ نے بے دھیانی سے کہا تھا: ''کون سی؟''

''اللہ سے لو، سکون مل جائے گا۔ یہ لوگ تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ نہ تم امپورٹنٹ ہو، نہ سیاست کے کام کے ہو، نہ قارون کے بھائی ہو کہ سب کا پیٹ سونے کے بسکٹوں سے بھر دو۔ اور تمہارا کیس تو دنیا جہان سے فرق ہے: مرنے والے کے وارث تک سامنے نہیں آ رہے ہیں جنہیں خون کی قیمت دے سکو۔''

پہلی بار وارثوں والی بات سننے پر تلمیذ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا:

''تم خدا کو مانتے ہو؟''

''ہاں۔''

''تو مجھے پھانسی ہو جائے تو بھی یاد رکھنا میں چاہے کتنا بھی برا آدمی ہوں، کتنا ہی گنہگار، میں نے

ساری زندگی میں کبھی نہ کسی کا خون کیا نہ خون کرنے کا ارادہ، بلکہ میں نے تو کبھی کسی حلال جانور تک کو ذبح نہیں کیا۔ میں بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک بقرعید کے دن اس طرف نہیں جاتا تھا جدھر جانور ذبح کیے جاتے تھے، اس لیے کہ خون دیکھنے سے مجھے ہمیشہ سے......"

ایماندار کونسٹیبل نے کہا "مجھے تمہاری بات کا یقین ہوگیا۔ لیکن میں کیا کرسکتا ہوں۔ آج میں لوگ اپ کے باہر ہوں: ان کا کہا نہ مانوں تو کل میں بھی بند ہوں گا۔ مجھے نہیں چھوڑتے۔"

"کون؟" تمیند کے منہ سے نکلا۔ اور پھر فوراً ہی "کاہے سے نہیں چھوڑتے؟"

"نوکری سے۔ سو دفعہ ریٹائر کر دیے جانے کے لیے درخواست دے چکا ہوں کہ دماغی کمزوری ہے، پاگل ہو جاتا ہوں بعض وقت۔ نیند، ہاضمہ، آنکھیں سب خراب ہو چکے ہیں۔ نہیں مانتے۔ لعنت ہے ایسی نوکری پر۔ مجھے عینی گواہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ قرآن پر ہاتھ رکھوا کر بے گناہوں کو مجرم بنواتے ہیں کہ ہاں اسے میں نے جائے واردات پر دیکھا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اس نے قتل کیا تھا۔ پتہ نہیں کیسی مٹی کے بنے ہوئے ہیں یہ لوگ! لعنت ہے ایسی روزی پر۔ چھوڑ کر گھر بیٹھ رہوں تو ایسا پھنسوں کہ دن دیکھنا نصیب نہ ہو کہ جھوٹی گواہیاں دی تھیں ۔ چت بھی ان کی، پٹ بھی ان کی۔ میں نوکری چھوڑ کر بھیک مانگنے کو تیار ہوں، یہ نہیں چھوڑتے۔ گواہی نہ دوں، بھاگ جاؤں بیوی بچوں کو مار دیں گے یا اغوا کرا دیں گے۔ ایسا پہلے ایک کونسٹیبل کے ساتھ کر چکے ہیں۔ بیوی کہتی ہے: 'نوکری چھوڑ دو، تمہارے لقات لگ گئے ہیں، سوتے میں اول فول بکتے ہو، بچے ڈر کر جاگ جاتے ہیں۔ اللہ رزاق ہے۔' مگر یہ اللہ کو رزاق بننے دیں، تب نا۔ وہ کہتی ہے: 'میں لوگوں کے برتن مانجھوں گی، کپڑے دھوؤں گی۔ تم گھر بیٹھ رہو۔' قرآن کی بے عزتی اور میں کروں! جی چاہتا ہے: دہریا یا کافر بن جاؤں تو عدالت جاتے ہوئے دل نہیں ملے گا کہ اب......"

برابر کے سیل سے آواز آئی: "توبہ کرلو اور اللہ سے لو لگا لو اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

ایماندار کونسٹیبل کی بات کٹ گئی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

بات کاٹنے والے نے کہا: "اگر قتل کیا ہے یا تمہارے بہتان کی وجہ سے کسی نے خودکشی کی تھی

اور تمہیں سزائے موت ہوئی۔ پھر تم نے خون بہا دے کر آزادی خرید لی تو یاد رکھو مرنے کے بعد آخرت میں تم بے قصور نہیں ٹھیرائے جاؤ گے، قتل کا گناہ ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔ یہ نہیں کہ خدا بھی معاف کر دے۔"

بولنے والے کا لہجہ ایسا تھا کہ اس کی بدیاں لکھنے والا فرشتہ اپنے لکھے پر لکیر کھینچ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا۔

تمیز نے جذبات کی سردی دور ہوتی ہوئی محسوس کی۔ بولا: "تم نے قتل خود کیا تھا، کسی اور سے کروایا تھا، یا تمہارے بہتان سے کسی نے خودکشی کی تھی جو یہاں پڑے ہو؟"

سعید الحسن نے کہا: "تینوں میں سے ایک بھی نہیں۔ مجھ سے کسی نے کروایا تھا۔"

"کس نے؟"

"وہ تم نہیں سمجھو گے۔ تم روح کو نہیں مانتے تو ان باتوں کو کیا سمجھو گے۔ روح خدا خود جسم میں پھونکتا ہے، اس نے آدم کے جسم میں پھونکی تھی۔ اسی نے مریم کے رحم میں پھونکی تھی۔ روح بہت طاقتور ہوتی ہے، خدا کے بعد سب سے طاقتور۔"

"کیا مذہب کے نام پر کسی نے تم سے قتل کرایا تھا؟" سعید الحسن کے سیل کی دوسری طرف والے مجرم نے پوچھا لیکن سعید الحسن نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔

تمیز جنگلے کے باہر ایک ہاتھ پھیلا کر دوسرے بازو پر سر رکھ کر فرش پر لیٹ گیا۔ جو دن جا چکا تھا اس کی شام جو باتیں سیل سے گھنٹہ بھر کی رہائی میں قیدیوں میں ہوئی تھیں تمیز کے ذہن میں آنے لگیں۔ جیسے خواب میں جو کچھ ہوا تھا اب جاگنے پر یاد آ رہا تھا:

"کچھ مجرم فیصلہ جلد چاہتے ہیں جیسے مکہ کے کفار قیامت کے جلد بپا کیے جانے پر اصرار کرتے تھے۔ یعنی محض ڈراوا ہے آئے گی نہیں۔ نہ قیامت کچھ ہے۔"

"یہاں معاملہ الٹ ہے۔ جانتے ہیں پھانسی ہوگی، اس کا ڈراوا نہیں ہے۔ تاریخ پر تاریخ پڑتی جا رہی ہے۔ یہ جج نہیں ہے، وہ جج چھٹی پر ہے، وہ مر گیا۔"

''جیوری بیٹھے گی۔ آدمی کم پڑ رہے ہیں۔ جتنے ہیں متفق ہو ہو کر چھٹی کریں، گھر والے بھی دوڑ بھاگ میں تھک چکے ہیں چاہے مُنھ سے نہ کہتے ہوں۔ وہ بھی آرام سے بیٹھیں۔''

''مردہ قبر میں آرام کرے، مقدمے سے گھر والوں کو کنگال ہوتا نہ دیکھے۔'' ممدو نے کہا۔ یہ وہ آدمی تھا جس کی آنکھوں سے آنسو بہتے کسی نے نہیں دیکھا تھا لیکن زندگی سے بُری طرح بیزار نظر آتا تھا، ہمیشہ۔ کبھی کبھی ملنے کے لیے آنے والوں کی خبر سن کر شہادت کی انگلی اٹھا کر 'نہ' کا اشارہ کرتا تھا اور جگہ سے نہیں ہلتا تھا جیسے موت کا انتظار کر رہا ہو کہ اگر ایک لمحے کو بھی جگہ سے ہلا تو موت کا فرشتہ اگر آیا تو اُسے نہ پا کر واپس چلا جائے گا۔

رفیق نے، جس کے پرانے پیچ پرزوں کے کھیئے[1] کو اب اس کا بوڑھا باپ سنبھال رہا تھا، دل کی گہرائی سے کہا تھا: ''جتنی دیر ٹل جائے اچھا ہے۔ عبادت کرلیں۔''

اُس شام اور اس سے پہلے کے دنوں میں تمیذ کو کچھ ایسے مجرم بھی نظر آئے تھے جن کی گفتگو میں دو ایک پولس والے بھی شامل رہتے تھے۔ یہ لوگ سب قیدیوں سے مختلف تھے۔ وہ اس امید میں تھے کہ دیکھیں کب نئی پارٹی کی حکومت بنتی ہے۔

انہیں قوی امید تھی جس حکومت نے انہیں قتل کے مقدمے میں پھانسا تھا ٹوٹ جائے گی۔ الیکشن ہوں یا فسادات، نئی حکومت بنے گی اور عام معافی دی جائے گی۔ جس طرح شہنشاہ دیا کرتے تھے — اپنے یا ملکہ کے صحت یاب ہونے پر، یا عید کا چاند نظر آنے پر۔ اس دور کے سیاسی لیڈر جب ان کے اختیار میں حکومت ہو اُن شہنشاہوں سے کم نہیں ہوتے ہیں۔ ان کے بھی دربار لگتے ہیں جن میں پرجا کی شکایات کی درخواستیں لیتے ہیں اور دربار ختم ہونے پر انہیں سیکریٹری کے حوالے کر کے ہاتھی پر بیٹھ کر نہیں، لمبی لموزین میں بیٹھ کر عوام کو ہاتھ ہلاتے ہوئے وہاں سے چلے جاتے ہیں۔

جس وقت تمیذ نیند میں ڈوبتا جا رہا تھا اُسے اپنی آواز سنائی دی، جیسے دور سے آرہی ہو:

---

[1] سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر دکان۔

''یہ بھی شہنشاہوں سے کیا کم ہیں۔ حکومت ان کی آنے والی پشتوں میں چلتی ہے۔''

آنے والے جمعے کی نماز کے لیے جب مجرم مسجد لے جائے جا رہے تھے، کونسٹیبل ذاکر نے اس کے سیل کے پاس آ کر کہا: ''چلو نماز پڑھ لو۔''
تملیذ نے کہا: ''یہ دھوکا ہے جو میں خود کو نہیں دینا چاہتا۔ جسے زندگی بھر نہیں مانا اُسے اب کیا مانوں۔ مایوسی کے دن آ جانے پر؟ میں کوئی سمندر میں پھنسا ہوا فرعون ہوں کہ ڈوبنے لگوں تو موسیٰ کے رب کو پکاروں کہ میں ایمان لایا، مجھے بچا۔ جیسے ابھی موسیٰ اور اس کے آدمیوں کو بچایا ہے۔''
''یہ واقعہ کب پڑھا تھا؟''
''پڑھا نہیں تھا، میری ماں بچپن میں قرآن کے قصے سنایا کرتی تھیں۔''
''تندرست ہیں؟''
''اللہ کو پیاری ہوئیں۔''

اس شام دین دار کونسٹیبل، جسے تملیذ اس کی داڑھی اور ماتھے پر سجدے کے نشان کی وجہ سے مولوی ذاکر کہنے لگا تھا، جب ڈیوٹی ختم ہوئی تھکا ہارا خاص طور سے اس کے سیل کے پاس آیا اور بولا: ''گھر سے مشکوٰۃ شریف منگوا لو۔ وہ پڑھا کرو پھر اپنا فرعون سے مقابلہ کرنا چھوڑ دو گے۔ تمھیں پتہ چلے گا پچھتانے اور توبہ کرنے والے کے لیے اللہ نے کیا انعام رکھے ہیں۔ اُسے غلطی اور گناہ پر شرمندہ ہونے والے بندے بہت پسند ہیں۔''
تملیذ نے کہا: ''گھر والے مجھے بھول گئے ہیں۔ ہیں ہی نہیں۔ آتے دیکھا ہے تم نے کسی کو؟ اور میں نے کب کہا میں فرعون ہوں۔ کب میں نے اپنے دشمنوں کے بیٹوں کو پیدا ہوتے ہی مروایا! میری بھی آن ہے۔ فرعون سے تو بہتر آدمی ہوں — ذاکر بھائی۔''
اگلے دن دین دار کونسٹیبل نے اُسے مشکوٰۃ شریف لا کر دی۔ پہلی جلد۔

کچھ دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا، پہلی جلد، دوسری جلد، تیسری، چوتھی اور تلمیذ بغیر پڑھے دو، دو، تین تین دن کے وقفے سے لوٹاتا رہا کہ پڑھ لی۔

اُن دنوں طویل وقفے کے بعد جب خیالات نے پھر سے آنا شروع کیا تھا وہ خود سے متفق تھا نماز، روزہ، زکوٰۃ سب مرنے کے بعد کی زندگی کے لیے ہیں۔ اِس زندگی میں کام نہیں آتے ہیں۔

(پرانے تلمیذ نے ہنس کر کہا: 'یا لوگوں پر اپنے تقدس اور تقویٰ کا اثر بٹھانے کے لیے۔')

فوراً ہی اُسے خیال آیا یہ کیا میں سپاہی مولوی ذاکر کے لیے کہہ رہا ہوں؟ وہ مجھ پر کیوں اپنا اثر بٹھانے لگا: نیک آدمی ہے۔ دُکھا ہوا دل رکھتا ہے۔ بھانپ گیا ایسا آدمی ہوں جو سب کچھ لٹا کر پھانسی گھر میں آیا ہے، مذہب کو بھی ساتھ نہیں لایا کہ وہ سکون دے۔

'پھر کیا اپنے باپ کے لیے کہہ رہا ہوں۔ جو مجھے اپنی ماں کی موت کی وجہ سمجھتے تھے؟ نہیں یہ خیال ان کی ذات سے نہیں اُبھرا ہے۔ وہ نہ پابندی سے نماز پڑھتے تھے، نہ پورے روزے رکھتے تھے۔ پھر؟ تایا حضرت عزیز الرحمٰن علیہ رحمۃ کے لیے؟ خاندان والے انہیں پہنچا ہوا بزرگ سمجھتے تھے۔ خط لکھ کر پوچھتے تھے بینک میں روپیہ رکھنا جائز ہے؟ محلے کا قصائی سنا ہے شراب پیتا ہے کیا اس کی دکان سے گوشت لیا جاسکتا ہے؟ دوسرے قصائی دور ہیں۔'

'نہیں وہ لاکھ مجھ سے رکھائی سے پیش آتے ہوں لیکن میرے دل میں ان کے لیے ہمیشہ محبت رہی۔ تسنیم کے باپ تھے۔ اب بھی اگر ان کا فوٹو کہیں سامنے آجائے جو انہوں نے ساری زندگی کھنچوایا ہی نہیں، حج کے پاسپورٹ کے لیے بھی نہیں، تو اس میں مجھے تسنیم کی آنکھیں نظر آجائیں۔ باقی وہ اپنی ماں پر پڑی تھی۔'

صرف دو ہستیاں ایسی تھیں جو اس کے تقدس اور تقویٰ کے تصور پر پوری اترتی تھیں۔ جلانے کی لکڑی کی طرح خشک بڑے بہنوئی اور ان کے بڑے بھائی حافظ مفتی صاحب۔ دونوں زندگی کی ڈگر پر ساری زندگی اس طرح اپنا بیلینس ٹھیک کر کر کے چلتے رہے جیسے ایک

بال جیسی باریک رسی پر چل رہے ہوں جس کے نیچے دونوں طرف جہنم کی آگ دہک رہی تھی اور شاید نیک نیتی کی بنا پر چاہتے تھے دوسرے جنہیں وہ رسی اور جہنم کے شعلے نہ بھی نظر آتے ہوں ان ہی کی طرح چلیں۔

پہلی بار جیل میں خود کو پانے سے پہلے ہمیشہ یہی اس کا ایمان رہا تھا زندگی مختصر ہے، اُسے کیوں عبادت میں ضائع کیا جائے۔ جیل میں آ کر خیالات نے ایک نیا رخ اختیار کیا اور وہ وہی کرنے لگا جو مایوسی کا شکار قیدی کرتے تھے۔ وہاں سے نکل کر کچھ ہی دن بعد نماز اُسے دوبھر لگنے لگی۔ اس کا دماغ اس نتیجے پر پہنچ کر ٹھیر گیا: 'جب تھک کر بیٹھ رہیں گے دن رات عبادت کیا کریں گے۔'

اگر اس سے کہا جاتا: تم مذہب کو چھوڑ بیٹھے ہو۔ سوچ کر بتاؤ اس کا کیا تمہیں پسند نہیں آیا؟ تو وہ بات کو سمجھ کر کہتا: حقیقت میں میں مذہب کے بارے میں بہت کم جانتا تھا، لیکن مذہبی لوگوں کے بارے میں بہت کچھ۔ اب سمجھ میں آتا ہے جتنا جانتا تھا، غیر ضروری تھا اور اس کو بھی اس طرح چھوڑ بیٹھا جیسے کوئی بغیر کسی وجہ کے چائے میں دودھ ڈالنا بند کر دے اور کہے مجھے چائے اسی طرح پسند ہے۔

(۵۴)

ایک قیدی جو کچھ ہی عرصہ ہوا پھانسی بارک میں لایا گیا تھا، ہر وقت روتا رہتا تھا اور اس کی ایک ہی رٹ تھی: ''میں بے قصور ہوں۔'' اس کا کہنا تھا عدالت میں کسی نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔

ایک صبح جب ایک گھنٹے کے لیے کوٹھریاں کھولی گئیں اور قیدی تازہ ہوا کے لیے باہر آئے، اسپن خان نے گھاس پر بیٹھنے سے پہلے جسم کے ہر حصے کو اکڑایا، ڈھیلا کیا، کمر کو پیچھے جہاں تک جا سکتی تھی موڑا، سامنے کے رُخ موڑا جیسے دو آدمیوں کے ساتھ کوٹھری میں بند رکھے جانے سے اس کا جسم اینٹھ گیا ہو، پھر بیٹھ کر نسوار گال میں رکھی، ڈبیا کے شیشے میں اپنے چہرے کو ہر زاویے سے دیکھا، مسوڑھوں اور دانتوں کو چیک کیا اور مطمئن ہو کر لیٹ گیا۔

چھوٹے خان بھی اس کے پاس آ بیٹھا اور رونے لگا ''میں بے قصور ہوں۔''

اسپن خاں کچھ دیر چپ کیے اس کے رونے کو سنتا رہا، پھر اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسے مارنے کو تھا کہ عبادت گزار رفیق نے کہا ''مارنا مت بے چارے کو۔ میرا خیال ہے بس اتنا چاہتا ہے کوئی تو اس کی کہانی سنے اور کہے واقعی تم بے قصور ہو۔ ہے نا یہی بات؟''

چھوٹے خاں نے مریل انداز میں سر اوپر نیچے کیا۔ اسپن خاں کا اٹھا ہوا ہاتھ گر پڑا اور پھر لیٹ گیا۔

ایک ادھیڑ عمر قیدی نے کہا "یہاں قصور وار کون ہے! سب بے قصور آئے، بے قصور گئے۔ جنہوں نے واقعی قتل کئے تھے، بم پھینکے تھے انہیں بھی کسی نے اس کام پر اُکسایا تھا۔ بے قصور وہ بھی تھے۔ اک صحیح سلامت بم پھنکوانے قتل کرانے والے رہتے ہیں۔ یہی ریت ہے اس ملک میں اوپر سے لے کر نیچے تک۔"

چھوٹے خان اس کی بات توجہ سے سُن رہا تھا۔ جب وہ چپ ہوا تو اس نے پھر رونا شروع کر دیا۔

سعید الحسن نے کہا "میں نے بھی اپنی مرضی سے کبھی کوئی قتل نہیں کیا۔ ایسے کام روح کراتی ہے، پیغمبروں تک سے۔"

ایک قیدی نے سنجیدگی سے پوچھا "یہ کام روح نے تم سے کتنی بار کرایا؟"

سعید الحسن چپ رہا۔

"کس کس کا؟"

ابھی وقفہ ختم نہیں ہوا تھا لیکن سعید الحسن وہاں سے اٹھ کر اپنی کوٹھری کی طرف چل دیا۔ وہ کسی کو بھی اس کا اہل نہیں سمجھتا تھا کہ اُسے اپنی کہانی سنائے۔

مقدمے سے پہلے بھی سعید الحسن نے جیل کے ڈوکٹر کو اپنے بارے میں کچھ بتانے سے انکار کیا تھا اور عدالت میں بھی اس کا ایک ہی جواب تھا۔ "وہ تم نہیں سمجھو گے۔"

وہاں اس سے پوچھا گیا تھا: "تم خود کو روح کا فرماں بردار بتاتے ہو؟"

"درست"

"کیا روح کائنات میں سب سے بڑی طاقت ہے؟"

"درست"

"اور وہ روح سنا گیا ہے تم کہتے ہو اللہ بندے میں پھونکتا ہے۔"

"تم بحث کر کے مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہو؟" سعید الحسن نے درشتی سے کہا۔

جج نے بھی درشتی سے کہا "جواب دو"

سعید الحسن نے جج کی طرف دیکھ کر 'ہنھ' کیا اور اس کی طرف پیٹھ پھیر کر چل پڑا۔ جیسے باہر جانے کا ارادہ ہے۔

اس وقت سعید الحسن کو اپنے سیل کی طرف جاتے دیکھ کر تلمیذ سوچ رہا تھا: 'کتنا خوش قسمت انسان ہے۔ موت اس کے لیے جذبات سے عاری کوئی چیز ہے۔ آئے گی اور آ کر چلی جائے گی۔ ایک میں ہوں پھانسی گھر لے جانے کے لیے جب مقررہ دن پر صبح صبح جیل کے سپاہی سیل کا دروازہ کھول کر کہیں گے 'اٹھو، وقت ہو گیا' تو میرے منھ سے کیا نکلے گا: ' کا ہے کا؟' یعنی موت کے خوف سے ایک بار پھر سکتے میں ہوں گا!''

'ہرگز نہیں۔ نہ اُن کے ہاتھ پکڑ کر اٹھانے پر میں، زمین میں گڑھ جانے کی کوشش کروں گا کیونکہ وہ موت کو طول دینا ہوگا۔ میں موت کے لیے اس لمحے بھی تیار ہوں۔'

('تم دوسری طرح کی موت کے لیے تیار ہو کیونکہ اس کے خوف کے عذاب سے بچنا چاہتے ہو۔ سعید الحسن کی تمہاری کیا برابری۔ اُسے پھانسی کے تختے پر اگر لے جا کر گھنٹے دو گھنٹے بھی کھڑا رکھا جائے تو یہ بھی نہیں کہے گا جلدی کرو۔ زندگی اور موت اس کے لیے یکساں بے معنی ہیں')

تھوڑی دیر اس حملے کو سہہ جانے کے بعد تلمیذ کے دماغ نے کہا 'بیرسٹر احمد عبدالرحمٰن اگر زندہ ہوتے اور یہ کیس انہوں نے ہاتھ میں لیا ہوتا تو میں ہاتھ جوڑ کر کہتا: 'خیر کیس آپ ہار گئے لیکن ایک درخواست دیجئے میرا موکل چاہتا ہے پھانسی کل کی جگہ آج اسی وقت دے دی جائے۔ وہ بے صبرہ ہے، پھانسی میں دیر ہوئی تو خودکشی کر لے گا۔

'بڑی بہن کے شوہر کو اگر میری اس درخواست کی خبر لگ جاتی تو کہتے: 'وہ پکا مجرم تھا اور تم نے اُسے اپنے بچوں کے ساتھ رکھنے کی حامی بھر لی تھی کہ وہ بھی بگڑ جائیں!'

'اگر کسی دوسرے شخص کو میں اپنے سے پہلے پھانسی کے پھندے سے لٹکا دیکھنا چاہتا ہوں تو وہ بڑے بھائی جان تھے، جنہوں نے میری زندگی برباد کر دی۔ اور اب دونوں وہیں کے قبرستان میں آرام کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے دونوں کو جنت مل ہوگی۔ یا قیامت کے دن ملے گی، اس عمل کے انعام میں کہ انہوں نے اپنی دانست میں ایک بگڑے ہوئے نوجوان کو گھر سے نکال

دیا تھا۔ فرشتے پوچھیں گے: کیا وہ سدھر نہیں سکتا تھا؟ اور بھائی جان کہیں گے: وہ دوسرا منظور تھا۔ اور آپا جی ہاں میں سر ہلائیں گی۔ فرشتے اپنے رجسٹر میں دیکھنے لگیں گے: منظور کون تھا؟

'مجھ سے پوچھیں تو کہوں: ایک خدا کا بندہ۔ اس نے بھی گو گنہگار تھا، کسی کو اغوا نہیں کیا تھا اس کی میرا دل گواہی دیتا ہے۔ ایسا ہوتا تو بھگا کر شیلا کو فنم سٹی کیپیٹل لے جاتا جہاں کا ان دنوں ہر گھر سے بھاگنے والا رخ کرتا تھا۔ نہ اس نے کسی پر بہتان لگایا ہوگا جس سے اس کی زندگی برباد ہو جاتی، نہ کسی کی جان لی ہوگی ('نہ آدمی کی نہ جانور کی: یہ کہنا وہ کبھی نہیں بھولتا تھا) نہ کسی کا ابورشن کرایا ہوگا۔ ہوسکتا ہے میری طرح پیتا ہو، آخر کو وہ میں ہوں۔

'نہیں یہ سب گناہ نہیں، ساری زندگی میں مجھ سے صرف ایک گناہ سرزد ہوا:

خود کو تجھ سے دور رکھا۔ باقی سب اس کی جزئیات ہیں۔

پہلے مذہبی آدمی تھا، بہن کے گھر آ کر عبادت سپلسری سبجیکٹ بن گیا۔ مسلط کئے ہوئے کام — تجھ سے زیادہ کون سمجھے گا — انسان دل سے نہیں دکھاوے کے لیے کرتا ہے۔ میں نے بھی کچھ دن کیا، پھر نباہ نہ سکا۔

'پہلی بار جیل سے چھوٹ کر جب اپنے ہوٹل کے کمرے میں گیا تھا نماز شروع کی تھی۔ پھر شیطان اکسانے لگا: زندگی کو کیوں عبادت میں ضائع کرتے ہو! صرف ایک بار ہی تو ہے۔ تجھ سے کچھ جھوٹ نہیں بولوں گا۔

'پھر جب کاروبار چل نکلا، یہ مانتا ہوں، کام کرتے کرتے کبھی کہہ بیٹھتا تھا: پروردگار میرے لیے پریشان مت ہو۔ تیرا دیا میرے پاس سب کچھ ہے اور چونکہ تیرا دیا ہے اس لیے ختم نہیں ہوسکتا۔ فکر ان کی کر جنہیں تو نہیں مل سکا ہے اور جو دکھ میں نہیں جانتے دلاسے کے لیے کس کے پاس جائیں۔

یعنی تجربے نے مجھے کچھ نہیں سکھایا تھا یہ میں مانتا ہوں۔'

اُسے وہ زمانہ کبھی کبھی یاد آ جاتا تھا جب جبار بھائی اور نصرت بھابھی کے دنوں میں بزنس شروع کرنے کے بعد کبھی بے کار بیٹھے بیٹھے وہ کہہ بیٹھتا تھا "Hello God, how are you?"

یا ''کہو بھگوان کیسے ہو؟ تمہاری کرپا سے میں ٹھیک ہوں۔تم نے بہت جتن کیے میرے جیون کو بگاڑنے کے پھر بھی میں ٹھیک ہوں۔ میری پرارتھنا ہے تم بھی نشچنت رہو۔''

اکثر ایسا ہوا اس کی آواز سن کر شریف نے اندر آ کر پوچھا ''آپ مجھے آواز دے رہے تھے۔ میں ذرا دور تھا، نہیں سنا۔''

وہ ہنس کر کہتا ''پانی پلاؤ۔''

اس دن سعید الحسن کو ناراض ہوکر اپنے سیل میں جاتے دیکھ کر خیالات کا جو سیلاب آیا اس میں یہ بھی تھا 'موت کے یقینی بن جانے کے بعد جو سکتہ مجھ پر طاری ہوا تھا نہ کسی کے قرآن پڑھ پڑھ کر سنانے سے خاتمے کو پہنچا تھا نہ آخری سانس تک ہنس کر جینے کا حوصلہ دلانے والوں کے بولوں سے۔ بہت دیر اس سکتے میں ڈوبا رہا، پھر خود ہی اس سے نکل آیا۔ اور جب دماغ جاگا تو احساس ہوا کیوں میں نے جینے کے لیے اتنی جدوجہد کی تھی -انجام تو شروع ہی سے ظاہر تھا۔ مجھ جیسے کتنے بے قصور موت کے گھاٹ اتارے جاتے ہیں اور خطاوار اس نرس کے قاتل کی طرح فرد جرم عاید ہونے پر بھی شادی رچاتے ہیں اور آرام کی نیند سوتے ہیں۔تو اگر ایک میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تو اس میں نئی بات کیا ہوگی۔'

چند لمحے پھر سے پیدا کرنے اور پالنے والے سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کے، اب وہ سمجھ پایا تھا کیا ہوتے ہیں- بارش کے چھینٹے پر ریگستان میں چند دنوں کے لیے اگ آنے والا سبزہ جس کے آگے پھر سال دو سال کا سوکھا ہوتا ہے۔اب جب زندگی اس چھوٹی سی کوٹھری -سیل- میں بند ہوگئی تھی اور اُسے خدا سے مانگے بغیر صبر آ گیا تھا کہ یہاں سے نکلنا اس کے مقدر میں نہیں ہے، سوائے جیل کے مقررہ اوقات میں، اور ہمیشہ کے لیے اس وقت جب چلا کر اُسے وہاں لے جایا جائے گا جہاں فرشتہ روح قبض کرنے آئے گا- اور اس میں اُسے شبہ تھا یہ ناگوار کام ایک فرشتہ کرے گا یا وہ بدنصیب جسے زندہ رہنے کے لیے اس سے بہتر کام نہیں مل سکا۔

اس آخری جیل میں آنے سے پہلے تمیز کو یاد تھا وہ کتنی ہی بار قانون کی گرفت میں آتے

آتے بچا تھا۔ گرفتاری اور جیل تک کی نوبت صرف ایک بار آئی تھی لیکن اپنے خلاف اس نے کیس بار ہا ختم کرایا تھا۔ اور وہ مہربان کیس ختم کرنے والے کب قانون کے پجاری ہوتے تھے یا بغیر معاوضے کے یہ کام کرتے تھے!

آج وہ سوچ رہا تھا وہ وقت سخت تکلیف سے پُر ہوتا تھا جب اس فکر میں رات بھر نیند نہیں آتی تھی کہ مال جو کسٹم کے عملے سے مل ملا کر بغیر ڈیوٹی اور demurrage (ہرجانہ) ادا کئے اٹھوا لیا ہے کل کیا رنگ لائے گا، انشورنس کلیم جو مال کی قیمت سے دُگنا تگنا ہے assess کرنے والے انشورنس کمپنی کے نمائندے کے تعاون سے داخل کیا ہے اس کے سارے کاغذات وہ ہیں کہ اُن پر ہر قسم کا اعتراض اٹھے گا، بوگس کلیم کا بھید کھلنے والا ہے۔ یہی اور ایسے کتنے ہی کارنامے جو دنوں جان کو حلق میں لا پھنساتے تھے اور جب تک ناؤ پریشانی اور خوف کے بھنور سے نہ نکل آئے زندگی کو اجیرن بنائے رکھتے تھے۔

ایسے ہی ایک بار کیس کے ختم ہوجانے پر، حقیقت میں اس کے حق میں فیصلہ ہوجانے پر، اس نے عہد کیا تھا اب جو زندگی ہوگی اس میں یہ سب نہیں ہوگا کہ بھید کھلنے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے، تفتیش ہونے والی ہے، بزدلی اور بے حیائی کی گھڑیاں، اُن کے سامنے بے عزتی کے لمحے جن سے وہ مدد لینے جاتا تھا اور جو جانتے تھے حقیقت کیا ہے اور پھر بھی اس کا غلط کام کردیتے تھے۔

اس دور کی زندگی کا دوسرا رخ وہ تھا جب وہ اپنے طیش کا غلام ہوتا تھا اور نہیں جانتا تھا کیا کررہا ہے۔ ان لمحوں کے بعد بھی ذلت سہنی پڑتی تھی۔

شادی کا فیصلہ زندگی کے ان دو رخوں سے بے زاری کی دین تھا۔ زندگی کی کتاب کا نیا صفحہ نیا باب ہی نہیں، نیا جزو جسے وہ اپنی تمام کمزوریوں کو ختم کر کے شروع کررہا تھا، جب نہ کسی عدالت میں اس کے خلاف کوئی مقدمہ چل رہا تھا نہ کسی دفتر میں کوئی تفتیش ہورہی تھی۔

اس بار جب وہ وقت آیا جب اُسے بتایا گیا ملک کے پریزیڈینٹ نے تمہاری رحم کی درخواست کو مسترد کردیا ہے اس لمحے اس کا دماغ ماؤف ہوگیا۔ اتنا کہ اگر کوئی کہتا ''اٹھو وہ سامنے پھانسی گھر ہے۔'' تو وہ ایک میسمرائزڈ شخص کی طرح اٹھ کھڑا ہوتا اور بغیر اپنی روح کو

ساتھ لیے اس کے پیچھے چل پڑتا۔

جو کچا راستہ پھانسی گھر کی کوٹھریوں کے سامنے سے گزرتا تھا اس پر معتوب سیدھے ہاتھ سے الٹے ہاتھ کو اس طرح چلا کر لے جایا جاتا تھا کہ اُس کے ہاتھ بندھے ہوتے تھے اور چار مسلح سپاہی اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے ہوتے تھے۔ زمین کے اس ٹکڑے کو راستہ کہنا اس وجہ سے درست تھا کہ اس پر بوٹوں تلے آ کر گھاس ختم ہوچکی تھی ورنہ اس میں اور کوئی بات راستہ ہونے کی نہیں تھی۔ بائیں ہاتھ پر تھوڑی ہی دور جا کر اصل پھانسی گھر تھا۔ معتوب کو اس راستے پر لے جائے جاتے دیکھ کر اکثر موت کا انتظار کرنے والے اپنی کوٹھری میں پیٹھ پھیرے دعائیں پڑھنے لگتے تھے۔ جیل والوں کو اس میں دلچسپی نہیں تھی جن کا نمبر آنے کو ہے ان پر ان لمحوں میں کیا بیتتی ہے۔ تملید کے ذہن میں وہ سین ایسے موقعے پر ہمیشہ آئے: مرغیاں بیچنے والے جو گاہک کے لیے وہیں باقی مرغیوں کے سامنے انہیں ذبح کرنے بیٹھ جاتے ہیں، کمیلے میں اور بقرعید پر ذبح کرنے والے یہی سلوک باقی قربانی کے جانوروں سے کرتے ہیں۔ اکثر مرغیاں سر اٹھا کر اپنے ساتھی کو دیکھتی ہیں اور پانی پینے لگتی ہیں۔ بچھڑے، بکریاں، دنبے، مینڈھے منہ اٹھا کر اس سین کو دیکھتے ہیں، پھر سر کو جھٹک کر کچھ دیر کے لیے مُنہ چلانا بند کر دیتے ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم وہ موقعے کی نزاکت کو سمجھ پاتے بھی ہیں یا نہیں۔

'اس جگہ کو بنانے والوں نے بالتزام پھانسی گاہ، کوٹھریاں اور یہ راستہ اس طرح بنائے ہیں کہ جنہیں آئندہ قتل ہونا ہے ان کے سامنے سے مقتل کو جانے والا گزرے۔'

دماغ کے ماؤف ہوجانے کی وہ کیفیت جس میں اُسے نہ یہ خبر تھی وہ کہاں ہے نہ ان سب کی جو کبھی اس کی زندگی سے متعلق تھے کافی دن رہی۔ دماغ کے جاگ اٹھنے کے بعد اُسے اپنے ناکردہ جرم کی پاداش کا شدت سے احساس ہوا۔ جو پیغام اس کی طرف سے مقتول کے گھر والوں کو پہنچایا گیا تھا کہ وہ خون بہا لے لیں اس کا جواب اُن لوگوں کی طرف سے یہ آیا: 'ہم

خوں بہا نہیں لیتے ہیں۔'
ور ایک خفیہ پیغام یہ بھی: 'قاتل اور اس سے یہ کام کروانے والے کا خون ہمارا خوں بہا ہوتا ہے۔'

تلمیذ کو اس جواب سے ایک پھیکی سی تشفی ہوئی: اگر وہ خون بہا لینے پر راضی ہوجاتے تو وہ انہیں کیا دے پاتا! ایک معمولی سا بنگلہ جو اس نے شادی کے کافی سال بعد خریدا تھا جس پر مقدمے کے دوران قرضہ چڑھ گیا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا اس کے مرنے کے بعد اس کے بارے میں عدالت کا کیا فیصلہ ہوگا، 'دفتر کی پگڑی؟ بے پی ہرمیز ٹائپ رائٹر، فرنیچر اور میرے کپڑے جوتے۔ اور ہاں ایک لائبریری دست شناسی، نجوم اور نمبروں کی کتابوں[1] کی۔ اور جو ادبی کتابیں میمونہ نے اپنا کتب خانہ بنانے کے لیے چنی تھیں۔ گرہستی میں پھنسی ہوئی عورت۔ اُن کے پڑھنے کا اُسے کیا موقع ملا ہوگا!' اس کے منھ سے بے مزہ ہنسی نکلی۔
'میں نے خود کو کن لوگوں میں پھنسا لیا تھا! میں تو دنیا سے چلا جاؤں گا۔ خون کی ادلا بدلی دونوں فریق کرتے رہیں۔'

یہ کہنا غلط ہوگا تلمیذ نے بالاارادہ، کوشش کر کے ماضی کے واقعات کو ذہن میں لانا شروع کیا تھا تاکہ حسرت کو وہاں سے دور کر سکے۔ حقیقت یہ تھی اب کرنے کو کچھ نہیں تھا، زندگی کی ساری جدوجہد ختم کو آ پہنچی تھی تو کیوں نہ ماضی اس خلا میں درآتا! ایک ضخیم ناول جسے لکھنے والے نے ختم کو پہنچا کر دوبارہ نہ پڑھا ہو اور جب لکھنے پڑھنے کو اور کچھ نہیں رہ گیا تو وہ اُسے، اپنی تحریر کو، لے کر بیٹھ گیا ــ قطعاً اک غیر شعوری فعل۔ اور اس پر کھلا ماضی سارا اس میں موجود ہے، لائبریری کی شکل میں نہ سہی، ایسی ردی کی دکان کی شکل میں جس میں کتابیں ترتیب سے نہ رکھی گئی ہوں، کھلی شیلفوں پر، الماریوں میں جن کے پٹ نہیں ہیں، الماریوں کے اوپر کی جگہ میں جہاں ان پر دھول جمع ہوتی رہتی ہے، فرش پر جہاں بھی جگہ ملے۔

---

[1] Palmistry, Numerology, astrology

اس مایوسی سے بھری دنیا میں جہاں کے باسیوں کا مقدر تنور کی جلی روٹیاں، بے مزہ دال اور کڑوی چائے تھی کبھی کبھی کوئی خوشی کا دن بھی آ جاتا تھا — جیسے یوم آزادی، تلمیذ کی پھانسی کی بارک deathrow کے دنوں کا پہلا یوم آزادی۔

سب کو باہر گھاس پر دو قطاروں میں بٹھا کر ہر ایک کے آگے کھانا چن دیا گیا — پلاؤ، قورمہ اور زردہ۔ ایک مضبوط جسم کے قیدی نے جو لگتا تھا جیل اسٹاف سے فری ہے کھانے کو دیکھ کر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے جو پاس ہی کھڑا پائپ پی رہا تھا کہا "پہلے یہ تو بتا دیتے تمہارے ولیمے کا کھانا ہے یا ..."

اس نے کہا "ملک کا ولیمہ ہے۔ تم چپ کر کے کھاؤ اور اپنے سیل میں جاؤ۔"

اس تعارف کے بعد اکثر قیدی خوشی سے کھانے پر پل پڑے۔

"یہ موت یعنی پھانسی جو ہمیں دی جائے گی پہلے سے مقرر تھی اور اس کی جگہ بھی، یعنی جہاں موت آئے گی پہلے سے مقرر ہے۔" تلمیذ نے ایک سنجیدہ، ادھیڑ عمر کے قیدی کو اپنے ساتھی سے کہتے سنا۔

"میں predestination (مقدر) کو نہیں مانتا ہوں۔" دوسرے آدمی نے تُن فُن ہو کر کہا۔ "سکون سے کھانا کھانے دو۔"

"تم مقدر کو کیا مانو گے! تم تو اللہ کو اللہ ہی نہیں مانتے۔ کبھی گوڈ کہتے ہو، کبھی خدا اور کبھی اللہ میاں۔"

"ایک ہی بات ہے۔" ایک تیسرے قیدی نے کہا۔ "ایشور کہو تو بھی درست ہے۔ شرط یہ ہے تمہارا اعتقاد درست ہو۔"

"تم کمیونسٹ ہو۔" اس قیدی نے کہا جو ہر ایک سے کتنی ہی بار کہتا آیا تھا: تو یہ جگہ مقرر تھی میری موت کی۔ بس موت کی گھڑی کی خبر نہیں اور نہ اُس کی جہاں یہ مٹی جو آج میرا جسم ہے مٹی کو پیاری ہو گی۔"

جسے کمیونسٹ ہونے کا طعنہ سننا پڑا تھا ڈکار لیتا ہوا بولا'' جو بھی ہوں اندر باہر ایک ہوں۔ جب پھانسی کا پھندا گلے میں پڑے گا یہی سوچ رہا ہوں گا کہ آدم کو، جو میں ہوں، بنانے کے بعد اس نے جس کے نام کے بارے میں تم جھگڑ رہے ہو، کیوں اس میں اپنی روح پھونکی تھی۔''

اسسٹنٹ سب انسپکٹر نے ڈانٹ کر کہا'' کھانا ختم ہو چکا، چلو سب اپنی اپنی کالکوں میں۔''

تندرست ہنس مکھ قیدی نے کہا'' اگلی دعوت کب کر رہے ہو؟''

ایک ہڈیوں اور پوست کے قیدی نے جسے کبھی کسی نے ہنستے نہیں دیکھا تھا کہا'' تمہارے چالیسویں پر۔''

ایک شام جب ذاکر رات کی ڈیوٹی پر آیا تلمیذ نے اس سے دبی زبان میں بڑی منت سے کہا:'' حکومت سے تو مجھے کچھ بھی توقع نہیں تم مجھے ایک بار فرار کا موقع دے دو، بدلہ لے کر لوٹ آؤں گا۔ ایک رات ہی کی بات ہے۔ وہ بھی بارہ گھنٹے کی رات نہیں بس چار چھ گھنٹے کی۔''

جب ذاکر خاموش رہا تو تلمیذ نے کہا'' تم کہتے ہو بغیر دل سے اپنا گناہ تسلیم کیے اور ایمان لائے چین نہیں ملے گا، میں کہتا ہوں اگر اپنے قاتل سے بدلہ لیے بغیر مر گیا تو دوسری دنیا میں بھی مجھے چین نہیں ملے گا، چاہے دل میں ایمان لیے اس دنیا سے گیا ہوں۔ اور بدلہ نہیں لیا تو سمجھو گناہ گار تھا اور گنہگار دنیا سے گیا کیونکہ میرا قاتل اسی طرح دوسروں کو کرائے کے لوگوں سے مرواتا رہے گا۔ میرا خیال ہے اس کا قتل مجھ پر فرض نہ سہی واجب ضرور ہے۔''

ذاکر کے چہرے پر اگر تلمیذ پڑھ سکتا لکھا تھا'' تم نہیں سدھرو گے'' سر ہلا کر بغیر جواب دیے وہ اپنی گشت پر چلا گیا جس سے تلمیذ نے اُسے روک دیا تھا۔

اگلی ملاقات پر تلمیذ نے کہا'' تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔''

''کون سی؟''

''مجھے ایک رات کے لیے فرار کا موقع دے دو۔ تمہاری زندگی کا یہ سب سے بڑا کرم ہوگا۔''

ذاکر خاموش رہا۔

''تم جانتے ہو میں نے قتل نہیں کیا ہے اور اس اپنی ماں کے خصم سردار اور رنگ ناز نے مجھ پر قتل کا الزام رکھا ہے خود قتل کرا کے۔ ظاہر ہے وہ دوزخ میں جائے گا تو کیوں نہ میں ہی اُسے وہاں روانہ کروں۔''

''یعنی تم سچ مچ قاتل بن کر اللہ کے حضور جانا چاہتے ہو! بدلے کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ اللہ کو شو بھا دیتا ہے بندے کو نہیں۔''

''خیال میرے لائے نہیں آتے ہیں۔ میں انہیں دباتا ہوں اور وہ اپنی مرضی سے آتے ہیں۔ بس دو گھنٹے کے لیے۔''

ذاکر نے کہا ''جو کل تمہاری بات کا جواب تھا وہی آج ہے۔''

تملیذ نے گلے میں پھنسے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ کہا ''میں وہ بدقسمت ہوں کہ جو قتل ہوا ہے اس کے پس ماندگان سے بھی سودا نہ کر سکا۔'' پھر چند لمحے خاموش رہ کر بولا: ''اور سودا ہو جاتا تو کہاں سے انہیں قصاص ادا کرتا۔''

ذاکر نے کہا ''افسوس مت کرو۔ وہ معاملہ بازی صرف اس دنیا کی زندگی کے لیے ہے۔ قاتل جب اللہ کے حضور پہنچتا ہے اُسے پتہ چلتا ہے کیس وہیں کا وہیں ہے۔ کیسا قصاص، کیسی دیت۔ روپے سے خدا کا منہ نہیں بند کر سکتے ہو، نہ اس کا سزا دینے والا ہاتھ پکڑ سکتے ہو۔''

اُن شروع کے دنوں میں شاید ہی کوئی تملیذ سے ملنے آیا ہو، لگتا تھا جیسے ایک غیر ملکی ہو جس کا اس شہر میں کوئی واقف تک نہیں تھا اور جسے ایک ناکردہ جرم کی سزا میں جیل میں رکھا گیا ہے۔ پھر ایک دن جب بارش سے موسم بہت خراب تھا، جیل میں بھی کیچڑ ہی کیچڑ تھی اور جیل کے باہر بھی، ملاقاتیوں کا دن تھا، ایک سنتری نے آ کر کہا ''قیدی تملیذ تم سے ایک عورت ملنے آئی

ہے۔"

تمیز سوچ میں پڑ گیا: 'کون سی عورت ہوسکتی ہے؟' جیسے اس سے ملنے کے لیے خدا کی بھری دنیا میں آنے والی ایک بھی ہستی نہیں رہ گئی تھی۔

ملاقاتیوں کے ہول میں اڑے ہوئے رنگ کے سیاہ برقعے میں ایک سانولی ادھیڑ عمر کی عورت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ تمیز کو دیکھ کر وہ رو پڑی اور اُسی عالم میں سر کو جھکا کر سلام کے لیے ہاتھ مُنھ تک لے گئی۔ تمیز اُسے مطلق نہیں پہچان سکا۔

"اخبار میں آپ کے خلاف مقدمے کی خبر پہلی بار میری بہو نے پڑھ کر سنائی تھی، پھر میں ٹوہ میں رہی کہ کب مقدمے کی خبر چھپے" ہچکیوں میں اس کی بات کا سمجھنا تمیز کے لیے دشوار تھا۔

"پہلے امید کرتی تھی آپ بچ جائیں گے۔ اب اس سے ناامید ہوکر آئی ہوں کہ بادشاہ نے رحم کی درخواست بھی ٹھکرا دی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"آپ نے میرے بیٹے کا علاج کرایا تھا۔ اُسے کینسر تھا۔ میں اللہ بخشے آپا روشن آرا کا خط لے کر آپ سے ملنے آپ کے دفتر آئی تھی۔ وہ لڑکا ترقی کر کے ایک دن مل میں ویونگ ماسٹر بنتا، لیکن خدا کی مرضی نہیں تھی۔"

دونوں چپ کھڑے رہے۔

"کاش اب خدا میری سن لے اور آپ رہا ہو جائیں۔"

تمیز اس کے چہرے کو بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔

"میرا دل جانتا ہے آپ بے قصور ہیں۔"

تمیز کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے آنے والی کی آنکھوں میں ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا: "آپ کو یقین ہے؟" جیسے فیصلہ سنانے سے پہلے جج نے ایک آخری اچانک آ جانے والے ایماندار گواہ سے پوچھا ہو۔

اس نے کہا: "جی، جیسے کلمہ طیبہ پر۔ وہ کام آپ کر ہی نہیں سکتے تھے۔"

تھوڑی دیر تمیز کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔ پھر وہ رک رک کر بولا "میرے لیے آپ کا فیصلہ

اس ملک کی بڑی سے بڑی عدالت کے فیصلے پر بھاری ہے۔"

اس عورت کے چہرے کے نقوش، آنکھوں اور ہاتھوں کی حرکت میں کہیں چھپی وہ ہستی تھی جو اس کی دیکھی ہوئی تھی لیکن پوچھنے پر وہ نہ بتا پاتا کہاں اور کب۔

اس عورت کے خدا نگہبان کہہ کر جانے کے بعد اس نے خود سے کہا 'کون کہتا ہے فرشتے نہیں ہوتے ہیں۔ یہ تھی، مجھے خدا کا فرمان سنانے آئی تھی۔'

اُس اڑے ہوئے سیاہ رنگ کے برقعے والی عورت کو تلمیذ دروازے سے باہر جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کہ ایک عورت بچے کو گود میں لیے گرل کی طرف آتی نظر آئی۔ ساتھ میں جو لڑکی تھی اس کے ہاتھ میں ایک چوڑے پیندے کی لمبی بوتل تھی جس میں پانی تھا اور بوتل کے منھ سے ایک ہرا پودا باہر سر نکالے تھا۔

بچے کو لڑکی کے بازوؤں میں دے کر عورت نے بوتل ریلنگ کے عین نیچے فرش پر رکھ دی اور ہرے پتوں کی بیل کو جو پاس سے دیکھنے میں نظر آتا تھا ایک تیلی پر لپٹی ہوئی ہے، ریلنگ تک پہنچایا، تیلی کو اس پر باندھ کر بیل کے آزاد سرے کو ریلنگ پر دوڑا دیا۔

سب قیدی، اور ان سے ملنے کے لیے آنے والے اپنی بات بھول کر عورت اور اس بیل کو دیکھ رہے تھے۔

اس عورت کے آدمی نے کہا "اسے کوئی یہاں چھوڑے گا! کوئی اپنے گھر میں سجانے کو لے جائے گا یا یہاں سے باہر نکلتے ہی بیل اور پانی پھینک کر بوتل کو اپنے گھر لے جائے گا کہ اور کچھ نہیں تو مٹی کا تیل رکھنے کے کام آئے گی۔ سارا ملک تو چوروں سے بھرا ہے۔"

سب قیدی، سنتری اور دوسرے پہرے دار جو اس سین کو ابھی تک دلچسپی سے دیکھ رہے تھے ملک کے چوروں سے بھرے ہونے کی بات پر ہنس پڑے۔ کسی نے نہیں کہا یہ جھوٹ ہے۔

(۵۵)

نگہداری کے برج[1] کی پشت پر سیاہ آسمان سے باتیں کرتی ہوئی روشنی تھی۔

تکمیذ بے وجہ دماغ پر زور دے رہا تھا 'آج کون سا اہم دن ہے جو وہاں روشنی کی گئی ہے؟ جس دن آزادی کی تاریخ مقرر کی گئی تھی اس کی خوشی میں؟ جس دن آزادی ملی تھی اس کی برسی ہے؟ ری پبلک ڈے کی؟ اور اس سے پیچھے اگر چلا جائے تو چھاؤنی گڑھ میں سپاہیوں کی بغاوت کا دن ۹ مئی؟ اُنھ! جہنم میں جائے۔ میں کبھی ہسٹری میں اچھا نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے کسی کی شادی کی تقریب ہو۔ لیکن ایسی روشنی تو کبھی اس جیل کے چاروں طرف دیکھنے میں نہیں آئی۔'

بالٹی سے منھ پر پانی کا چھپاکا مار کر اور گردن اور گریبان کو نم کر کے وہ دروازے سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ ہوا کی گرمی رات کے بڑھ جانے پر ختم ہوچکی تھی اور بھیگوئی کھال پر اچھی لگ رہی تھی۔ دروازے کی سلاخیں بھی خاصی ٹھنڈی تھیں، گھیر گھار کر لائے ہوئے خیالات اُن سے ماتھا ٹکائے ٹکائے جلد ہی ختم ہوگئے۔ اگر اس سے پوچھا جاتا اس طرح کے خیالات کی جرح پیدا ہی کیوں کرتے ہو تو اس کا جواب ہوتا: 'اس لیے کہ جیتے جی، جاگتے ہوئے دماغ کا خیالات سے خالی ہونا بڑا عذاب ہے، اور وہ بھی اس صورت میں جب کوئی خواہش ہی نہ رہ گئی ہو، لگتا ہو دماغ بے جان لکڑی کا ٹکڑا ہے۔ کچھ تو ہو اس میں۔ جہنم بھیجے جانے کا خوف ہی سہی۔'

---

[1] واچ ٹاور

پھر جب آنکھیں میچے میچے اُسے جھپکی آنے لگی تھی تو دماغ نے کہا: 'کیوں دوست برٹش پروٹیکٹوریٹ کی عرب بندرگاہ کی سیر کیسی رہے گی، اسے بھولے ہوئے ہو! وہ دنیا کیا تھی، کیسی تھی؟'

'بہت اچھی' اس میں جیسے جان پڑ گئی۔ 'کیا بات تھی ڈیسنٹ بلیموریا کی اور ست نارائن کی۔ دونوں اخلاق کے پتلے تھے۔'

'اور یہاں وارد ہونے کے بعد کی دنیا؟' فوراً ہی خیالات کہیں اور نکل گئے۔

گرل پر پیٹھ ٹیکے بیٹھا وہ سامنے کی دیوار کو دیکھ رہا تھا جس پر بنی ہوئی لائنیں، تصویریں، لکھی ہوئی دعائیں اُدھر روشنی کم ہونے سے غائب ہوگئی تھیں اور ان کی جگہ خالی اسکرین پر حرکت کرتی ہوئی تصویریں بن اور بگڑ رہی تھیں۔ پیڑ، باؤنڈری کی دیوار، نگہداری کا برج۔

'سو وہ ایک باب تھا زندگی کا' تمیز نے فرش پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ دروازے کی سلاخیں اس کے ہاتھوں میں تھیں، اُن پر گھٹنے جما کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ کھوے چرچرائے، پھر اس نے کندھوں کو گھمایا اور بازوؤں کو ڈھیل دے کر ماتھا سلاخوں پر رگڑنے لگا۔

صبح جب تمیز اس طرح فرش پر سو رہا تھا کہ سلاخیں اس کے سر کو چھو رہی تھیں اُسے احساس ہوا اس کے سر میں سرسراہٹ ہو رہی ہے۔ دھوپ اس کے پیٹ تک پہنچ رہی تھی، لیکن اس میں تمازت نہیں تھی۔

اس کے مُنھ سے نکلا! ''کون ہے؟'' جیسے گھر پر ہو۔ اس کے ساتھ ہی بے دھیانی میں ہاتھ سر پر گیا۔

''اچھا آپ ہیں! اڑ کیوں گئیں۔ بیٹھی رہتیں۔ شاید کوئی اچھا معصوم سا خواب دیکھ رہا تھا جس کی تعبیر آپ نکلیں۔ کسی کو یا خود کو تکلیف دینے کا خواب ہوتا تو اس کی تعبیر میں شاید ہاتھ گلے پر جاتا کہ رسی کھول دوں۔''

''خود سے باتیں کر رہے ہو تمیز!''

''نہیں خواب دیکھ رہا تھا۔ آنکھ کھلی تو پتہ چلا چڑیا اپنے پنجوں سے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی، یا

شاید چونچ سے۔'' تلمیذ اٹھ کر بیٹھ گیا'' بلکہ اسی نے تو جگایا تھا بڑی اچھی نیند تھی۔ بغیر خواب کی۔ بڑے دنوں بعد۔''

مولوی ذاکر نے کہا: ''اللہ کا شکر ادا کرو چڑیا بس تمہارے سر میں پنجے اور چونچ چلا رہی تھی، کچھ اور نہیں کر رہی تھی۔''

''اور کیا کر سکتی تھی - دماغ کو جانے والا سوراخ؟''

''نہیں وہاں سے کچھ کھانے کا۔''

پھر مولوی ذاکر نے اس کے سیل کے پاس سے نکلتے ہوئے اپنی بات پوری کی:

''میرا خیال ہے تم بچ جاؤ گے۔''

''کیسے؟'' تلمیذ نے بغیر کسی جذبے کے کہا۔

''اس نے وہاں بیٹھ کر کچھ کھایا نہیں۔''

تلمیذ نے مولوی ذاکر کی بات کو اہمیت نہیں دی۔ 'ابھی بہت کچھ غم دور کرنے کے لیے دماغ میں موجود ہے۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔' لیکن یہ کہتے وقت وہ اس شرابی کی طرح نہیں تھا جسے عذاب سے ڈرایا جا رہا ہو اور اس کی روح گلاس کے پیندے میں بچی ہوئی شراب میں اٹکی ہو۔ اس کے دماغ میں ایک خوف یہ تھا: 'جب یہ پرانی باتیں ختم ہو جائیں گی تو دماغ میرا کیا حشر کرے گا؟ جیسے پکچر غائب ہو جانے پر فلم دیکھنے والے شور مچانے لگتے ہیں اور اسکرین پر دو ایک بیٹری کی لائنیں نظر آنے لگتی ہیں۔

'واقعی اگر چڑ ئیں سر سے کچھ کھا رہی ہوتیں!' اُسے جُھرجُھری آ گئی 'لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے پھانسی کا حکم تو آ چکا ہے۔'

بہت دیر وہ سلاخوں کو پکڑے، سر اُن سے لگائے بیٹھا سامنے دیکھتا رہا۔ لیکن جو کوئی پوچھتا 'تم نے کورٹ یارڈ میں بھاگتی ہوئی گلہریوں کو دیکھا؟' تو وہ کہتا 'نہیں۔' وہ بھی شاید۔ 'اور گرگٹ کو جو پیڑ سے اتر کر بہت دیر بے وجہ خاک میں بیٹھا رہا؟' تو سوال کرنے والا بغیر اپنے سوال کا جواب پائے اٹھ جاتا اور تلمیذ کو پتہ بھی نہ چلتا۔

اپنی اس کیفیت سے تمیز گھبراتا تھا۔ اتنا شدید موت کا خوف کہ ہاتھ پاؤں اور جبڑے اپنا کام چھوڑ دیں اور آہستہ آہستہ سکتہ طاری ہو جائے۔

شام کو پہنچتے پہنچتے اُسے پیاس محسوس ہوئی اور پانی پی کر خیال آیا پیٹ خالی ہے۔ ساتھ ہی اُسے زندہ ہونے کا احساس ہوا اور اگلے ہی لمحے یہ احساس یقین میں بدل گیا۔

'یہ مولوی ذاکر اور اُس جیسے شاید دنیا میں بھیجے اسی لیے گئے ہیں کہ اٹھتے بیٹھتے لوگوں کو موت سے ڈراتے رہیں: نحوست کیونکہ موت کا فرشتہ تمہاری تاک میں ہے، ٹانگیں پھیلا کر سونا موت کی علامت ہے، زیادہ کھانا موت کی علامت ہے۔ یہ لوگ ہر اس کام کو جس سے انسان کو خوشی ملے موت سے جوڑ دیتے ہیں۔ ہر کام کو کرنے سے پہلے کی دعائیں ان کے پاس موجود ہیں — حتیٰ کہ

اُسے ہنسی آ گئی۔

'جس وقت مجھے بڑی آپا کے گھر سے نکالا جا رہا تھا میں کہہ رہا تھا میں تو اللہ کو مانتا ہوں اور وہ ملاؤں کے ملا کہہ رہے تھے 'نہیں مانتے ہو' یعنی اگر کوئی اس طرح کی زندگی نہیں بسر کر رہا ہے جس طرح کی ایک کٹر مذہبی انسان کی ہوتی ہے تو وہ اُن کے نزدیک منکر ہے۔ وہ دن جس نے میری زندگی بدل کر رکھ دی، اس دن فیصلہ ایمان اور اعتقاد کی بنیاد پر نہیں تھا۔ تھا تو اس پر جو وہ نہیں جانتے تھے کہ میرے دل و دماغ میں ہیں یا نہیں اور ہیں تو کتنے۔'

کچھ دیر دماغ بند رہا پھر اس کے منھ سے اونچی آواز میں نکلا! ''بنھ، گولی مارو۔''

برابر کی کوٹھری سے آواز آئی ''تمہیں گولی نہیں ماری جائے گی چاہے اس کے لیے درخواست دو۔ سیولین مرڈر کیس میں پھانسی ہوتی ہے یا عمر قید۔''

(۵۶)

کبھی کبھی کوئی کتاب پڑھتے ہوئے پچھلی زندگی کا کوئی سین تمکین کے دماغ میں اس طرح ابھر کر آتا کہ آگے پڑھنے کو ناممکن کر دیتا۔ وہ اٹھ کر گرل کے دروازے پر جا کھڑا ہوتا، برابر کی کوٹھری کا قیدی کچھ کہتا تو اُسے ان سنی کر دیتا اور باہر جو بھی نظر آئے اُسے دیکھتا رہتا۔ دن کی روشنی میں نظر آنے والے پھول، پیڑ، دیوار جو جیل کے اس حصّے کو باقی جیل سے جدا کرتی تھی اور اس کے آگے زیادہ فاصلے پر دوسری زیادہ اونچی دیوار، واچ ٹاور (نگہداری کا برج)، اس پر تعینات سنتری اور ان سب کے پیچھے شہر کی عمارتیں، ڈبل ڈیکر بسوں کی حرکت کرتی ہوئی اوپر کی منزل۔ اگر رات ہو تو پاس کی ساری تفصیل پر چھائیں جیسی بن جاتی تھی، دور شہر ویسے کا ویسا ہی رہتا تھا بلکہ اس میں رنگ اور روشنیوں کا اضافہ ہو جاتا تھا، اور وہاں چلتی ہوئی روشن کھڑکیاں۔
اس سیر کے خاتمے پر اس کا ذہن لامحالہ موت گھر کی اُن کوٹھریوں کے پیچھے چھوڑی ہوئی زمین کی طرف چلا جاتا تھا جو سننے میں آیا تھا مزید کوٹھریاں بنانے کے لیے وقف ہے — جب بھی معاشرے کو ان کی ضرورت پڑ جائے۔ وہاں چالیس پچاس کوٹھریاں دم بھر میں کھڑی کی جا سکتی تھیں۔ پھانسی گھر سب کے لیے ایک ہی کافی تھا۔

اور کبھی یہ ترکیب کارگر نہ ہو تو کاٹی ہوئی زندگی سے پھر گزرنا پڑتا تھا — اس کا جو تکلیف دہ حصّہ واپس بلا رہا ہو: 'تم یہ تھے اپنے کو یہ بنا لیا۔ اچھا بچا گھر کھو بیٹھے۔ وہ نیلا صوفہ سیٹ اب

نجانے کس کے استعمال میں ہوگا۔ شادی کے فوراً بعد خریدا تھا۔ جس پر کھڑے ہو کر کودنے پر نجم بے چارہ اتنی بار پٹا تھا کہ اس نے اس پر بیٹھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس کے ساتھ خریدا ہوا فرنیچر اور آرائش کی چیزیں کیا ہوئیں؟ اس طرح تو آباد گھر فسادوں اور جنگوں میں اجڑتے ہیں، میں نے اُسے امن کی حالت میں اجاڑ دیا۔ نجم کے کپڑے کیا ہوئے ہوں گے جنہیں میمونہ اپنے ساتھ نہیں لے جا پائی؟ جنہیں اس نے نظر سے دور رکھنے کے لیے اُس ریفریجریٹر میں بند کر دیا تھا جو پھٹے پرانے کپڑوں کے رکھنے کے کام کا رہ گیا تھا۔ اور انہیں وہ کسی کو دینا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اب کس کے کام آ رہے ہوں گے؟ جس کے بھی، مجھے اس حقیقت کو برداشت کرنا پڑے گا۔ کاش آزاد زندگی میں بھی ایسے جذبات کو درہم برہم کرنے والے مرحلوں پر بھی برداشت سے کام لیا ہوتا۔'

'پہلی بار جیل سے ضمانت پر رہا ہونے کے بعد خیر نماز تو کم ہی پڑھی تھی جس کا تھوڑا بہت عہد کیا تھا، لیکن پینا اور جوا کھیلنا یکسر چھوڑ دیا تھا۔' نماز کا عہد ناممکن تھا اور اس کی وجہ وہ جانتا تھا: جن کے گھر میں بیوی ہونے پر بھی باہر غیر ضروری عورتیں تھیں، اُن کو نماز پڑھتے دیکھ کر وہ خود کہتا تھا ''میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ کسے چکما دیتے ہیں خود کو یا خدا کو؟''

امینہ نے صرف ایک بار یاد دلایا تھا ''تم نے جیل میں کعبے کی طرف ہاتھ اٹھا کر مغرب کے وقت کیا کہا تھا؟''

''کہ میں غلطی پر تھا کہ تجھے ماننا چھوڑ دیا تھا۔ میں تجھے مانتا ہوں، تجھ پر ایمان لاتا ہوں۔''

''اور بھی کچھ کہا تھا۔''

''چھوٹ جاؤں تو نماز پڑھا کروں گا۔''

''پھر؟''

''اس کے لیے تمہیں چھوڑنا پڑتا۔ میں دوغلا آدمی نہیں ہوں۔''

امینہ خاموش ہوگئی۔

نہ پینے اور جوا کھیلنے سے توبہ نے اُسے مقدمے میں جتوایا تھا، اس کا اُسے اعتراف تھا۔

'اور وہی لے ڈوبے'

'پھر؟'

'پھر بے چینی حد سے بڑھتی جارہی تھی اور جب انسان کے پاس اُسے دور کرنے کے لیے کوئی پسندیدہ کام نہ ہوتو وہ جان لیوا بن جاتی ہے۔ اسی بے چینی نے پھر سے بگاڑا، پھر لے ڈوبی۔'

گرل سے ہٹ کر تلمیذ کوٹھری کی پشت کی دیوار کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اُسے اپنے دل میں اُن سب کے لیے ہمدردی محسوس ہورہی تھی جو دیواروں پر اپنی نشانیاں چھوڑ گئے تھے اور جس نے وہاں اپنی بچی کی تصویر بنا کر اس کے نیچے 'لڈو' لکھا تھا اس کے لیے جی میں پیار امڈ آیا۔

'بچی کی تصویر جیسی بھی بنی تھی بنانے والے کو اپنی محبت کے اظہار کے لیے یہ لائنیں ہی کافی تھیں جو اُسے محبت لوٹاتی ہوں گی۔ کاش پھانسی گھر میں بھی وہ چہرہ اس کے ذہن سے نہ ہٹا ہو۔'

ایک دن اُس سنتری سے جو شاید اس جیل میں سب سے پرانا تھا تلمیذ نے سوال کیا ''تمہیں معلوم ہے بچی کی یہ تصویر کس قیدی نے بنائی تھی؟''

اس نے اچٹتی ہوئی سی نظر دیوار پر ڈالی اور طنزیہ ہنسی میں کہا: ''ہوگا کوئی۔ یہاں تو دن رات لوگوں کا آنا جانا لگا ہے۔''

''وہ بچ گیا تھا؟''

سنتری نے دور ہوتے ہوئے کہا ''ہنھ۔ چڑھ چکا ہوگا پھانسی پر۔ ہوگا کوئی چرسی جس نے نشے میں قتل کیا ہوگا۔''

اگر پہرے کا سپاہی اُسے اس وقت دیکھتا تو نظر آتا ایک آدمی دیوار سے چمٹ جانا چاہ رہا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ سر کے اوپر دیوار پر پھیلے ہوئے ہیں، سینہ اور چہرہ اس سے چپک کر رہ گئے ہیں اور وہ سسکیاں لے کر رو رہا ہے۔ سُنتا تو سنائی دیتا: ''آخر مجھے کیا ہوگیا تھا!''

اس سے آگے اس میں اُس وقت شادی کے باقی دنوں کو سوچنے کا بوتا نہیں تھا۔

نجم کی موت کے بعد کے کتنے ہی سین تکمید کے دماغ میں تھے۔ ('اسے تم نے مارا، تم نے گھر کو جوئے خانہ بنا دیا چاندنی کے فرش والے گھر سے بدتر، تم نے بیوی کو گھر چھوڑ کر جانے پر مجبور کیا۔')

'پھر بھی میں نے یہ نہیں کیا تھا کہ پوری پہلی رات میمونہ گھونگھٹ نیچے کیے بیٹھی رہی اور میں سمندر کے کنارے کی ایک ہٹ میں کسی لڑکی کے ساتھ بیٹھا شراب پیتا رہا۔'

اُسے اپنی آواز سنائی دی: ('بیوی تو تمہارے firm order (اورڈر) پر تمہیں دی گئی تھی۔ وہ کیوں ساری رات گھونگھٹ نیچے کیے بیٹھی رہتی۔ اور یہ کیا تم ہر بار اپنی برائی کو جھٹلانے کے لیے کسی دوسرے کی، کی ہوئی برائی کا حوالہ دینے لگتے ہو!')

اس جواب سے سر کا تناؤ جو ناقابلِ برداشت تھا دونا ہوگیا۔

پھر تھوڑی دیر بعد اسی آواز نے کہا ('تم اُن سے اپنا مقابلہ کر کے جو تمہاری دانست میں حد سے گرے ہوئے تھے خود کو بے چون و چرا جرم اور گناہ کے مکمل اقرار سے بچا جاتے ہو۔ اس طرح تم جس مکتی کا انتظار کر رہے ہو وہ تمہیں نہیں ملے گی۔')

اس کا سر اوپر نیچے ہلا۔

اٹھ کر اس نے بالٹی سے پانی پیا اور ایک مگ سر جھکا کر اس پر انڈیلا۔

تھوڑی دیر بعد وہ فرش پر لیٹا سوتا جا رہا تھا۔ دونوں پیر گرل سے باہر نکلے ہوئے تھے۔

'کاش تسنیم اُس دور میں میری زندگی میں آ گئی ہوتی جب میں بے مقصد زندگی کی ڈگر پر روانہ ہونے والا تھا' آنسو نکل کر گالوں پر بہہ آئے 'سب ہی کبھی نہ کبھی ایسی ڈگر پر چل پڑتے ہیں، مگر کچھ دور چل کر اُن کی زندگی میں کوئی ایسی ہستی آ جاتی ہے جو فرصت کے لمحوں میں، رات کو سوتے وقت اور صبح آنکھ کھلنے پر جیسے سامنے آ جاتی ہے، ساری کلفت، بے حوصلگی کو ہٹا کر جتاتی ہے۔ 'میں تمہارے ساتھ ہوں، میں تمہاری ہوں۔' ایسی ہستی کے معیار پر وہ انسان جینا چاہتا ہے، اور چاہے ساتھ رہنا تھوڑے عرصہ کو بھی نہ ہو دونوں جی جان سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور اس یقین میں جیتے رہتے ہیں کہ کبھی نہ کبھی دونوں کی زندگی ایک ہو جائے گی۔ اگر ایسا ہوا

ہوتا تو میں آج دوسرا ہی کمینہ ہوتا۔'

'کاش اس الزام میں نہ پکڑا گیا ہوتا، یا پکڑا گیا ہوتا تب، جب ہر قسم کی برائی چھوڑ دی تھی اور میمونہ میری تھی تو اس تنہائی میں اس کی اور بچوں کی یاد تعویز بن جاتی جیسے کتنے ہی پہنے ہوئے ہیں۔ انہیں کچھ تو تسلی ملتی ہوگی ان سے اور انہیں پہنے پہنے تختے تک چل کر جائیں گے۔

میرے پاس کیا ہے؟ نہ تعویز جس پہ میرا ایمان ہو نہ کسی کی یاد جس نے مجھے اپنا کہا ہو — کچھ مدت کے لیے نہیں، تمام عمر کے لیے۔'

(۵۷)

تیسری یا چوتھی کوٹھری سے گانے کی آواز آرہی تھی ۔۔ آواز اچھی تھی۔

''اپنے ساتھ اپنی آواز بھی لے جائے گا۔ یہی زندگی کی ٹریجڈی ہے۔ کاش ہم مرتے مرتے جو کچھ اپنی ذات میں اچھا تھا چھوڑ جایا کرتے۔ پھر کسی کو مرنے کا دکھ نہ ہوتا۔''

تمکینؔ نے جواب میں اونچی آواز میں کہا: ''کوئی انسان جب مرتا ہے تو اکیلا نہیں مرتا ہے۔ اپنے اندر وہ کتنوں ہی کو لیے ہوتا ہے: جنہوں نے اسے بغیر دوسروں کو ستائے جینا سکھایا، جنہوں نے دوسروں کی خوشی کی قیمت پر، اور وہ بھی جنہوں نے اُسے دکھ اور سکھ کو ایک ہی جیسے بھوگنا سکھایا۔''

''تب تو واقعی ہم میں سے کوئی نہیں مرتا ہے'' پہلی بات کہنے والے نے کہا۔

اُس رات وہ کوشش کر کے سویا 'آج تینوں میں سے ایک کو تو ضرور خواب میں دیکھوں: اماں، تسنیم یا کسم کو۔' پھر خود پر حکم چلانے کے الفاظ اس نے درست کیے: 'تمکینؔ آج تو مجھے اماں، تسنیم اور کسم کے چہرے دکھا۔' 'آٹو سجیشن'[1] کی یہ تکنیک جو بچپن میں بہت کام آتی تھی تعجب ہے اُسے ابھی تک یاد تھی۔ جس کو خواب میں دیکھنا ہو اس کا نام ذہن میں لیے سوؤ۔ راجد ھانی

---

[1] ذہن میں خود اپنی تجویز کو اتار دینا کہ وہ کوئی پسندیدہ کام بے اختیاری میں کرائے یا ناپسندیدہ کام اسی طور روک دے۔

والوں کی زبان میں: 'وے دیکھوں گا۔' اور اس کا الٹ بھی کہ فلاں خواب میں نہ آئے اور وہ
ادبدا کر آتا ہے۔ ورنہ خواب کس کے کہنے میں ہوتے ہیں!
لیکن ہر وہ تیکنیک برتنے کے بعد جس سے وہ واقف تھا کہ کس طرح آدمی جسے دیکھنا ہو خواب میں
اس کا چہرہ دیکھتا ہے، امتحان میں آنے والے سوال، ریس کا کئی نمبر، ہوا یہ کہ نیند دھوکا دے گئی۔
پھر جس دم جیل کی مسجد سے اذان کی آواز ابھری اُسے یاد آیا' تایا ابا ایک وظیفے سے، کم از کم
مشہور ایسے ہی تھا، قبر میں سوئے ہوئے سے بات کر لیتے تھے۔ کچھ کا کہنا تھا بلکہ اُسے تھوڑے
فاصلے سے دیکھ بھی لیتے تھے۔ ان کے پاس ایسے کتنے ہی لائے جاتے تھے — بیوائیں، یتیم،
لیسر، بوڑھے، جوان جو اپنی زندگی کی متاع گم کر بیٹھنے پر ہوش و حواس کھو بیٹھتے تھے، اور ان کی
ایک ہی آس ہوتی تھی بس ایک بار جانے والا نظر آ جائے۔
تمیز نے وہ جگہ دیکھی تھی، نئی راجدھانی سے سوسوا سو میل دور کے ضلع رضی پور کے ایک
قصبے میں جہاں سب شادی میں گئے تھے، یاد نہیں کس کی تھی۔ دلہا اور اس کے باپ اور بھائیوں
کو دلہن کے گھر لے جانے کے لیے دو ہاتھی ریلوے اسٹیشن کے باہر پہلے سے کھڑے تھے۔
باقی برات کے لیے بہلیاں¹ اور ربھے تھے۔ تمیز کو بھی دلہا کے ساتھ ہاتھی پر بٹھایا گیا تھا۔
اگلے دن رخصتی سے پہلے بہت سے مرد قبرستان گئے تھے جہاں انہوں نے کئی قبروں پر جا جا کر
فاتحہ پڑھی — درختوں میں گھری ہوئی کچی پکی قبریں جن میں سے ایک پہلی تائی اماں کی تھی۔ ان کی
قبر پر پیلی نبولیاں پڑی تھیں اور برابر میں اُگے ہوئے نیم کے پیڑ کی وجہ سے قبر پر چھاؤں تھی۔
فاتحہ کے بعد وہاں سے سب کے چل پڑنے کے بعد بھی تایا ابا کچھ دیر وہیں کھڑے رہے۔
درخت کی دو جڑیں قبر کی بغیر سیمنٹ کی اینٹوں کی باؤنڈری کے نیچے گھس گئی تھیں۔ کسی نے کہا
''ان جڑوں کو کٹوانا پڑے گا نہیں تو قبر کو نقصان پہنچائیں گی۔''
تایا ابا نے سر اور ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور بولے ''اسے کچھ مت کہیں کھڑا رہنے دیں۔''
شاید ان کے دماغ میں ہو گا: دونوں کا ساتھ ہے، اس ساتھ کو مت توڑو۔

---

¹ کھلی بیل گاڑیاں اور وہ جن کی سفید کپڑے کی چھت اور دیوار ہوتی تھی۔

ایک زمانے میں تایا ابا اُسی قصبے میں پریکٹس کرتے تھے۔ عزیزوں رشتے داروں سے دور جو سب کے سب راجدھانی میں تھے۔ وہاں وہ صدمہ انہوں نے تنہا اٹھایا تھا۔ رات کو قبرستان چلے جاتے تھے اور وہیں صبح کردیتے تھے۔

جب لوگوں کو پتہ چلا، عبادت گزار تو ہمیشہ ہی سے ہیں، اب اُن میں یہ روحانیت بھی پیدا ہوئی ہے کہ مرے ہوؤں سے بات کرسکتے ہیں تو دروازے پر بھیڑ کے ٹھٹ لگنے لگے۔ لیکن تمیذ نے انہیں ہمیشہ سے راجدھانی میں دیکھا تھا— خاموش انسان، پریکٹس چھوڑ چکے تھے، اکا دکا مریض گھر پر اپنی بیٹھک میں دیکھ لیتے تھے۔

آج پہلی بار تمیذ کو اُن سے محبت محسوس ہوئی۔ وہ کھرا پن، مردم بیزاری، اُن میں چھوٹوں سے شفقت کی کمی ایک برف کی چادر تھی جو انہوں نے اوڑھ رکھی تھی۔ پتہ نہیں تسنیم کی قربت کی گرمی بھی اس برف کو پگھلا سکتی تھی یا نہیں! اور چھوٹی تائی اماں سے؟ پتہ نہیں کیسے وہ دوسری شادی کے لیے رضامند ہوئے ہوں گے اور کس نے انہیں راضی کیا ہوگا!

اُسے یاد ہی نہیں رہا وہ یاد کے کس سفر پر روانہ ہوا تھا کہ مرحوم حاجی عزیز الرحمن راہ میں کھڑے ہوئے ملے۔ آزادی کے بعد کے فسادات میں ساری آبادی ڈھل کر دوسرے ملک کو چلی گئی لیکن تایا ابا اُس چھوٹی اینٹ کے مکان کو چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوئے جو اُن کے دادا نے بنوایا تھا۔ ممکن ہے وہاں سے وہ آخیر عمر میں رضی پور کا چکر لگا آتے ہوں۔ پکی قبر بنانے کے خلاف تھے۔ لیکن ہر برسات کے بعد اپنے جفضے کی قبر پر، اور آس پاس کی چند اور قبروں پر، مٹی ڈلوا کر لیپ کراتے تھے۔ باؤنڈری وہ جیسی بھی تھی اُن کی بنوائی ہوئی نہیں تھی۔ جب ایک سال بارشوں کے بعد وہ خود وہاں نہیں جاسکتے تھے کسی عقیدت رکھنے والے نے یہ کام کروایا تھا۔

اور تسنیم کہاں تھی؟ کچھ سال پہلے تک وہ جان پہچان والے اور رشتے دار زندہ تھے جو اپنے پیچھے رہ جانے والے رشتے داروں، ملنے والوں کا پتہ جانتے تھے۔ نئی پود کو 'کہاں سے آئے تھے' کا جواب اس سے زیادہ پتہ نہیں تھا 'فلاں ملک سے۔' جیسے وہ کسی دوسرے کا ملک ہو۔ بعض ذہن پر زور دے کر بڑے شہروں کے نام لے سکتے تھے: وہاں سے، یا اس کے پاس

کے کسی چھوٹے شہر یا قصبے سے، یا ڈرتے ڈرتے صوبے کا نام بتاتے – جس طرح امتحان میں کچی تیاری والے ڈرتے ڈرتے کوئی جواب دیتے ہیں کہ کہیں غلط نہ ہو۔

وہ چہرہ جو خواب میں آنے سے خلل دے گیا تھا اس وقت جاگتے میں آنکھوں کے کہیں پیچھے دکھائی دے گیا، اپنی تمام خوبصورتی، معصومیت اور زندگی دے جانے والی نگاہ کے ساتھ۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

وہ دن کسی ترتیب سے اس کے ذہن میں نہیں آتے تھے۔ نہ سب ایک دن۔ کبھی صحن سے گزرتی ہوئی تسنیم سامنے آ جاتی تھی، کبھی اس کی آواز کا شبہ ہوتا تھا جو اس نے کم ہی سنی تھی۔ لیکن اس کوٹھری کا اتنا کرم تھا اس کی آواز کو آنے سے نہیں روکتی تھی نہ خود اس کے گھڑی بھر کے آ جانے کو۔

(۵۸)

سردیاں گئیں۔ کچھ دن جھڑے ہوئے پتے صحن میں بھاگے بھاگے پھرے۔ کوٹھریوں کے سامنے جو دیوار جیل کے اس حصّے کو باقی حصّے سے جدا کرتی تھی اتنی اونچی نہیں تھی کہ ادھر کے پیڑ ادھر نظر نہ آئیں۔ اُن کی ننگی ٹہنیوں اور شاخوں پر ایک صبح گلابی رنگ کے پھول تمیز کو نظر آئے۔ 'یہ نیا دھب ان ٹہنیوں اور شاخوں نے اپنے سنگھار کا اختیار کیا ہے!'

اُدھر کی ہوا میں سیمل کی روئی اڑ رہی تھی۔ تمیز نے جنگلے سے ہاتھ باہر نکال کر ایک آک کی بڑھیا کو پکڑ لیا جو نجانے کہاں سے یہاں آ پھنسی تھی' شاید اڑ کر باہر نہ جا سکے۔'

بڑھیا کو ہتھیلی پر رکھ کر دیر تک غور سے دیکھتا رہا۔ مکڑی کے جالے کے سے باریک لیکن سیدھے سفید تار اور ان کے قلب میں بیٹھا ہوا بھورا بیج: 'او یہ باریک تاروں کی گاڑی اپنی سیر کے لیے تم نے بنائی ہے! کہاں کا ارادہ ہے؟' یہ بیج بچپن میں چاند کی بڑھیا کی طرح کیا کچھ نظر آتا تھا۔ مُنی پور ہی میں آک کی بڑھیا اور چاند کی بڑھیا نے اپنی دلچسپی کھو دی تھی۔ راجد ھانی، اسلامک یونیورسٹی کے شہر، فلم ڈم کے کیپیٹل اور کہیں بھی دونوں نظر نہیں آئی تھیں۔ نہ آج سے پہلے یہاں۔ اس نے آہستہ سے پھونک مار کر بڑھیا کو اڑا دیا' افسوس وہ دعا یاد نہیں رہی جو سفر سے پہلے پڑھی جاتی ہے۔ یاد ہوتی تو سفر پر بھیجنے سے پہلے بڑی بی تم پر دم کرتا۔'

سیمنٹ کے فرش پر سر ٹیکتے ہوئے اُسے مُنی پور کا اپنا سیمل کا تکیہ یاد آ گیا' اماں نے اپنے لیے

بنوایا تھا، پھر مجھے دے دیا۔'

اس دوپہر کھانے کے بعد جب وہ لیٹا اور گناہوں کے خیال نے دوبارہ اس کے دماغ کو روندنا چاہا اس نے ان کا منھ بند کرنے کے لیے اپنی ناکردہ گناہوں کی فہرست ایک بار پھر پڑھنا شروع کر دی جو اُسے رٹ گئی تھی: 'پھر بھی بہت سے گناہ میرے ذمے نہیں ہیں۔ میری وجہ سے کبھی کسی کو ایبورشن (اسقاط) نہیں کرانا پڑا، کوئی غیر فطری حرکت مجھ سے سرزد نہیں ہوئی، نہ کسی معزز گھرانے کی باعزت لڑکی کی زندگی میں نے برباد کی، بلکہ کسی بھی باعزت لڑکی کی، نہ دوستوں کی بیویوں کی طرف ہاتھ بڑھایا، نہ کسی عورت کو میں نے بلیک میل کیا جو جانتی تھی مجھے اس کا راز معلوم ہے اور سب سے بڑھ کر: ایک بھی ریپ فرشتے نے میرے اکاؤنٹ میں نہیں لکھا ہوگا۔ صرف کام میں آنے والی عورتیں یا وہ جو میری طرح اس حساب کتاب میں نہیں پڑتی تھیں۔

'مگر یہ سب باتیں کسی کے کریڈٹ میں نہیں جاتی ہیں: نہ دنیا کے بینک میں نہ آخرت کے۔

'میرا خیال ہے ڈیئر گوڈ حساب لیتے وقت تو ان سب ناکردہ گناہوں کی بھی رعایت رکھے گا۔ رہا غصہ جس نے مجھے بارہا ذلیل کیا اتنا تو کبھی نہیں ہوا کہ کسی کی جان میرے ہاتھوں جاتی۔ نشانہ اچھا تھا لیکن شکار کبھی نہیں کھیلا — میں نے تو کبھی بقرعید تک پر بھی کوئی جانور ذبح نہیں کیا۔' اسے ہنسی آ گئی جیسے کسی نے کہا ہو: کافر ہے بے!

'نہ ہی اپنی بیوی کے سوا کسی دوسری عورت پر ہاتھ اٹھایا۔ اس پر بھی صرف نشے میں یا وہ جب بحث پر تلی ہو۔ نہ کسی پر بہتان لگایا۔

'اور یہاں ہر جیل اور تھانے کی طرح باہر لگے ہوئے بورڈ اور سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں ٹنگے ہوئے طغرے پر قرآنی آیتیں لکھی ہوئی ہیں — جس طرح سرکاری دفتروں میں جہاں پبلک سے روپے کا لین دین ہوتا ہے لکھا ہوتا ہے: رشوت لینے اور دینے والا دونوں گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں' کبھی یہ پڑھنے میں نہیں آیا: جو رشوت کا سودا کراتا ہے، دینے والے سے ہزار لیتا ہے، خود پانچ سو رکھتا ہے اور لینے والے کو پانچ سو دیتے ہوئے قسم کھا کر کہتا ہے: 'اتنے ہی اس کمینے نے دیے۔ زیادہ دیے ہوں اور اس میں سے کچھ میں نے رکھ لیے تو سمجھو میں نے سور

کھایا۔ گناہ کے اسکیل پر اے نیکی بدی لکھنے والے فرشتوں اُس کا کیا مقام ہے؟
کیا میں ان سب سے گیا گزرا ہوں؟

میں اگر اس بات پر فخر کروں کہ گو شراب اپنی ہر شکل میں میری کمزوری رہی ہے تو یہ بھی ہے کہ بھنگ، چرس، کوکین، ہیروئن یا افیون کو میں نے کبھی منہ نہیں لگایا۔
("کبھی؟" بولنے والا بولا)

صرف ایک دفعہ ہوسٹل کے دور میں نوکر نے بھنگ کے پکوڑے کھلائے تھے، گرفتہ بال کی بات ہے، اور جب نشہ دماغ کو چڑھا تو ہم تینوں تفنگیے (muskeleers) سمجھ گئے اس بدمعاش نے اپنا فن دکھایا ہے۔ اگلی صبح صبغت اللہ نے اُسے قمیص کے گریبان کو پکڑ کر کوئی دو فٹ اوپر اٹھا دیا اور کہا: "بول کل چائے میں کیا ڈالا تھا؟"

اس نے کہا: "چائے میں نہیں" اور جب گلا گھٹنے لگا تو بولا: "پکوڑے بھنگ کے تھے۔"

پورا بدمعاش تھا۔ جس دن نئی فلم لگتی تھی، یعنی ہر جمعے کو۔ غائب رہتا تھا۔ پھر ایک جمعے کو جب ہم پنا ناکیز میں نئی فلم دیکھنے گئے وہ وہاں ٹکٹ بلیک میں بیچتا نظر آیا۔ ہمارا خیال تھا ہمیں دیکھ کر چھپے گا لیکن اس نے پاس آ کر کہا: "ٹکٹ ختم ہو گئے لیکن آپ کے لیے انتظام کر سکتا ہوں۔"

اس دفعہ استاد ایمن نے اسے قمیص کے بٹنوں سے پکڑ لیا اور کہا: "کیسا انتظام؟ جو جیب میں ہیں نکال۔" اور اس وقت تک نہیں چھوڑا جب اس نے جیب سے پانچ ٹکٹ نکالے اور ان میں سے گن کر تین ہمیں دیے۔ پھر اپنے بٹن فرش سے چننے میں لگ گیا۔

ہم اس کی ڈھٹائی پر ہنستے تھے۔ اگلی صبح اس نے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا نکٹوں کا بل ہمیں پیش کیا کہ کتنے پیسے اپنی جیب سے اُسے ٹکٹ بلیک میں بکوانے والے کو دینے پڑے تھے۔
"جس سے لے کر کمیشن پر ٹکٹ بیچ رہا ہے۔" صبغت اللہ نے کہا۔
"فی ٹکٹ آٹھ آنے کے حساب سے پورے ڈیڑھ روپے۔"
خیر وہ ہم نے دیئے۔

ہا! اچھا آدمی تھا۔ بعد میں جب آزادی ملنے پر مذہبی فسادات ہوئے اور مسلمان مختلف

علاقوں سے ڈھونڈھ کر پرانی شاہی عمارتوں کو لے جائے جا رہے تھے وہ کسی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ دوست سے تانگہ مانگ کر پہاڑیوں سے اُدھر جہاں ملی جلی آبادی تھی وہاں سے اپنی بہن اور اس کے شوہر، ساس، سسر اور بچوں کو پرانے قلعے لے جا رہا تھا۔ مجھے سارا واقعہ یوسف مواج نے سنایا تھا۔ خود میں ان دنوں فلم کیپیٹل میں تھا۔"

(۵۹)

ایک دن بیٹھے بیٹھے جب سلاخوں سے باہر دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا چکی تھیں، اچانک اعجاز کا قصہ تمیز کو یاد آیا، این ایڈورڈ سے شادی کرنا چاہتا تھا نہ ہوسکی، فلم کیپٹل سٹی سے حمیدہ، وہاں کی دنیا کی مندنا، بلا رہی تھی نہ جاسکا۔ باپ نے جس لڑکی سے چاہی شادی کردی۔ شادی میں سہرہ پڑھنے کے لیے یوسف عسکری مواج تک نہیں گیا تھا کیونکہ اس کا کہنا تھا سہرے کی جگہ مرثیے کے اشعار دماغ میں خود بخود بن رہے تھے۔ آخر کو اعجاز اس کا بہت ہی پیارا دوست تھا اس کی آرزوؤں کی ملی پر تہنیت کے شعر کیسے قلم کی زبان سے نکلتے!

مگر اس کا مجھے یقین ہے اس نے اپنی بیوی کے ساتھ وہ چنگیزی سلوک نہیں کیا ہوگا جو واجد خاں نے مہر افروز نکہت آرا کے ساتھ سہاگ رات کے موقعے پر کیا تھا۔ ایک معصوم ہستی کو سسکا سسکا کر مار دینے کا۔ وہ کیا کیا خواب دیکھتی ہوئی اس گھر میں گئی ہوگی!

وہ دنیا دکھاوے کو شاید نماز جنازہ میں شریک ہوا ہوگا اور قبرستان تک بھی گیا ہوگا، مٹی بھی دی ہوگی۔ تعجب ہے نہ پاگل ہوا، نہ خودکشی کی۔ ایسے آدمی کو اُس جوہڑ میں کود کر خودکشی کرنی چاہیے تھی جس میں پورے شہر کی نالیاں، نالے، آبچک کھلتے ہوں۔

شکر ہے میرے نامۂ اعمال میں اے خدا تجھے ایسا کوئی واقعہ نہیں ملے گا۔

اگر میری اماں زندہ ہوتیں تو اُن کو ہر قیمت پر ساتھ لے جاکر چھاؤنی گڑھ کے کسی چرچ میں

این ایڈورڈ کو انگوٹھی پہناتا۔ اس سے میں نہ کرسچین بن جاتا نہ منافق۔ گریس ولف کی طرح وہ
این ایڈورڈ رہتی اور میں تلمیذ الرحمٰن۔
'شکر ہے میری وجہ سے کسی نکہت آرا مہر افروز نے خود کو مٹی کا تیل چھڑک کر آگ نہیں لگائی۔
('نجم نے تو تمہاری ہی وجہ سے ایسا کیا تھا')
'میری وجہ سے! وہ کیسے؟'
('اپنے ظلم سے پوچھو')

بن بلائے بیٹے کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جانے پر تلمیذ کو چکر آ گیا۔ سہارے کے لیے دروازے کی سلاخوں سے لپٹ کر اس نے اُن پر اپنا سر ٹیک دیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے بہہ نکلے۔

(۶۰)

'آج نیند لانے کے لیے فلموں کی گنتی نہیں کروں گا- کتنی راجدھانی میں دیکھی تھیں کتنی فلم کمپیٹل میں، کتنی ع میں، اور کتنی وہاں کے سینما ہالوں میں جہاں دیکھنے والے ہیروئن کے ناچ سے خوش ہوکر اسٹیج پر سکّوں کی بارش کردیتے تھے اور شو ختم ہونے پر گن کر اپنے اپنے پیسے اٹھا لیتے تھے۔ وہاں اس معاملے میں ایمانداری چلتی تھی باقی ہر قسم کے گناہ اور جرم کو برداشت کیا جاتا تھا۔

'اور ایک جگہ اور جہاں ایمان داری کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی - سرخ بتی کا علاقہ یعنی بازارحسن میں۔ جس میں داخلے کی سڑک پر دو ملٹری پولس والے پہرے پر موجود ہوتے تھے، چیک کرنے کو کہ کوئی ان کا آدمی تو ادھر کا رخ نہیں کررہا ہے۔ جیسے آنے والا کنسیشن کے لیے وردی پہن کر آئے گا جس پر چڑیا گھر، میوزیم اور سینما میں ان کے لیے رعایت ہوتی ہے۔ پہرہ سورج ڈوبنے کے بعد سے آدھی رات تک رہتا تھا۔ یعنی صبح کو کسی کو ادھر آنے کی ضرورت نہیں پڑسکتی ہے۔ کمفرٹ گرلز کا تصور جس کے لیے دنیا کو جاپان اور امریکا کا شکرگزار ہونا چاہیے نہ جب تک یہاں پہنچا تھا نہ دوسری بڑی جنگ کے بعد۔' وہاں بھی نچھاور کئے جانے والے پیسوں میں ایمانداری کا راج ہوتا تھا۔ اگر کوٹھوں کے بیچ کی سڑک پر رات کو مجرا ہورہا ہے اور آس پاس کے مکانوں سے، کوٹھوں دکانوں سے نوٹ لٹائے جارہے ہیں تو گرنے والا چھونے سے چھوٹا

نوٹ ہاتھوں ہاتھ گانے والی تک پہنچتا ہے۔ مجال ہے جو کوئی شرابی جواری اُن میں سے ایک بھی دبا بیٹھے۔'

'سوچتا ہوں زندگی میں کتنی لڑکیوں، عورتوں سے واسطہ پڑا جنہیں بھگا کر لایا گیا تھا اور میں نے انہیں دیکھا یا ان کے بارے میں سُنا۔ اخبار میں جن کے بارے میں پڑھا انہیں گنتی میں نہیں لاؤں گا۔ ایک تو وہ تھی جسے پہاڑی علاقے سے اس کا چچا بھگا کر لایا تھا- حقیقت میں باپ کا سوتیلا بھائی۔ جس طرح تمام قبیلے والوں کے لیے مشہور ہے مہمان نواز ہوتے ہیں اسی طرح وہ اس علاقے سے تھا جس کے لیے مشہور ہے وہاں صرف خود دار لوگ بستے ہیں، عزت کے لیے قتل کرنے اور قتل ہوجانے والے۔ وہ عورت ایک بچی کی ماں تھی، شوہر کسی عرب ملک میں تھا، چچا پر بھروسہ کر کے اس کے ساتھ ہولی تھی جو اُسے بیمار بچی کے لیے دوا دلوانے نزدیک کے شہر لے جا رہا تھا۔

'جس زمیندار نے اُسے خریدا تھا وہ بھی خوددار اور خوں خوار قبیلے سے تھا، لیکن تھا دوسری زبان والا۔ ایک زمانے میں وہ میرے ساتھ پینے والوں میں سے تھا۔ اس کی بیوی عمر میں اس سے پندرہ سال بڑی تھی اور بوڑھی ہو چلی تھی۔ بھگائی ہوئی عورتوں کو ہزار ہزار میل کی دوریوں سے لاکر ایک گھر میں جو ہر طرف سے بند تھا رکھا جاتا تھا۔ جاؤ اور اپنی پسند کی عورت خرید لو- یہ وہاں بزنس کا طریقہ تھا۔ اس نے بھی خریدی اچھی خاصی بڑی رقم دے کر اور یہ اس کی قسمت نکلی کہ نہ وہ کنواری تھی نہ ہوش مند، سال کے اندر اندر پتہ پڑ گیا پاگل ہے۔ صورت شکل کی ٹھیک تھی، مضبوط کاٹھی کی - چار بچوں کے بعد بھی ایسی ہی رہتی، گورا رنگ اور چہرے پر چار پانچ جگہ سرمے کا گُدنا تھا۔ گلے کا تعویز اس نے کبھی نہاتے میں بھی نہیں اتارا تھا اور اس میں شک تھا وہ نہاتی بھی تھی یا زبردستی نہلائی جاتی تھی۔

'دوسری؟ فلم انسٹی ٹیوٹ والی۔ میں نے اُسے قریب سے دیکھا تھا۔ وہ بھگائی ہوئی نہیں تھی۔ اس نے خود اپنے کو ایکٹنگ کے شوق میں بھگوایا تھا۔ ورنہ پہلے اپنے شہر میں کسی کولج میں انگریزی کی لیکچرر تھی۔ مشکل یہ آ پڑی تھی آدھی فلم کی شوٹنگ ہو چکی تھی، ہرش وردھن فلم کا نام تھا اور وہ رانی

کے رول میں تھی، اور یہ طے نہیں ہو پا رہا تھا جب پبلسٹی میٹیریل چھپے گا - پوسٹر، اسٹل شوٹس اور ہیروئن کی بازار لوٹ لینے والی تصویریں، تو اس کے گھر والے بلیک میل کرنے پر تو نہیں اتر آئیں گے کہ لاکھ دو لاکھ دو ورنہ ہم کیس کورٹ میں دائر کریں گے کہ ہیروئن بھگائی ہوئی لڑکی ہے اور سالوں فلم کو نمائش کی اجازت نہیں ملے گی۔ جب میں نے فلم کیپیٹل چھوڑا اس وقت تک فلم مکمل نہیں ہوئی تھی۔ ایمن نے اپنے خط میں بتایا فلم پیک ہوگئی اور پروڈیوسر ڈائریکٹر نے ہیروئن سے شادی کر لی۔ ممکن ہے کی ہو، ممکن ہے اپنے شہر لوٹ کر پھر کالج میں پڑھانے لگی ہو۔ تھی خوبصورت۔

'اور جو حاجی تصدق حسین کے نواسے کی بیوی کے ساتھ ہوا ابھی تک مجھے اس کا دکھ ہے۔ سوچتا ہوں ایسا کچھ لوگوں ہی کے حصے میں کیوں آتا ہے، سب کے نہیں۔

آبادی کے اتھل پتھل کے دن تھے، انگریز جا چکے تھے، جو نئی حکومتوں میں تھے انہیں بس شہروں میں بلوہ کرانے کا تجربہ تھا، امن قائم کرنے کا نہیں۔ بلوہ کرانے ہی میں اُن کی لیڈری کو برقراری تھی ورنہ آزادی حاصل کرتے وقت ان کے پاس کوئی اور پروگرام کب تھا! صبغت اللہ اس موضوع پر گھنٹوں بول سکتا ہے میں صرف اتنا جانتا ہوں آزادی ملنے پر لوگوں نے کھویا بہت کچھ اور اس کے بدلے میں پایا بہت کم۔

'ایک ہندو جو اُن کے شہر میں کسی اور صوبے سے آیا تھا حاجی تصدق کے نواسے نعیم کا کاروبار میں ساجھی بن گیا، عمارتی لکڑی اور بانسوں کا کاروبار حاجی صاحب کو اپنے باپ سے ملا تھا۔ انہوں نے کاروبار کو اپنی محنت سے تگنا چوگنا کر دیا۔ بیٹا کوئی تھا نہیں، بڑھاپے میں جب جوڑوں نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا تو کاروبار نواسے کو سونپ کر وہ گھر کے ہو کر رہ گئے- مسجد، گھر، مسجد۔ رمضان میں اسی مسجد میں اعتکاف میں بیٹھتے تھے۔ کبھی کبھی اکے میں بیٹھ کر اپنے گدام کا چکر لگا آتے تھے۔ رام نریش کو اپنا بزنس پارٹنر بنا لینے میں نعیم بھائی کو تحفظ نظر آیا ہوگا، بلوائی ان کے گدام کو آگ لگانے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے ورنہ اور کیا وجہ ہوسکتی تھی چلتے ہوئے کاروبار میں کسی بالکل غیر کو ساجھی بنا لینے کی!

'منے ساتھی نے اس قدر نعیم بھائی کے دل میں گھر کرلیا کہ انہوں نے دوست کے اصرار پر مہرو بھابی کا پردہ اس سے اٹھوادیا۔ پہلے صرف شوہر کی موجودگی میں گھر کے اندر آتا تھا، بعد میں غیر حاضری میں بھی آنے لگا۔ وہ دو چھوٹے چھوٹے بچوں کی ماں تھیں لیکن خوبصورتی کی تعریف سننے کی بیماری ان میں بھی تھی، جو ترکیب شاید پہلی عورت کے ساتھ شیطان نے برتی ہوگی۔ رام نریش رابطے رکھنے والا آدمی تھا کیونکہ جس صوبے سے وہ آیا تھا وہاں کے لوگ آپس میں منظم تھے اور نئے ملک میں آنے پر بھی بااثر تھے۔ میرا خیال ہے اسی طرح ہر ملک میں چلتا ہے جو جنگ یا انقلاب کا شکار رہا ہو۔ خیر، اسی نے لکڑی سپلائی کے کئی بڑے آرڈر نعیم بھائی کو دلوائے ورنہ فسادات کے زمانے سے ان کا کاروبار ٹھپ ہو چکا تھا۔

بھلا مہرو بھابی، جوان عورت، میری ہزار بار کی دیکھی ہوئی، یہ کیوں نہ مانتیں کہ یہ مالدار، اثر رسوخ والا آدمی اُسے فلم کیپیٹل لے جا کر ہیروئن بنائے گا۔ اس چھوٹے سے تحصیلی شہر میں ان کا حُسن بے کار جا رہا تھا۔ میرا اندازہ ہے نعیم بھائی نے کبھی کھل کر ان کے حُسن کی تعریف نہیں کی ہوگی۔

'اور ہوا کیا جب انہوں نے رام نریش کے شہر جانے کا فیصلہ کرلیا تو شوہر کی منتوں کا ان پر کیا اثر ہوتا! نعیم بھائی نے بچے زبردستی ان کے ساتھ کر دیے، رو رہے ہوں گے کہ ماں ہمیں چھوڑ کر کیوں جا رہی ہے۔ اطلاع ملنے پر حاجی صاحب ریلوے پلیٹ فورم پر پہنچے کیونکہ بھابی ہی نے پرچہ لکھ کر انہیں بلایا تھا کہ میں شہر اور شوہر کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں آپ آ کر بچے لے لیجیے۔ اُن کا مہرو بھائی کے پیروں پر پگڑی رکھنا بے کار گیا، نہ بھیگی ہوئی سفید داڑھی پر بہو کو ترس آیا۔ اور وہ ٹرین سے وہاں کے لیے روانہ ہو گئیں جہاں ہیروئن گر عاشق ان کا انتظار کر رہا تھا۔'

'نینی پور سے انگریزوں کی پرانی راجدھانی آنے والے ایک شخص سے یہ واقعہ یا سانحہ میں نے سنا تھا۔ برابر کے شہر ہی کا تو معاملہ تھا میرے دادا کے تعلقات حاجی صاحب سے رہے تھے۔

جب آخری بار خود نینی پور گیا وہاں جانا چاہتا تھا، لوگوں نے منع کیا وہاں جا کر کیا کرو گے۔

''نعیم پاگل ہو چکا ہے۔ تم لاکھ اُسے بڑے بھائی کی طرح سمجھتے آئے ہو وہ تمہیں شاید ہی پہچانے۔ بچے اُن کی خالہ آ کر نانا کے گھر سے لے گئی تھی۔''

میں نے کہا: ''اور مہرو بھابی کی خیر خبر وہ کیسی ہیں؟''

ایک میرے ہم عمر آدمی نے خفگی سے کہا: ''ابھی تک اس عورت کو بھابی کہتے ہو!''

'اُن دنوں ایک دم ہوک اٹھتی تھی وہاں جاؤں جہاں کے بازار میں دل بھر جانے پر اس آدمی نے مہرو بھابی کو بٹھا دیا تھا۔ لیکن ایسے بازاروں میں گلی کے منھ پر تو مکان اور مکین کے بورڈ نمبر لگے ہوتے ہیں — جیسے نمبر ۳۲۱، اوپر کی منزل، کمرہ نمبر ۳: ساوتری۔

۷۹ ۴ / تیسری منزل — ماہ پارہ۔

کسی بھی بڑے شہر کا ریڈ لائٹ ایریا ملٹری چھاؤنی سے کم نہیں ہوتا ہے۔ منٹ میں آنے والے کی نیت بھانپ لی جاتی ہے اور وہاں سے کوئی ایک بھگائی ہوئی لڑکی تک کو اس کاروبار سے نکال کر پرانی دنیا میں نہیں لے جا سکتا ہے۔

'مجھے اپنی وہ بے بسی ابھی تک تھوڑی دیر کے لیے اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔'

(۶۱)

'انسان خود کچھ بھی نہیں ہوتا ہے۔ ایک نوسیکھیا پیراک سمجھتا ہے تیرنا آتا ہے' جدھر چاہوں گا ہاتھ پیر مارتا ہوا اُدھر نکل جاؤں گا۔ مگر حقیقت میں اس کی نیت، اس کی ہمت تک پانی کے کرنٹس (سیل) کے بس میں ہوتی ہیں۔ دھارے جو اُسے نظر نہیں آتے ہیں چاہیں تو کنارے پر پہنچا دیں، نہ چاہیں تو اُدھر جدھر کا پانی شارکوں سے بھرا ہے، جدھر نظروں سے اوجھل کنویں ہیں، بھنور ہیں۔ ہمت ابھی تھی ابھی ٹوٹ گئی۔

'جب ابا نے انگریزوں کی نئی راجدھانی بھیجا قرآن دہرا رہا تھا، دو درجن کے قریب آیات حفظ کی تھیں، تین چار قرأت کے ساتھ۔ عربی رسم الخط کی داد ساری زندگی مجھے ملی اور وہی ایک چیز تھی جسے زوال نہیں ہوا ورنہ عمر کے ساتھ جتنی بھی خوبیاں تھیں ایک ایک کر کے دم توڑتی گئیں — اور وہ تھیں ہی کتنی۔'

'اور بڑی آپا کے یہاں آ کر کیا ہوا؟ نماز بے مزہ ہوگئی، قرآن کا پڑھنا — لگنے لگا دونوں طرف دو سزا دینے والے فرشتے کھڑے ہیں، ذرا غلطی کی اور ایک نے آگ کا کندہ سر پر کھینچ مارا۔ جہاں رکنا چاہیے تھا نہیں رکا دوسرے نے بھی دہکتی ہوئی آگ کا کندہ سر پر دے مارا۔ پھر نماز کم ہوتے ہوتے ایک وقت کی بھی نہیں رہی۔ عید، بقرعید کی بھی نہیں۔

'ایک دفعہ نواب یوسف عسکری مواج کے گھر عید کے دن تیسرے پہر گیا، پیچھے پڑے

تھے۔ میں نے کہا: ''اکیلے عید منا رہے ہو، شرم نہیں آتی!''
اس نے کتابوں کی الماری میں سے کتابوں کے پیچھے رکھی ہوئی کوارٹ[1] کی چپٹی بوتل نکالی اور کہا ''بھول سکتا ہوں، لو پیو۔''
'پھر یہ ہوا آیات بھی بھول گیا اور آہستہ آہستہ نماز کا طریقہ بھی، صرف عربی رسم الخط یاد رہا کیونکہ اُسے ہر جگہ کام میں لایا، ڈاک کے پتے اور کتابوں کو پیوں پر نام لکھنے کے۔'
('اور اُن سب کی جگہ جو تم گم کر بیٹھے تمکید الرحمٰن تمہارے جعلی دستخط کرنے، forged documents (جھوٹی دستاویز) تیار کرنے کی مہارت، شناخت کی تبدیلی اور contraband items (چھپواں ناجائز مال) ادھر سے اُدھر لے جانے نے لے لی!')
'ان کا اپنا مزہ تھا: نہ پکڑے جانے کا۔' تمکید نے بغیر جھینپے ہوئے کہا۔
'لیکن پیارے خدا کیا ان سب خرابیوں کا میں اکیلا ذمے دار ہوں؟ امینہ جو ہے، کیا وہ خود اس کی تنہا ذمے دار ہے؟ اس کا دل تو چوبیس کیراٹ گولڈ کا ہے۔ رتی برابر اس میں دھوکے، جھوٹ اور ٹھگنے کی ملاوٹ نہیں ہے۔ اور وہ پارسا عورتیں بھی میں نے دیکھی ہیں جن کے دل گلٹ کے تھے۔
'یہ سچ ہے جس طرح موقع بے موقع کو مریڈ صبغت اللہ سرخ جھنڈے کی قسم کھاتا تھا، اب بھی جھوٹ چھپانے کو اپنی گوری کو مریڈ بیوی گریس ڈولف سے کھاتا ہوگا، میں نے بھی کچھ اپنی کہاوتیں بنالی تھیں جن کا مقصد بس دوستوں کو ہنسانا ہوتا تھا۔ نہ صبغت قسم کھاتے ہوئے سنجیدہ ہوتا تھا نہ میں یہ کہتے وقت کہ ناجائز پیسہ برکت لے کر آتا ہے جیسے جوئے کا پیسہ، اور جس آفس میں کام نہ بن پڑ رہا ہو وہاں ناپاکی کی حالت میں جانے سے کام بن جاتا ہے — کاغذ پر ہر دفعہ اوبجیکشن (اعتراض) لگنے کی جگہ approved (منظور) کا ٹھپا لگا نظر آتا ہے۔ بعض دفتروں میں نام کی چٹ اندر بھیجتے وقت آخیر میں نقوی یا زیدی لگا دو کام بن جائے گا، دوسری جگہ غور کرو اندر جو افسر بیٹھا ہے جس کے ہاتھ میں اس وقت تمہاری زندگی ہے تمہارے نام کے ساتھ کیا پُچھلا دیکھ کر خوش ہوگا؟ — یا ناخوش! صدیقی؟ فاروقی؟ نہیں اس سے وہ شیشے

---

[1] پاؤ گیلن

میں نہیں اترے گا۔ ایسے نام والے اَن گنت ہیں، میں کہا کرتا تھا کام شیطانوں سے آ پڑا ہو تو فرشتہ بن کر جانے سے فائدہ! میمونہ میری اس بات کو سن کر استغفراللہ، استغفراللہ کہتی تھی۔ میں کہتا تھا ''ڈارلنگ یہ زندگی میں کامیابی کے نو نکتے ہیں۔'' بے چاری سیدھی عورت جو شیفون اور بنارسی۔ململ میں بھی اتنی ہی خوبصورت نظر آتی تھی جتنی کھونٹے لگے ہوئے ململ کے دوپٹے میں۔

'ڈیئر گوڈ۔ میں اگر اتنا ہی بڑا گنہگار تھا تو تو نے اتنی خوبصورت روح والی عورت مجھے کیوں بخشی تھی!

'میں نے ٹھرّا اور بیوڑا بھی کبھی نہیں پیا– یا شاید پیا ہو بھول گیا– نہ کسی کی جیب کاٹی، نہ کسی کی لگائی بھگائی نہ کسی کی لڑکی، میں وہ کبھی نہیں رہا جو محبت جتا کر عورت کو ساتھ بھاگنے پر اُکساتے ہیں پھر گھر سے دور، غیر جگہ پہنچ کر اس سے پیشہ کراتے ہیں۔

'آج رات نیند کو بلانے کے لیے زبردستی ایسے سب واقعات کو ذہن میں لاؤں گا اور ان کی تعداد گنوں گا جو بھگائی ہوئی لڑکیوں عورتوں کے بارے میں ہیں۔

'ہاں اسکول کے زمانے سے تین پتی کھیلتا آیا تھا، اور ہمیشہ جیتتا تھا۔ اس سے سارے شوق پورے ہوتے تھے۔ اُسے بُرا کیوں کہتا کسی کی جیب تو نہیں کاٹتا تھا، وہ بھی حلال کی کمائی ہوتی تھی۔ بعد میں تین پتی کی جگہ رمی نے لے لی۔ برج کھیلا لیکن بڑا سست کھیل ہے اور دماغ پر زور ڈالنا پڑتا ہے۔

'یہاں اگر تاش کی بازی جمنے لگے تو وقت اتنا بھاری نہ لگے، کوئی کہاں تک توبہ کرتا رہے! یوں ہوا کرے بازی جمی ہوئی ہے: ایک انسپکٹر اور دو کونسٹیبل آ کر نام لے کر کہتے ہیں تمہاری باری آ گئی اٹھ کھڑے ہو، اور وہ اپنے ہاتھ کے پتے بازی دیکھنے والوں میں سے ایک کو تھما کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اپنا کھیل ختم ہوا۔'

اور اس پر دوسرے کہیں 'چلو، ہم آتے ہیں۔'

رمی کا خیال آنے پر اسے کتنی ہی ادھوری بازیاں یاد آتی چلی گئیں: جب کوئی اپنا بڑا

اچانک آ گیا تھا، ہوسٹل وارڈن، پولیس پارٹی۔ وہ جواریوں کا اٹھ کر ادھر اُدھر بھاگنا، بیڈ کے نیچے دبک جانا، پکڑے جانا، گالیاں اور طمانچے۔ وہ دیر تک ہنستا رہا۔

پھر اُسے یاد آیا میں نے خیالی آٹو بائیوگرافی بھی تو لکھنی شروع کی تھی:

'[1]The Life and Times of a Debauch'

اُسے یاد کر کے پھر وہی مسرت لوٹ آئی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی حیرانی کی انتہا نہیں رہی جب اس نے دیکھا شادی کے بعد میمونہ نے اس کے ساتھ گھوم پھر کر جو ہارڈ باؤنڈ کتابیں پڑھنے اور ڈرائنگ روم کی زینت کے لیے خریدی تھیں اُن میں وہ کتاب بھی شیلف پر کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اس نے سر کو جھٹکا دیا اور ماتھے اور کنپٹیوں کو جھکولیا۔ اب ایسا کوئی ڈرائنگ روم وہاں نہیں تھا نہ بک شیلف، نہ ہی اس کی خودنوشت۔

لیکن یہ خیال آنے پر کہ کاش زندگی یوں نہ گزاری ہوتی خوشی کی وہ لہر کنارے سے لوٹ کر وہاں پہنچ کر معدوم ہوگئی جہاں سے اٹھی تھی۔ اور اپنے ساتھ نیند کو بھی لیتی گئی۔

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ خیالات کی اس کڑی کو وہ زیادہ دیر دماغ کی اسکرین پر ٹھہرنے نہیں دینا چاہتا تھا ورنہ پھانسی سے بڑا گھور اندھیرا اُسے اپنی لپیٹ میں لے لے گا جس میں وہ بس ایک جسم رہ جائے گا — بغیر جذبات، خواہشات اور احساسات کی ہستی، جب وہ چاہے گا کاش اس کوٹھری میں خودشیو کرنے کی سہولت ہی دی جاتی! تب وہ اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرتا۔

'اور یہاں مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے زندہ رکھا جا رہا ہے۔ اس سے بڑی ریاکاری قانون نہیں کرسکتا تھا۔'

جس چیز نے پھانسی سے زیادہ تلمیذ کو ستایا تھا وہ تھا پچھتاوا۔ پھانسی کا خوف نہیں۔ خیالات کی سیریز، مربوط سلسلہ: 'وہ رات آئے گی جب پتہ چلے گا کل صبح پھانسی ہے، خوف سونے نہیں دے گا، نہ کوئی ساتھ ہوگا جس سے بات کرسکوں، خوف سے، جب وہ سیل کا دروازہ

---

[1] ایک عیاش کی خودنوشت

کھول کر پھانسی گھر چلنے کو کہیں گے، تو پیشاب تو نہیں نکل جائے گا؟ بلکہ...... وہ جگہ جب نظروں کے سامنے آئے گی، تختہ، گلے میں...... ' اس سے آگے وہ نہیں سوچ سکتا تھا۔

لیکن پچھتاوا رکھنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ اور پچھتاوے ایک دو ہوتے تو بات تھی، جب وہ اس پر حملہ آور ہوتے تھے اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے، کہاں نکل جائے۔ پوری فوج کی فوج زندگی کی ہر سمت سے اس پر حملہ آور ہوتی تھی۔ کوئی غور سے دیکھتا تو پتہ چلتا ایک جگہ بیٹھے ہوئے بھی اس کا جسم مستقل حرکت میں ہے۔

' بھیڑیئے اور مگرمچھ جیسے جانور اکثر دوسرے جانوروں اور انسانوں کو خاموشی سے مارتے ہیں اور سو رہتے ہیں۔ نہ انہوں نے ان کا کچھ بگاڑا ہوتا ہے نہ اُن کے گوشت کی اس وقت انہیں ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس پر مارنے والے پچھتاتے بھی نہیں ہیں۔'

' اور انسان بھی نہ پچھتائے اگر بھیڑیا یا مگرمچھ بن جائے۔'

' یہی تو میں کہہ رہا ہوں غلط کام کرنے سے پہلے انسان کو خود کو بدل ڈالنا چاہیے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو like a good boy or good girl[1] دنیا کی جنت میں رہتے رہنا چاہیے۔'

' تا عمر؟ پھر زندگی کا کیا فائدہ؟ اُسے اپنی آواز دور سے سنائی دی۔

کچھ دیر کے لیے اس کا دماغ خالی ہو گیا۔

"تلمیذ بھائی تم کیا اس کوٹھری کا فرش گھس کر برابر کرنے کے لیے یہاں بھیجے گئے ہو؟" ایک قیدی نے جس کی موت کی سزا سننے میں آیا تھا عمر قید میں بدل گئی ہے اس کی کوٹھری کے سامنے سے گزرتے ہوئے کہا۔

"تو موت دلواؤ نا۔ تمہاری تو وہاں بہت واقفیت ہے۔" تلمیذ کو لگا یہ بات اسے جلانے کے لیے کہی گئی ہے۔ لیکن اس سے کڑوا جواب ممکن نہیں تھا۔

---

[1] اچھے لڑکے اور اچھی لڑکی کی طرح

(۶۲)

مصری کو اس قطار کی تیسری کوٹھری میں آئے مشکل سے تین چار ہفتے ہوئے تھے کہ اس کے ملاقاتی تحفے تحائف لیے آئے، صرف اس کے لیے نہیں اسٹاف اور ہمسفروں کے لیے بھی۔
ملاقات کے لیے جاتے ہوئے وہ تمکینؔ کو بھی اصرار کر کے ساتھ لیتا گیا: ''تم سے کوئی ملنے نہیں آتا ہے اس لیے ہر وقت سوچ میں ڈوبے رہتے ہو۔ مجھے دیکھو، میرے خلاف کیس پکا ہے پھر بھی پیٹ بھر کر کھاتا ہوں اور ٹانگیں پھیلا کر سوتا ہوں۔ اس لیے کہ جانتا ہوں وہ جلاد ابھی پیدا نہیں ہوا ہے جو پھندا میرے گلے میں ڈالے گا۔''

اس کے ملنے والے خود شکل سے خونی لگتے تھے۔ مصری کو ضروری پیغامات پہنچانے کے بعد، ان میں جو سب سے زیادہ زندگی سے مطمئن نظر آتا تھا تمکینؔ سے بولا: ''مصری تمہارے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہے۔ فکر مت کرو، ہم تمہیں بھی یہاں سے لے جائیں گے — اس ملک سے باہر۔ یہاں کیا رکھا ہے۔ زندگی کا مزہ نہیں، کیا اندر کیا باہر۔ جو جیل کے باہر ہیں کیا انہیں ایذائیں نہیں دیتے ہیں؟ بلا کسی جرم کے۔''

جنگلے کے نیچے کی بار سے تمکینؔ کی طرف بلیک اینڈ وائٹ کا چپٹا ڈبا بڑھاتے ہوئے اس نے کہا: ''لو پیو۔''

مصری ہنستا رہا۔

دو سنتریوں نے ایک ساتھ کہا "وہاں جانے کی اجازت نہیں ہے، ریلنگ سے باہر نکلو۔"
مصری کے ساتھیوں پر ان کے چلانے کا اثر نہیں ہوا۔
زندگی سے مطمئن آدمی نے کہا "بڑے جرم کے لیے دنیا میں سب سے اچھی جگہ امریکا ہے۔ کوئی تمہیں چھو نہیں سکتا ہے۔" منھ چھت کی طرف کر کے اس نے دھوئیں کا غبارہ چھوڑا۔ "وزن، بلڈ پریشر، خون ایک ایک چیز کا ریکارڈ رہتا ہے۔ چھینک آئے تو ڈاکٹر موجود۔ ٹیلی وژن، تیرنے کا ٹینک، جمناسٹک کا اکھاڑا - اور کیا چاہیے۔ بس ایسی اسٹیٹ ہو جس میں سزائے موت نہ دیتے ہوں۔ اگر تم باہر کے ہو، تھرڈ کلاس ملکوں میں سے کسی کے نہیں اور تم پہ سیاسی چھاپ نہیں ہے تو کہو گے بس یہی ایک مرنے کے لائق جگہ ہے خدا کی زمین پہ۔
وہاں سے مرسینری (mercenary[1]) بھرتی ہو کر بہت کمایا جا سکتا ہے۔ اتنا کہ ایک معرکے کے بعد چالیس برس اطمینان سے گھر رہ کر کھاؤ۔ اور معرکوں کی وہاں کبھی کمی نہیں ہوتی ہے۔ برابر چھوٹے ملکوں میں امریکا اپنی فوجیں بھیجتا رہتا ہے اور بھر بھر کے مرسینری بھی۔
میں انگریزی بولنے کی پریکٹس کر رہا ہوں، سمجھ میں نہ آئے پر دیکھتا امریکی فلمیں ہوں۔ لگتا ہے باقی دنیا کو خدا نے فرشتوں سے بنوایا تھا اور امریکا کو اپنے ہاتھ سے۔"
ملاقات کا وقت ختم ہونے تک ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ چلتے چلتے زندگی سے مطمئن آدمی نے تملیذ سے کہا: "Get the hell outa here"[2]
جو تحفے وہ لوگ مصری کو دے گئے ان میں فلمی رسالے، مقبول عام ناول اور بندوقوں توپوں کی کتابیں تھیں۔ مقصد برآری کی دعاؤں کی بھی ایک کتاب۔ اور رات کو پڑھ کر سونے کے لیے ناولٹ۔

اُن لوگوں کے جانے کے بعد تملیذ دیر تک اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھتا رہا۔ دماغ کی

---

۱ بھاڑے کا فوجی
۲ نکلو یہاں سے

لائن، دل کی لائن، عمر کی لائن۔' کیا واقعی میری عمر کی لائن لمبی ہے؟ اس میں سے کتنا حصہ ابھی طے نہیں ہوا ہے؟

'لڑکے تین ہیں، بیٹیاں دو۔ عمر کی لائن میں جزیرہ ہے، اور دماغ کی لائن چمٹا بنا کر ختم ہوتی ہے۔ بیچ کی انگلی کے نیچے سیدھ میں ستارہ ہے! خودکشی؟ اونو، میں خودکشی کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوا تھا۔'

لیکن دوسروں کی لکیروں میں جو معلومات کا خزانہ اُسے چھپا نظر آتا تھا آج اپنی لکیروں میں اس کی جگہ خاموشی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ حسینوں کے ہاتھ، ہاتھ میں لے کر ان کی قسمت کیا کہتی ہے بتانے کا وقت گزر چکا تھا۔ ان کے لیے بھی اور تلمیذ کے اپنے لیے بھی۔

دیر تک وہ اپنے کھلے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتا رہا: 'یہ ابا کا ہاتھ ہے جو وہ بن سکتے تھے نہیں بنے، یہ میرا ہاتھ ہے: جو میں بن سکتا تھا اس سے زیادہ بنا اور بگڑا۔ خواہ مخواہ ساری زندگی خود کو دانشمند سمجھتا رہا، تھا معمولی عقل کا آدمی جسے نہ اپنے جذبات پر قابو تھا نہ خواہشوں پر۔ کاش کچھ نہ بنا ہوتا تو آج کو کندھے ہلکے ہوتے، کتنا بوجھ ہے ان پر لوگوں کے دل دکھانے کا، غلط کام کرنے کا، جب اللہ سے ناتا توڑ لیا۔ اس وجہ سے نہیں کہ مذہب پر غور کیا تھا، بس اس وجہ سے کہ دوسرے توڑے بیٹھے تھے۔ تو اللہ نے بھی مجھ سے ناتا توڑ لیا کہ اب خود اپنی پیدا کی ہوئی مصیبتوں، پریشانیوں سے نمٹ۔

کل ان ہاتھوں سے جب رسی کھولی جائے گی اور یہ نیچے گر پڑیں گے تب یہ ریکھائیں پڑھنے کے لائق ہوں گی۔ شاید۔ نہیں، پڑھنے کے لائق نہیں رہیں گی، سب کا سفر ختم ہو چکا ہوگا، دماغ کی لائن کا، دل کا، عمر کا۔'

دوپہر کی پوریوں اور سیخ کے کبابوں کے بعد اُسے یقین تھا آج نیند اچھی آئے گی لیکن چکنا چور خوابوں نے دوپہر کو سونے دیا نہ رات کو۔ بہت سی ہتھیلیاں لڑکیوں اور خوبصورت عورتوں کی جو اپنی شادی سے مطمئن نہیں تھیں، نینی پور کا سنگھاڑوں کا تالاب، کُسُم کا سر لیکن

صرف پچھلا حصہ، انسان کا سب سے زیادہ چاہے جانے والا حصہ نہیں دکھایا گیا!

جب وہ جاگا صبح کا اجالا ہو چلا تھا۔ 'یہ سب اچھے خواب تھے پھر میں پریشان کیوں ہوں؟'
'کیونکہ مصری کے ساتھیوں کی باتیں سن کر تمہیں بھی آزادی کی پری بہکانے لگی تھی کہ تمہیں اپنے ساتھ اڑا کر لے جاؤں گی اور عمر کی لکیر کہتی ہے خاتمہ نزدیک ہے۔'
ایک بار پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنی زندگی کا جائزہ لینے کی بھول بھلیوں میں چلا گیا۔ کوشش کے باوجود نہ اپنی زندگی کے پرلطف سین دماغ میں آ رہے تھے نہ فلموں کے، نہ وہ ان دھنوں کو اپنے ذہن میں جگا سکا جو دفتر میں کام کرتے ہوئے سنائی دینے لگتی تھیں اور وہ قلم رکھ کر بیٹھ جاتا تھا۔
'میں نے صرف ایک غلطی کی ہے — تجھ سے خود کو دور رکھا، نہ رکھتا تو اس وقت پھانسی بارک کی اس کوٹھری میں ضمیر کا بچھو ڈنک نہ مار رہا ہوتا۔'
'نہ ہی قتل میں نے نہیں کیا، پر وہ زندگی تو میں نے ہی بنائی تھی جو وہاں تک انگلی پکڑے لے گئی جہاں پہنچ کر قتل کا الزام مجھ پر لگا اور میری پچھلی زندگی دیکھتے ہوئے اُسے سچ مان لیا گیا — ایک طرح کا circumstantial evidence — ازروئے جملہ واقعات زندگانی۔ اُن میں گُھپ جانے والا ایک اور واقعہ۔'
'وہاں سے اگر فرشتے پکڑ کر اللہ کے سامنے لے جائیں اور کہیں' پتہ نہیں یہ قاتل ہے یا نہیں' تو جانتا ہوں اس کا فیصلہ کیا ہوگا۔ میری تمام زندگی کی فائل اس کے سامنے ہوگی جسے شاید لوحِ محفوظ کہا جاتا ہے: 'یہ قتل اس نے نہ کیا ہو پر تھا یہ سزائے موت کے لائق۔'
'اپنی زندگی پر خود نظر ڈالتا ہوں، جج یا فقیہ بن کر، جیسی بڑی آپا کے جیٹھ کی تھی (اندر کی آواز نے کہا 'اپنے بیٹے کے قاتل')۔ ہر قدم پر گھمنڈ، غرہ، غیظ و غضب، بدمزاجی، نفسانی خواہش جو ساری عمر اس سانڈ کی طرح رہی (آواز نے کہا 'پن کٹے ہوئے بجار' کی طرح) جو چرنے کے لیے جاتی ہوئی گئیوں کے ساتھ کچھ دور چلتا ہے اور اپنی حرص سے اچانک گلے میں بھگدڑ مچا دیتا

ہے۔ راستہ چلتے ہوئے رک کر یہ موونگ سرکس دیکھنے لگتے ہیں۔ جنس کے بھوکے!

'حقیقت میں instincts (جبلتوں) کے جال میں پھنسا ہوا پر نوٹا پرندہ جسے اگر شکاری ترس کھا کر آزاد کردے تو بھی اڑ نہیں سکتا۔ اڑ کر کہاں جائے!

'میں نے زندگی بھر اُسے مذاق میں اڑایا جو ساری دنیا کے لیے، سیدھے سادے انسانوں کے لیے، قابلِ احترام ہے۔ انسان کا عقیدہ۔ کیا انسان تھا میں بھی!

('ابھی سے خود کے لیے' تھا' استعمال کر رہا ہے جیتے جی)

'شراب خانہ جانے کو پیر جی کے آستانے میں حاضر ہونا کہتا تھا۔ میرا یہ کہنا پیر جی بار رہے ہیں سننے والوں کو پسند تھا۔ کوئی کہتا 'ہمیں بھی بیعت کرانے کے لیے لے چلو'

'میری بڑائی یہ تھی کہ وہاں پی کر بھٹکتا نہیں تھا بلکہ جو بہک رہا ہو اُسے حقارت سے shallow (اتھلا) کہتا تھا۔ وہاں جو عزت مجھے ملتی تھی وہ تھی گنہگاروں کے شہر میں سب سے بڑے گنہگار کو سر پر بٹھانے کی سعادت۔ اس نے تمام شراب خانوں میں صدراول کم کرایا۔ پیتا بھٹکتا، توڑ پھوڑ، مار پٹائی کرتا پولس بلائی جاتی تو پینے کو انگام تھی۔ مگر ہر شراب خانے میں آپنے پدھارئیے کا سلوک ہوتا تھا، اور ہر شراب خانہ پیر جی کا آستانہ تھا۔ کبھی تو بابا نے بچپن میں ٹھکائی کی ہوتی! کی ہوتی تو آج کو دوسرا ہی آدمی ہوتا۔

('نظم اور منظور نہ بنتے؟')

'ندامت میرے لیے نئی نہیں ہے۔ وہ اوّل عمر کے گناہ! ان کے بعد جیسے ایک کانٹا سا دل میں گڑھ جاتا تھا۔ ضمیر تب زندہ تھا۔ نہ معلوم کب اس کی موت واقع ہوئی؟ انا للہ

'کیا شراب کے گھونٹ ماں کے سامنے حلق سے اتار سکتا تھا یا پی کر جا کے ان کے زانو پر سر رکھ کر چھوٹا بن کر لیٹ سکتا تھا جب وہ قرآن پڑھ رہی ہوتی تھیں یا تسبیح۔ اگر وہیں رہتا، اور وہ کچھ دن اور جی جاتیں، اتنی کہ بری خواہشات کو پیدا ہونے کی خطرناک عمر گزر جاتی۔ مگر مجھ سے پوچھ کر کب خدا نے ان کے پیٹ میں مجھے رکھا تھا اور کب مجھ سے پوچھ کر انہیں مجھ سے چھین لیا!

شراب، جوا، کوٹھا — توبہ کر لیتا تھا، کچھ دن اچھے گزرتے تھے، خوش رہتا تھا پھر ایک لمحے کی

غفلت میں وہ کمزوری اپنا وار کر جاتی تھی۔

مگر تب میرے اندر ایک خفیہ زندگی اور پل رہی تھی۔ اینگلو محمڈن اسکول کے دینیات کے سبق یاد رکھتا تھا — توبہ سے زیادہ تقویت کے، کہ آئندہ ترغیبات کے ان حملوں کو جھیل جاؤں، ان کے سامنے گھٹنے نہ ٹیک دوں۔

جو دوست گناہوں میں شریک تھے ان سے اپنی ندامت کے جذبات کو چھپاتا تھا کہ اگر وہ جان گئے تو ہنسی اڑائیں گے: 'ماں کی انگلی پکڑ کر چلنے والا بچہ۔ گنڈ بوائے۔' پھر مجھ سے کھنچنے لگیں گے۔

'تاہم میں ان میں سے نہیں ہوں جن کے لیے کہا جاتا ہے اُسے بری صحبت نے بگاڑا۔ پتہ نہیں کتنے میری صحبت سے بگڑے، اور مجھے بگاڑنے والی دنیا میرے چاروں طرف بسی تھی — دیواروں پر، سڑکوں پر، محلوں میں، اپنے گھر میں — نہیں میں آخرت میں بھی اپنے بگاڑنے کا الزام کسی پر نہیں دھروں گا۔ نہیں معلوم دانستہ یا نادانستہ میں نے کتنوں کو بگاڑا۔ دانستہ شاید ایک کو بھی نہیں۔ نادانستہ؟ وہ بھی نہیں کہہ سکتا۔

'جب میں آزاد تھا، یا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خود کو آزاد محسوس کرتا تھا میری زندگی کی پتوار مختلف قسم کی اچانک پیدا ہونے والی خواہشوں کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور ایک دھارے میں پڑ کر اگر کنارہ نظر بھی آنے لگتا تھا تو دوسری خواہش، پچھلی خواہش کی کمک میں اونچی اٹھنے والی موج کی طرح آ کر ناؤ کو ایک اور دھارے میں لے جاتی تھی۔ کبھی کنارہ آ جاتا تو وہاں جا کر مشکل سے آسمان کی طرف منھ کر کے ریت پر لیٹا ہوتا کہ ایک اور خواہش یا ضرورت کی پہاڑ جیسی لہر کنارے پر چڑھ کر مجھ سے ٹکراتی اور میں پھر خوشی سے مارے باندھے نہیں، خود کو دریا کے سپرد کر دیتا اور سمجھتا میں ان موجوں، اپنی پتوار اور دریا کا بادشاہ ہوں، حالانکہ میرے ہاتھوں میں صرف چپو ہوتے تھے اور نیا کا سفر تو پتوار جس کے ہاتھ میں ہو وہ متعین کرتا ہے۔ کیا مجھ جیسے ان گنت دوسرے اسی طرح زندگی بھر اپنے آپ سے ٹکراتے رہتے ہیں!

'بالآخر اس تنگ کوٹھری میں، جس کی دونوں دیواروں کو ہاتھ پھیلا کر چھو سکتا ہوں، اور چھت کو ہاتھ اٹھا کر، آ پہنچنے پر پہلی بار مجھ پر کھلا: کتنا بڑا احمق میں ساری زندگی رہا — نہ

۔ موجیں میرے کہنے میں تھیں، نہ چپو، نہ پتوار اور دریا تو کبھی ان میں سے کسی کا نہیں تھا جو خود کو اس کا بادشاہ سمجھتے ہیں۔'

یہاں آ کر تلمیذ نے نجانے کب بلا ارادہ اپنی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر لیا تھا:

'جب میں نہ ماں باپ کے لیے مسئلہ بنا تھا، نہ قریبی رشتے داروں، پڑوسیوں کے لیے۔ وہ میرا بچپن تھا۔ تب میں خود اپنے لیے بھی مسئلہ نہیں تھا۔ اس منزل تک میرا خیال ہے قدرت سب کے معاملے میں برابر کی فیاضی برتی ہے۔ عمر کی اس منزل تک ہٹلر مسولینی برابر ہوتے ہیں منٹگمری اور چرچل کے، فرعون برابر موسیٰ کے، ہابیل برابر قابیل کے۔

پھر جب بڑے عمر والوں نے چھپواں زندگی کے باغ بغیچے ایک کم عمر لڑکے کو۔ اس میں لڑکے لڑکی کی تخصیص کیا؟۔ دکھائے تو مجھے اس خوشی کا پتہ پڑا جو ماں باپ نے، اُن سب نے جن کا کہنا میں مانتا تھا۔ جو مجھ سے چھپا کر رکھی تھی۔ تب میرے ذہن نے کہا اگر بڑے ایسا کرتے ہیں اور چھپ کر کرتے ہیں، تو پھر اگر چھپ کر میں یہ کر رہا ہوں تو اس میں برا کیا ہے۔ اس لیے میں نے شکیلہ سے کہا تھا اپنا سینہ کھول کر دکھاؤ تو شاید اس دن میرے ذہن میں یہی ہوگا کہ اس کے دماغ میں بھی ایک پوشیدہ صندوق ہوگا اور جو میں کہہ رہا ہوں یہ بھی اُس صندوق میں جا کر مقفل ہو جائے گا جو میں نے ایک تندرست، بھرا ہوا سینہ چھو کر اپنے دماغ میں سب سے چھپا کر بنا لیا تھا۔ میرا خیال ہے سب کے دماغ میں ایسا صندوق، اچھے برے کی تمیز آتے ہی قدرت رکھ جاتی ہے۔ تب سے وقت کے ساتھ میں اس میں بہت کچھ بند کرتا گیا۔ صندوق تک بس میری رسائی تھی، نہ ماں باپ، نہ حکم چلانے والے قریب کے رشتے دار اس تک پہنچ رکھتے تھے، نہ ٹیچرز۔ دنیا سے یہ صندوق پوشیدہ رہتا ہے تاوقتیکہ اس کا مالک خود ہی اُسے کسی کے سامنے کھولے اور دکھائے ۔۔ جتنا وہ دکھانا چاہتا ہے۔'

ایک دن جب تلمیذ اس خیال کی یورش میں تھا جو اسے ذلیل اور نیچ ٹھہراتی تھی اور کوئی صورت اس سے بچ نکلنے کی نہیں تھی، خودکشی تک اس کی مدد کو نہیں آ سکتی تھی، دیواروں اور لوہے

کے دروازے سے سر کو ٹکراتا وہ دیکھ چکا تھا کئی دن کے لیے نیند اڑا سکتا تھا اس سے زیادہ اور کچھ نہیں، اچانک مسیحا بن کر وہ عورت اس کے ذہن میں ابھری جسے نجم کے پیدا ہونے کے بعد میمونہ نے گھر کے کام کے لیے لگا لیا تھا — نصیبا۔

محنتی عورت تھی۔ کام کر کے اپنا اور اپنی بوڑھی ماں کا پیٹ بھر رہی تھی۔ شوہر تھا لیکن نہ ہونے کے برابر۔ جواری، شرابی اور چھوٹی موٹی چوریاں کرنے کا عادی۔ پہلے کبھی مہینوں میں گھر آتا تھا لیکن جب سے نصیبا کام پر لگی تھی ہفتہ دس دن میں چکر مارنے لگا تھا۔ جو کھانا وہ گھر لے جاتی تھی اس سے پہلے کہ کوئی اور کھائے وہ اُسے حلق سے اتار چکا ہوتا تھا۔ پھر اُسے چائے چاہیے ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ رات کو کوٹھری میں سوتا تھا جب سخت سردی میں ساس باہر سو رہی ہوتی تھی - سکڑی سکڑائی، ایک پرانی رضائی میں۔

پھر، اگر مہینے کا آخری دن ہو یا پہلا تو پیسہ کا مطالبہ کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا، اور صحیح تھا، وہ ساری تنخواہ ایک دفعہ میں گھر نہیں لے جاتی تھی۔ اس پر وہ مار پیٹ پر بھی اتر آتا تھا اور کہتا تھا: تجھ سے شادی تیری شکل دیکھنے کے لیے نہیں کی ہے۔

رمضان کا پہلا ہفتہ تھا اور اتفاق سے مہینے کا بھی شروع جب نصیبا گھر میں داخل ہوئی وہ وہاں پہلے سے موجود تھا۔

چھوٹتے ہی بولا: "پیسے نکال۔"

نصیبا نے کہا "کھانا لائی ہوں وہ کھالو۔"

اس نے کھانا اس کے ہاتھ سے لے کر دور پھینکا اور گریبان پکڑ کر بولا "تنخواہ اور زکوٰۃ کے۔"

نصیبا نے اُسے دھکا دیتے ہوئے کہا: "کیسی زکوٰۃ۔ کس نے دی ہے۔"

"مجھے چلاتی ہے۔" اس نے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا "تنخواہ تجھے ملی ہے۔ زکوٰۃ تیری ماں کو۔ سرکار نے سب بیوہ، اپاہج عورتوں کو زکوٰۃ دی ہے۔"

بڑھیا جس کے بال برف جیسے سفید تھے اور کپڑے اتنے جھنا کہ کچھ بھی نہیں چھپا رہے تھے، تھر تھر کانپ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بیوی کی پیسے چھپانے کی جگہوں کو کھکھوڑ کر وہ یکبارگی

ساس پر چڑھ دوڑا اور اس کا کمر بند پکڑ کر بولا ''نکال پیسے، نہیں تو ابھی تیری ماں کو......''

بڑھیا نیم بیہوشی میں ایک طرف ڈھے گئی اور نصیبا چیخنے لگی ''ارے دوڑو اس شیطان نے میری ماں کو مار دیا۔''

تمیذ کو پورا واقعہ یاد آ گیا میمونہ کے الفاظ میں، جیسے اس کی سامنے ہوا ہو۔ اس نے دروازے کے لوہے کے سریوں کو چھوڑ کر جا کر بالٹی سے پانی پیا اور خود سے سوال کیا 'کیا تو اس جواری، پکے عیبی سے بھی گیا گزرا ہے جو اپنی بوڑھی ساس کو ریپ کرنے کی دھمکی دے رہا تھا؟'

سوتے وقت اس کے ذہن میں تھا 'شکر ہے، جیسا ہوں، اس سے برا بھی ہو سکتا تھا۔'

جیسا ہوں، لاؤ اس پر اپنے سدھار کی عمارت تیار کرنی شروع کرو۔ شاید پھانسی سے پہلے فٹ دو فٹ اونچی اُس کی دیواریں ہی نظر آنے لگیں۔'

(۶۳)

بارش کا زور ختم پر تھا۔ جب ہو رہی تھی تو تمید کے موڈ میں خوشی اور غم دونوں کے رنگ تھے۔ بارش کی جھار رومانی جذبات کو سالوں بعد بیدار کر رہی تھی۔ ان جھاؤں سے دوری اور اُن افراد کی غیر موجودگی اُسے مایوسی میں لیے جا رہی تھی۔

آخر کو بارش تھمی اور جوں ہی آسمان بادلوں سے صاف ہوا تمید کا دماغ بھی اسی کی طرح صاف ہو گیا۔ پورے سترہ دن، اگر کوئی حساب رکھ رہا ہوتا، اس کی یہ کیفیت رہی: چلتا پھرتا مردہ جسم۔

پھر ایک ہمراہ پھانسی گھر لے جایا گیا اور تمام کوتاہیاں، خرابیاں، خطائیں پرا باندھ کر آ گئیں، جیسے پرندے اُمڈ کر آئے ہوں اور انہوں نے اس کی مدافعت کی بچی کھچی فوج کو اپنی کنکریوں سے ختم کر دیا۔

اور اس اماوس کی رات کے خاتمے پر پہلی پھیلنے والی روشنی کی طرح یادوں نے خطاؤں کی جگہ میمونہ کو دے دی۔ اس کے ساتھ گزارا ہوا وقت - پہلی رات سے لے کر جب تک دونوں کی زندگی ایک رہی، دو حصوں میں تقسیم نہیں ہوئی تھی - آیا اور اپنے پیچھے دماغ اور جسم کو پرسکون چھوڑ گیا، کسے ہوئے مسلز اور پٹھے اپنی اکڑن کھو بیٹھے جس طرح دودھ مُنہے بچے کا سر نیند آتے ہی ماں کی بانہوں میں جھولنے لگتا ہے۔

گھنٹوں اس سرخوشی میں ڈوبے رہنے کے بعد وہ اس لائق تھا کہ اپنی زندگی اور موت کا جائزہ دور سے لے سکتا تھا: موت سے چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر ہوتے ہوئے بھی پھانسی گھر آج بھی اتنا ہی پرے ہے جتنا پہلے دن تھا۔ رہی باقی ماندہ زندگی؟ اس پر نہ معلوم کی علامت لگی ہے۔ درمیان کی ایک رات سے لے کر مزید چار چھ سال یا اس سے بھی زیادہ۔ جتنی دور پیدائش کے وقت تھی اب بھی اتنی ہی دور ہے۔

'اس احساس کے ہونے نے آج کہیں جا کر میرا موت کا خوف ختم کیا ہے۔ مجھے ایسا اطمینان سے پُرسکون ملا ہے جس کا بیان ممکن نہیں ہے۔ کہیں جانا وانا نہیں ہے۔ جیسے میں نے خود ہی سے بدی پر فتح پالی ہے۔ اپنی بدی پر، دنیا کی بدی پر نہیں، وہ کام کسی پیغمبر کا ہوگا میرا نہیں۔ میں معمولی آدمی ہوں اور معمولی آدمی نے اپنے حصّے کی بدی کو زیر کرلیا ہے۔ اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں دنیا چھوڑنے کا مجھے افسوس نہیں ہوگا۔

'اور دنیا ہے کیا؟ بھٹکتے پھرنے کی جگہ اور وقت۔ بچپن میں جو اعتقاد تھا نوجوانی کو پہنچتے پہنچتے آدھا یا پورا مٹ گیا۔ اب نہ پیڑ پر جن اور جنّی رہتے ہیں نہ بورڈنگ ہاؤس کے گیٹ میں سے اگر آدھی رات کو گزرنا پڑے بن سرا ملے گا جسے دیکھ کر وہاں کا بھنگی مر گیا تھا۔ نوجوانی میں جنہیں کھویا وہ مشکل ہی سے کبھی خواب میں آتے ہیں اور میں خود نہ مجنوں بنا نہ فرہاد۔

'پتہ نہیں کیا سچ تھا، کیا غلط، ہاں اتنا ضرور ہے جیتے رہنے کا مطلب ہے غلطیاں کیے جانا اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ غلطیاں درست نہیں کی جاسکتی ہیں پھر بھی اُن پر کڑھتے رہنا۔'

•

ساری زندگی اس کے سامنے تھی — سارے جرم، فرار، افیئرز (معاشقے) — جن میں سے زیادہ تر میں پاکیزہ جذبات نام کو نہیں تھے۔ محبت سے بھرے الفاظ بھی وقتی ہوتے تھے، حقیقت سے خالی جیسے تمام کوٹھے والیوں کے پاس جانے والوں کے منہ سے وقت آنے پر نکلنے لگتے ہیں: "پیاری، میں تیرا ہوں، تو ہے کتنی خوبصورت اس بازار میں کیوں آئی۔ تیری جگہ کسی بادشاہ کی خواب گاہ تھی۔" ایک بول اٹھی تھی "نہ آتی تو تیری ضرورت کیسے پوری ہوتی" اور

دھکا دے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ یہ واقعہ استاد ایمن نے سنایا تھا۔ قطعاً بے معنی الفاظ – جب انسان جانوروں کی طرح ہانپ رہا ہوتا ہے۔ اور چند منٹ بعد وہ لفظ منھ سے نکلنے بند ہو جاتے ہیں۔ تب وہاں سے رخصت ہوتے وقت دس منٹ پہلے کا عاشق ڈر رہا ہوتا ہے دودھ یا پھل کے پیسے نہ مانگ بیٹھے۔ جیسے ریستوران یا ہوٹل میں دی جانے والی ٹپ، یا حکومت کے کارندوں کو جب اُن سے کام آ اٹکا ہو۔

'اور شاید ایسے جھوٹے لحاتی رومان ہی فلمی کہانیاں لکھنے والوں اور ڈائریکٹر سے وہ فلم بنواتے ہیں جس میں لڑکی، میدان عمل میں ہے، ہر آدمی جو اس کے پاس آتا ہے اُسے خریدنا چاہتا ہے لیکن وہ نہ کسی کو اپنا انگ چھونے دیتی ہے نہ اپنے کوٹھے پر رات بھر ٹھہرنے۔ اور نہ ہی اس کی عزت کرنے والا ہیرو ان حدود سے آگے بڑھتا ہے کہ ایک دو ٹھمری سنے یا داد دے، اس کے کتھک کے پیر دیکھے اور شو ختم ہونے پر گھر لوٹ جائے۔

'میں اگر فلم سٹی کیپیٹل میں رہتا تو اس سے زیادہ کیا کرتا! اور یہ نے اچھا کیا جو واپس لوٹ گئی۔ ایکٹنگ کا شوق اُسے فلم سٹی کیپیٹل لایا تھا، جب وہ بغیر خود سے کسی قسم کا سمجھوتا کئے پورا ہوتا نظر نہیں آیا تو اپنے شہر واپس چلی گئی۔'

تلمیذ اپنی رقیق القلبی پر متعجب بھی تھا اور خوش بھی اور ہر لمحے اس کا عبادت کا جذبہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ آسمان یعنی چھت کی طرف سر اٹھا کر کہتا 'عبادت گزاری، محنت، درست کردہ کردار، نفس کشی، خدمت گزاری، تھوڑے میں گزارہ اور دنیا اور آخرت کا صحیح علم – تو مجھے ایک بار پھر زندگی دے کر تو دیکھ۔

'افسوس ہے مجھے الحمد کے آگے کچھ بھی یاد نہیں، کن الفاظ میں تجھ سے دعا مانگوں! ایک وقت تھا کتنی ہی دعائیں یاد تھیں – دینیات پڑھانے والے مولوی صاحب اور میری ماں کی روح اور مٹی پر تیری رحمت ہو – اب ایک بھی یاد نہیں۔ کیا یہ جیتے جی تیری طرف سے مجھے سزا ہے یا اعمال نے سب بھلا دیں؟'

پھر ایک دن اس نے سنتری ذاکر سے جو ڈھارس بندھاتا آیا تھا کہا "میں مسجد جانا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا "یہ کون سا مشکل کام ہے۔"

لگتا تھا تلمیذ نے نہیں اس نے مغفرت حاصل کر لی ہے۔ مسجد میں الٹی سیدھی دو رکعت نماز پڑھنے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر تلمیذ نے زیر لب کہنا شروع کیا: "میں نہیں جانتا تو کون ہے، نہ زندگی بھر جانا نہ اب جانتا ہوں مگر تجھ پر ایمان لاتا ہوں، جس طرح میرے ماں باپ اور ان کے ماں باپ ایمان لائے ہوں گے بنا کسی قسم کا شک کیے۔"

(اس کے سر کو جھٹکا لگا: 'انہوں نے کب خدا کو کھویا تھا جو ایمان لاتے۔')

'جس طرح میرے ماں باپ، دادا دادی، نانا نانی ایمان رکھتے ہوں گے۔ نفس کشی کروں گا: بھوک میں بھی اگر ایک روٹی سامنے آئی تو آدھی دروازے کی کنڈی بجانے والے کو دے دوں گا، لیکن اس کا موقع تو مجھے ایک بار پھر دے، اور سردی میں بھی اپنے تن کے زائد کپڑے کسی ننگے کو۔'

(اس کی اندر کی آواز نے کہا 'تو پیغمبر کی زندگی کی آرزو کر رہا ہے۔ تیری مٹی اس کے لیے پاک نہیں ہے۔ اور کیا ایک پیغمبر کی سی صعوبتیں برداشت کر سکے گا؟')

'ہاں۔'

('تو تو بسر کر۔ اور آخیر میں پھر وہی نتیجہ ہوگا، کہے گا: 'صحیح طرح سے بسر نہیں کر سکا۔' تو پھر کیا خدائی مانگ رہا ہے کہ خود کو معاف کر سکے؟')

'جانتا ہوں خدا نہ کچھ غلط کرتا ہے، نہ اُسے اس کی معافی خود سے مانگنی پڑتی ہے۔ دنیا کو وجود میں لانا کوئی خطا نہیں تھی۔ ٹھیک ہی کیا ہوگا جو زمین بنائی اور وہ سب کچھ جو اس پر ہے، اور جو اس پہ باہر سے نظر آتا ہے، اور بار بار غلطی کرنے والا انسان اور اس کے پچھتاوے۔

'میں زندگی کے شہر میں جہاں جاتا تھا، وہاں جاتے ہوئے کہیں غلط موڑ مڑ لیا۔ ایک بار غلط موڑ مڑ لیا پھر ادھر کے جو کام تھے خود بخود ہوتے گئے۔ جانتا ہوں سب سے پہلے اس معرکے میں جو کام آیا وہ ایمان تھا۔ پڑھنا جانتا تھا لیکن ایک بار بھی قرآن کو نہیں چھوا۔ اور یوں بھی بغیر سمجھے پڑھنے سے وہ کیا کام آتا۔ جب ناپاک نہیں ہوتا تھا تب بھی نہیں پڑھا — نہ نماز۔ پھر ساتھ بھی

ہوا تو کن کا جو خود خانہ خراب تھے۔ اور اب جتنا بھی خود کو پہچان پایا ہوں اس آخری گرفتاری کی دین ہے۔ پہلی گرفتاریوں نے تو اس کے سوا کچھ بھی نہیں دیا تھا کہ بس آزاد ہولوں تا کہ جنہوں نے پھنسایا تھا اُن سے بدلہ لے سکوں۔'

اس رات جب پہلو بدل بدل کر وہ تھک گیا تو اس نے ارادہ کیا' برا ہوں، زندگی بھر برا کیا۔ لاؤ آج گنوں اسکول کے زمانے کے پہلے جوئے سے لے کر میمونہ کے دنوں تک کل کتنی کمائی کی تھی جوئے سے۔' ایک نئی مسرت اُسے محسوس ہوئی۔ سارے ہتھکنڈے نیند پر فتح پانے کے ناکارہ ہو چکے تھے۔ آج ایک نیا ہتھکنڈا سوجھا تھا جو دماغ کو تھکا مارے گا اور نیند آجائے گی۔

جب صبح کی اذان کی آواز جیل بھر میں گونجی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

'یہ حربہ نیند کو بھگانے کے لیے پڑھائی کے دنوں میں آزمایا ہوتا۔ چائے سے تو بہتر ہی ہے۔'

اس دن تلمیذ کو پتہ بھی نہیں چلا، پچھلے دن کا اس کے اندر کا جاگا ہوا انسان نجانے کس وقت دوبارہ سونے چلا گیا۔ ذاکر جب رات کی ڈیوٹی پر آیا اور اس نے اشتیاق سے پوچھا

''کتنے وقت کی نماز پڑھی؟''

اس نے کہا ''ایک وقت کی بھی نہیں۔''

''کیوں؟''

''یونہی۔ آتی ہی نہیں ہے۔ ٹکریں مارنے سے فائدہ۔''

''نعوذ باللہ۔ سجدے کو ٹکر مارنا کہتے ہو! نہیں آتی ہے تو سیکھ لو۔'' ذاکر نے تلمیذ کے سیل سے دور جاتے ہوئے کہا۔

(۶۴)

ایک بار پھر اپنے ہارے ہوئے کیس میں دوبارہ جان ڈالنے کے لیے تمیذ کی وہ کوشش تھی جب اس نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو رضامند کیا کہ ''میری درخواست کسی طور اوپر تک پہنچوا دیجئے۔ مجھے یقین ہے اگر میری گزارش کو اہمیت دی گئی تو نہ صرف یہ کہ میری جاں بخشی ہوجائے گی آئندہ کو قانون کے ہاتھ میں ایک نیا سچ اور جھوٹ کو پرکھنے کا آلہ آجائے گا جس سے اندازہ لگایا جاسکے گا کوئی واقعی مجرم ہے یا نہیں۔''

یہ کہنا دشوار ہے تمیذ کی درخواست اوپر کہاں تک پہنچی، جیل کی چہاردیواری سے باہر نکلی بھی یا نہیں لیکن اتنا ضرور ہوا جواب میں اُسے بتایا گیا: تمہاری درخواست رحم کے زمرے میں آتی ہے اور رحم کو صدر مملکت ٹھکرا چکے ہیں۔ تاہم اگر تمہیں یقین ہے تم قانون اور تفتیش کی ان گنت ضخیم کتابوں کو غلط ثابت کر سکتے ہو تو دیکھنا یہ ہوگا کہیں تم خود کو دماغی مریض ثابت کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو۔ لیکن یہاں یہ بتانا ضروری ہے سوال موجودہ وقت میں تمہارے ذہنی مریض ہونے کا نہیں ہے، عدالت کی تمام کارروائی کے دوران تمہاری ذہنی حالت درست تھی۔

رحم اور ذہنی بیماری ثابت کرنے کے سوا تمہارا سچ اور جھوٹ پرکھنے کا آلہ اگر کچھ اور ہے تو اس کی تفصیل بتانا ضروری ہے۔ ایسا بارہا ہوا ہے کہ موت کی سزا مقرر کئے جانے کے بعد کتنے ہی سائنسدانوں، تحقیقی اور تخلیقی کام کرنے والوں نے deathrow (موت گھر) میں رہتے

ہوئے اپنا کام مکمل کیا اور سزائے موت کے بعد اس کا کریڈٹ انہیں دیا گیا۔

تلمیذ نے سپرنٹنڈنٹ کے آفس میں بیٹھ کر جو جامع تجویز ان کے نام جن سے یہ تجویز متعلق ہے، لکھی اُسے پڑھ کر جیل سپرنٹنڈنٹ ہکا بکا رہ گیا۔ کبھی وہ ان چند سطور کو پڑھتا تھا کبھی تلمیذ کے چہرے کو دیکھتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا تلمیذ کا دماغ جیل میں رہتے رہتے چل گیا ہے یا اس بہانے وہ جیل اور عدالت کے حکام کی انگریزی محاورے میں ٹانگ گھسیٹ رہا ہے؟

اس کے بعد وہ درخواست ان سب نے پڑھی جو دفتر میں آتے گئے۔ ان سب کا بھی وہی ردعمل ہوا۔ گھبراہٹ اور پسینے چھوٹنے کا۔

بالآخر سپرنٹنڈنٹ نے تلمیذ کو ایک سادہ کاغذ دیا: ''اس پر ٹائپ کر کے یہیں میری میز پر چھوڑ جاؤ۔'' اور پہرے دار سے جو اُسے وہاں پھانسی گھر سے لایا تھا کہا: ''درخواست مکمل کرلے تو مجرم تلمیذ کو اس کی کوٹھری میں لے جانا۔''

اپنی کوٹھری میں پہنچ کر تلمیذ کو ایک نئی فتح کا احساس ہورہا تھا جس سے وہ پہلے صرف اتنا آشنا تھا کہ جس جس پر یہ حربہ آزمایا وہ جز بز ہونے لگتا تھا۔ اس نے لکھا تھا:

میں سزائے موت کی توثیق ہوجانے کے بعد بھی اپنے خلاف عائد کردہ جرم کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں اور آخری سانس تک انکار کروں گا۔ پھانسی پانے کے بعد بھی چاہتا ہوں میری قبر پر ایک کتبہ لگا ہو جس پر لکھا ہو: مجھے جرم کی صداقت سے انکار ہے اور اس کے نیچے میرا نام۔

اب میری یہ تجویز ہے میری بات کی صداقت کا جائزہ تین ذرائع سے لیا جائے: ملک اور بیرون ملک سے جیوتشیوں کی ایک ٹیم بلائی جائے جو اپنے پیشے میں نامور ہوں۔ اس میں بڑا خرچہ عدلیہ کو برداشت کرنا ہوگا لیکن میری، کسی بھی، قیدی کی جان کی قیمت اس سے زیادہ ہے۔

نمبر ایک: Palmist (دست شناس) کیونکہ ہاتھ کی ریکھائیں جھوٹ نہیں بولتی ہیں۔

نمبر دو: Astrologer (نجومی) ستارے بھی جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔

نمبر تین: Numerologist۔ اعداد کے اسرار و رموز کے ماہر۔

نہ میرے ہاتھ میں قتل کی ریکھا ہے، نہ خودکشی کی۔ میں فطرتاً آرٹسٹ کا مزاج رکھتا ہوں اور آرٹ ظلم کو برداشت نہیں کرتا ہے۔ نہ کسی کے خلاف نہ اپنے۔
میں جس ستارے میں پیدا ہوا ہوں ویسے شخص سمندر یا دریا کے کنارے گھر بنا کر رہنا چاہتے ہیں، سنگیت اور نرت کو جی جان سے چاہتے ہیں۔

میری جنم پتری میں نہ کہیں قتل ملے گا، نہ عورت پر اتم انیائے۔

آخری بات: میں یہ نہیں کہتا ہوں جو نجومی، رمال، دست شناس کی عدالت کا فیصلہ ہو اس سے مجھے آگاہ کیا جائے/ میری موت کی سزا موقوف ہو۔
بس اتنا کہ اس فیصلے کا کتبہ بھی میری قبر پر نصب کر دیا جائے۔ مجھے اس فیصلے کے زندگی میں دیکھنے کی تمنا نہیں ہے کیونکہ میں اس فیصلے پر خود پہنچ چکا ہوں۔
نیچے خود اس کے دستخط تھے۔

چند دن تمکین کی دماغی حالت بڑی ولولہ انگیزی کی رہی: اب عدالت کی ایک ٹیم جیل میں اس سے ملاقات کرنے آئے گی۔ اب ایک فرمان آئے گا جس میں اطلاع ہوگی: 'دست شناسوں، رمالوں، نجومیوں کی ٹیم بلائی گئی ہے اور تمہیں اُن سے ملنے کی اجازت ہوگی۔' اب ہفتہ گزر جانے کے بعد اس نے پھر جیل سپرنٹنڈنٹ سے ملنے کی درخواست کی۔ جو سپاہی اس کا پیغام لے کر گیا تھا وہ ایک کاغذ اور پنسل لیے لوٹا کہ ''جو کہنا ہو اس پر لکھ دو۔''

تمکین نے لکھا: ''میری درخواست کا آخر کیا بنا؟ میری بات میں کتنی سچائی ہے اسے آپ خود اپنے آپ پر آزما کر دیکھ لیں۔''

اگلی بار جب اُسے جیلر کی عدالت میں بلایا گیا وہاں چار اور باوردی اشخاص بیٹھے تھے۔ جیلر نے اُس کا تعارف اُن سے کرایا: IG Prisons, DIG Prisons, DS Police,SP

تمیز سے بیٹھنے کے لیے کہا گیا اور وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا۔

اُن میں جو سب سے بڑا افسر تھا اس نے انگریزی میں کہا: ''آپ کا تعلق باہر کی دنیا سے کتنا ہے؟''

تمیز نے کہا ''بالکل نہیں۔''

''پریس سے؟''

''پریس سے!'' تمیز نے چونک کر کہا۔ ''ذرہ برابر بھی نہیں۔''

''کسی سیاسی پارٹی سے؟''

ایک بار پھر تمیز کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ''بالکل نہیں۔'' پھر خود کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے اس نے کہا: ''نہ ہے، نہ کبھی تھا، نہ ہو سکتا ہے — میرا مطلب ہے ناگے جانے کے بعد۔''

سب ہنس پڑے۔

انسپکٹر جنرل پرزنس نے کہا ''اگر آپ کی درخواست کا یہ مختصر جواب دیا جائے کہ قانون کی نظروں میں نہ پامسٹری کی اہمیت ہے، نہ نم، نم (تمیز نے شوشہ دیا — ''نمرولوجی'') نمرولوجی کی، نہ ایسٹ، ایسٹ (''ایسٹرولوجی'') ایسٹرولوجی کی تو آپ کیا کہیں گے؟''

تمیز کچھ دیر سوچتا رہا۔ لگتا تھا اپنی انگلیوں سے سوئٹر بن رہا ہے۔ پھر اس نے کہا ''حلف اٹھانے کی؟''

''ہے'' سپرنٹنڈنٹ پولیس نے کہا۔

تمیز کہنے کو ہوا یہاں جیل کے اسٹاف ہی میں سے میں ایک کو جانتا ہوں جو روتا ہے کہ اس سے قرآن پر جھوٹا حلف اٹھوایا جاتا ہے مگر اس نے کہا ''اس کے باوجود کہ آپ جانتے ہیں اس طرح ملک بھر کی عدالتوں میں روزانہ کتنی ہی بار قرآن کی بے عزتی کرائی جاتی ہے۔ اور جھوٹے حلف کو تسلیم کرلیا جاتا ہے۔''

''اس کا تمہارے مقدمے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے طیش میں آ کر اردو میں کہا۔

انسپکٹر جنرل پرزنس نے بغیر مشتعل ہوئے کہا ''وہ علیحدہ معاملہ ہے۔ آپ نے حلفیہ بیان دیا تھا؟''

''میں نے حلف اٹھانے سے انکار کر دیا تھا کہ لاواقف ہوں agnostic''

جیلر نے سپاہی سے کہا ''مجرم تمیز کو واپس اس کی کوٹھری میں پہنچا دو۔''

تمیز نے بیٹھے بیٹھے کہا: ''حلف نہ اٹھا کر میں نے خود کو دھوکا نہیں دیا تھا یہ تو آپ مانیں گے۔''

آئی جی پرزنس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مجھے ان علوم کی روشنی میں جانچنے کا موقع تو آپ نے دیا ہوتا۔ حلف اٹھوانے والا لامذہب ہو، اس کا جو بھی عقیدہ ہو بیان دینے والے سے یہ نہیں کہتا ہے میں تیرے مذہب، عقیدے کو نہیں مانتا ہوں۔ تیرا مذہب کچھ اور ہے میرا کچھ اور، میں تجھے حلف اٹھانے کی اجازت نہیں دے سکتا ہوں۔''

جیلر نے سپاہی پر کڑی نظر ڈالی۔ اس نے تمیز کے بازو کو پکڑ کر کہا ''اٹھو۔''

چلنے سے پہلے تمیز نے کہا ''میں اس دنیا کو مانتا ہوں اس پر مجھے پرکھا جاتا۔ میں کون سی جاں بخشی کی عنایت مانگ رہا ہوں!''

(۶۵)

پھانسی بارک کے بنانے والوں کے دماغ میں یہ یقیناً نہیں تھا کہ کبھی انہیں بھی اس میں دن گزارنے پڑ سکتے ہیں۔ ایک لائن میں بنی ہوئی کال کوٹھریاں جن کے آگے برآمدہ تک نہیں تھا، جو اگر ہوتا تو بڑی گرمی میں دھوپ کو اندر آ کر اُن جسموں کو جلانے سے کچھ تو روکتا جنہیں ابھی کچھ وقت اور اس زندگی کا ساتھ دینا تھا جو ان میں بسی ہوئی تھی۔ بارش بھی ہوا کے جھونکے کے ساتھ پچھلی دیوار تک کی خبر لیتی تھی۔ کبھی کبھی بادل کی دہلا دینے والی گرج کے ساتھ بجلی کوٹھریوں کے اندر تک اپنا بھیانک روپ دکھا جاتی تھی۔ مشہور تھا ایک دفعہ جن تین برابر برابر بنی ہوئی کوٹھریوں سے بجلی گزری تھی اُن کے مقیم وہیں جل کر رہ گئے تھے اور جو پیڑ ان کوٹھریوں کے سامنے تھا وہ بھی جل کر ٹنڈ منڈ ہو گیا تھا۔

کوٹھریوں کا فرش جہاں ختم ہوتا تھا وہاں تھوڑی نیچائی پر کچی زمین تھی جس پر کیلیں لگے ہوئے بوٹوں کے دن رات چلنے سے گھاس کا جمنا محال تھا۔ ہاں بارش کے بعد پانی کچھ دن کھڑا ہو کر کیچڑ کے گڑھے ضرور بنا دیتا تھا، جس میں پہلے مچھر پیدا ہوتے تھے، پھر ان کے ساتھ مل کر دور و نزدیک کے مینڈک اپنا اور کیسرا چھیڑتے تھے جس پر بعض کوٹھریوں سے گالیوں کی آوازیں آتی تھیں لیکن دونوں میں سے کوئی اپنی آواز دھیمی نہیں کرتا تھا۔ جب دو ایک دن میں پانی سوکھنے لگتا تو کیچڑ سے سڑتے ہوئے جانوروں کی سی بو آنے لگتی تھی۔

جب سے یہ بیرکس بنی تھیں دیواروں اور چھتوں کو شاید دوبارہ چونا یا رنگ دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ جس کوٹھری میں تلمیذ تھا اس کی پچھلی دیوار پر ایک جگہ اُس پانچ چھ سال کی لڑکی کی تصویر بنی تھی جس کے نیچے لکھا تھا 'لڈو'۔

جا بجا اشعار تھے، کچھ اتنے ہی بے ربط اور وزن سے خارج جتنے ٹرکوں اور بسوں پر لکھے ہوئے اشعار — لیکن صاف اظہار خیال سے خالی کوئی نہ تھا، نہ ٹوٹتی ہوئی آس کے جذبے سے۔

ہر کوٹھری میں ۷۸۶ لکھا تھا اور اس کے نیچے کی دیوار پتہ دیتی تھی اس پر گال یا ماتھے رگڑے گئے ہیں۔ اس کوٹھری میں صلیب اور اوم کے نشان مٹ سے گئے تھے اور بعد کے مکینوں نے انہیں اجالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ تلمیذ کے ذہن میں اُن بھدی تصویروں کا نہ ہونا نہیں آیا جو ہوٹلوں، دفاتر، تعلیمی اداروں کے ٹوئلیٹس میں نظر آتی ہیں — مسخ جنسی جذبات کا کوئلے اور چاک میں اظہار اس یقین کے ساتھ کہ انہیں دوسرے دیکھیں گے کچھ ہنسیں گے، کچھ شرمائیں گے اور کچھ طیش میں بھی آ جائیں گے۔

موت کی کوٹھریوں کی یہ لکیریں، یہ نقش خود اپنی تسکین کے لیے تھے جس نے بھی بنائے تھے اور ان کے بنانے والے کے ذہن میں شاید یہ بھی تھا میں تو خیر چلا جاؤں گا یہ میرے بعد آنے والے کو تسلی دیں گے اور اُسے لو لگانے کے لیے کہیں گے کیونکہ اس کے سوا اور کچھ ممکن بھی تو نہیں ہے۔

پانی کی مچھار نے تلمیذ کو جگا دیا۔ موسم کی پہلی بارش!

پھنّن بیرکس بنانے والوں کو بہن اور بیٹی کی گالیاں دے رہا تھا۔ اس کے منھ سے الفاظ ہمیشہ ایسے نکلتے تھے جیسے تیزاب کی پھوار — جس پر بھی پڑے۔

تلمیذ نے اونچی آواز میں کہا "استاد کسے گالی دے رہے ہو؟"

پھنّن نے کہا "جیل بنانے والوں کو۔ اُن میں سے اگر ایک بھی مل جائے تو اپنا رامپوری چاقو اس کے سینے میں اتار دوں۔"

''رامپوری چاقو ہے تمہارے پاس؟''

''ہے۔ اگر چھوٹ جاؤں تو گرفتار کرانے والے، شہادت دینے والوں اور موت کی سزا سنانے والے سب کو موت کے سفر پر اپنے سے آگے روانہ کردوں کہ جاؤ اور میرا انتظار کرو۔''

تمیز نے کہا ''یہی ارادہ میرا بھی تھا۔''

''اب نہیں ہے؟''

''مجھ سے پہلے مر گیا۔''

''مر گیا نہیں سو گیا ہے، جگا لو اُسے، بے بدلہ لیے دنیا سے چلے جانا مرد کو شوبھا نہیں دیتا ہے۔''

کئی کوٹھریوں سے ہنسنے کی آوازیں آئیں۔

وہ پہرے کے سپاہی کو ''سُن او بیٹی.... '' کہہ کر آواز دیتا تھا۔ لگتا تھا بارش نے اس کے اندر چھپے ہوئے شاعر کو جگا دیا ہے۔ بولا ''لو سنو، تازہ شاعری کی ہے۔''

تمیز نے کہا ''ارشاد۔''

دوسری طرف کی کوٹھری والے نے کہا ''ارشاد کو پھانسی پائے تین سال ہو گئے۔ اس بے چارے کو کیوں بلاتے ہو۔ دنیا سے شہید ہو کے گیا۔''

پھنّن نے شعر پڑھنے شروع کیے۔ اُسے اس میں مطلق دلچسپی نہیں تھی کل کسے پھانسی ہوئی تھی اور کل کسے ہونی ہے۔

جہاں ملے اُبالے ریٹھے کی چائے پینے کو اُسے کہتے ہیں ہر میجسٹی کا پرزن[1]
جہاں ملے چھیدوں بھری جلی روٹی
دونوں وقت، کھانے کو اسے کہتے ہیں ہر میجسٹی کا پرزن
موتیلا پانی، جس کی تلی میں ہوں
دو ایک دال کے دانے، مٹی بھر کنکر
جو بھیجا جاتا ہے ہمارا دل جلانے کو اسے کہتے ہیں ہر میجسٹی کا پرزن

---

[1] ملکہ عالیہ کا زنداں

آوازیں آئیں: واہ واہ استاد چھنن تم تو مشاعرہ لوٹ لیتے ہو گے۔

ایک نے کہا: ''وہ سناؤ استاد سپر نٹنڈنٹ کی لگائی والا۔''

ریٹنے کی چائے میں دودھ سپرڈنٹ کی لگائی کا تاتھئی تاتھئی تا

(لگتا تھا خصمک لگا رہا ہے)

سوچتے ہیں ہم، ہمارا کیا ہوا پھر وہ سسروا تاتھئی تاتھئی تا

کان لاؤ پاس تک دھیان سے سنو

ہے وہ لگائی اس کی بالضرور

پر یہ نہیں ہے اُس کا خصم وا تاتھئی تاتھئی تا

ہر طرف سے دیر تک واہ واہ ہوتی رہی۔ ''استاد لگتا ہے عربی کا شعر ہے۔ بالضرور کا جواب نہیں۔'' تلمیذ نے کہا۔

چند دن بعد جب وہ آخری سفر پر لے جایا جا رہا تھا لگتا تھا اس کے ہونٹ سل گئے ہیں۔ اُس دن دوپہر کا کھانا کسی سے نہیں کھایا گیا۔ تلمیذ نے چھیدوں والی جلی روٹی جس پہ ایک جگہ کونے کا ٹکڑا ابھی چپکا رہ گیا تھا ٹکڑے ٹکڑے کر کے باہر یارڈ میں پھینک دی اور کوؤں کی اُن پر لینڈنگ اور ٹیک آوف، جیسا کہ وہ کہا کرتا تھا، دیکھتا رہا۔

باوجود کوشش کے اس دن نہ وہ تُسم کو ذہن میں لا سکا، نہ تسنیم کو۔

شام تک اپنے آپ سے نفرت اتنی بڑھ گئی کہ اگر بس میں ہوتا تو خود کو ختم کر دیتا۔ اور جب کنپٹیوں اور ماتھے کی کھال میں کھنچاؤ حد سے بڑھ گیا اور دماغ پھٹنے لگا تو اس نے خود بخود بولنا شروع کر دیا:

''بھاگے تھے؟ گھر والوں سے تنگ آ کے؟ فلم ڈم کے کیپٹل جا کر ہیرو بننے کے لیے؟ راجدھانی میں دل نہیں لگتا تھا؟''

''وہاں تھا کیا دل لگانے کے لیے — داڑھی اور بھوک بھگانے کے لیے ایک پیسہ روز۔''

''نینی پور میں بھی نہیں لگتا تھا۔''

''وہاں لگتا تھا، وہاں سے بھگایا گیا تھا۔''

پڑوسی کی آواز آئی ''جاگ رہے ہو یا سو گئے؟ جاگتے رہو، جتنا ہو سکے جاگتے رہو، بعد میں صرف سونا ہی سونا ہے۔''

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ پھر تملیذ گانے لگا: ''پیڑ پیڑ کیا کرتا تیری پیڑ نہ جانے کوئی۔''

''تم مرنے کے بعد کی زندگی کے دھوکے میں تو نہیں ہو؟ کچھ نہیں ہے۔ اس لیے اب جاگ لو۔''

تملیذ نے کہا ''میرا کیس تم سے مختلف ہے۔ میں کہتا ہوں: الٰہی ایک بار پھر سے مجھے، نئے سرے سے، نئے ڈھب سے زندگی بسر کرنے کا موقع دے۔ اس لمبی سڑک پر چل کر مجھے پتہ لگ گیا ہے کہاں کہاں پانی کے نیچے چھپے ہوئے گڑھے ہیں، نرم پتا ہے جس میں پہیہ پھنس جاتا ہے، دلدل ہے، بس ایک بار اور موقع دے دے پھر میں چل کر دکھاؤں۔ قسم لے لے جو کہیں قدم لڑکھڑائیں، کپڑوں پہ چھینٹیں پڑیں، کیچڑ میں پھنسوں۔''

''بولتے رہو، تمہاری تو یہ تلا کسی کام کی نہیں ہے۔''

تملیذ چپ ہو رہا۔ اُسے یقین تھا ایک دن جب یہ پھانسی کے لیے لے جایا جا رہا ہوگا تو سب پچھلوں کی طرح اس کا سر بھی گریبان میں لٹکا ہوگا، ٹھوڑی سینے کو چھو رہی ہوگی۔

اپنے بارے میں اُسے تھوڑی امید بندھی کہ 'شاید خدا، اب جب کہ میں نے اُسے مان لیا ہے، ایک موقع اور زندگی بسر کرنے کا دے دے۔' پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا: 'لیکن بس تھوڑی دیر کے لیے۔

' زیادہ زندگی مجھ سے نہیں جی جائے گی۔ اُن سب تکلیفوں، دکھوں، نراشاؤں سے دوبارہ نہیں گزرنا چاہتا ہوں جو میرے برے کرموں کا نتیجہ نہیں تھیں اور پھر بھی مجھے بھوگنی پڑیں۔ اور انہوں نے مجھ سے سارے برے کام کروائے۔'

(۶۶)

پھانسی پارک میں سکتے سے نکل آنے کے بعد سے جو جنگ تمکید کے دماغ اور ضمیر میں چھڑی تھی آہستہ آہستہ سرد پڑتی جا رہی تھی۔ اتنے دنوں میں اس کا ضمیر اپنے دو دشمنوں کو ڈھونڈ پایا تھا: بے انداز غصہ اور وہ خواہشیں جن کا مطالبہ فوراً پورا کئے جانے کا ہوتا ہے۔ یہ ترتیب بار بار بگڑی تھی۔ 'پہلے ناقابلِ تسخیر خواہشیں پیدا ہوتی ہیں' وہ کہتا' اور جب انہیں فوراً پورا نہ کیا جائے غصہ دماغ کو اپنے بس میں کر لیتا ہے، جو دوسروں پر بھی نکلتا ہے اور دوسروں سے زیادہ خود پر۔'

ان خواہشوں کا دوسرا نام ضرورتیں تھا اور ان میں کیا نہیں چھپا تھا! معمولی، زیادہ تنگ نہ کرنے والی خواہشوں سے لے کر، ان تک جو مہلک ہوتی تھیں۔ وہی جھوٹ بلواتی تھیں۔ بیوی، بچوں، نوکروں یعنی اپنے سے کمزوروں سے کہنا منواتی تھیں۔ یونیورسٹی کی ڈگری، فلم میں ہیرو کا رول، فوج میں کپتان کا عہدہ — یہ سب کیا تھا؟ بارعب ہونے کی خواہش جو غصے کا پہناوا ہے۔ جس کے پاس رعب نہ ہو وہ غصہ کیا کرے گا! اور اس نے کیا دیا؟ ایک مصنوعی زندگی: میں یہ کچھ ہوں، میرا ادب کرو، مجھ سے ڈرو۔ اور اس مصنوعی زندگی کے مطالبات چاہتے تھے انہیں فوراً پورا کیا جائے۔ مجھے بہترین کپڑے چاہیے ہوتے تھے، ویسے ہی جوتے، بہترین علاقے میں مکان، اچھی سے اچھی شراب، قیمتی سگریٹ (سگار اور پائپ سے میری کبھی نہیں بنی)، دوستوں کے ساتھ اچھے سے اچھے شراب خانوں میں شام گزارنا، پوش ریستورانوں میں بگڑی

ہوئی عورتوں کی صحبت میں ڈنر۔ اپنے لیے میں فیاض، مہمان نواز کے القاب سننا چاہتا تھا۔

('خرچے کی تمہیں پرواہ نہیں تھی')

بحث کرتے ہوئے وہ دونوں رول ساتھ ساتھ ادا کرتا جاتا تھا۔

('ہوائے نفس تمہاری کمزوری تھی اُسے تم شادی شدہ زندگی تک ملتوی نہیں کر سکتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا رت کو دوستوں اور لڑکیوں کو ریستوراں میں زبردست کھانا کھلانے کے بعد اگلی صبح تمہارے پاس ناشتے کے پیسے نہیں ہوتے تھے')

'ایسا کبھی نہیں ہوا۔ پورا پرس خالی کر کے نہیں اٹھتا تھا'

('اس کے بعد تمہارے پاس ایک ہی راستہ ہوتا تھا— کسی طرح بھی روپیہ پیدا کرنے پر آمادگی، وہ جوا ہو یا کوئی بھی خفیہ کام۔')

'جوے نے اسکول کے دنوں میں ساتھ دیا تھا۔ وہ ہمیشہ برے وقت میں آڑے آیا'

('کبھی یہ نہیں ہوا کہ سوچتے ان ضرورتوں کو اس وقت کے لیے ملتوی کرتا ہوں جب نیا 'ایل سی' کھلنے کے بعد مال آئے گا، یا یہ سوچتے تب تک کسی بزنس فرم میں معمولی سی نوکری کر لیتا ہوں۔ دوسو روپے، دو گھنٹے کے لیے کیا برے تھے۔ صرف شام کو جا کر اکاؤنٹ رجسٹر کو مین ٹین کرتا ہوتا۔ وہ کاروباری کمپنی والا دوست بار ہا کہہ چکا تھا: ''تلمیح بھائی اتنا کام تمہارے لیے میں برابر نکال لوں گا جرورت ہو یا نہیں ہو۔ بلکہ کیا کرتا یار! ہمارے میں اس کو برا نہیں سمجھتے ہیں۔ تیرے یار کا بڑا کاروبار ہے پھر بھی بیوی پاپڑ بیل کر دس میں روج بنا لیتی ہے۔ کتنی بار کہہ چکا ہوں اسٹوپ کر رات کو کراہتی ہے: کندھے میں درد ہے، انگلیوں میں درد ہے۔ میں کہتا ہوں تیرے کو پیسے کی کیا جرورت ہے پر نہیں مانتی۔ جس کا پچاس ہزار مہینے کا کاروبار ہے ہمارے میں وہ بھی اپنے لڑکے کو دوسرے کی دکان پہ کام کے لیے لگوا دیتا ہے۔ آ جانا۔ تیرے لیے میرے پاس ہمیشہ کام ہے آخر کو تاش کا ساتھی ہے۔'')

'وہ خود میرے ساتھ پیتا تھا اور پی کر جا کر باپ کو سنبھالتا تھا جو دھاکڑ پیے والا تھا اور نشے کی حالت ہی میں مرا۔ لیکن اس کی اسپیئر پارٹس کی دکان میں کام کر کے مجھے خود کو جھکانا پڑتا۔'

'زندگی بے معنی ہے یا یہ کہ میری زندگی بے معنی رہی۔ یا اللہ اگر جلانے میں اتنے چکر تھے تو کیوں اس مٹی میں جان ڈالی، جو آج میری بے کل اور کتنوں کی ہوگی۔' وہ اپنے چہرے، سر اور جسم پر ہاتھ پھیر کر کہتا: 'اس میں، اس میں اور اس میں۔' 'کاش دو زندگیاں دی ہوتیں — ایک اپنی مرضی ... سے بسر کرنے کی، دوسری اس سے پیدا ہونے والے تجربے کے ساتھ بسر کرنے کی۔ میں اس زندگی میں جان گیا ہوں وہ سب کیا ہے جس نے آخر میں مجھے تکلیف پہنچائی اور اگلی کے لیے سمجھ گیا ہوں کیسے بسر کرنی ہے۔'

اس نے خیالوں میں اُس مستقبل کی زندگی میں ایسے سین ڈھونڈ نکالے جن کے بعد تکلیف نہیں ہوگی اور ان کو سیکوئنس میں ترتیب دینے کی کوشش کی جیسی جیل سے پہلے کی زندگی میں انتقام اور لذت کے لیے کرتا آیا تھا۔ تب سین اور سیکوئنس کے سیکوئنس ذہن میں ابھر کر آتے تھے — جنھوں نے کچھ بگاڑا ہو انھیں سزا دینے کے اور جو اس کی طرف جھک رہی ہوتی تھیں اُن سے لذت کوشی کے۔ لیکن پھانسی بارک کی کال کوٹھری میں بیٹھ کر تصور نے زیادہ دور تک ساتھ نہیں دیا۔ جب زندگی کا امکان ہی نہیں تھا تو اُسے دوبارہ بسر کرنے کا تصور کیا خاک کام کرتا۔ اور اس میں شک تھا دوسری زندگی ملی بھی تو کیا وہ اسی دنیا میں لائے گی۔

اس کا ہیجان بڑھتا رہا، جس سے وہ نکلنا چاہ رہا تھا۔ اور یہ کیفیت کئی دن سے تھی۔ 'اگر اپنے گناہوں کو درست نہ سہی، بجا سمجھ کر اُن سے نکل جاتا' بعد میں اُسے خیال آتا تھا 'تو ویسے کا ویسا ہی رہتا جیسا ہمیشہ سے تھا۔ لیکن اس میں جیت ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر دماغ کی ہوتی، ضمیر شکست کھا کر اس وقت تو سو رہتا، اگلے دن جاگتا اور مجھے پھر بلا کر رکھ دیتا۔'

'اس رات میں نے ہیجان کو بڑھنے دیا، دیکھوں کہاں تک مجھے لے جاتا ہے۔ جب تھک گیا تو اس بالٹی کے پانی سے وضو کیا جو ہر کام کے لیے تھا۔ پھر نینی پور کے اسکول کے دنوں کی طرح جیسا ہمیں سکھایا گیا تھا کھڑے ہو کر پانی لوہے کے گلاس سے حلق میں انڈیلا — جو حکم بدھنے میں بچے ہوئے پانی کے لیے ہوتا تھا، الحمد پڑھی اور رات بھر دعائیں مانگتا رہا۔ معافی کی اور سکون پانے کی۔'

اگلے دن وہ بہت دیر سے سو کر اٹھا۔ گرل کے باہر کھانے کی تھالی زمین پر رکھی تھی۔ روٹی سے دال کے پیالے کو ڈھک دیا گیا تھا اور برابر میں صبح کی چائے کی پیالی بھی رکھی تھی۔ دونوں پر دھوپ پڑ رہی تھی۔ اُسے ہنسانے کے لیے دماغ نے کہا 'کھانا اور چائے دونوں گرم ہوں گے۔'

ایک گوریا پیالی کی نگر پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ تلمیذ نے کہا "ارے تمھیں کہاں سے چائے کی لت پڑ گئی!" اور دیر تک اس کے چونچ بھر چائے لے کر، سر کو اوپر اٹھانے اور گلے سے نیچے اتارنے کو دیکھتا رہا۔

"مت پیو چڑیا، میری ننھی دوست۔ دل دھڑک دھڑک کر تمہارے سینے سے باہر نکل آئے گا۔ مجھے دیکھو۔ مجھ سے سبق لو۔"

پھر اس نے دودھ مونہے بچے کی طرح اُسے ہتھیلی پر انگلیوں کے کھولنے بند ہونے کے ساتھ کہا "آ چڑیا، آ" کئی بار لیکن اس پر جو مسرت اُسے ملی اس میں حسرت شامل تھی۔

چڑیا کے اڑ جانے کے بعد اس نے منھ، ہاتھ اور پیر دھوئے اور منتظر رہا کب ذاکر نظر آتا ہے۔ اور جب وہ نظر آیا اُسے اشارے سے پاس بلا کر کہا "مجھے نماز پڑھا دو۔"

"اس وقت! یہ تو کوئی وقت نہیں ہے۔"

"نہیں! میں نے تو سنا ہے ہر وقت خدا کی عبادت کا وقت ہوتا ہے۔ بس تم کہے جاؤ، میں کرتا جاؤں گا اور آخیر میں دعا بھی پڑھوں گا ــــ وہ ربنا والی۔"

اس شام جب ذاکر ڈیوٹی پر آیا تلمیذ نے کہا "قرآن شریف کی شروعات کراؤ۔ مجھے پڑھنا آتا ہے۔ بس غلط پڑھنے کا ڈر نکال دو۔ اُس سے میں بچپن سے ڈرتا آیا ہوں، پھر خود پڑھنے لگوں گا۔"

''کا ہے سے ڈر؟''

''سب مولوی کہتے تھے جہاں ٹھیرنا چاہیے وہاں نہ ٹھیرنے کا عذاب اور جہاں نہیں ٹھیرنا تھا وہاں رک کر سانس لینے کا عذاب۔''

اس رات اور اگلی رات وہ سجدے میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رویا' میں نے تجھے بھلا دیا تھا۔ نہیں ساری زندگی کوشش میں رہا بھول جاؤں، لیکن اب جان گیا ہوں تو ہے اور تیرے اختیار میں زندگی کا وہ حصّہ بھی ہے جسے ہم بھلا دیتے ہیں اور جب چاہے تو اُسے واپس لا کر ہمیں دکھا دیتا ہے: یہ تم تھے شیخی خورے، کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو افلاطون سمجھنے والے۔''

وہ جس کوشش میں تھا خود اسی کی شدت نے اس کے آنسوؤں کو تھام رکھا تھا۔

ان چند ہیجان سے بھری راتوں کے بعد وہ پانچوں وقت نماز پڑھنے لگا۔ قرآن شریف پڑھتا اور ہمت کرتا جیل کی اُسی خوراک پر جو رمضان کے سوا باقی سارے سال ملتی تھی روزے رکھے، اُن کھوئی نمازوں اور روزوں کی تلافی کرے۔

ایک دن اس نے جیل سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا ''جیل میں نماز روزے کی اجازت ہے، کیا کبھی ایسا بھی ہوگا کہ حج کی اجازت بھی ہونے لگے۔''

اس کی رنگت پیلی پڑ چکی تھی اور وزن بھی آدھا رہ گیا تھا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ اپنی جگہ پر جم کر رہ گیا۔ پھر بولا:

''کیوں وہاں سے بھاگنے کا ارادہ ہے؟''

''بس تمہاری کھوپڑی میں اتنا ہی آ سکتا تھا!'' اس نے بغیر ڈرے کہا۔

سب قیدی جو آس پاس کھڑے تھے تکمیذ کا جوابی جملہ سُن کر ٹھٹھا مار کر ہنسے۔

جیل سپرنٹنڈنٹ نے خفت مٹانے کے لیے کہا ''پوری پولس فورس چاہیے ہوگی تمہیں وہاں لے جانے اور لانے کے لیے۔'' اور وہاں سے آگے بڑھتے ہوئے کہا ''اُس سے زیادہ جتنی ملک کے صدر کو حج یا عمرہ پر لے جانے کو چاہیے ہوتی ہے۔''

(۶۷)

تلمیذ کے ساتھی چار سال میں بدلتے رہے۔ جو موت کا انتظار کر رہے تھے وہ بھی اور جیل کا اسٹاف بھی۔ خود جیل میں تبدیلیاں آئیں۔ کئی سایہ دار درخت کاٹ دیئے گئے۔ ان کی جگہ یوکلپٹس کو دے دی گئی کہ وہ جلد بڑھتے ہیں۔ مین گیٹ کا رنگ پہلے سفید تھا اور سڑک پر کھیلنے والے لڑکوں کے کوئلے سے لکھنے کے لیے بڑے کام کا تھا۔ پھر اس پر کالا رنگ کر دیا گیا اور اس پر وہی سب کچھ سفید رنگ سے لکھ دیا گیا جو پہلے تھا— ہر میجسٹی کو حذف کر کے۔ نگہبان کے کھڑے ہونے کا برج توڑ کر بنایا گیا۔ پہلے برج کی چھت چپٹی تھی، اب اُسے کٹیا کی شکل دے دی گئی۔ سڑک پر کھیلنے والے لڑکے اب چوک سے گیٹ پر لکھنے لگے تھے۔

خشک آنکھوں والا مو دصبر کی تلقین کرتے کرتے ایک دن خود صبر کرنے سے بے نیاز ہو گیا۔

ایک وہ تھا احتشام، جسے چند سال پہلے سوتیلی ماں کے قتل کے الزام سے آخری منزل پر بری کر دیا گیا تھا، دوسری دفعہ تیرہ مہینے بعد گرفتار ہوا۔ سزائے موت ہوئی۔ مگر اس دفعہ موت کی کال کوٹھری تک پہنچنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے ساتھی اُسے کورٹ سے اڑا لے گئے۔ اس مہم میں جن کی آئی تھی مرے، جن کی نہیں آئی تھی زخمی ہوئے۔ اب شاید وہ مسقط یا ہونگ کونگ میں ہے۔

سعید الحسن کے کام اس کی روح کے بس میں تھے، جو چاہتی تھی کراتی تھی، اس کے اعضا اور دماغ قصوروار نہیں ہوتے تھے۔ اگر استغاثے کا سرکاری وکیل کہتا کہ وزیر اعظم پر گولی تم نے

چلائی تھی تو وہ اس عائد کردہ جرم کو بے چوں و چرا تسلیم کر لیتا۔ کیونکہ اس کا مطلب ہوتا کہ اس کی روح کہہ رہی ہے اس طرح اپنی جان دے دو۔ اور چونکہ پھانسی پاتا وہ اپنی روح کے ایما پر تو یہ خودکشی نہیں ہوتی۔ جس دن سعید الحسن کو پھانسی دی جانی تھی اس کے ایک شام پہلے جیل کے ایک حصے میں مکمل خاموشی تھی۔ آوازیں اگر تھیں تو باہر کی دنیا سے آنے والی۔ اور وہ بہت دور کی آوازیں لگ رہی تھیں۔ ادھر بھی یہی لگ رہا تھا سب سرشام سو گئے ہیں۔ سعید الحسن چین کی نیند سو رہا تھا جیسے ساری دنیا سے اس کی صلح صفائی ہے۔

سوگ کی یہ خاموشی ایک دن پہلے سے سب پر طاری رہی تھی۔ نہ کسی نے کھانے پر جھگڑا کیا نہ چائے پر۔ نہ چھٹی کے وقت میں کوئی اپنے سیل سے باہر نکلا۔ اس رات خالی پیٹ پر تلمیذ نے خود کو عجیب دنیا میں پایا:

> زمین کی طاقت ثقل ختم ہوگئی ہے، لوگ ہوا میں تیر رہے ہیں۔ خود میری ماں، بہن، بھائی، باورچی خانہ، چمٹا پھنکنی، کڑھائی، کرچھا، توا، دیگچی اور مٹی کی ہانڈیاں سب اڑے اڑے پھر رہے ہیں۔ جو پیڑ ہمارے صحن میں تھا اکھڑا اپنی جڑوں کے ساتھ ہمارے اینٹوں کے فرش کو بھی لے اڑا — وہ دور دور تک بکھر گئیں۔ دریا سوکھ گیا ہے کیونکہ اس کا پانی ہوا میں برسنے والے پانی کی طرح اڑ رہا ہے۔ میں مینہ کی ترچھی لکیروں کو دیکھ سکتا ہوں۔

جب وہ جاگتا جا رہا تھا اس نے خود کو کہتے ہوئے پایا: اُسے لٹکایا جانا چاہیے تھا، نہ لٹکایا جاتا تو اُسے لمبی داڑھی والے جن کے اوپر کے ہونٹ مونچھوں سے آزاد ہیں مار دیتے۔ ان کی عورتیں سیاہ موزوں، سیاہ دستانوں اور سیاہ برقعوں میں ہیں۔ وہ کہتے یہ آدمی شرک بکتا ہے کہ اس کی جان اس کی روح کے بس میں ہے۔ یعنی خدا کے سوا کسی اور کے۔ اگر قدرتی موت مرتا تو ان میں سے کوئی اس کی فاتحہ تک نہیں پڑھتا — نماز میں شرکت کا کیا مذکور۔

پھانسی کے بعد مسجد کے باہر سعید الحسن کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔ تلمیذ پہلی صف میں امام صاحب کے عین پیچھے تھا۔ جس وقت مرنے والے کا چہرہ دیکھا جا رہا تھا تلمیذ دل میں کہہ رہا تھا

'تم بڑے آدمی تھے، میری طرح معصوم، یقیناً تم جنت میں پہنچ چکے ہو، تمہارا چہرہ دیکھ کر میں بیہوش نہیں ہوا۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ میں دیکھ رہا ہوں تمہاری جگہ میں لے لیتا ہوں۔'

کندھا دینے والوں میں وہ آگے سیدھے ہاتھ پر تھا اور اسی طرح کلمہ پڑھتا ہوا سعید الحسن کے جنازے کو بیچ کی دیوار کے دروازے تک لے گیا جہاں سے مرنے والے کے گھر والوں نے جنازے کو سنبھال لیا۔

''بالآخر آج جیل سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔'' کسی نے کہا۔

''گھر والے میت گاڑی لے کر آئے اور اُسے لے گئے۔''

''بس یہ ہے ہم سب کی، جو زندہ رہ گئے ہیں، کہانی کا خاتمہ۔'' اس نے کہا جو کہتا تھا خدا کو اللہ کہو، گوڈ، ایشور یا جو جی چاہے کہو، بس اعتقاد درست ہونا چاہیے۔

جو قیدی جنازے کی نماز میں شریک نہیں ہوا تھا اور دور سے سب کچھ دیکھتا رہا تھا جنازے کو بیچ کی دیوار تک چھوڑ کر آنے والے سے دانشمندانہ انداز سے بولا ''اب دوزخ میں یہ ہوگا، پینے کو کھولتا ہوا پانی اور کھانے کو کانٹوں بھری جھاڑی کے سخت بدمزہ کڑوے پھل اس کا مقدر ہوں گے۔''

تمیز نے کہا ''وہ ہم زندگی میں بھی کھاتے رہے ہیں۔''

''کیسے؟'' دیندار قیدی نے کہا۔

''تھوڑے دوسروں کی اگائی ہوئی جھاڑی کے، زیادہ اپنی اگائی ہوئی کے۔''

''تو تمہارے لیے وہاں نیا کیا ہوگا۔'' بات بات پر اعتراض کرنے والے نے کہا ''ہنستے کھیلتے وہاں چلے جانا۔''

تمیز سے ملنے کے لیے آنے والے بھی کم ہوتے گئے۔ پہلے سب کے سب ہفتے میں دو دفعہ آتے تھے۔ پھر تعداد میں کم ہوتے گئے اور وہ وقت آیا کوئی مہینوں نہیں جھانکتا تھا۔

امینہ جب پہلی بار آئی منھ اوپر اٹھانے کی جگہ سر نیچے کیے پورے وقت کھڑی روتی رہی۔ بال سفید ہو چکے تھے لیکن ان کے سروں تک پر بھی نہ مہندی کا آخری پتہ تھا نہ خضاب کا۔ ناخن

ترشے ہوئے تھے لیکن ان میں خون کی ہلکی سی رنگت بھی نہیں تھی۔ ہمیشہ کی طرح برقعے میں تھی۔ نقاب بھی ہمیشہ کی طرح اس کے سامنے سر پر الٹا ہوا تھا۔

تمکید نے کہا "تم نے اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے!"

"بیوہ کا، تمہاری بیوہ کا۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

"تمہارا بھائی؟" تمکید نے دماغ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"نام بھول گئے؟ سلیم۔ ٹھیک ہے۔ کلارک ہے۔ یہاں نہیں دور ہے، شادی ہو چکی ہے۔ ایک بیٹا، ایک بیٹی ہے۔ تمہارا نام ہمیشہ عزت سے لیتا ہے۔"

مختصر خاموشی کے بعد "بیوی خلع لے کر چلی گئی۔" تمکید نے اُسے خبر سنائی۔

"مجھے معلوم ہے۔"

"بڑا لڑکا۔"

"اللہ کو پیارا ہوا۔ دونوں بیٹیاں ماں کے پاس ہیں۔" اُسے معلوم تھا۔

تمکید دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ پھر رُک رُک کر بولا:

"مجھے معلوم ہے تم سے اگر میں نے شادی کے لیے کہا ہوتا تو تم مجھ سے اتنی سچی تھیں کہ اگر شوہر زندہ بھی تھا تو بھی راضی ہو جاتیں۔ مگر جب میمونہ مجھے کنٹرول نہیں کر پائی تو تم کیا کنٹرول کرتیں۔" آنسو اس کی آواز کو روک رہے تھے۔

امینہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، گال بھیگے ہوئے تھے، اور آہستہ سے سر کو ہلایا۔ وہ اس کی بات کو سمجھ گئی تھی۔ بولی

"نہیں۔ اگر تم نے شادی کے لیے کہا بھی ہوتا تو میں ہاں نہ کرتی۔ کیوں؟ میری شادی ہو چکی تھی اور ابھی تک ہے۔ اس لیے۔"

یہ بات تمکید کے لیے دھماکا بن کر نہیں آئی۔ اس کو ہمیشہ سے یقین تھا یہ عورت شادی شدہ ہے۔

کچھ وقفے سے امینہ نے بولنا شروع کیا: "پتہ نہیں پڑوس کے ملک میں میرا شوہر کہاں ہے۔ ہے بھی یا وہاں کی مٹی میں مل گیا۔ ہم غریب تھے، وہ فوج میں تھا لیکن بلا یونیفارم کا۔ لیکن اتنے غریب یا

اپاہج بھی نہیں تھے کہ اگر وہ فوج کی نوکری چھوڑ دیتا تو ہم بھیک مانگنے لگتے۔ پھر اُسے ٹرپوں (trips) پر بھیجا جانے لگا اور پہلی دفعہ جانے سے پہلے اس نے صرف اتنا بتایا کس ملک میں بھیجا جارہا ہے۔ شہر کا نام، پتہ کچھ نہیں۔ مہینے کے مہینے اس کی تنخواہ میرے ہاتھوں میں پہنچ جاتی تھی لیکن خط یا پیغام کچھ نہیں ہوتا تھا۔ میں کیسے اُسے خط لکھتی۔ سال ڈیڑھ سال چھوڑ کر وہ دو دفعہ گھر آیا اور دونوں دفعہ ایک ہی بات کہی 'اگلی دفعہ گھر آنے پر نوکری چھوڑ دوں گا۔' لیکن یہ بات کہتے ہوئے اس کے چہرے پر سنتوش نہیں ہوتا تھا۔ اشانت لگتا تھا۔ مجھے اس سے سچی محبت تھی۔

''جس دن تم ہسپتال مجھے دیکھنے آئے تھے اور میں نے تم سے چلے جانے کے لیے کہا تھا، اس لیے کہ مجھے اپنی سسرال والوں کے آنے کا پتہ تھا۔ انہوں ہی نے ہسپتال کا بل بھرا تھا۔''

وہ رونے لگی اور دیر تک کھڑی روتی رہی۔ حالانکہ تلمیذ نے اس سے بیٹھ جانے کے لیے کئی بار کہا۔ پھر اپنی آنکھیں اور ناک پونچھ کر اس نے سر اوپر اٹھا کر تلمیذ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

''اگر تمہیں آزادی مل بھی جائے پھر بھی میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔ کیوں؟ ایسا کرنا پاپ ہوگا۔ ٹوکرم، اس لیے۔ میں اپنے شوہر کی اور تمہاری وفادار رہی ہوں۔ وہ نہیں جو تم اپنے دل میں مجھے سمجھتے ہوگے......''

''نہیں۔ ہمیشہ وفادار سمجھا۔''

''تمہیں وہ دن یاد ہے جب پہلی بار بڑے گھر سے چھوٹ کر آرہے تھے، میں تمہارے ساتھ تھی اور راستے سے اتر گئی تھی۔ اس شام ٹیکسی میں اندھیرے کی وجہ سے تم میرے چہرے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ دیکھ سکتے تو پتہ پڑتا، خوش نہیں تھی پریشان تھی۔ اس دن مجھے خبر ملی تھی میرا شوہر واپس آگیا ہے اور کسی بھی وقت گھر میں ہوگا۔ یہ بات میں نے تمہیں نہیں بتائی تھی۔ جلد ساز کو معلوم تھا تم میرے ہسبینڈ کی خیر خبر یا اس کا کوئی سندیسہ دینے آتے ہو، اُسے تمہاری طرف سے کوئی کھٹکا نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہہ رکھا تھا تمہیں یا کسی کو بھی جو مجھ سے ملنے آئے میرا گھر نہ دکھائے۔ وہ بتانے آتا تھا میں خوش ہوجاتی تھی۔ وہ پوچھتا 'خیریت؟' میں کہتی 'ہاں'۔ پھر تم

سے ملنے آ جاتی تھی۔

"اس خبر کے اگلے دن مجھے پتہ پڑا تھا نہیں میرا اسپینڈ نہیں آ رہا ہے بس اس نے خیریت کی خبر بھیجی ہے۔"

پھر تمکینہ نے کہا "تمہیں معلوم ہے میرا کیس ہر منزل پر فیل ہوتا گیا ہے اور اب بس اتنا کہہ سکتا ہوں آئندہ یہاں مت آنا۔"

جو اس کے جی میں تھا اُسے وہ ٹھیک سے نہ کہہ سکا: 'شاید وقت آنے پر مجھے کوئی نہ لینے آئے، تم اپنے بھائی کے ساتھ آ کر مجھے لے جانا۔ اس دن میرے جیل سے باہر لے جائے جانے پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ تم اپنے بھائی کے ساتھ آ کر مجھے لے جانا اور جو مرنے کے بعد ہوا کرتا ہے وہ سب کرا دینا۔'

پھر اس کی آواز لوٹ آئی:

"تمہیں معلوم ہے اُن بے دینی کے دنوں میں بھی میں تم سے وفادار تھا۔ کسی دوسرے کو تمہیں ہاتھ لگانے نہیں دیتا تھا، چاہتے سب تھے۔ ہرجائی تھا لیکن تمہیں ہرجائی بنتے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ تمہارے لیے میرے دل میں عزت تھی۔"

امینہ زاروقطار رونے لگی۔ ایسی کہ تمکینہ نے اُسے کبھی اس طرح روتے نہیں دیکھا تھا۔

اپنی حالت کو چھپانے کے لیے امینہ نے بیل کے پتوں پر انگلیاں پھیریں جو نکل پلیٹیڈ ریلنگ پر گز دو گز چلی گئی تھی اور اس کے ٹینڈرل' یہاں وہاں سر اٹھائے ہوئے تھے جیسے اپنے لیے جگہ ڈھونڈ رہے ہوں۔

"یہ جیل والوں نے لگائی ہے؟"

"ایک عورت اور اس کی بیٹی نے۔ کہنے پر پانی جیل والے ڈال دیتے ہیں۔"

دونوں کی نظریں بیل پر آپس میں مل رہی تھیں جیسے کوئی محبت کرنے والا جب رات کو کھلے آسمان تلے سونے کو لیٹے اور وہاں چاند جگمگا رہا ہو اُسے دیکھ کر دل میں کہتا ہے ہوسکتا ہے اس وقت وہ

Tendrils ۱

بھی چاند کو دیکھ رہی ہو۔

تمیذ نے اپنی بات دہرائی "ایک نیک عورت اور اس کے بچے یہ پاک پودا اس اداس فضا میں اگا گئے ہیں۔ پہلے وہ آتے تھے تو پانی ساتھ لاتے تھے"

امینہ ہرے پتوں کو پیار کر رہی تھی۔ ایک دم چونک کر بولی "اب نہیں آتے؟"

"نہیں۔"

امینہ پھر اسی شدت سے رونے لگی۔ تمیذ کہہ رہا تھا "تعجب ہے جس ملک میں ایمانداری اور دیانت داری عنقا ہے وہاں یہ کمزور بیل بغیر حفاظت کے سلامت رہی۔ یہاں تو بیوہ ناداروں کے وظیفے تک موٹے مشٹنڈے ہضم کر جاتے ہیں جن میں اکثر "

امینہ نے ہتھیلی اور انگلیوں سے اُسے چپ ہو جانے کا اشارہ کیا۔

دوسری ملاقات پر امینہ نے اطلاع دی "فتی بھائی کا انتقال ہوئے تو عرصہ ہوا۔ پتے کا کینسر بتایا گیا تھا۔ سوکھ گئے تھے۔ میں ہسپتال میں دیکھنے گئی تھی ہمت کر کے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ رو پڑی۔

کچھ دیر بعد بولی "میمونہ نے میکے کے شہر میں بیٹیوں کے نام بدل کر اسکول میں ان کا داخلہ کرایا تھا۔ داخلے کے فارم پر باپ کے خانے میں لکھا تھا — مر چکے ہیں۔"

تمیذ کے دل کو دھکا لگا۔ ہنس کر بولا "صحیح لکھایا ہے۔"

"اور سرپرست ایک ماموں کو دکھایا تھا۔ بیٹیوں کے نام سعیدہ، ماریہ ہیں۔"

تمیذ نے کہا "کیا جاسوسی کے لیے گورمنٹ نے تمہارے آدمی کی جگہ تمھیں رکھ لیا ہے!"

وہ ہنس پڑی۔

"مجھے فتی بھائی نے بتایا تھا یوسف تمہارا بچپن کا دوست ہے وہ اس کیس میں بہت کچھ کر سکتا ہے۔ جس دن انہوں نے یہ بات بتائی تھی بیچارے خود کھاٹ پر پڑے تھے۔ ریڈیم کی سوئیاں لگ رہی تھیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب تمہارے کیس کا فیصلہ نہیں سنایا گیا تھا اور میں

--

تمہارے لیے بلبلائی پھرتی تھی۔ خود نہیں جانتی تھی کس کی عزت ہوں۔ اس کی جو پڑوس کے ملک میں غائب ہو گیا یا تمہاری۔ بس یوں سمجھ لو ایک ساتھ دُہری بیوہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔''

کچھ دیر وہ روتی رہی۔

''اُن کے گھر ایک دفعہ گئی تھی پتہ چلا کر۔ ان سے کہنے کچھ کیجئے۔ آپ کے بچپن کے دوست ہیں، غریب پرور ہیں۔ مقدمہ ختم پر ہے۔ فیصلہ سنایا جانے کو ہے۔ وہ آدمی قتل کر ہی نہیں سکتا تھا۔ مگر وہ آدمی نہیں پتھر ہے۔ بولا' بچپن ختم ہوا اور بچپن کے دوستانے بھی' اور یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی بیوی وہیں تھی اس نے مجھے روک لیا اور پوچھا' تمہارا تملیذ بھائی سے کیا رشتہ ہے؟''

کچھ دیر وہ نیل کے پتوں سے بات کرتی رہی۔

'' مجھے ایک دن انگریزی بازار میں اچانک یوسف کی بیوی مل گئی۔ اس نے بتایا تھا اس کی خط و کتابت تملیذ بھائی کی بیوی سے ہے۔ سنا تم نے وہ تمہیں ابھی تک بھائی کہتی ہے۔ خیر کہہ رہی تھی: 'دونوں اچھے آدمی تھے۔ ایسا کیوں ہوا؟'

وہیں اس نے تمہاری بیوی اور بیٹیوں کی خبر سنائی تھی۔''

جیل سے واپس جاتے ہوئے امینہ کے ذہن میں تملیذ کی وہ باتیں گونج رہی تھیں جب دوستی پکی ہو جانے کے بعد ایک دن تملیذ نے ہوٹل میں کھانے کے بعد جب وہاں سے نکلنے کو کھڑے ہوئے تھے، اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا تھا: 'تم سے شادی نہیں کر سکتا ہوں۔ زیادہ پیسے والا نہیں ہوں۔ تم غلط راستے پر مت چلنا۔ پیسے کی ضرورت نہیں ہونے دوں گا — جتنا بھی خرچہ اٹھا سکا.....'

''اور واقعی وہ ایسا نکلا تھا'' اس نے زیرِ لب کہا۔

اس شام رات کا اندھیرا پڑنے سے پہلے تملیذ نے اپنی کوٹھری کی پشت کی دیوار پر کوئلے سے دو تصویریں بنائیں — جتنی اچھی بنا سکتا تھا۔ ایک کے نیچے لکھا سعیدہ، دوسری کے ماریہ۔

(۶۸)

ایک رات جب چاروں طرف خاموشی ہو چکی تھی اور وہ نیند میں ڈوبتا جا رہا تھا تکمید نے میمونہ کو دیکھا: برقع پہنے ہے، جو اُس نے رخصتی کے بعد ٹرین ہی میں چھڑوا دیا تھا، ساتھ میں نجم ہے، خواب کے اسکرین پر دائیں سے بائیں کو جا رہے ہیں۔ نجم قد میں اپنی ماں سے بڑھ گیا ہے۔ وہ انہیں آواز دیتا ہے: 'ٹھیرو، میں بھی آ رہا ہوں' لیکن موٹی ریت بھری ہوا کا غبار اُن کے اور اس کے درمیان آ گیا، جیسی ہوا اُن دنوں جب نئی آبادیاں یہاں سے وہاں تک پھیلے ہوئے میدانوں میں بسائی جا رہی تھیں چلتی تھی۔ ایک جیسے کوارٹروں کی آٹھ دس لائنیں، کچھ پیلے رنگ کے، کچھ ادھ بنے ریت کے رنگ کے، ہر طرف ایسے ہی چٹیل میدانوں میں وہ ہوا کے جھکڑ اور ریت کے بگولے اٹھتے بھاگتے نظر آتے تھے اور ان کوارٹروں اور اُن کے مکینوں کو بھی اپنے اندر چھپا لیتے تھے۔

آنکھ کھلنے پر کافی دیر اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کہاں ہے۔ سارا جسم اکڑا ہوا جیسے انچاس، پچاس کے سالوں میں جب کسی کے گھر سے بس اسٹوپ کی طرف جاتے ہوئے ہوا دھکا دے رہی ہوتی تھی اور وہ اگر کوئی ساتھ ہو، سدا کا مسخرہ 'اسٹوپ' کہہ کر خود کو ایک جگہ گاڑ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔

جو ساتھ چل رہا ہو اس پر ہنستا اور کہتا: ''جب خود رک رہے ہو تو اسٹوپ کیوں کہتے ہو؟''

''نہ کہوں تو ہوسکتا ہے جسم نہ رکے۔ میں ٹیسٹ کرتا ہوں میرے بس میں ہے یا ہوا کے۔''
'نجم اتنا بڑا تھا جتنا آج کو ہوتا' اس نے سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔

بیوی اور بیٹے کو دیکھنے سے جس خوشی کو لیے وہ جاگا تھا وہ فوراً ہی حسرت میں بدل گئی اور حسرت احساس جرم میں جو دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ شدید ہوتا جا رہا تھا:

'میں نے رجب علی کا قتل نہیں کیا تھا، نہ زندگی میں کبھی کسی کا۔ لیکن نجم کے خون کا میں ذمے دار ہوں اس سے میں کیسے انکار کرسکتا ہوں۔ میں خدا کے سامنے انکار کر بھی جاؤں اس کی ماں کی میرے خلاف گواہی کافی ہوگی۔ حقیقت میں زندگی بھر ایسا جانور رہا جسے اپنے غصے پر قابو نہیں تھا — بھیڑیا، چیتا، مگر مچھ۔ نہیں ان میں سے ایک بھی نہیں۔ جسے ہم ان کا غصہ کہتے ہیں حقیقت میں ان کی بھوک ہوتی ہے — خالی پیٹ۔ مجھے بھرے پیٹ پر بھی غصہ آتا تھا، بلکہ زیادہ تر جب پیٹ بھرا ہو۔ میں نے ڈھالتے ڈھالتے زندگی میں خود کو کیا بنا لیا!'

اگلی صبح جمعے کی ہے یہ تلمیذ کو یاد تھا۔

جمعے کی نماز سے پہلے دیا جانے والا وعظ بغیر لاؤڈ اسپیکر بھی پوری مسجد میں سنا جاسکتا تھا لیکن اس پر تلمیذ نے کبھی توجہ نہیں کی تھی۔ جو توجہ دیتے تھے وہ اس وقت مسجد کے صحن میں بیٹھے ہوتے تھے اور نماز مکمل کر کے اپنی بارکوں اور کوٹھریوں کو لوٹتے تھے۔ بعض وہاں وعظ اور قرأۃ کے دوران اتنا روتے تھے کہ ہچکیوں سے اُن کا جسم ہلتا دیکھا جاسکتا تھا۔

میمونہ اور نجم سے ملاقات کے کرب کو زائل کرنے کے لیے تلمیذ وعظ کے ایک ایک لفظ کو دماغ میں بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یقیناً اللہ انسانوں پر رتی بھر بھی ظلم نہیں کرتا ہے۔ لیکن انسان خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔ [1]
''ہم میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جن پر بار بار بُرا وقت آپڑتا ہے اور وہ پھر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر

---

[1] سورۃ یونس ۱۰:۴۴

ادا کیے جاتے ہیں، لیکن تعداد میں اُن سے کہیں زیادہ وہ ہیں جو اونچی آواز میں نہ سہی دل میں ضرور رکھتے ہیں کہ اللہ نے ہم پر زیادتی کی ہے، کہ نعوذ باللہ وہ ظالم ہے۔ وہ ہم سے معافی مانگے، ہم کیوں اس سے معافی مانگیں ــ استغفراللہ استغفراللہ، جو ایسا کہتے یا سوچتے ہیں وہ زیادہ بڑے گنہگار ہیں۔ جیسے برا وقت انسان کی آزمائش کا ہوتا ہے وہ وقت بھی ایمان کی آزمائش کا ہوتا ہے۔ خدا دیکھنا چاہتا ہے جتنے احسانات اس نے کیے ہیں اُن میں سے کتنوں کو ہم نے اپنی جان کا حصّہ بنالیا ہے، اپنی روح کا۔ یا یہ کہ بس عام خوشی کی طرح وہ ہماری زندگی میں آئے اور گزر گئے۔ ہم انہیں بھول گئے۔ جیسے قرض لینے والا لیتے وقت قرض دینے والا کا شکریہ ادا کرتا ہے اور پھر بھول جاتا ہے وہ قرض اُسے کبھی لوٹانا بھی ہے۔ خدا کو ظالم ٹھیرانے والے وہ ہوتے ہیں جن کی نظر کبھی اپنے اعمال پر نہیں جاتی ہے۔ غیبت اور شرک، جنہیں وہ گناہ سمجھتے ہی نہیں ہیں اُن سے ساری زندگی سرزد ہوتے رہتے ہیں۔''

اس کے بعد کے جملے میں جو لفظ دبی زبان میں تھا تمیذ اسے نہیں سن سکا۔

''ہمیں نہیں بھولنا چاہیے غیبت اور شرک ..... سے بدتر ہیں۔ بہت سے دوسروں پر لگائے ہوئے اپنے بہتان کو بھی بھول چکے ہوتے ہیں۔ ان کے برخلاف آدمی اپنے کیے ہوئے ایک قتل کو نہیں بھولتا ہے کیونکہ وہ اس کی سزا سے ڈرتا ہے، جان بچانے کے لیے دنیا جہان میں بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ غیبت اور بہتان کے بعد بھاگا بھاگا نہیں پھرتا ہے، یہ اس کے دماغ میں نہیں آتا ہے کہ اس نے دوسرے کی زندگی کو ایک غیبت یا بہتان سے اجاڑا ہوگا۔ اس حد تک کہ جس کی غیبت کی تھی کبھی بدنامی سے تنگ آ کر خودکشی بھی کر بیٹھتا ہے یا ہوسکتا ہے جس نے غیبت کی تھی وہ اس کا قتل کر ڈالے.....''

سننے میں آیا تھا وعظ دینے والا افریقی نسل کا باشندہ کبھی اس جیل میں خود پھانسی کا مجرم بن کر آیا تھا۔ پھر اس کا مقدمہ چلا اور اُسے رہائی مل گئی لیکن ہر جمعے کو نماز پڑھانے آتا تھا اور رمضان میں تراویح بھی۔

خطبہ سننے کے اگلے دن تلمیذ نے ذاکر سے جو پہلے پولس فورس میں تھا اور اب کئی سال سے ہر میجسٹی کی پرزن میں، کہا "مجھے مشکوۃ شریف لا کر دینا۔"

اس نے کہا: "وہ تم پڑھ چکے ہو۔ ترجمے والا کلام مجید لا دوں؟ وہ پڑھو دل کو سکون ملے گا۔ پھانسی یا کسی طرح بھی مرنا کوئی صدمے کی بات نہیں ہے۔ اصل چیز ہے مکمل ایمان کی حالت میں مرنا۔ تب آدمی کو دنیا چھوڑنے کا دکھ نہیں ہوتا ہے۔ پڑھو گے تو لا دوں؟"

تلمیذ نے کہا "تم سے جھوٹ بولا تھا۔ تب مشکوۃ نہیں پڑھی تھی۔"

"مگر اس میں تو پڑھنے کی نشانی ہوتی تھی۔"

"سینک؟ وہ تو نیم کی ڈنڈی ہوتی تھی، پتیاں جھاڑ کر۔ اب بھی وہی رکھوں گا۔ یہاں اور کس چیز کو نشانی بنا سکتا ہوں۔ مگر اس بار جہاں تک پڑھا ہوگا وہاں رکھوں گا۔"

ذاکر نے جاتے جاتے کہا "خیر قرآن ترجمے کے ساتھ بعد میں پڑھ لینا۔"

(۶۹)

ایک دن تلمید نے سلیمان سے پوچھا: ''انسان اور شیطان میں ایک دوسرے سے کتنی دوری ہے؟ کبھی بھی وہ انسان سے کتنے فاصلے پر ہوتا ہے؟'' پھر خود ہی ہنس کر کہا: ''ایک بالشت کی؟ گز بھر کی؟ کوس دو کوس؟''

سلیمان نے کہا: ''نہیں تم ایک بالکل دوسری قسم کی دوری کے بارے میں سوال کر رہے ہو۔ میرا خیال ہے وہ انسان کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا ہے۔ جب تک انسان بچہ ہے اپنے اور اپنی ماں کے جسم کو ایک سمجھتا ہے، اس کے ساتھ جو جی چاہے کرے، جو چاہے منھ میں رکھ لے انگارا یا برف کا کیوب، مرچ یا مٹھائی تب تک شیطان اس سے دور ہوتا ہے۔ پھر جب بچے میں صحیح غلط، اچھے برے کی سمجھ پیدا ہو جاتی ہے شیطان جان جاتا ہے اس کے دماغ نے میرے لیے جگہ بنا لی۔ فوراً اڑ کر اس کے پاس آ تا ہے۔ پھر ساری زندگی اس سے اتنے نزدیک رہتا ہے کہ دونوں جب چاہیں ایک دوسرے کو چھو لیں۔ تمہارا ایک بالشت تو بہت ہے، بس سوت دو سوت۔ اس کا نزدیک ترین دوست، جب زندگی اُسے ڈل لگتی ہے، لطف سے خالی — شیطان اُسے بتاتا ہے بوتل اور جنس مخالف تمہاری پہنچ میں ہے، ہر لمحے۔ اُسے کیوں بھولے ہوئے ہو۔ چنگیز کے پاس ان دو کی کمی نہیں تھی، اُسے بتاتا ہوگا: 'قتل کر، ایک کے بعد ایک، طبیعت پر سے زنگ ہٹ جائے گا'۔''

تلمیذ کو سلیمان پسند تھا- نیا سب انسپکٹر۔ جو اُن دنوں ہر میجسٹی کی جیل میں تعینات کیا گیا تھا جب تلمیذ کو اکثر خیال آتا تھا 'یہ جیل ہی حقیقت میں میرا گھر میری دنیا ہے۔ اتنا عرصہ شب و روز میں زندگی میں کسی اور عمارت میں نہیں رہا ہوں، یہیں مجھے آلام دنیا سے نجات ملی، یہیں مجھے دین نصیب ہوا (آواز نے کہا 'واقعی؟') اگر رہائی نصیب ہو بھی تو شاید اس پرانی دنیا میں دل نہ لگے اور لگے بھی تو اس کوٹھری اور اس کے پڑوس، پورے محلے کو دیکھنے کبھی نہ کبھی آیا ہی کروں۔ یہاں سو طرح کے آرام ہیں: پکا پکایا ملتا ہے، نہ بجلی اور پانی کا بل، نہ ٹیلی فون رکھنے کی ضرورت، نہ دھوبی، بھنگی، مالی کا خرچہ۔ رات کو آدمی آرام سے سوسکتا ہے۔ یہ دھڑکا نہیں رہتا ہے کہ ایک رات آنکھ کھلے اور پتہ چلے گھر میں ڈاکو گھس آئے ہیں۔ رہا ملنے والوں کا توڑا تو وہ بھی مل ہی جاتے ہیں تہواروں اور اُن کی سالگراہوں اور برسی کے دن پر جن کے نام پر قوم متحا نکلتی ہے۔ پھر جو اس آخری دور کے ہم سفر ہیں وہ کب دوستوں رشتے داروں سے کم ہیں۔'

اس کا یہ استدلال سن کر سب ہی ہنس پڑتے تھے حالانکہ ان باتوں کو گھما پھرا کر وہ سب ہی کے سامنے کہہ چکا تھا اور ایک دفعہ نہیں کئی کئی بار۔ سدا پائپ پینے والے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے ایک دفعہ اس کی بات سن کر کہا تھا ''اگر موت کی سزا معاف ہوجائے تو عمر قید کی سزا کے لیے درخواست دینا۔ یہ آسائشیں تمام عمر رہیں گی۔''

سلیمان ایم اے تھا، کتابوں کا اچھا ذوق رکھتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں پولس کی نوکری لے بیٹھا۔ بتا چکا تھا ''جب میری والدہ کو پتہ چلا میرے پاس غلط پیسہ آرہا ہے، اور اس کا انہیں شروع سے کھٹکا تھا، تو انہوں نے گھر کا کھانا کھانا چھوڑ دیا۔ پیسے دے کر اپنا کھانا بازار سے منگوانے لگیں یا بیٹی کے گھر سے۔ وہ پیسے ان کی پنشن کے ہوتے تھے اور پہلے انہیں گھر کے بچوں پر خرچ کرتی تھیں۔ میرے پیسے سے جو بھی آتا تھا اس کے لیے کہتی تھیں 'اس میں رشوت کا پیسہ شامل ہے۔' یہ حالت بس مہینہ دو مہینہ ہی رہی۔ میں نے ان کے پیروں پر سر رکھ کر کہا: ''اماں اب میرے پاس ایسا ایک پیسہ نہیں آئے گا قسم لے لیجئے۔ اب میں اپنے پیسے سے آپ

کو حج کراؤں گا اور ساتھ خود بھی جاؤں گا۔ آپ دیکھیں گی مجھے ایک لمحے کو بھی خجالت نہیں ہو گی نہ سنگ اسود کو بوسہ دیتے وقت، نہ نبی کریم کے روضے پر۔''

ایک شام جب جیل میں مکمل خاموشی تھی سلیمان اور مولوی ذاکر ساتھ ساتھ وہاں آئے جہاں پھانسی کے منتظر قیدیوں کی کوٹھریاں تھیں۔ ابھی وہ کچھ دور کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ تمکید نے اپنے جاگنے کا احساس دلانے کے لیے تھوڑی اونچی آواز میں کہا: 'جاگ رہا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد تینوں میں وہی زندگی نیند میں گنوانے اور موت کے نزدیک پہنچنے پر جاگ اٹھنے کی باتیں ہو رہی تھیں کہ سلیمان نے کہا: ''یہ کتنی عجیب بات ہے ایک شخص زندگی بھر نیک عمل کرتا ہے اور جب جنت اور اس کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس کی تقدیر دھوکا دے جاتی ہے اور وہ بغیر چاہے دوزخیوں کا سا کام کر بیٹھتا ہے۔

''اسی طرح ایک شخص عمر بھر برے کام کرتا رہتا ہے اور جب دوزخ اور اس کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس کی تقدیر اس پر ایسے غالب آ جاتی ہے کہ وہ جو بھی کرتا ہے نیکی میں گنا جاتا ہے اور جنت میں جاتا ہے۔''

کچھ دیر کے لیے جیسے وہ گہرے خیالوں میں کھو گیا۔ پھر چھنکارے کا سانس لے کر بولا: ''مجھے ایمان بڑی مشکل سے نصیب ہوا ہے۔ ان باتوں پر زیادہ غور نہیں کرنا چاہتا ہوں کہیں جو سکون ملا ہے اُسے نہ کھو بیٹھوں۔ کاش والد صاحب کی زندگی میں یہ سکون ملا ہوتا۔''

تمکید نے کہا: ''تو اب جب مجھ میں اور جنت یا دوزخ جو بھی آگے ہے صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ گیا ہے تو کیسے اگر بدی کے بعد نیکی ملی ہے تو دوبارہ بدی میں چلے جانے کو روکوں؟''

ذاکر نے فوراً کہا: ''چوکنے رہو اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ نہ معلوم کب حرص غالب آ جائے۔ دولت کی، دوسرے کو ٹھگ کر اپنا بھلا کرنے کی، جنس کی۔ انسان بس چوکنا رہ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا ہے۔''

سلیمان نے ہاں میں سر ہلاتے ہوئے کہا: ''جن صاحب سے میرے والد بیعت تھے وہ بھی یہی کہتے تھے کہ آخری لمحے تک انسان کو چوکنا رہنا چاہیے۔ اور وہ ایک زن فاحشہ کا قصہ بھی سناتے تھے جو اس لیے بخشی گئی کہ اس نے اپنے چمڑے کے موزے کو ڈول کی جگہ استعمال کر کے ایک پیاسے کتے کی پیاس بجھائی تھی۔''

مولوی ذاکر نے درود شریف پڑھا اور بولے ''وہ حدیث تھی اب قرآن کی ایک آیت کا مطلب سنو: ماں کے پیٹ میں جو ہے اُسے اللہ ہی جانتا ہے۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ کل کیا کرے گا، نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ کس زمین میں مرے گا۔ تو یہ ہے تلمیذ بھائی تمہارے سوال کا پورا اور آخری جواب۔''

تلمیذ نے کہا: ''ذاکر بھائی تمہاری بات سے مجھے سکون ملا۔''

''میری بات سے نہیں قرآن کی آیت سے۔ آئندہ جب سورۃ لقمان پڑھو ان آیتوں کو ڈھونڈ لینا۔'' اُسے معلوم تھا تلمیذ اب معنی سمجھ کر قرآن پڑھتا ہے۔

اس گفتگو کے چند دن بعد ہی سلیمان کا ٹرانسفر کہیں اور کا ہو گیا۔ مگر جاتے ہوئے وہ تلمیذ کے سوچنے کو بہت کچھ چھوڑ گیا۔

ان دنوں تلمیذ اپنی بنیادی دینی تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ پہلے قرآن مجید کا پڑھنا وہ کب کا بھول چکا تھا اور پڑھتا تھا تو اٹک اٹک کر، اب ذاکر سے چند دن ہی پڑھنے کے بعد روانی سے پڑھنے لگا تھا۔ اور معنی کے ساتھ بھی ختم کر چکا تھا۔ اس کے بعد تفسیر اور سیرت کی کتابیں۔ لیکن فتاوٰی عالمگیری کی پہلی جلد کے چند صفحوں کے بعد ہی اس نے فیصلہ کر لیا یہ وہ نہیں ہے جس کی میرے دماغ اور میری روح کو ضرورت ہے۔ تفسیر اور سیرت نے اس کے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ روح کا طلاطم تھم چکا تھا اور اس کے ذہن کی وہ حالت تھی جو سمندر کی سطح کی اس وقت ہوتی ہے جب ہلکی ہوائیں موجوں کو تھپکی دے کر سلا رہی ہوتی ہیں۔ نئے مطالعے نے جو سکون اُسے بخشا تھا، زندگی میں پہلی بار، وہ اُسے سوچنے پر اُکساتا تھا: 'اب اگر خدا مجھے موقع دے ایک بار پھر

زندگی بسر کرنے کا تو ہر اُس کام سے دور رہوں گا جو گناہ کے گڑھے میں دھکا دینے کو ہر وقت تیار رہتا ہے۔

'اگر تو مجھے دوبارہ زندگی دے، یا دوبارہ پیدا کرے تو ہر لمحے یاد رکھوں گا

Woe unto us! Verily, we are wrong doers.

کیونکہ ساری تباہیاں جھیلنے کے بعد زیرک نہ سہی تجربہ کار ضرور ہو گیا ہوں۔ اور جانتا ہوں کہاں کھائی ہے، کہاں گڑھا۔ اور اُن کے بیچ میں سے جو تنگ محفوظ راستہ گزرتا ہے بس اتنا میرا ہے، اس پر چلنا ہے۔ شاید اُسی کو پل صراط کہتے ہیں۔'

دن کے بیشتر حصے میں تلمیذ کو نماز، قرآن یا دوسری دینی کتابیں پڑھتے دیکھ کر ایک دن ایک قیدی نے جو نمازی تھا لیکن پڑھا لکھا نہیں تھا اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "بھیا مجھے بھی کچھ سنایا کرو۔"

"کیا؟"

"جو پڑھتے ہو۔ اللہ رسول کی باتیں۔"

تلمیذ کے کل وجود میں ایک خوشی کی لہر دوڑ گئی جس سے وہ پہلے آشنا نہ تھا۔ یہ کہ اس کی ایک نئی پہچان بن گئی ہے۔ شاید جواری شرابی کی پہچان کے دن لد گئے۔ اس نے کہا "سنایا تو کروں لیکن جو باتیں پڑھ کر میری سمجھ میں آئی ہیں وہ تو تمہیں خدا خود پڑھا چکا ہے۔"

اس کے بارے میں بھی سب کو معلوم تھا بے وجہ قتل کے الزام میں پکڑا گیا ہے۔

بولا: "وہ کیسے؟"

تلمیذ نے کہا: "سورج ڈوبنے پر تم جیسے سو جاتے تھے ویسے ہی صبح سو کر اٹھتے تھے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے، تلمیذ نے اُسے بازو سے پکڑ کر کہا" نہ پچھلے دن کا غم لیے سوتے تھے نہ اگلے دن کی فکر لیے اٹھتے تھے۔ جانتے ہو اسے کیا کہتے ہیں؟"

اس نے کہا "کیا؟"

"قناعت۔ سکون۔"

اس کے چہرے پر جو سوال اُبھرا تھا وہ اس جواب سے مٹا نہیں۔

"زندگی بھر نہ تم نے کسی کا حق چھینا نہ کسی کی جان لی۔ محنت سے خود کو پالا، محنت سے گھر والوں کی پرورش کی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا سبق تم کتابوں سے لے سکتے ہو؟ اور یہ سبق میں نے کتابوں سے لیا ہے۔"

جو سوال تلمیذ ایک دن سلیمان سے پوچھ بیٹھا تھا آج ذاکر سے لے بیٹھا مگر ایک فریق کو بدل کر۔ انسان اور شیطان کی جگہ انسان اور گناہ کبیرہ نے لے لی۔

ذاکر نے کہا: "انسان گناہ کبیرہ سے کتنی دور ہے اس کا علم مجھے نہیں ہے۔"

تلمیذ نے کہا: "یا یہ کہ گناہ کبیرہ زندگی بھر اس سے کتنے فاصلے پر رہتے ہیں؟"

ذاکر نے کہا: "میں زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں، جتنی باریکی سے تم نے تفسیر اور سیرت کی کتابیں پڑھی ہیں، میں نے نہیں پڑھیں۔ بس اتنا جانتا ہوں آدمی کو ہر وقت چوکنا رہنا چاہیے۔ چوکنا رہے تو اُسے یہ کالے کپڑے پہنے ہوئی بھتنیاں جنہیں گناہ کبیرہ کہا جاتا ہے۔ جب سے آدمی ہوش سنبھالتا ہے مرتے دم تک۔ اپنے اوپر حملہ کرتی نظر آجاتی ہیں۔ اللہ بخشے میری ماں کہتی تھیں: بیٹا ان بھتنیوں سے ہمیشہ ہوشیار رہو۔ کبھی عبادت کرنے سے روکنے کو آجاتی ہیں کبھی غلط کام کروانے کو۔ اور جب غلط کام کروانے کو آتی ہیں تو خوبصورت بن کر آتی ہیں۔ اچھی سے اچھی پوشاک میں۔ آدمی ہوشیار رہے تو اُسے ہمیشہ ایسی نظر آتی ہیں جیسے گھپ اندھیری رات میں کالی کتیا کی چمکتی ہوئی آنکھیں۔"

"صحیح کہہ رہے ہو۔ رہے گناہ صغیرہ۔ اگر گناہ کبیرہ کالے کپڑے پہنے ہوئے بھتنیاں ہیں تو گناہ صغیرہ جونکیں ہیں اور انسان اس جنگل میں چلنے والا شکاری جس کی ٹانگوں میں کیچڑ اور گھنی گھاس جھاڑیوں میں یہ جونکیں برابر چپٹتی رہتی ہیں اور انہیں چھٹانے کے لیے وہ برابر ماچس دکھاتا رہتا

ہے۔''

''پھر بھی کھال پر نشان رہ جاتا ہے۔'' ذاکر نے اس کے خیال میں راہ پا کر کہا۔

''ہاں۔ اور ماچس جب ہی اس کے پاس ہوگی جب وہ سگریٹ پیتا ہو۔''

ذاکر نے اٹھتے ہوئے کہا ''اور سگریٹ پینا خود گناہ صغیرہ ہے۔ تعجب ہے تم نے کیسے جیل میں آ کر چھوڑ دی۔ پہلے تمہاری انگلیاں پیلی تھیں اور ہونٹ سیاہ۔ دوسرے قیدی سگریٹ بیڑی کی بھیک مانگتے ہیں۔''

تمیز کہنے کو ہوا سگریٹ جنت میں جانے والے کو ملے گی یا دوزخ والا اس معاملے میں خوش نصیب ہوگا؟ لیکن یہ کہہ کر وہ ذاکر کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایسا دوست اُسے زندگی بھر نہیں ملا تھا۔ 'اگر ملا ہوتا تو آج کو میری زندگی اس ٹریجڈی پر ختم نہ ہوئی ہوتی۔'

جاتے جاتے ذاکر نے ہنس کر کہا ''وہ بھی ہوتے ہیں جو آخری خواہش پوچھے جانے پر بیڑی یا سگریٹ کی فرمائش کرتے ہیں۔''

ایک دن باہر نکلنے کے وقفے میں ذاکر تمیز کو بتا رہا تھا اس کی ''بڑی لڑکی کی بات طے ہوگئی ہے۔''

تمیز کے دل کو دھکا سا لگا۔

''باقی دو چھوٹی اسکول جاتی ہیں۔ بڑا لڑکا پولس کی نوکری چاہتا تھا اور وہ اُسے مل جاتی لیکن میں نے روکا۔ اب اس کا ارادہ فوج میں جانے کا ہے۔''

تمیز کو وہ ہمیشہ زندگی سے مطمئن نظر آیا تھا، لیکن آج پہلے سے کہیں زیادہ۔ تمیز نے کہا ''آپ کے بارے میں ایک سوال نے مجھے اکثر تنگ کیا ہے۔ برا نہ مانیں تو اس وقت پوچھ لوں۔''

''پوچھو'' ذاکر نے مسکرا کر کہا۔

''وہ جو بات تھی کہ آپ سے قرآن پر حلف اٹھوا کر گواہی دلواتے ہیں۔ میں سوچتا رہا ہوں اس کے بعد آپ کیسے روزہ نماز ''

ڈاکر ہنس پڑا۔ ''اس کا انتظام بھی اللہ تعالیٰ نے کر دیا۔''

''کیا؟''

''کئی سال پہلے کی بات ہے ایک دن میں نے ڈاکٹر سے کہا 'ڈاکٹر صاحب مجھے ایک عجیب بیماری لگ گئی ہے جو مجھے پاگل کر کے چھوڑے گی۔' اس نے پوچھا 'کیا؟' میں نے کہا 'مجھے نہ اپنے جسم پر قابو رہا ہے نہ اپنے بولنے پر۔ لگتا ہے جو دماغ میں آ رہا ہے سب کے سامنے بولتا جاؤں گا۔ اس وقت سارا جسم گرم ہو جاتا ہے، ہونٹ خشک ہو جاتے ہیں اور لگتا ہے جسے دل میں روک رہا ہوں وہ زبان سے نکلنے والی ہے۔' وہ خوف زدہ ہو کر مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا 'خاص طور سے عدالت میں جج کے سامنے کہ اس آدمی کو تو میں نے پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ اور میرے منہ سے نکلتے چلے جائیں کہ جتنی دفعہ بھی جھوٹا حلف اٹھایا ہے۔' بس وہ دن اور یہ دن۔ اللہ نے بندوبست کر دیا۔ اب نہیں بلاتے مجھے، نہ پھر پولس ڈیوٹی پر بھیجا جاؤں گا۔''

ایک صبح شور مچا ہوا صفدر اپنی کوٹھری میں مرا پڑا ہے۔ سب اپنی اپنی گرل کو پکڑے اس طرح کھڑے تھے جیسے زور مار کر باہر نکل آئیں گے اور نعرے لگانے لگیں گے کس نے اُسے مارا۔

تمیز شب بیداری کے بعد فجر کی نماز پڑھ کر سو گیا تھا۔ لوہے کے دروازے کو کھولنے اور دوسرے قیدیوں کے اپنے دروازوں کو بھڑ بھڑانے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ صفدر کو کچھ ہوا ہے یہ اس کی سمجھ میں آ گیا۔ 'کیا کمرے ہی میں پھانسی دے دی؟' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر ہاتھ جھاڑتا ہوا صفدر کی کوٹھری سے نکلا اور اس کے پیچھے قیدیوں نے اس

کے بھاری جثے کو ایک کھری کھاٹ پر لے جائے جاتے دیکھا۔ ساتھ ساتھ کونسٹیبل، سنتری وغیرہ تھے۔ پھر خبر پھیل گئی: صفدر سانپ کے کاٹنے سے مرا ہے۔

کرم علی نے بسورتی صورت لیے کہا' یہ جیل ایسی ہی جگہ ہے۔ کل سپرڈنٹ کے آفس لے جاتے وقت میرے پاؤں میں کانٹا اتنا گہرا چبھا کہ گھنٹوں خون بہا۔'

کسی نے اس کی بات کو توجہ سے نہیں سنا۔

اُن دنوں تمیز کو جیل کے عملے نے سنایا تھا، ایک بار نہیں کئی بار، تمہاری پھانسی کی تاریخ مقرر کی جانے والی ہے۔

صبح کی نماز کے بعد جو دعا وہ کئی دن سے مانگ رہا تھا یہ تھی:

' میرا اس جسم سے جو تو نے پہنا رکھا ہے پیار ختم کر دے۔ اس کے نہ رہنے کا خوف دور ہو جائے۔ تب تک اس کی بس اتنی دیکھ بھال کروں کہ میرے کام کا رہے۔ اسے اتار کر چل کھڑے ہونے کا غم ختم کر دے' کبھی دعا مانگتے مانگتے دماغ بہک جاتا اور وہ اپنی کھال کو کہیں سے بھی پکڑ کر کہتا' کب تک تیری دیکھ بھال کروں!'

وہ دور ختم ہو چکا تھا جب اس کی دعا ہوتی تھی' اب جو جیوں گا تو اپنی ذات کی تجھے مکمل سپردگی کے ساتھ — Total surrender'

صفدر کے چلے جانے والی رات سب قیدی ڈرتے ہوئے سوئے تھے۔ تمیز دیر تک گرل کو پکڑے کھڑا رہا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں موت کے فرشتے کو ڈھونڈ رہی تھیں جسے ایک رات وہ دیکھ چکا تھا۔ لیکن نہ گھاس میں کوئی حرکت تھی نہ سرسراہٹ۔

سونے سے پہلے وہ خود سے کہہ رہا تھا' نہیں مجھے نئی زندگی نہیں چاہیے۔ مجھے ان بنا دے، جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ نئی زندگی بھی نہیں چاہیے۔ وہی تو پھر خود سے لڑتے گزرے گی اور میں اُس

لڑائی سے تھک گیا ہوں۔"

سلیمان کے ٹرانسفر کے بعد جو پولس افسر اس کی جگہ آیا، ابو موسیٰ، اس کے بارے میں سب جانتے تھے 'demote' ہو کر یہاں آیا ہے۔ اُسے پہلے سے معلوم تھا یہاں ایک وہ قیدی بھی ہے تمیذ، جیل کی زندگی جس کی تالیف قلب کر چکی ہے۔ ڈیڑھ رو میں سال گزارتے ہوئے صرف نماز روزہ ہی اس کے شب و روز نہیں بن گئے ہیں وہ ان کے سوا بھی کچھ حاصل کر چکا ہے۔ جس سے دوسرے قیدی آزادی کے وقفے میں آیات کے معنی اور تفسیر سنتے ہیں اور محمد مصطفےٰ صلعم کی زندگی کے وہ واقعات جو اُن کی پریشانیوں کو اُن پر سہل بنا دیتے ہیں۔ اور کچھ اُسے اپنے کردار کے تاریک پہلوؤں کا حال سنا کر اپنا دل بھی ہلکا کرتے ہیں۔

ایک دن ابو موسیٰ تمیذ کے پاس اس وقت آیا جب بیش تر مجرم دن کے کھانے کے بعد سوتے جا رہے تھے یا سو چکے تھے۔ اس نے گرل میں سے ہاتھ گزار کر اپنا کھلا ہوا سنہری سگریٹ کیس تمیذ کی طرف بڑھایا۔ تمیذ نے دیکھا اس کا میزبان ہر چیز میں مہنگا ذوق رکھتا ہے — سگریٹ، سگریٹ کیس، لائٹر، انگوٹھی اور گھڑی۔

"سب کمزوریاں چھوڑ چکا ہوں۔" تمیذ نے بغیر ہاتھ بڑھائے کہا۔

اس بات کا ابو موسیٰ پر اثر نہیں ہوا۔ اس نے اپنا سگریٹ سلگاتے ہوئے فلسفیانہ انداز سے کہا: "کیا ستم ظریفی ہے انسانی حیات کی، کہ اُسے جو گرد و پیش دیئے گئے ہیں اُن میں کیا نہیں ہے، اور جو ہے اس میں سے کیا ممنوع نہیں رکھا گیا ہے! وہ اس وسیع دستر خوان سے کچھ لے تو گنہگار بن جاتا ہے، نہ لے تو ڈپریشن کا شکار مانا جاتا ہے — اُداسی کا مریض۔"

تمیذ نے اس کے چہرے پر پڑھنے والی نظر ڈالی۔

"بعض تو یہاں تک کہہ بیٹھتے ہیں جو سب کچھ تک رسائی ہوتے ہوئے اُس میں سے کچھ بھی نہ

---

[1] عہدے کا گھٹنا

لے وہ بچ واؤ ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی بات پر قہقہہ مار کر ہنسا، تنہا، اور بغیر رکے بولا'' آدم کا پالا صرف ایک پیڑ سے پڑا تھا اور اس کا پھل کھانے سے اُسے روکا گیا تھا، یہاں تو ممنوعہ پھلوں کے ان گنت پیڑ ہیں - باغ کے باغ۔'' لگتا تھا demote کیے جانے کا اس پر مطلق اثر نہیں ہوا ہے۔

تملیذ نے خود کو بتلایا 'یہ نہیں سدھرے گا۔'

ذاکر کو ابوموسیٰ پسند نہیں تھا لیکن وہ اگلی ہر ملاقات میں تملیذ سے اس کے بارے میں کوئی سوال بھی نہیں کرتا تھا۔ ایک دن خود ہی تملیذ نے ذاکر سے کہا'' یہ صاحب جس اپنائیت سے مجھ سے بات کرتے ہیں اس سے مجھے تو یہی اندازہ ہوا ہے ان کے دماغ میں دو میں سے ایک بات ہے۔''

'' کون سی؟''

'' یا تو یہ میری رہائی کی تمنا لے کر یہاں آئے ہیں - نیا مواد جو یہ اوپر بھیج سکیں کہ وہ قتل اس شخص نے نہیں کیا تھا (ذاکر ہنس پڑا) یا یہ کہ میں ان کی باتوں سے متفق ہو جاؤں: انسان نہ گنہگار پیدا ہوتا ہے، نہ گزرتی زندگی کے ساتھ گنہگار بنتا جاتا ہے۔ گنہگار اگر ہے تو اس کا ماحول۔ بلکہ گناہ ساز''

ذاکر اٹھ کھڑا ہوا، وہ اُن خوش قسمت سیدھے سادے آدمیوں میں سے تھا جو جس مذہب پر پیدا ہوتے ہیں اُسے مضبوطی سے ساری زندگی تھامے رہتے ہیں، کبھی اپنے ایمان میں دراڑ نہیں پڑنے دیتے ہیں۔

ابوموسیٰ ان میں سے تھا جن کی ایمان پر گرفت پہلے سے ڈھیلی ہوتی ہے اور سوچ کر اُسے قبول یا رد کرنے کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی وہ اُن کے لیے اہمیت کھو چکا ہوتا ہے۔

نوکری میں تنزل اپنے جلو میں اس کے لیے جذباتی ہیجان لایا تھا۔ وہ اُسے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا' کیا جو میرے ساتھ ہوا وہ اوفیشیل سزا ہے جس کا میں مستحق نہیں تھا کیونکہ جو میں کر رہا تھا وہ دوسرے بھی کر رہے تھے، ان پر دفتری کارروائی کا فالج نہیں گرا، مجھ اکیلے پر گرا۔ یہ کوئی دوسری قسم کی سزا ہے - اوپر سے آنے والی۔ اور یہ دوسری وجہ اُسے بار بار تملیذ کے سیل تک لاتی تھی۔

تملیذ کو اسی مقصد سے اوفس بلواتی تھی کہ اس کے ذہن میں جو بیان اپنی دفاع میں بنتا گیا تھا بلا پوچھے اُسے کسی کے سامنے دہراتے رہنے سے آہستہ آہستہ سزا کا یہ پہلو اپنا نشتر کھو بیٹھے، اُسے یقین ہوجائے جو کچھ اس نے کیا، جس کی وجہ سے اس کی بدنامی ہوئی اخلاقی کمزوری کی بنا پر نہیں تھا۔ اگر اس سے کہا جاتا گناؤ تمہارے محکمے میں ایسے کتنے آدمی ہیں، صرف افسر نہیں، جن پر کرپشن (بدعنوانی) کا چارج ہے تو وہ بلا جھجک کہتا: اُن کی نسبت ان کی گنتی آسان ہوگی جو کرپٹ نہیں ہیں۔ اپنے دل میں وہ مطمئن تھا آئندہ جو کچھ بھی کروں گا زیادہ احتیاط سے کروں گا۔

ابو موسیٰ کا کہنا تھا ''بڑے ہونے کے عمل میں آدمی کا اپنا اصل کچھ بچا ہی نہیں ہوتا ہے، جسے لے کر وہ پیدا ہوا تھا — وہ کل میزان[1] ہوتا ہے اپنے ماں باپ کے سائے، گھر کے ماحول، اپنے خاندان کے ماضی اور حال کا — وہاں کی اقدار کتنی قیمتی تھیں، کتنی بے مول ...''

(تملیذ خود کو اس سے متفق ہوتے دیکھ کر بوکھلا جاتا تھا)

''محلہ، اسکول کے ساتھی، ٹیچر، دینی معلم، ساتھ کے کھیلے ہوئے اور دوست۔ ہر ایک کی شخصیت خود میزان ہوتی ہے انہی سب کا۔ اور ان سب پر کام کرتی ہے سوسائٹی اور ملک کی فضا ...''

تملیذ زیادہ دیر خود پر قابو نہ رکھ سکا: ''lust[2]، غصہ، ضرورتیں ضروری اور غیر ضروری ان کو پورا کرنے کے لیے انتظار کرنا سیکھا تھا یا نہیں؟ ناآسودگی frustration کو ہینڈل کرنا اگر اس کے بڑوں اور اساتذہ کو آتا تھا تب ہم اس سے امید رکھنے میں برحق ہوں گے کہ وہ اپنی طلب کے — ہر قسم کی طلب کے — پورا کرنے کو ملتوی کر سکے۔''

ابو موسیٰ اُسے تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ بولا: ''مگر اُسے کون ملتے ہیں بدچلن بزرگ اور بدچلن اساتذہ۔''

تملیذ نے پوچھا: ''جو آپ نے کہا اس کا اطلاق اوروں پر ہوتا ہے یا خود آپ پر بھی؟''

---

[1] sumtotal

[2] ہوائے نفس

ابوموسیٰ جلبلا گیا۔ بولا ''نہیں نہ مجھے بدچلن اساتذہ ملے تھے نہ بدچلن گھر والے، بزرگ۔''

''پھر؟''

ابوموسیٰ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد آنے والے سوال کو وہ نہیں سننا چاہتا تھا۔

ایک دن تلمیذ کہہ بیٹھا ''مگر یہ سب آپ مجھے کیوں سناتے ہیں؟''

''دو آدمی جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو انہیں کوئی نہ کوئی موضوع تو چاہیے ہوتا ہے بات کرنے کے لیے۔''

''دو آزاد آدمیوں کو — ایک قیدی ہو اور دوسرا آزاد، انہیں نہیں۔ اس موضوع میں مجھے دلچسپی نہیں۔ میں اپنی تسکین اور تسلی کے لیے یہی کچھ کیا کرتا تھا، ہر گناہ ہر خطا کا جواز ڈھونڈنا۔ فرق اتنا ہے آپ اونچی آواز میں دوسروں کو سنا کر یہ کام کرتے ہیں، میں خاموشی سے خود کو سنایا کرتا تھا'' تلمیذ نے کہا۔

''پھر؟''

''پھر مجھے معلوم ہو گیا یہ بھی ایک طرح سے اپنے گناہوں کو دھونا ہے۔''

''اس کے بعد کیا ہوا؟'' ابوموسیٰ نے پوچھا۔

''مجھے معلوم ہو گیا یہ طریقہ اسی دلدل میں لے جاتا ہے جس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مارے تھے۔ اس سے باہر آپ نہیں نکل پائیں گے۔ اور جب آپ اس سے نہیں نکل پائیں گے تو سکون بھی نہیں ملے گا۔ کیوں نہیں مان لیتے ہو بدعنوانی کا شکار تھے۔ اس سے کیا غرض دوسرے یہی کام کرتے تھے یا نہیں۔ تم کرتے تھے اہمیت اس کی ہے۔''

ابوموسیٰ پھٹی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔ خود اس نے قانون کا محافظ ہوتے ہوئے ایک قیدی کو یہ سب کہنے کا اشارہ کیا تھا۔

''جھوٹ کو سچ، سچ کو جھوٹ بناتے تھے بالآخر پکڑ میں آ گئے۔''

ابوموسیٰ نے غصے سے کہا ''میرے خلاف چارج جھوٹا ہے۔''

''شاید صحیح چارج یہ ہوتا کہ تمہیں جو تنزلی کا آرڈر ملا ہے اس میں لکھا ہوتا: تم اپنے سینیئرز کے تحفظ میں رشوت لیتے تھے۔ مگر ایک وقت آیا جب اُن کو اس تحفظ کا صلہ دینے میں تامل کرنے لگے اس لیے demote کیے جاتے ہو۔'' آخری جملہ کہتے ہوئے وہ بے اختیار اونچی آواز میں ہنس پڑا۔

ابوموسیٰ نے تقریباً چیخ کر کہا ''اب موقع ملا تو سال بھر ہی میں اتنا اثاثہ بنا لوں گا جتنا سیاسی لیڈر اور وزیر ساری زندگی میں بناتے ہیں۔ میرا پیسہ اُن سے زیادہ برا نہیں ہوتا تھا۔''

''دنیا چھوڑنے پر انسان سب کچھ یہیں چھوڑ جاتا ہے -اپنی زندگی تک جو آخرت میں اس کے کام کی نہیں رہتی۔'' تکمید نے بھی تقریباً چیخ کر کہا۔

باقی دن تکمید کا ایک ایسی خوشی میں گزرا جسے وہ عرصے سے بھولا ہوا تھا۔ سالوں بعد کسی پر فتح نصیب ہوئی تھی۔

(۷۰)

جب تمیز کے سننے میں آرہا تھا اب سزائے موت کے ملنے میں زیادہ دن نہیں ہیں ایک ملاقات کے دن سلیم اس سے ملنے آیا۔ خلاف توقع اکیلا۔ اب وہ چہرے اور کپڑوں سے سوسائٹی کے درمیانی طبقے کا ایک باعزت شخص لگتا تھا — یا نچلے درمیانی طبقے کا۔

سلام علیک کے بعد اس نے اپنی آواز اور آنکھوں پر قابو رکھتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر چند الفاظ میں بتایا:

''باجی کا انتقال ہوگیا۔''

تمیز ہکا بکا رہ گیا۔ ''کب؟'' اور اس کے فوراً بعد ''کیسے؟ کیا بہت بیمار تھیں؟''

''انہیں کینسر تھا۔''

''کیسا؟''

''جسم کے کسی حصے کا۔''

اس کے آگے تمیز کچھ نہ پوچھ سکا۔

''ہمارے ساتھ رہتی تھیں۔ میرے بچوں کو پال رہی تھیں کیونکہ میں زیادہ وقت مل میں رہتا ہوں اور بیوی ہائی اسکول ٹیچر ہے۔

(تمیز ایک ٹک اُسے دیکھے جا رہا تھا جیسے آواز گم کر بیٹھا ہو)

''آپ نے جو کچھ ہمارے لیے کیا وہ بس ہم جانتے ہیں۔''

تلمیذ کچھ نہ کہہ سکا۔ نسلیم کے اس جملے سے اُسے لمحے بھر کو خوشی محسوس ہوئی۔ کس نے کس کے لیے کچھ کیا تھا اس کا فیصلہ وہ نہیں کر سکتا تھا۔

امینہ وہ واحد ہستی تھی جو جتنے دن ساتھ رہا اُسے، بغیر کسی قسم کی سودا بازی کے، خوش رکھنے کے فرمان پر چلی تھی۔

''آپ نے جو بھی کیا ہو، وہ نہیں کیا ہوگا جس کی سزا میں آپ کو یہاں رکھا گیا ہے اور میں جانتا ہوں آپ کو جو سزا دی جائے گی وہ غلط ہوگی۔''

اب بغیر کوشش کے تلمیذ کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

رخصت ہوتے وقت سلیم نے کہا ''جہاں سزائے موت ہوگی وہاں بے گناہ کے جان سے جانے کا امکان ہمیشہ رہے گا۔''

تلمیذ نے جھوٹے تمسخر سے کہا ''اور جہاں سزائے موت نہیں ہوگی وہاں قاتل دندناتے پھریں گے۔''

تھوڑے توقف سے تلمیذ نے کہا ''ہر مرنے والے کی آخری خواہش ہوتی ہے۔ اب میرا دنیا میں کوئی نہیں رہا۔ میری آخری خواہش تم پوری کرو۔''

''جی۔ جی'' اس نے گھبرا کر کہا ''حکم دیجیے۔''

''اپنے بیوی بچوں کو مجھے دکھانے لاؤ اور۔۔۔'' وہ کچھ امینہ کی قبر کے بارے میں پوچھنے کو ہوا۔

''کیا؟''

''کچھ نہیں۔''

اس کے کچھ ہی دن بعد جو سنتری ملنے کے لیے آنے والوں کا پیغام قیدیوں کو سنانے آتا تھا ایک شام تلمیذ سے بولا ''تم سے ملنے کوئی عورت آئی ہے۔''

وہاں پہنچنے پر تلمیذ نے اُس عورت کو وہاں گیٹ میں کھڑے دیکھا جہاں سے ملاقاتی اندر کے ہول میں داخل ہوتے تھے۔ عورت سفید دو حصوں والے برقع میں تھی جیسا میمونہ پہنتی تھی،

چہرے پر نقاب تھا۔ ساتھ میں دو بچیاں تھیں جن کی توجہ اس کی طرف تھی۔ وہ گرل پکڑے کھڑا رہا لیکن عورت وہیں گیٹ میں گھڑی بھر کھڑے رہنے کے بعد واپس چلی گئی۔

اُسے بچیوں کے چہرے ٹھیک طرح سے دیکھنے کی آرزو ہی رہ گئی کیونکہ ہول میں روشنی مدھم تھی اور باہر سے آنے والی روشنی نے اُن کے سر کو اجاگر کر رکھا تھا، چہرے کو نہیں۔

'کیا اگر پاس آتی اور ہمارے ہاتھ چھو جاتے (جس کا امکان کب تھا!) یا وہ بات کر لیتی تو اُس کا دوسرا نکاح ٹوٹ جاتا! اگر دوسرا نکاح کیا ہے تو! آئی کیوں تھی؟ جلانے؟ بدلہ لینے؟ لیکن بدلہ لینا اُس سے دور تھا۔ شاید بیٹیوں کو باپ کی صورت دکھانے لائی تھی جسے کسی دن بھی پھانسی ہو سکتی تھی کہ 'دیکھ لو، یہ ہے تمہارا باپ۔'

شاید مجھے بلا کر واپس جا رہی تھی اور مجھے آتے دیکھ کر پلٹی اور واپس چلی گئی۔'

'چند ہفتے پہلے بھی مجھ سے ملنے ایک عورت آئی تھی۔ مجھے وہاں لے جایا گیا تھا۔ وہ بھی برقعے میں تھی۔ وہ بھی لوہے کی جالی کے نزدیک نہیں آئی تھی۔ اگر بیوی ہوتی تو بچیوں کو لے کر آتی۔ ایک نظر ڈال کر وہ پلٹ گئی تھی جیسے چیک کرنے کو آئی تھی کیا میں واقعی وہ ہی ہوں۔ لیکن کون؟'

اس دن سارے دن تلمیذ کو ایک خیال ستاتا رہا جیل سپرنٹنڈنٹ سے کہہ دوں مجھ سے ملنے جو بھی آئے اُسے منع کر دیا جائے کہ میں ملنا نہیں چاہتا۔ لیکن دماغ اس پر پوری طرح راضی نہیں تھا۔ شاید میمونہ کی محبت جاگ اٹھے اور اُسے خیال آئے میں اس کی اور بچیوں کی محبت میں تڑپ رہا ہوں گا اور انہیں دکھانے پر مجبور ہو جائے۔'

(۷۱)

ایک دن عشا کی نماز اور وظائف کے بعد تلمیذ لوہے کی گرل کے دروازے سے لگ کر لیٹ گیا۔ بس وہی ایک جگہ تھی جہاں ہوا کا گزر تھا، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے جس کو چھوتی ہوئی ہوا گزرتی تھی۔ چیونٹیوں اور جھینگروں کا آنا جانا اس کے نیچے سے رہتا تھا، وہ بھی جب کھانے کے بھورے فرش پر گرے ہوں۔ لیکن وہ سب کب کے اس کے لیے بے ضرر بن گئے تھے۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا کوک روچ بھی آ نکلتا تو تلمیذ اُسے کچھ نہ کہتا۔

اس کی سیدھی بانہہ سر کے نیچے تھی اور انگلیاں بالوں میں چل رہی تھیں۔ سر اتنا ہلکا تلمیذ کو ساری زندگی میں نہیں لگا تھا۔ خطاؤں اور گناہوں کا اقرار، بغیر کسی دوسرے پر ان کا الزام دھرے، خدا سے کر لینے کے بعد ساری ذہنی کشمکش ختم ہوگئی تھی۔ پہلے اگر وہ ذہن کی رہائی کے لیے بات اس پر ختم کرتا تھا ہر برائی کے لیے کسی نہ کسی نے مجھے اس کی اسٹارٹنگ لائن پر کھڑا کیا تھا، میرا گناہ حقیقت میں ہے تو اتنا کہ ہمیشہ آسانی سے ترغیب کے جال میں پھنس جانے والا آدمی رہا، جو اسٹارٹنگ لائن پر شوٹ سنتے ہی دوڑ پڑتا تھا، لیکن جب دن گزرتے گئے اور ذہن کو رہائی نہیں ملی تو اس کی فکر نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

'وہ لڑکی جس نے چھ سال کی عمر میں ایک نئی لذت سے روشناس کرایا ظاہر ہے اس کو بھی کسی نے اُس دوڑ پڑنے والی لائن پر لا کھڑا کیا تھا۔ ماں، باپ کی لاپرواہی، بڑے بھائی بھابھی کی اگر وہ

تھے تو؟ میں اپنا الزام اس پر نہیں دھروں گا۔

'ہوائے نفس، جوا، عیاشی میری زندگی کے خطرناک اسپورٹس رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے ان سے کسی نہ کسی نے میرا تعارف کرایا تھا۔ چاہے اُسے اس کا الزام دوں نہ دوں۔ جانتا ہوں مکمل سکون کے لیے بے چون و چرا غلطیوں، گناہوں، کوتاہیوں کو تسلیم کرنا ضروری ہے، مکمل طور سے۔ تب ہی نجات ممکن ہے۔ خیر وہ مرنے کے بعد کی بات ہے۔ اصل چیز سکون ہے اس زندگی کے لیے جس کا کوئی ختم نظر نہیں آتا ہے۔'

وہ سوچتا تھا کیا میری طرح ان دوسرے قیدیوں کے بھی جنہیں سزائے موت سنائی جا چکی ہے، دماغ دن رات کام کرتے رہتے ہیں؟ شاید نہیں، یا بہت کم کے۔ حالانکہ انہیں بھی موت کا حکم سنا کر مستقل موت سے دور رکھا جا رہا ہے۔ اگر موت اس دور میں آ جاتی جب میں اس سے ڈرتا تھا تو دماغ میں یہ کبھی نہ رکنے والی چکی نہ چلتی جیسے اپنے ضمیر کی عدالت میں دن رات کھڑا ہوں۔'

تب اُسے احساس ہوتا ابھی بھی بہت کچھ میرے فردِ جرم اور فردِ گناہ میں موجود ہے جس پر میری نگاہ نہیں پڑی ہے مجھے خود کو ذرہ برابر بھی معاف نہیں کرنا ہے، وہ نہ کیا تو سکون ہمیشہ ٹُل دیتا رہے گا۔

'وہ دوسرا بڑا گناہ جو مجھ سے ساری زندگی سرزد ہوتا رہا میرا غصہ تھا۔ غصے سے پھٹ پڑنے والا گناہ۔ اس کی نہ کوئی اسٹارٹنگ لائن تھی نہ کسی نے اس پر لا کھڑا کیا تھا۔

'وہ آپے سے باہر ہو جانے والا غصہ جس کی وجہ سے کتنے ہی کام بگڑے، کتنی ہی بار بے عزتی ہوئی۔ پہلے میں بے عزتی کرا لینے کے بعد خود کو جیسے بہلانے کے لیے کہتا تھا وہ تو مجھ میں موروثی ہے۔ میں اکیلے خود کو کیوں اس کا الزام دوں۔ اگر غصہ باپ دادا میں عزت کی چیز تھا تو میرے لیے بھی عزت کی چیز ہے۔ مردانگی کا نشان۔

'جس دن میں چند دوستوں کے ساتھ، انہیں دوست کہنا خود کو دھوکا دینا ہے، تاش کھیل رہا تھا، سب نے میرے پیسوں کے روسٹ چکن اور سیخ کے کباب کھائے تھے۔ میری ایک بوتل وسکی

کی ختم کر چکے تھے، دوسری کے لیے میرے نوکر کو ہورس شو ریسٹورنٹ بھیج رکھا تھا۔ میں بھی پیئے ہوئے تھا لیکن تھوڑی، بہت تھوڑی۔

'وہ، اب میں اس کے نام کے ساتھ وہ الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہتا ہوں جو پہلے کرتا تھا، سب انسپکٹر پولس اسفہانی چرس پر شراب اور شراب پر چرس پینے کا عادی تھا، بدکنے لگا کہ تم نے شوکرانے سے پہلے پتے بدلے ہیں۔ تب مجھ میں ہزار عیب تھے لیکن جوئے میں بے ایمانی میں نے کبھی نہیں کی تھی۔

میں نے کہا'' یہ کام تیرے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔'' مجھے اب تک اپنے الفاظ یاد ہیں۔

اس نے ماں کی گالی دی۔

میں نے میز کے پار ہاتھ لے جاکر اسے گردن کے پیچھے ہاتھ ڈال کر وردی کی قمیص کے کولر سے پکڑ کر اس زور سے گھسیٹا کہ اس کے دانت اور ناک میز سے ٹکرائے۔

'جب سے میں کمانے لگا تھا آدھ سیر دودھ کسی کھلے منھ کے برتن میں روز رات کو کسی ایسی جگہ رکھ کر سوتا تھا جہاں ہوا کا گزر ہو۔ اوپر ململ کا ٹکڑا ہوتا تھا اور اندر دو ٹکیاں مکھن کی اس پر تیر رہی ہوتی تھیں۔ یہ طورع میں بھی رہا اور اس کھاڑی کی بندرگاہ میں بھی۔ صبح ورزش کے بعد وہ میرا ناشتہ ہوتا تھا۔ ٹھنڈی ہوا میں رات بھر کھلے رہنے سے جیسے اس میں جان پڑ جاتی تھی۔ شادی کے بعد بھی وہ جان جسم میں ابھی باقی تھی۔'

('لیکن وہ جان اس وقت کام نہیں آئی جب زندگی میں پہلی دفعہ تھانے میں ایک پولس اوفیسر نے تمہارے ساتھ وہ سلوک کیا تھا۔')

تلمیذ نے مخالف خیال کے اس دخل در معقولات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے خیال کی پتوار کو درست رکھا۔

'اور اپنے بارے میں یہ رائے ٹھیرائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا: میں ساری زندگی ایک بہادر انسان رہا ہوں، جس کے اعصاب جب جرم کا پلان بنا رہا ہوتا تھا، یا اُسے بجا لا رہا ہوتا تھا، یا جہاں پکڑے جانے کا خطرہ ہوتا تھا بغیر ہیجان کے اُسے جھیل جاتے تھے۔'

('واقعی؟ اس وقت اپنی بے عزتی پر تمہارے ہاتھ اور منھ بے طاقت رہے تھے۔')

'جہاں لڑنے کا موقع ہوتا تھا لڑتا تھا، بہادر انسان تھا۔'

('او! تم جسمانی طاقت کو دلیری کے مساوی رکھ رہے ہو۔')

تملینڈ نے دھیان کو دوسری طرف لے جانا چاہا۔ دماغ میں خود پسندی اور عاجزی کی رسہ کشی ختم نہیں ہوئی تھی اور ایسے موقع پر اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اپنے خیالات کو کس سمت رکھے۔ اور اس سے زیادہ دکھ اس بات کا ہوتا تھا جیتے جی مکتی ابھی تک اُسے نہیں ملی ہے۔

('حقیقت میں تم اندر سے بزدل انسان تھے۔ اندھیرے سے ڈرتے تھے، رات کو مرگھٹ یا قبرستان کے پاس سے ہوکر گزرتے ہوئے تمہارا دل اتنا تیز ہو جاتا تھا کہ دیکھنے والا اسے تمہاری قمیص کو دیکھ کر سمجھ سکتا تھا، اور ٹانگیں کانپنے لگتی تھیں۔')

'بس؟' تملینڈ نے پوچھا۔

(''اور موت سے، اور ہر قسم کے اوپریشن کے نام سے ڈرتے تھے۔ انجکشن کی سوئی کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ جب ڈاکٹر قادری نے کہا تھا ''گردے میں پتھر ہے اور اس کا اوپریشن کیا جانا ضروری ہے۔'' کتنے دن اس اور اُس حکیم اور ہومیوپیتھ کے پاس جاتے رہے تھے کہ کیا پتھر گلا کر نہیں نکالا جا سکتا ہے؟ آخیر میں جب ڈوکٹر نے اوپریشن کا دن مقرر کر دیا تو تم نے کہا تھا ''ڈاکٹر صاحب مجھے یقین ہے اگر ایک بار اوپریشن ٹیبل پر لٹایا گیا تو اٹھوں گا نہیں۔'' اور ڈوکٹر نے بغیر کسی قسم کے جذبات کے تمہارے لیے دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا: ''ایسا ہے تو کھڑے ہوکر اوپریشن کرالو۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔'')

'سو میں کون تھا؟ شیر یا گیدڑ؟'

('دونوں میں سے ایک بھی نہیں۔ جب بھی آدمی تھے۔ ڈرپوک')

'اب اپنی موت کی طرف سکون سے چل کر جاؤں گا۔'

چاند ابھر کر عین سامنے نگہداری کے برج کے اوپر آ گیا تھا۔ اطراف کے کتے بھی سو

گئے تھے۔ دور کے ہوٹلوں سے فلمی گانوں کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی جو صرف ٹریفک کا شور ختم ہو جانے پر آتی تھی ('فلمی گانوں کا معیار کتنا گر گیا ہے' اُسے اکثر خیال آیا تھا) پوری جیل سوئی پڑی تھی۔ اور سارا شہر۔

جو بانہہ سو گئی تھی اُسے آزاد کر کے، اس نے دروازے ہی سے خود کو سٹا کر سر کو اُدھر کیا جدھر پہلے پیر تھے اور دوسری بانہہ پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

ایسا لگ رہا تھا سر اپنے اوپر دھری گٹھری کا سارا سامان زمین پر الٹ کر اُسے دکھا چکا تھا۔ دیکھ بھائی تلمیذ اب کچھ نہیں بچا ہے دکھانے کو۔

('کچھ نہیں؟')

ابھی بھی دماغ سزا دینے پر آمادہ تھا۔

جس دن پہلی بار اس نے اپنی سرشت کی ساری چھپی کمزوریاں ڈھونڈ لی تھیں اُسے بڑا سکون محسوس ہوا تھا کہ 'بس یہی خرابیاں تھیں مجھ میں۔'

('اور ہر خرابی اپنے اندر خرابیاں رکھتی تھی یہ مت بھولو')

اب وہ اپنے گناہوں کو نام دے کر صحیح معنوں میں ان کا اقرار کر کے توبہ کر سکتا تھا: 'ورنہ پہلے سب اُڑا اُڑا تصور تھا: گنہگار ہوں۔ وہ تو سب ہیں۔ ناکردہ گناہوں کو گننا جو کبھی مطمئن کر دیتا تھا، اپنا اثر کھو چکا تھا۔

'عیاشی میں وہ سب کچھ تھا جو تائے ابا میں شاید پیدائش کے وقت ہی سے نہیں تھا۔ عیاشی، جوا، شراب اور ہوائے نفس یہ اجزا مل کر زندگی کو جو چیز فراہم کر رہے تھے وہ ابھی تک مجھ سے جڑی ہے، جس طرح بکسوں کی وہ کوٹھری، جس طرح وہ خود کو بچوں کو دکھانے والا آدمی، وہ سڑک جو انگریزوں کی نئی راجدھانی میں خونی دروازے سے شہنشاہی مسجد کو جاتی تھی، اب بھی جاتی ہے وہاں جو شے فروختنی تھی، کلبز میں دیسی وہسکی، بلمور یاز کے نزدیک کی بار، تسنیم ('نہیں وہ نہیں')، کسم ('نہیں وہ نہیں')، دلآرا ('نہیں وہ بھی نہیں')، امینہ (دماغ چپ رہا) سوہو کے سوٹ، فان ہیوسین شرٹس، قیمتی گالوں جیسی چکنی ٹائی، چینی ریستوران — 'ہاں، ہاں، ہاں'

واٹ نون سینس۔ تسنیم اور کسم اور دلآرا کو میں اس لسٹ میں شامل نہیں کرسکتا ہوں۔ نہ ہی اُسے جو روٹھ کر چلی گئی۔ طلاق یا خلع دو محبت کرنے والوں میں طویل روٹھ جانے کے سوا کیا ہے۔ ان چاروں کا تصور ہمیشہ بغیر جنس کے آیا، بلکہ اب تو امینہ کا چہرہ اور جسم بھی بغیر لذت کے خیال میں دیکھ سکتا ہوں۔

('غلط')

[1]I think I am saved. A man is above sin when he can think about a a young woman, can see her in his imagination, as just another human being.

('تم گاندھی ہو رہے ہو')

[2]Sin is bad but guilt is worse.

[3]They were three saints:تسنیم، کسم اور دلآرا

'اور امینہ؟ دنیا میں پھنسی ہوئی عورت، اس کا چہرہ معصوم تھا اور پیار بھی اتنا ہی معصوم۔ میں جب ڈوب رہا تھا، جس پانی میں ڈوب رہا تھا مجھے گدلا لگا۔ اب پانی کے سر کے اوپر آ جانے پر دیکھتا ہوں کہ نہیں پانی شفاف تھا- جن یا ہیرے کی طرح شفاف۔ میں تو اس لڑکی کو، آج جا کے اس کا نام یاد آیا صاحبزادی، اس جرم میں شریک نہیں کروں گا، وہ نہ آئی ہوتی اس کی جگہ پہل کوئی اور کرتا تو آج جو ہوں اس سے کہیں زیادہ مجھے خود سے نفرت ہوتی۔'

نیند آتے آتے بھاگ گئی۔

'شراب بنانے کے اجزا- جو، کھجور، سیب، انگور، گھوڑی کا دودھ یہ سب کس نے بنائے؟ جنس کو

---

[1] میرا خیال ہے مجھے نجات مل چکی ہے۔ جب آدمی کسی جوان عورت کے لئے محض ایک انسان کی حیثیت سے سوچ سکتا ہے، اُسے تصور میں لاسکتا ہے وہ گناہ سے بالا ہوجاتا ہے۔

[2] گناہ برا ہے اور احساسِ گناہ اس سے بڑھ کر۔

[3] وہ تین دیویاں تھیں۔

ابھارنے والی ہستیاں، وہ سب کچھ جسے زبان ڈھونڈتی ہے۔ تو جب ہر طرف اے خدا تو نے ان سب کا اہتمام کیا ہے تو کسی کو گنہگار ٹھیرا کر اس سے سوال جواب کرنا کیا ضروری ہے! اس سے تو حکم دیا ہوتا کہ آدمی پیدا ہو......

'مگر یہ کمزوریاں اگر نہ رکھی ہوتیں تو تجھے کیسے پتہ چلتا کون نیک ہے کون بد۔ حقیقت میں یہ نظام تو نے اپنی سہولت کے لیے بنایا ہے۔'

اس کے بعد تھوڑی دیر کے لیے دماغ سوچ چھوڑ گیا۔ پھر کروٹ لے کر اس نے ہونٹوں کی جنبش سے کہا ''حقیقت میں نیکی اور بدی کی تمیز دے کر تو نے انسان پر بڑا ظلم کیا ہے۔''

برابر کی کوٹھری سے آواز آئی ''سونے دو یار۔''

ایک دم وہ اٹھ کر بیٹھ گیا: 'یہ میں کیا کہہ گیا! حقیقت میں یہ کسی اور کے الفاظ ہیں۔ ناصر کے، جو جیل میں مرا تھا جانتا ہوں۔ نہیں اے خدا، میں بے چوں و چرا، ہر گمراہی میں خود کو ذمے دار سمجھتا ہوں، صرف خود کو۔ آخر کو ہوش سنبھالنے کے بعد سے اتنی سمجھ آ گئی تھی کہ جو چیز زمین پر گری ہو اُسے اٹھا کر نہیں کھاتا تھا، اماں بی دیکھ رہی ہوں یا نہیں۔ کبھی پھٹا ہوا دودھ نہیں پیا۔ اس جیل میں آنے سے پہلے کبھی جلی ہوئی روٹی نہیں کھائی، نہ لگے ہوئے چاول، نہ بسائند والی مچھلی یا گوشت۔ دستر خوان یا کھانے کی میز پر کسی کے ہڈی چبانے کو برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ بدتہذیبی ہے۔ اچھے بُرے لفظوں کی تمیز رہی۔ کیا بڑوں کے سامنے مُنھ سے نکل سکتے ہیں، کیا نہیں۔

(اس کے دشمن نے کہا 'لیکن تمھیں جنس ان سب سے مختلف تھی۔ اس کی طاقت کے آگے بڑے بڑے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ شراب کی طلب لے کر تم پیدا نہیں ہوئے تھے، نہ جرم کرنے کی خواہش ... لیکن)

'I have been a weak human being all along[1]

'ابھی بھی دماغ، میرا دشمن، خود کو مکمل طور سے گنہگار سمجھنے سے روک رہا تھا اور میں اس کے کہے میں آتا گیا' اس نے سر کو ایک جھٹکا دیا۔

---

[1] ساری زندگی میں ایک کمزور انسان رہا ہوں

دن نکلنے میں ابھی بہت دیر تھی۔

'یہاں بند کرا کے دماغ میرا وہ حشر کر رہا ہے جو کھونٹے سے باندھ کر کوئی گائے یا بیل کا کرے۔ قہر کی حد کو پہنچا ہوا غصہ، جنس کے اشارے کی غلامی اور وہ سب کچھ جو زندگی کے لیے ضروری نہیں تھا اس کی طلب – ان سب ہی نے تو مجھے زندگی بھر دوسروں کی نظروں میں ذلیل کیا۔ اور اس سے بڑھ کر خود اپنی نظروں میں۔ پہلے میں کہہ لیتا تھا: مرد کی زندگی میں، ہر مرد کی زندگی میں دو موقعے آتے ہیں جب قابو ہوتے ہوئے بھی اُسے خاموشی سے ذلت سہنی پڑتی ہے، ایک جب اپنے سے طاقتور شخص سے گالیاں سنی پڑتی ہیں، دوسرے جب وہ بیوی بچوں کی ذلت پر بھی لڑنے کو اٹھ کھڑا نہیں ہوتا ہے۔ عورت کے یہ نصیب کہاں!' وہ ہنس پڑا۔ اس خیال کے آنے پر جیسے بڑھتے ہوئے احساسِ جرم و گناہ کے جڑوں سے نکل آیا۔

یہ نہیں کہ صبح اٹھ کر کوئی ضروری کام کرنا تھا لیکن چاہ رہا تھا نیند آ جائے۔ نیند آ گئی تو کل کا دن بہتری میں کٹے گا۔ ادھر دماغ رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

'افسوس یہ ہے جیل میں کوئی پیر جی کا آستانہ یہ لوگ نہیں بناتے ہیں۔ وہ ہوتا اور بل گورمنٹ کے حساب میں جاتا تو کون یہاں سے نکلنے کے جتن کرتا، کاش مرنے سے پہلے بارہ گھنٹے کی قید بامشقت ہی ملی ہوتی تو دماغ کا چوبیس گھنٹے کام کرنا نصیب نہ ہوتا۔'

'کبھی ایسا وقت نہیں آیا جب اچھے برے کی تمیز نہ رہی ہو – چرس اور افیون سینٹرل اسٹیشن آؤٹ پوسٹ سے بندرگاہ کو پہنچاتے وقت تک۔ لیکن جب جب اُس بازار میں گیا ہوں بے سمجھ گیا، آج سمجھ پایا ہوں وہاں کی عورتیں بخش دی جائیں گی۔ انہیں کس نے بچپن سے لے کر جوانی تک برداشت، صبر، قناعت اور اپنے بنانے والے کی اطاعت کا سبق پڑھایا تھا؟ یا طلب سے بھرے کوٹھے پر آنے والوں سے نفرت کا؟ مجھ میں یہ سب شعور تھا اور نفرت کر سکتا تھا، اُن سے نہیں، اپنی طلب سے۔

وہاں کی پہلی عورت جس کی کاٹھی ایسی تھی کہ بڑھاپے کو پہنچنے تک بھی لڑکی ہی نظر آتی ہوگی اُسے

میں کیسے بھول سکتا ہوں! اُسے زکام تھا اور اس کے لیے اس نے مجھے اپنے ساتھ بھاڑ کے گرم چنے کھلائے تھے اور چلتے وقت جیسے پڑوس کی لڑکی کی طرح کہا تھا ''پھر آنا۔''

'اس بازار کی دکانیں ان کے بڑے کام کی تھیں جن کو اوپر بیٹھنے والیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا، وہ نظر بچا کر اوپر دیکھ لیتے تھے۔ تمہارا کیا خیال ہے دنیا بھر کا کوئی فرد اپنے لیے وہ زندگی یا اس کا ایک لمحہ بھی چنتا ہے جسے دنیا کی آبادی بُرا گردانتی ہے؟ بداطواری، گناہ کی زندگی چپ چاپ چلتی رہتی ہے۔ ایسا ہوتا ہے جب وہ بداطواری، اس کی جو بھی قسم ہو، اسے پوری طرح اپنے گرفت میں لے چکے ہوتے ہیں تب جاکے اس کی یہ زندگی سب کو نظر آنے لگتی ہے اور اُسے بگڑا ہوا دوزخ کا کندا کہا جانے لگتا ہے۔'

خیال پورا چکر کاٹ کر ایک بار پھر غصّے کے پھٹ پڑنے پر آ گئے۔

'تمہیں نہ فلم ڈائرکٹر پروڈیوسر اسٹوڈیو سے اٹھوا کر باہر پھنکواتا نہ سردار اور نگ ناز قتل کے الزام میں گرفتار کرواتا اگر تھوڑی دیر کے لیے تم بھول گئے ہوتے کہ ہاتھ کی لکیروں، نجوم اور راس منڈل کی تمہیں شد بُد ہے اور جب اس سے تم اپنے مقابل پر حملہ کرتے ہو تو یہ بھول جاتے ہو اس کے پاس اُن سے مہلک ہتھیار ہیں۔'

'کب سرِ عام غصّے کا سین پیدا کر کے اور گھر میں میمونہ پر پھٹ پڑنے کے بعد مجھے سکون ملا تھا! وہ ایک وحشیانہ، جناتی طاقت تھی میں جس کے بس میں ہوتا تھا۔ پھر جو بے چینی میرا مقدر ہوتی تھی وہ رات کی نیند کے بعد ہی ختم ہوتی تھی۔'

('پوری طرح سے؟')

'کبھی نہیں بھی۔ خود سے سچ بولوں گا۔'

'تو اے ربِ کریم وہ قہر بھی میری ہی بدی تھی اور اس کے لیے میں کسی کو ذمے وار نہیں ٹھیراتا ہوں، باپ دادا کو بھی نہیں۔ کیونکہ اُن کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا جنہوں نے اپنے اندر غصّے پر فتح پائی تھی۔

میں بڑے بھائی جان سے نفرت کرتا تھا۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ پارسائی اور عبادت ان کی

برساتی تھی، اندر کا لباس کچھ اور تھا۔ پتہ نہیں زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

تائے ابا؟ میرا خیال ہے ان کے جسم پہ بارش سے بچاؤ کی کوئی برساتی نہیں تھی۔ وہ بھیگے ہوئے کپڑوں میں بھی خوش رہتے ہوں گے۔ اور خشک بھی۔

'اور جب اتنی بات کی مجھے سمجھ تھی تو اب جا کے جانا ہے کہ اگر گاہے بگاہے رک کر سوچتا تو پتہ پڑتا چلا جاتا یہ زندگی کے لیے ضروری نہیں ہے، وہ زندگی کے لیے ضروری نہیں ہے۔ کب شراب زندگی کے لیے ضروری تھی؟ اور وہ سب کچھ جس کے پیچھے زندگی بھر دوڑتا رہا تھا۔ کیوں نہیں امینہ کے بھائی کی طرح میں نے اپنے اکسانے والے سے سر ہلا کر کہا سب کچھ ہے۔ پاس ہو کر اگر اسکول ٹیچر بھی بن جاؤں تو بھی درست ہوگا یا ہسپتال کے رجسٹر میں مریضوں کے نام لکھنے والا کلرک۔ لیکن نہ بلیک مارکیٹ کا سہارا لوں گا نہ کوئی پوشیدہ زندگی رکھوں گا۔ گناہ اپنی ہر شکل میں بدصورت ہے اور بعد میں اس کا احساس اُس سے بدتر۔'

اس رات تملیذ کی حالت مہابھارت کے یدھ میں اس کم عمر یودھا کی سی تھی جسے دشمن کے رچے ہوئے چکر میں لڑتے ہوئے اندر تک پہنچ جانا آتا تھا لیکن اس سے نکلنے کا گر اس نے نہیں سیکھا ہوتا تھا اور ارجن کے بیٹے ابھی منیو کی طرح وہیں گھر کر رہ جانا اور مارے جانا اس کا مقدر ہوتا تھا۔ سکون حاصل کرنے کے لیے تملیذ نے خود کو خیالات کے بھنور میں پھنسا لیا تھا۔ خود کو موردِ الزام، موردِ گناہ، موردِ جرم ٹھہرانے والے بھنور میں۔ زندگی کی تمام کمزوریاں اُسے گھیرے ہوئے تھیں۔ ایک سے نجات پانے کا مطلب ہوتا تھا پچھلا دشمن پھر سے حملہ کرے گا۔

اس طویل رات کے خاتمے پر سلاخوں والے لوہے کے دروازے کے پاس لیٹے لیٹے تملیذ کو احساس ہوا آج میں نے دیکھ لیا سچ کیا ہے۔ کسی پر بدی کی راہ دکھانے کا الزام نہیں رکھتا ہوں۔ جیسا ہوں خود کو میں نے ویسا بنایا ہے۔ مجھے اس قتل کے الزام پر بھی اب غصہ نہیں ہے۔ جس راہ پر زندگی بھر چلا تھا جانتا تھا نہ مکّے کو جاتی ہے نہ مدینے کو۔ پھر بھی آنکھیں بند کیے اس پر چلتا رہا۔ اور اب پتہ چلا وہ راہ یہاں سے سو دو سو قدم کے فاصلے پر ایک تختے پر ختم ہوتی ہے

جس کے دو پٹ ہیں جو پیروں کے نیچے مقررہ وقت پر بغیر ایک لمحہ ضائع کئے کھلتے ہیں۔ اور میں اس کے لیے تیار ہوں۔

'میرے پیدا کرنے والے میں نے ایک بار پہلی جیل میں کہا تھا: میں تجھے نہیں جانتا مگر آج مانے لیتا ہوں۔ اور بعد میں یہی بات ایک ولی اللہ کے مزار پر انہیں گواہ بنا کر کہی تھی جس طرح سنتا آیا تھا فلاں نے مسجد میں کھڑے ہوکر اپنے غیر فطری فعل سے توبہ کی تھی کہ مسجد کا تقدس اُسے باز رکھے گا ورنہ اس بدفعلی کے وقت اس نے سنا تھا عرشِ عظیم ہل جاتا ہے۔

'آج میں نہ مسجد میں ہوں، نہ کسی مزار پر، نہ آبِ زمزم کا ایک گھونٹ مُنھ میں رکھ کر یہ کہہ رہا ہوں کہ میں گنہگار ہوں، عمر بھر گنہگار رہا۔ میرے پاس ان گناہوں کے کرنے کا عذر نہیں ہے، مطلق نہیں اور یہ بھی جانتا ہوں اگر تیری راہ پر چلا ہوتا تو آج میرے سر، کندھوں اور پیٹھ پر گناہوں کا اتنا بوجھ نہ ہوتا۔'

پھر اس نے نیند کو آنکھوں اور دماغ پر اترتے ہوئے محسوس کر کے کہا 'اب چاہے دوسری زندگی دے نہ دے میں نے اپنی تمام کمزوریوں کو بھانپ لیا ہے اور اُن سے نمٹ سکتا ہوں — بچی ہوئی اس زندگی میں بھی اور اگر زندگی پھر سے شروع کروں تو اس میں بھی۔ میرا خیال ہے یہی میری نجات ہے، میری مکتی، میرا نروان۔ بس اتنا کر کہ اگر دوسرا جنم دے تو موت کے ساتھ پہلی زندگی سے حاصل کیے ہوئے سبق نہ بھول چکا ہوں۔'

('جس طرح اس جنم میں پچھلے جنم کے سبق بھول کر پیدا ہوئے تھے۔ ہیں؟')

پہرے کے سپاہی نے آ کر جگایا ''تلمیذ بھائی اٹھو فجر کا وقت نکلا جا رہا ہے۔''

''اذان ہوگئی؟''

''کب کی۔ تم نے نہیں سنی!''

'پروردگار تیرے بندوں میں سے یہ تیرا نہایت گرا ہوا بندہ عبادت سے تھک چکا ہے۔ عبادت سے ہمیشہ دوسرے خیال پیوستہ ہوتے ہیں۔ کبھی تو

دو یا ایک ہی رکعت ایسی ہو جس میں صرف تیرا خیال ہو اور اس کے ساتھ وہ جذبہ ہو جو شاید تیرے خوش نصیب بندوں کا مقدر رہا ہے، میرا نہیں۔ ایک بار بھی نہیں۔ تو گواہ ہے میں نے ان آٹھ مہینوں میں جب سے قرآن معنی کے ساتھ ختم کیا ہے کتنی کوشش کی ہے جب تیرے سامنے آنکھیں نیچی کر کے کھڑا ہوں، جھکوں اور سجدے میں جاؤں صرف تیرا خیال ہو لیکن جب دنیا کے خیالات تھمیں تب نا! نتیجہ: سلام پھیرنے کے بعد خود کو پہلے سے زیادہ خطاوار محسوس کرتا ہوں۔'

تکمیذ کا رُخ باہر جیل کے صحن کی طرف تھا۔ جب نماز کے بعد وہ وہاں سلاخوں کو پکڑ کر جا کھڑا ہوا تھا رات کے اندھیرے کو صبح کی نرم روشنی پوری طرح ختم نہیں کر پائی تھی۔

'میرا خیال ہے اس رات کے بعد میں کبھی خیالات کی شورش کے بس میں نہیں ہوں گا جیوں گا تو اس کا ایک عاجز بندہ بن کر اپنے خلاف سارے فردِ جرم و گناہ کو تسلیم کرنے والا۔'

جب وہ پیچھے ہٹ کر فرش پر بیٹھ گیا تو صحن کی گھاس اور دیوار کی دوسری طرف کے پھول اپنے اپنے رنگ میں نظر آنے لگے تھے۔ نگہبانی کے برج والا سنتری نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہیں بیٹھ کر سو گیا تھا۔

'ہو سکتا ہے اپنی چائے لینے گیا ہو۔'

(۷۲)

ایک اور بغیر چاند کی رات تھی، اس جیل میں شاید تریسٹھویں، ستارے صرف یہاں وہاں ایک دوسرے سے اتنی دور تھے کہ لگتا تھا کبھی اُن میں آپس میں بنی ہی نہیں ہے۔

واچ ٹاور نظر تو آ رہا تھا لیکن اس میں کھڑے ہونے والے پہرے دار کا پتہ نہیں تھا۔ ہوسکتا تھا وہیں تھک کر فرش پر بیٹھ گیا ہو۔ وہ بھی آخر کو آدمی تھا۔ دیوار اپنی جگہ پر تھی لیکن اس پر لگے ہوئے ایستادہ اینگل آئرن اور ان کے درمیان کے برچھوں کو جو باہر کے رخ بھی گھومے ہوئے تھے اور اندر کے رخ بھی اور اُن میں سے گزرنے والے گوکھروؤں والے تاروں کی لائنوں کو اس دھیمی روشنی میں دیکھنا مشکل تھا۔

دن بھر گرمی رہی تھی اور شام سے گھٹن تھا۔ کچھ سیلز 'ایسے تھے جن کے بسنے والوں کو دنیا سے رخصت کر دیا گیا تھا اور خالی پڑے تھے پھر بھی بعض میں تین تین قیدی تھے جن کا پسینہ ایک دوسرے کو لگتا رہتا تھا۔

آدھی رات کے قریب کھاڑی کی طرف سے آنے والی ہوا کا پتہ درختوں کے پتوں کی آواز نے بتایا۔ تکمینہ نے چہرہ گرل سے لگا کر دونوں ہاتھ باہر نکال دیئے: جتنی دور بھی کھلی ہوا میں جاسکیں۔ یہی کام وہ پیروں سے کیا کرتا تھا۔ کوٹھری میں ہوا کا گزر نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ سر جھکتا گیا اور

---

۱ Cells

ماتھا گرل سے ٹک گیا۔

ناگہاں بائیں طرف سے جدھر مین گیٹ نہیں تھا دو شوٹس کی آواز آئی اور پیپل کے درخت میں سے چڑیوں کا شور اٹھا۔ تمیز کی آنکھ کھل گئی۔

واچ ٹاور سے جہاں پہلے کوئی نظر نہیں آرہا تھا کسی نے فائر کیا اور اگلے ہی لمحے تمیز کو پہرے کے سپاہی کا جسم وہاں کی دیوار پر سے جو نیچی تھی لپا ہوا نظر آیا جیسے اس پر دوہرا ہو گیا ہو۔ جس گولی نے یہ کام کیا تھا اس کی آواز سننے میں نہیں آئی۔ پھر اونچائی سے بندوق کے اُدھر کے سیمنٹ کے فرش پر گرنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد فائرنگ شروع ہو گئی۔

پوری طور سے نیند کے ٹوٹنے پر تمیز کی سمجھ میں آیا کہ اچانک جیل میں کوئی ہنگامہ شروع ہوا ہے جس کا شام تک کوئی سان و گمان نہ تھا۔

اب گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں بھی آرہی تھیں – اس طرف سے جو مین گیٹ سے سب سے دور تھی۔

کوئی چیخا ''ارے بدبخت یہ کیا کیا۔ میں بیوی بچوں والا ہوں۔ اب ان کو کون کھلائے گا۔''

اس کی آواز کو بھاری فائرنگ کی آواز پی گئی۔

ایک آدمی تیزی سے چلتا ہوا اس کے سیل کے دروازے پر آیا اور بولا ''بھاگ لے، یہی موقع ہے۔''

بلا ارادہ تمیز کے مُنھ سے نکلا ''میرے لیے یہ موقع نہیں ہے۔ میں نہیں بھاگوں گا۔''

جو آدمی یہ مژدہ لے کر آیا تھا اس کا جواب سُنے بغیر کہیں آگے جا چکا تھا۔

اگلے ہی لمحے کسی نے کہا ''دروازے سے پرے ہٹ جا'' پھر سیل کے تالے کے لوہاروں کے [1]بھاری ہتھوڑے سے توڑنے جانے کی آواز آنے لگی۔ اس وقت تمیز کے دماغ سے سارے عہد، ساری عاجزی، ساری مایوسی اس طرح دور تھی جیسے بلیک بورڈ پر چاک سے لکھی عبارت پر فیلٹ لگا ہوا ڈسٹر پھیر دیا جائے، اور جو لکھا تھا پاؤڈر بن کر فرش پر پڑا ہو۔ اس وقت وضو کی حالت

---

[1] Sledge-hammer

میں، دو رکعت نماز کے بعد کلمہ پڑھتے ہوئے پھانسی گھر تک جانے کا عزم اور مرنے کے بعد ملنے والی ابدی پاک معصوم زندگی پا لینے کا خیال اس کے ذہن میں نہیں تھا۔

پھر دروازہ بھڑاک سے کھلا اور نجات دلانے والے نے کہا "تمیذ دیر مت کر، بھاگ، یہ ماؤسر رکھ لے، لوڈیڈ ہے۔ آزادی میں نے دلائی ہے اب اپنی حفاظت خود کر۔"

باہر کے کورٹ یارڈ میں دو تین جسم پڑے تھے، اُدھر بم پھینکا گیا تھا جس نے الیکٹرک سپلائی لائن کو بھی ختم کر دیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ کے اوفس اور برابر کے کمروں میں نہ کوئی ٹیوب لائٹ سلامت تھی نہ بلب۔ سرچ لائٹ اور کھمبوں کے بلب شاید شروع رات ہی سے اوف تھے۔

کسی کی آواز آئی "سیاسی قیدی کو ختم کرنے کے لیے بم پھینکا گیا ہے۔"

اس جیل کی تاریخ دلچسپ تھی، بڑے بڑے سیاسی قیدی اس میں انگریزوں کے زمانے سے رکھے گئے تھے لیکن جیل بریک پہلی بار تھا۔

مرنے والوں میں کون سپاہی ہے کون مجرم یہ کہنا مشکل تھا۔

بھاگتے میں تمیذ کے پیر کو زمین پر گرے ہوئے ایک سپاہی نے کس کر پکڑ لیا۔ تمیذ نے زور لگایا۔ زخمی سپاہی اس کے پیر کے ساتھ گھسٹنے لگا۔ کھینچا تانی میں ماؤسر تمیذ کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ تمیذ کی حالت ایک ہپنوٹائزڈ فرد کی تھی۔

جس نے تالہ توڑا تھا پاس آ کر بولا: "میں نے تجھے آزاد کر دیا اور تو ابھی تک یہیں کا یہیں ہے۔" کہنے والا سب سے خستہ حال مسکین قیدی تھا - بسورتی صورت کا، لیکن اس وقت لگتا تھا اپنے گلے کا سردار ہرن ہے جو شکاری جانوروں تک سے ٹکر لینے کو تیار ہے۔

گرے ہوئے سپاہی نے کہا "زندگی کے لیے باقی عمر قانون سے بھاگتے رہنا کیا پھانسی کے تختے سے بہتر ہے!"

تالہ توڑنے والے نے اپنا چُھرا تمیذ کو تھمایا اور دیوار کی طرف بھاگا۔ وہاں سے ہنہنانے اور ٹاپوں کی آوازیں پیچھے رہ جانے والوں کو بلا رہی تھیں۔

ٹانگ پکڑے رہنے والے سپاہی نے کہا "ہم سب آفت میں آ جائیں گے۔ حکومت کا ایک ہی

چارج ہوگا ہم قیدیوں سے ملے ہوئے تھے۔ خدا کے لیے۔"

"اب بھی یہی چارج ہوگا۔"

"نہیں ابھی چارج سیاسی قیدی کے چھڑانے والوں پر آئے گا۔" وہ زیادہ حقیقت حال سے آگاہ تھا۔

تمیز نے چھرے کا دستہ اندھیرے میں گھستے ہوئے سپاہی کے سر پر مارا، اس کی ٹانگ آزاد ہوگئی۔

دو آدمی فصیل پر کھڑے تھے، وہاں اب نہ اینگل آئرن میں جڑے ہوئے برچھے تھے نہ گوکھرو والے تار۔ اُن میں سے ایک نے ہاتھ پکڑ کر اُسے ایسے اوپر اٹھا لیا جیسے کنوئیں کے منھ تک آئے ہوئے ڈول کو۔

پتہ نہیں جیل سے فرار ہوتے وقت اپنا وہ جملہ تمیز کے ذہن میں تھا یا نہیں 'کیا آدمی گناہ اور جرم سے واقعی کبھی دور ہوتا ہے؟'

اور ممکن ہے اس کے ذہن میں آیا ہو 'جرم میں کر رہا تھا یا قانون؟'